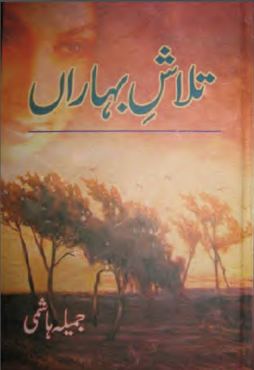
تلاشِ بہاراں
جمیلہ ہاشمی

کنواری رات کی سیاہی ستاروں کی روشنی میں گُھل کر بہہ رہی ہے۔ میرے کمرے کے سامنے برآمدے کی سیڑھیوں پر پڑے ہوئے فرن میں سے گزرتی ہوئی ہوائیں نوحہ کر رہی ہے جیسے وہ کسی ویران محل کی لمبی غلام گردشوں میں چکر لگاتی آئی ہو۔ اپنے بھرے پُرے گھر میں جانے کیوں آج میں اتنا اکیلا محسوس کر رہا ہوں' جانے کیوں؟

کنول کماری ٹھاکر کو تو میں مدتیں ہوئیں بھلا بیٹھا تھا۔ کم از کم میں نے دل کو یقین دلانے کی پوری کوشش کی تھی کہ میرے لیے کنول مر چکی ہے۔ پھر کبھی کبھی سالوں جس کوشش میں اپنی پوری قوت صرف کر دو' ماضی کے دھندلکوں میں سے نکل کر دو بول بھی اسے اکارت کر دیتے ہیں۔ اخباروں میں اِدھر اُدھر جب بھی میں نے اس کا نام پڑھا ہے۔ دوسروں کی زبانی اس کا نام سنا ہے' میں نے انجان بن کر اس کے نام کو اور اس کی بات کو بھلانا چاہا ہے۔ پھر بھی اس کے نام کو میں نظر انداز نہیں کر سکا۔ آج وہ میرے لیے پھر سے زندہ ہو گئی ہے۔ وہ ماضی کے سہارے ستاروں کی چھاؤں تلے رات کی سیاہی میں پھر میرے اتنے ہی قریب آباد ہو گئی ہے' جتنی قریب وہ ہمیشہ رہی ہے' کیونکہ آج کنول کماری ٹھاکر اس دنیا میں نہیں رہی۔

یہ سوچتا ہوں' یہ دنیا ہے ہی کیا؟ ایک مسکراہٹ اور ایک جاودانی سی زندہ رہنے والی مسکراہٹ جو مجھے نہ مل سکی۔ میرا ایک حصہ کنول کے ساتھ مر گیا ہے۔ ایک حصہ آج رات شمشان کی آگ میں اس کے ساتھ جل جائے گا اور اس کے پھول چننے والا' وہاں کون ہے' جو اس کی راہ میں میرا جلا ہوا دل تلاش کر لے گا۔ میرا دل کنول کے ساتھ جل نہیں سکتا' کیونکہ میرے دل میں وہ دھیرج نہیں تھا جو کنول کے خوابوں کے ساتھ ساتھ چلتا۔ میں تو ایک ہارا ہوا جواری ہوں جس نے ہر گام پر شکست کھائی ہے اور اپنی شکست پر نازاں ہونے کا وقت بھی مجھے اس دنیا میں نہیں ملا دیا' پھر یہ سب باتیں بے کار اور بعد از وقت ہیں۔

ایسی سرد خاموش اور اندھیری رات میں جب سیاہی ستاروں کے ساتھ گھل کر بہہ رہی ہے' صرف کنول کماری ٹھاکر ہی شمشان کی راکھ بن سکتی ہے' کیونکہ وہ اپنے خوابوں میں ساری عمر ناروے کے ہیرو ناجیل کا انتظار کرتی رہی تھی۔ برفاب سمندروں پر ایک شانِ بے اعتنائی سے سفر کرنے والے ساگار کے ہیرو ناجیل کا انتظار اور ایسی سرد رات میں ناجیل کے ہیرو کے ساتھ برفانی سمندروں پر ایک طویل سفر پر جانے کے لیے کنول نے اپنا یہ فانی لباس اتار پھینکا تھا۔

چند دن اخباروں میں اس کی موت کا چرچا ہوگا۔ آج کی طرح سیاہ حاشیوں میں اس کی موت کی خبر چھپے گی۔ اس کے جاننے والے اس کے متعلق مضامین لکھیں گے۔ اس کے خطوط جو اس نے لوگوں کو وقتاً فوقتاً لکھے ہوں گے' اس کے اقوال' اس کی باتیں سب ایک خاص نمبر میں شائع ہوں گی۔ بہت ہوا تو لوگ اس کا مجسمہ بنا کر کسی چوراہے پر نصب کر دیں گے اور پھر اس کے پاس سے یوں گزر جایا کریں گے گویا مجسمہ ان کے لیے کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ پھر زمانے کی گرد اور بھولے ہوئے دنوں کی گزرگاہوں کی خاک اس پر پڑ جائے گی اور کنول کماری ٹھاکر پتھر کے پیکر میں قید وہاں کھڑی رہے گی۔ منتظر ایسے ہی جیسے وہ ساری عمر ناجیل کا انتظار کرتی رہی ہو اور آخر خاموشی سے موت کے کہرے میں گم ہو جائے گی۔ یہ سب کچھ ہوگا اور ظاہر میں صرف کنول ہی دنیا میں سے کم ہوگی مگر اس کے ساتھ وہ سارے نظریے' وہ ساری باتیں بھی ختم ہوں گی جن کے سہارے وہ زندہ تھی۔ اس کے بعد کوئی اور نرالی بہتر یا بدتر عورت اس کا علم ہاتھ میں لے کر چلے گی مگر وہ کنول تو نہ ہوگی۔

میں نے ایک بار بہت ہمت کر کے اس سے پوچھ ہی لیا تھا' کنول ٹھاکر تم صرف ناجیل کی منتظر کیوں رہی ہو؟ کوئی کرشن کنیا' کوئی دیوتا' کوئی یونانی وادیوں میں پھرنے والا چرواہا' خدا تمہارے کام آ سکتا ہے۔ تمہارا مطمح نظر بن سکتا ہے' تو اس نے کتنی حقارت سے کہا تھا' تمہاری دیومالا میں دیوتا ہیں تو سہی پر وہ اپنی تکمیل کے لیے کسی نہ کسی پاربتی کے منتظر رہتے ہیں اور یونانی خدا بھی عام انسانوں کی طرح محبت کرتے زندہ رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے حاسد ہیں۔ میں ایسے دیوتاؤں کا کیا کروں۔ تمہارے دیوتا تو عام انسانوں کی طرح زندگی' جہنم اور جنگ کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ میرا ناجیل ان سب کمزوریوں سے بالاتر' ان خامیوں سے بلند برفانی پہاڑوں پر اکیلا سفر کرتا ہے۔ اس کی زندگی میں محبت کا اس لیے فقدان ہے کہ وہ ہمہ محبت ہے۔ وہ مجسم شفقت ہے۔ اس کا وجود ان قوتوں کا مظہر ہے جو زندگی کے لیے قوتِ نمو ہیں اور میں نے دل ہی دل

میں بچپن کی ان کہانیوں کو کوس ڈالا جنہوں نے کنول کا تعارف ناجیل سے کروایا تھا۔

کنول کو پہلے پہل میں نے ایک غیر ملکی وفد سے ملاقات کرتے ہوئے عورتوں کی نمائندہ کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ اس کی باتوں میں بڑی متانت اور ہنسی میں بڑی مٹھاس تھی۔ اس کی پیشانی پر وہ نور تھا جس کو لفظ بیان کرنے سے قاصر ہیں جس کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اور گہری پُروقار آواز اس کی کم عمری کے باوجود موثر تھی۔ پھر اس کا لفظوں پر زور دینے اور اپنی بات منوانے کا انداز' فیصلہ کن سی باتیں' میں اسی پہلی ملاقات میں ہی اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔

پھر سمندر کی سطح پر کشتی کے سفر میں کبھی کبھار روشنیاں نظر آ کر چھپ بھی جایا کرتی ہیں۔ مہینوں مجھے کنول کی بابت کچھ معلوم نہ ہوا۔ کام کے بعد جب کبھی میں سوچنے کی کوشش کرتا' مجھے صرف کنول کی آنکھوں کی روشنی سی یاد پڑتی۔ آنکھیں کبھی یاد نہ آئیں۔ مجھے جن لوگوں سے لگاؤ ہو ان کی شکلیں یاد نہیں آتیں۔ مجھے اپنی بیٹی بینا کی شکل کبھی یاد نہیں رہتی۔ جب سونے کے لیے اٹھتا ہوں تو اتنے چہرے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں مگر بینا کا چہرہ کبھی یاد نہیں آتا۔ بینا مجھے سب سے پیاری ہے مگر اپنی اس یادداشت کا کیا کروں۔

ایک عام بیزاری کے تحت سارا ملک جاگ رہا تھا۔ عورتوں میں تعلیم عام ہو رہی تھی۔ روز جلسے ہوتے تھے۔ جلوس نکالے جاتے تھے۔ عورتیں جھنڈے ہاتھ میں لیے جلوس کی قیادت کرتیں۔ من چلے لوگوں نے عورتوں کا ساتھ دینے کے لیے بڑے بڑے جلسے کیے۔ رسالوں میں عورتوں کے حقوق پر بحثیں ہوئیں' کتابیں لکھی گئیں اور ایک سال تک ملک نے حیرت سے بیداری کے اس خواب کی تعبیر کو دیکھنے کے لیے آنکھوں کو پوری قوت سے کھولے رکھا اور پھر آہستہ آہستہ عوام اس روز روز کے شور سے تنگ آ گئے۔ آخر کوئی کہاں تک اس دلچسپ تماشے کو ایک حقیقت میں ڈھلتا دیکھے اور دیکھتا چلا جائے۔ عام لوگوں کی بیویاں' مزدوروں کی بیٹیاں' بیویاں اس جاگنے کے جادو اور طلسم ٹوٹنے کے سحر کو بڑے چاؤ سے دیکھتی رہیں اور پھر جب اس کروٹ بدلتے ہوئے زمانے میں ہر ایک کو وہی خوبصورت گھر نصیب نہ ہو سکا جس کا وعدہ اسٹیج پر چڑھ کر عورتیں کرتی تھیں تو تحریک سونے لگی۔ متوسط طبقے کی عورتیں اپنے چولہے چوکے گھر بار اور بچوں کے بوجھ تلے دبنے لگیں۔ ایک اور جماعت اٹھی جس نے مشرق کے نصب العین اور زندگی کی آزادی کے خلاف زوردار مظاہرے کیے۔ دو پاٹوں کے درمیان عام لوگوں کا ذہن پسنے لگا اور روز

روز کی گھُمر گھُمر سے تنگ آ کر عورتیں واپس گھروں کو چلی گئیں۔ انہوں نے جلسوں کو بکواس اور وقت ضائع کرنے کا ایک ذریعہ سوچ کر اس سے اجتناب کرنا شروع کر دیا اور یوں یہ بیداری کا خواب ایک شکست میں بدل گیا۔ مردوں نے اپنے کلبوں میں گھروں کی پارٹیوں میں عورتوں کا خوب مذاق اڑایا۔ عورتیں کیا کام کر سکتی ہیں؟ عورتیں تو گھر کے اندر قید ہی بہتر ہیں۔ پھر واقعات بھی کچھ ایسے ہی ہو گئے۔ ایک ورکر لڑکی نے کسی مہاشے سے کورٹ میں جا کر شادی کر لی۔ لڑکی خاصی قبول صورت، پڑھی لکھی اور عقلمند تھی۔ شادی جذبات کی رو میں اور نئی آزادی سے فائدہ اٹھانے کے لیے کی گئی تھی اور لڑکا بھی عورتوں کی آزادی کا حامی خوب نعرے لگانے اور باتیں کرنے والا ایک اچھا شعلہ بیان مقرر تھا۔ اس کے لفظ مردوں سے ایسی باتیں کرواتے تھے جن کا خواب بھی کبھی ملک نے نہیں دیکھا تھا۔ ملک کے تعلیم یافتہ حلقوں نے اس شادی کو بہت پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ لڑکیاں اپنی آنکھوں میں ایسے ہی خواب لیے گھومنے لگیں۔ بہت سے چہروں پر رونق سی آ گئی۔ مایوسی کے اندھیرے میں چند روشنیاں سی چمک اٹھیں مگر یہ تو اس کے شرارے تھے کہ بجھ گئے۔ چار ماہ کے بعد اخباروں نے، جو ہر بڑی خبر کو بہت ہوا دیتے ہیں، اسی شادی کے متعلق زور و شور سے لکھنا شروع کر دیا۔ تعلیم یافتہ لڑکی اپنے تجربے کی خامی اور خیالات کی ناپختگی کے باعث ایک بہت بڑے دور سے شکست کھا کر نکلی تھی۔ شور اور فضول کے غوغے کی طرح یہ چرچا بھی چند دنوں کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔ سوسائٹی کے دماغ کو جھٹکے لگتے ہی رہتے ہیں۔ پرانی ڈگر پر چلنے والی زندگی جب کروٹ بدلتی ہے تو ہلچل لازمی ہوتی ہے۔ اس کے بعد پھر نئی کروٹ تک وہی خاموشی وہی سناٹا اور سنسان ہولناک ویرانوں کی سی بے کیفی۔ یکا یک اخباروں نے ایک مقدمے کی سماعت کی خبر چھاپی۔ لڑکی کی طرف سے مقدمے کی پیروی کنول کماری ٹھاکر کر رہی تھیں اور لڑکے کی طرف سے شرون کمار بینر جی۔ کنول کماری کا نام میں نے مہینوں کے بعد پھر سنا اور مقدمہ بھی اپنی نوعیت سے کچھ عجیب سا تھا۔ سارا ملک رنج و غم کی لہر سے بیتاب سا ہو گیا۔ عورتوں کی ہمدردیاں کرشنا بوس کے ساتھ تھیں اور مردوں کی رویندر مہاشے کے حق میں۔ رویندر سوسائٹی کے اس اعلیٰ طبقے کا ممبر تھا جو زندگی کو تفریحاً گزارتا ہے۔ جس کے لیے عورت کے جسم و روح سے لے کر سیاست تک ایک دلچسپ اور نا مختتم کھیل ہے۔ رویندر نے ایک چھوٹے سے راجواڑے کے کمار کی حیثیت سے یونیورسٹی کے بہترین ہوسٹل میں رہ کر کئی سالوں میں اپنی ڈگری لی تھی۔ پھر سمندر پار جانا بھی (اتنا ہی ضروری ہے جتنا جینے کے لیے سانس) دونوں یورپ کے ساحلوں،

ہوٹلوں اور یونیورسٹیوں، آرٹ کونسلوں اور شہروں میں گھوم کر لوٹے تو عورت کے حقوق کی حفاظت میں لگ گئے۔ ایک بہت بڑے ورکر کی حیثیت سے اخباروں میں اپنا نام پڑھ کر جھوٹے غرور اور شہرت کی حس کو تسکین سی ہوئی۔ اس میدان میں جہاں عورتوں کے حامی کم اور مخالف زیادہ تھے، ان کا نام خوب چمکا۔ ڈنر پارٹیوں، جلسوں اور عورتوں کا نمائندہ بن کر رویندر کمار کو عشق سُوجا۔ کرشنا بوس کا نیا شباب تھا۔ کام کے جوش کو، رویندر کے سہارے کو، اس نے زندگی کے سہارے میں بدل دیا۔ دونوں جذباتی تھے۔ ایک کھایا کھیلا اور زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کہنہ مشق شکاری تھا۔ دوسری طرف آزادی کی روشنی سے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہر اندھیرے میں بھی خواب آور سہاروں کی جھلک دیکھنے والی معصوم لڑکی تھی۔ داؤ چل گیا۔ کام کے پردے میں دل بھی بہلتے رہے اور پھر؟ خدا جانے کس جلد بازی کے تحت رویندر کمار نے کورٹ میں جا کر شنا بوس سے شادی کر لی۔ سیاسی حلقوں میں اس شادی کا بہت چرچا ہوا۔ سماج کے ٹھیکیداروں، تہذیب کے علمبرداروں اور مشرقی روایتوں کی حفاظت کرنے والے واعظوں نے عورتوں کی زندگیوں پر نفرین بھیجنی شروع کی۔ کرشنا کے اقدام نے کئی والدین کو اپنی لڑکیوں پر سختی کرنے پر مجبور کر دیا۔ ایک عام ہوا سی چلی اور جوان لڑکیاں خواہ مخواہ ہی معتوب ہونے لگیں۔ اچھا بھلا چلا ہوا کام رک گیا۔ تحریک دب سی گئی۔ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے حامیوں نے بھی دانتوں تلے انگلی دبا کر اپنے خیالات سے توبہ کر لی۔ ماؤں نے بیٹیوں کو گھروں کی چار دیواری سے باہر نکلنے سے منع کر دیا۔ جانے ان دنوں کتنے آنسو تکیوں میں جذب ہوئے ہوں گے اور کتنے آنسو رات کے اندھیروں میں سانسوں کے سہارے جذب کیے گئے ہوں گے۔ آزادی کے افق پر تاریکی سی چھا گئی۔ نوجوان، رویندر کی خوش قسمتی پر اس کے حامی تھے۔ وہ سب کے لیے باعثِ رشک تھا۔ پرانی روایتوں کے علمبرداروں نے بہت لے دے مچائی۔ رویندر کمار برہمن تھا۔ کرشنا بوس ایک معمولی خاندان کی لڑکی تھی۔ یہ شادی کسی طرح بھی نہیں ہو سکتی۔ کم از کم سنسکاروں کی رُو سے یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ کورٹ کا ہندوستانی زندگی میں کوئی مقام نہیں۔ یہ سب یورپ کے ڈھکوسلے ہیں اور اس لیے جو قانون یورپ کی سوسائٹی میں قابلِ عمل ہیں یہاں نہیں ہو سکتے۔ نتیجہ کیا تھا شادی کے چار ماہ بعد سماج نے اعلان کر دیا کرشنا اگر چاہے تو رویندر کے گھر میں ایک داشتہ کی حیثیت سے رہ سکتی ہے، ایک بیوی کی طرح نہیں۔ یہ ایک بجلی تھی جو گر کر نئی روشنی کو بجھا گئی۔ جلسے بند کر دیئے گئے۔ عورتوں کے جلوس بھی نکلتے نکلتے رہ گئے۔ ہندوستانی سوسائٹی میں عورت کا جو مقام بھی ہو، وہ ماں، بہن اور بیٹی ہوتے ہوئے اس زندگی میں

عزت کی محافظ ہے۔ وہ ہندوستان کی عزت ہے۔ جب تک عورت قید ہے اس کا گھر میں رہنا ہی مرد کو باوقار اور بلند بناتا ہے۔ جوان لڑکیوں نے کرشنا کو گالیاں دیں۔ کالجوں اسکولوں میں مذہبی تعلیم پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ مندروں میں پوجا کے سمے عورتوں کی بھیڑ زیادہ ہوتی...... جوان لڑکیاں گھبرائی ہوئی ہرنیوں کی طرح پجاری کی تیز نظروں کے سامنے دوہری ہو جاتیں۔ مغرب اور مشرق گلے مل لیتے تھے کہ جدا کر دیئے گئے۔ مغرب اور مشرق اکٹھے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلنے لگے تھے کہ ان کو الگ راہوں پر لگا دیا گیا۔ فضا میں ایک طوفان سا تھا۔ روز اخبار میں ایک نئی خبر سرخ حاشیوں میں شائع ہوتی۔ کبھی کرشنا کے بیانات اور کبھی رویندر کمار کے پتا کے بیانات۔ رویندر خاموش تھا۔ شریف باپ کا برہمن بیٹا برہمن سوسائٹی کا اعلیٰ رکن صالح اولاد کی طرح اس نے اپنی جلد بازی اور جذباتیت کے فیصلے سے توبہ کر لی تھی۔ پھر سنا گیا کہ بڑے بڑے مہاتما اس کے پرائشچت کے لیے دور دور شہروں سے بلائے گئے۔ ایک بہت بڑا ہون ہوا اور رویندر جو لڑکا تھا کسی چھوٹے موٹے راجواڑے کا کمار تھا معاف کر دیا گیا۔ کرشنا بوس کے متعلق مہینوں کوئی بات نہ سنی گئی اور دنیا کا دستور ہے بڑے سے بڑے زخم کو مندمل کرنے کا علاج جانتی ہے اور جلد ہی کر لیتی ہے۔ یہ معاملہ جو اخبارات کی سرخیوں میں اولین جگہ پاتا رہا تھا خاموشی کی راہوں سے تہذیب کے اسی غار میں جا اترا جہاں سے ایسے بہت سے گناہوں کا مسکن ہوتا ہے۔

اور پھر اخباروں نے ایک دن ایک نئے مقدمے کی سماعت اور کارروائی کی خبر شائع کی۔ کرشنا بوس کی طرف سے کنول کماری ٹھاکر عدالت میں کھڑی ہوں گی اور یوں دوبارہ کنول ٹھاکر کا تعارف مجھ سے ہوا۔

جس دن مقدمے کی سماعت تھی۔ عدالت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ میں بھی تماشائیوں کے گروہ میں کھڑا تھا اور اس خاموشی میں صرف دلوں کی دھڑکن کو سن رہا تھا جو انجانے ہی اس بڑے کمرے پر چھا گئی تھی۔

سوال کیا گیا کہ کرشنا بوس کا کیا کہنا ہے؟

یہ کہ اسے رویندر کمار کی بیوی تسلیم کیا جائے۔

رویندر کمار برہمن ہے اور کرشنا بوس ویش جب کہ دونوں کی شادی سنسکاروں کی رو سے جائز نہیں تو اسے کس طرح رویندر کی جائز بیوی تسلیم کیا جائے۔

کنول ٹھاکر کے چہرے پر غصے اور اس ذلت پر جو عورتوں کی پوری جنس کے متعلق ان لفظوں میں پوشیدہ تھی، جھنجھلاہٹ بھی تھی مگر اس کی تیز بارعب آواز ہی صرف عدالت کے کمرے میں گونج رہی تھی۔ اس نے کرشنا بوس کی طرف سے ایک فاضل وکیل کی طرح پورے معاشرے پر تنقید کی اور آخر میں بتایا کہ اس جاگتے ہوئے زمانے میں کسی رویندر کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کرشنا کے ساتھ شادی رچا کر اسے تین چار ماہ اپنے پاس رکھے اور پھر اسے اپنی داشتہ کہہ کر اس کی بے عزتی کرے اور یوں مہذب دنیا میں اسے ذلیل کرے۔ کنول کے لفظوں میں رویندر پر تین الزامات تھے۔

کرشنا بوس کو غلط راہ پر چلانے کا۔

اس سے شادی کر کے اسے اندھیرے میں دھکیلنے کا۔

اور اس کی بے جا ذلت کا۔

اتنے ماہ کے بعد کڑیاں یکے بعد دیگرے ملتی جا رہی تھیں اور رویندر کے باوا جو تھوڑی دیر پہلے اپنے آپ سے مطمئن بڑے سکون سے شیروانی کے گلے کے بٹن بند کرتے ہوئے عدالت کے کمرے میں تشریف لائے گھبرا رہے تھے۔ رویندر کے منہ پر ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں۔ کرشنا زرد اور بے جان بُشرے کے ساتھ بہت الگ سی بیٹھی ہوئی تھی۔ مقدمے کی سماعت دوسرے دن پر ملتوی ہو گئی۔ لوگ جیسے خواب سے جاگے ہوں۔ پہلے ہولے ہولے بھنبھناہٹ سی ہوئی اور پھر رویندر کے خلاف غصہ اور غم سا پھیلتا گیا۔ آدمی باتیں کر رہے تھے۔ سردیوں کی ایسی ہی بجھی ہوئی غیر دلچسپ سی شام تھی۔ عدالت کے دروازے کے باہر ایک کتیا جس کا رنگ بالکل سفید تھا لیٹی اپنے پلّوں کو دودھ پلا رہی تھی۔ پلّے سردی سے کانپ رہے تھے، کوں کوں کر رہے تھے۔ اس پر ٹوٹ پڑے۔ سات آٹھ معصوم سے سفید اور سیاہ ننھے ننھے گوشت کے لوتھڑے سے۔ آدمیوں کا سیلاب سا عدالت سے باہر نکلا۔ کسی چوکیدار نے کتیا کو اٹھانا چاہا مگر وہ اسی طرح لیٹی رہی۔ زندگی کے ریلے میں کسی نے کتیا کی طرف دیکھا کسی نے نہیں دیکھا اور پھر انجانے میں کسی کی سائیکل کے پہیے کے نیچے کتیا کی دونوں پچھلی ٹانگیں مسلی گئیں۔ وہ اسی طرح لیٹی اپنے پلوں کو دودھ پلاتی اور درد سے کراہتی رہی۔

کیسی عورت ہے یہ اٹھتی ہی نہیں۔ کسی پڑھے لکھے نوجوان نے کنول ٹھاکر اور کرشنا بوس کو نکلتے دیکھ کر انہیں سنانے کی خاطر کتیا کی طرف منہ کر کے کہا۔

''ہندوستان کی عورت ہے کیسے اٹھے گی۔'' کنول نے اس نوجوان کے پاس کھڑے ہو کر کہا اور پھر بھیڑ کو چیرتی ہوئی دروازہ پر کھڑی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔

اس کے پیچھے رویندر نکلا' مرجھایا ہوا۔ بڑا پریشان حال' اداس سا۔ اس کے باوا کہہ رہے تھے ''بیٹا گھبرانے کی کیا بات ہے۔ تمہارا معاملہ سولہ آنے سچا ہے مگر اس عورت کا' اس تیتری کا کیا کیا جائے۔ کنول کماری ٹھاکر۔ ہماری برہمن برادری کی لڑکی ہے۔ اس کے پاس جا کر یا کسی کو بھیج کر کہلواتے ہیں کہ اس مقدمے میں کرشنا کی حمایت کرنے سے اسے کیا ملے گا۔ آخر یہ اونچی ذات کی عزت کا سوال ہے اور تم جانو آدمی عزت کے لیے ہی تو جیتا ہے۔ عزت کی حفاظت دنیا کی ہر شے سے زیادہ اہم ہے۔ گھبراؤ نہیں بیٹا۔'' نہ جانے کیوں میں بھی ایک مرد تھا۔ ایک ہندوستانی تھا' ایک برہمن تھا' پھر بھی میری ہمدردیاں کرشنا کے ساتھ تھیں۔ اس دوسری عورت کی آواز میرے کانوں میں اسی طرح گونج رہی تھی' کنول کماری ٹھاکر کی آواز۔ تب میں نے یاد کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں نے یہ نام پہلے بھی کہیں سنا ہے۔ کانوں کو یہ صدا آشنا سی معلوم دیتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ غیر ملکی وفد کی باتیں یاد آئیں۔ وہ میٹنگیں اور پارٹیاں یاد آئیں اور ان سب یادوں پر وہ آنکھیں ابھریں جن کی نگاہ ہی مجھے سب سے زیادہ آشنا اور قریب معلوم دیتی تھی۔ میں نے پچھلی ملاقات کے سہارے میں کنول سے ملنے کا ارادہ کرلیا۔

اس کی گاڑی جا چکی تھی اور آدمیوں کی مختلف آوازوں سے فضا میں ایک بے ہنگم شور سا تھا۔ میں انجانے ہی رویندر اور اس کے باوا کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ دونوں میرے وجود سے بے خبر باتیں کررہے تھے۔

رویندر کے پتا کہہ رہے تھے ''بھئی یہ تو معمولی بات ہے۔ ہم کسی کو اس کے پاس بھیجیں گے۔ اگر مانے گی تو اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ اگر نہ مانے گی تو ہمارا کیا جاتا ہے ایک معمولی عورت ہے نا۔ ہمارے آدمی اس کو گم کرسکتے ہیں' اس کا منہ بند کرسکتے ہیں۔ ہم سے باز پرس کرنے والا کون ہے۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم لوگ عدالت سے بنا مقدمہ جیتے چلے جائیں۔ عورت کا معاملہ ذرا خطرناک ہے مگر میں ایک ویش بہو کو گھر میں کیسے رکھ سکتا ہوں۔ پھر ہوسکتا ہے رویندر سے پہلے وہ لڑکی کسی اور کے ساتھ بھی اس طرح کے تعلقات رکھتی ہو۔ ہمیں اس کا ماضی معلوم نہیں۔ پڑھی لکھی ضرور ہے مگر پڑھنے لکھنے سے یہ مطلب تو نہیں کہ ویش برہمن کا مقابلہ کرنے لگے۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ ہر قیمت پر مجھے جیتنا ہے۔ یہ میری عزت کا سوال ہے اور عزت

ساری دولت دے کر بھی مہنگی نہیں۔''

پھر شام کی سردی' رات کی تاریکی کے ساتھ مل کر بادلوں کے اندھیرے میں گھلنے لگی اور میں بہت کچھ سننے کے بعد اپنے راستے پر ہولیا۔

عزت کا سوال' عزت ساری دنیا کی دولت دے کر بھی مہنگی نہیں۔ دنیا کے سرد و گرم کو دیکھے ہوئے یہ بزرگ عزت کے سوال پر غور کرتے ہوئے یہ بھول رہے تھے کہ کرشنا کی عزت بھی کوئی شے ہے اور کنول ٹھاکر بھی کسی کی بیٹی ہے۔ اصل میں مرد کے غرور کو سخت ٹھیس لگتی ہے جب عورت اس کے مقابلے کے لیے سر اٹھائے تو وہ اس ناگن کو مار دیتے ہیں اور پھر بھی زخمی ناگن کی آنکھیں کھول کر اپنے گرد دیکھنے پر بھی انہیں بہت حیرت ہوتی ہے۔ وہ ناگن کے چمکیلے رنگ اس کی خوبصورتی سے مسحور ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھانکتے ہیں اور جب جادو ٹوٹنے لگتا ہے تو وہ ناگن کو کھلونا سمجھ کر توڑ دیتے ہیں' مار دیتے ہیں۔ ایک زندگی کا سوال ان کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا' یہ راجواڑوں کے مالک یہ جھوٹے کمار اور یہ لمبی لمبی داڑھیوں والے بزرگ۔ رات گہری ہوئی تھی۔ سردیوں کے بادلوں سے آنسو برس رہے تھے۔ ہوا زوروں سے پیڑوں کو جھکاتی ہوئی چل رہی تھی۔ آگ میں بھی حرارت نہ تھی مگر مجھے چین نہ تھا جو کچھ میں نے سنا تھا' اس سے یہ لازم تھا کہ میں کنول کماری کی حفاظت کروں۔ کرشنا بھی آخر ایک کمزور اور بھولی سی لڑکی ہی تھی۔ جس کو چند ماہ پہلے بوٹی سنگھا کر بے ہوش کیا گیا تھا اور جب اس کی آنکھ کھُلی تو وہ اندھیرے میں اکیلی کراہ رہی تھی۔

پھر میں نے عدالت کے ریڈر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایسی بھیگی اُداس رات اور بے رونق سی فضا میں کالی گھٹاؤں کے نیچے میرا یوں گھومنا اسے ایک اچنبھے سے زیادہ ہی لگا۔ اس کی میری دیرینہ ملاقات نہ تھی۔ کسی دعوت میں کسی دوست کے ہاں ایک بار میں اس سے سرسری ملا تھا اور اب سالوں کے بعد پوچھتے پوچھاتے اس کے گھر آیا تھا۔

جب تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے اس سے کرشنا بوس اور کنول کماری کے گھر کا پتہ پوچھا تو وہ مسکرانے لگا۔ میں نے کہا: ''دوست مسکراتے کیوں ہو' آخر کیا ہرج ہے اس بات میں۔''

وہ زور سے ہنس پڑا۔ بولا: ''کوئی اور ہوتا تو میں اسے کبھی نہ بتاتا مگر تمہارا معاملہ الگ ہے۔ تم سوبھاش کے دوست ہو۔''

میں نے دل ہی دل میں سوبھاش کی دوستی کا شکریہ ادا کیا اور کنول کے گھر کا پتہ معلوم کر کے تھوڑی دیر کے بعد اٹھا۔ اس کی آواز مجھے اپنی پچھلی گلی میں گونجتی ہوئی سنائی دی۔ ''دیکھو بھئی راہ نہ بھول جانا' دھرم سب سے بڑی شے ہے۔''

بارش مسلسل پڑ رہی تھی۔ پانی نالیوں میں بہہ رہا تھا۔ کبھی کبھی گرج سنائی دیتی' بجلی کی چمک راہ کو روشن کر دیتی۔ بھیگے ہوئے مکانوں کے بند دروازوں میں کہیں روشنی کی ایک کرن بھی دکھائی نہ دیتی تھی جیسے روشنی بھی اس گھن گرج سے ڈر کر چھپ گئی ہو۔ سیاہ مکان میرے چاروں طرف کھڑے تھے۔ بارش ایک ہولناک آواز سے مکانوں' چھجوں اور ٹین کی چھتوں پر ہو رہی تھی۔ ایک گلی کے موڑ سے گزرتے ہوئے مجھے بلیوں کے رونے کی آواز آئی جس جگہ مجھے جانا تھا' وہ میرے گھر سے کوئی تین میل دور تھی۔ گاڑی' سائیکل' موٹر ہر قسم کی سواری کا لے جانا ناممکن تھا مگر صبح مقدمے کی سماعت تھی اور میرا کنول سے ملنا بہت ضروری تھی۔

میں دل میں خیالوں کے کارواں سے لیے ہوئے بھیگی ہوئی سڑک پر پانی کے ریلے میں کانپتا' کوٹ کو اپنے گرد لپیٹتا' چھتری سے بارش کی تیزی کو روکنے کی ناممکن کوشش کرتا ہوا چل رہا تھا۔ کیا ہوا اگر کنول کماری ایسے میں مجھے اپنے گھر میں گُھسنے نہ دے۔ وہ مجھے دھتکار دے۔ وہ دروازہ ہی نہ کھولے۔ آخر تو وہ عورت تھی اور عورت کی فطرت میں ڈر بھی بہت زیادہ ہے۔ عورت تو چوہے سے بھی خوف کھاتی ہے۔ بلی کی میاؤں میاؤں سے بھی ڈر جاتی ہے۔ اس کے لیے کسی آدمی سے ڈرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ مرد کے لیے بے باک ہونا۔

دور کسی گھڑیال نے گیارہ بجائے تھے' جب میں نے پھاٹک کھلوانے کے لیے چوکیدار کو مسلسل آوازیں دینی شروع کی ہیں۔ پندرہ منٹ کے بعد لبادے میں لپٹی ایک عورت نے آ کر دروازہ کھولا اور میں حیران رہ گیا۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ خود کنول تھی۔

بولی: ''چوکیدار کی بیوی آج بیمار تھی۔ میں نے سوچا اس کے بغیر رات گزر ہی سکتی ہے۔ آپ کیسے تشریف لائے ہیں۔ آپ کون ہیں؟'' میں نے کہا: ''میں ایک دوست ہوں ایک بہت ضروری کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ اس بارش میں بھیگنے کے بجائے مجھے اندر ہی لے چلیں۔''

''چلیے آیئے۔'' یہ کنول کا جواب تھا اور پھر میں اس کے پیچھے چلتا ہوا خوبصورت برآمدے کے فرش پر اپنے گندے بوٹوں سے نقش و نگار بناتا ہوا بیٹھنے کے لیے کمرے میں چلا گیا۔

کمرے میں آگ خوب روشن تھی۔ ایک طرف ایک نرم قالین پر آگ کے سامنے کرشنا بیٹھی تھی۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا بچہ سویا ہوا تھا۔ میں نے گیلے بوٹ اتار دیئے۔ کنول نے کوٹ میرے ہاتھ سے لے کر کرسی پر لٹکا دیا اور مجھے ایک کمبل دیتے ہوئے بولی: ''آپ آگ کے سامنے آ جایئے آپ بڑی دور سے آئے جان پڑتے ہیں۔ تھکن آپ کے چہرے سے ظاہر ہے۔''

میں کمبل اوڑھ کر آگ کے سامنے اس نرم قالین پر بچے کے قریب ہی جا بیٹھا۔ کرشنا خاموشی سے اٹھ کر اندر کسی کمرے میں چلی گئی۔ کنول بیٹھ کر ایک اخبار میں سے کچھ پڑھنے لگی۔ اس روشن آگ کے سامنے اس نرم قالین پر بیٹھ کر اس پوری شام میں مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ زندگی میں گرمی بھی ایک نعمت ہے اور ہر گام پر اس کی ضرورت ہے۔ دل کی گرمی' زندگی کی گرمی اور آگ کی گرمی۔ عورت کا وجود کائنات کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اگر عورت نہ ہو تو کیا ہو۔ یہ اپنا پن' یہ کمرے میں ایک الگ سی روح' ہر شے میں سے زندگی کی کرنیں یہ سب عورت کے وجود سے ہے۔ کونے میں ایک میز پر کسی دیوی کی مورتی تھی۔ آگ کی سرخ روشنی میں سنگ مرمر کی سفیدی میں خون مچلنے لگا تھا۔ دیوی کے ہاتھ میں پکڑے کنول کی پتیاں بہت زندہ اور جاندار لگ رہی تھیں۔ دیوی کی آنکھیں اُفق کے پرے خوابوں سے بھی دور کسی اور ہی دنیا میں دیکھ رہی تھیں۔ آگ کے سامنے میں کانپ رہا تھا۔ جب گرمی اور سردی ملتی ہیں تو کپکپاہٹ شروع ہو جاتی ہے۔ جب اندھیرے اور اجالے ملتے ہیں تو روشنی لرزنے لگتی ہے۔ پھر جب روحیں ملتی ہیں پھر روح کا تو کوئی وجود ہی نہیں آتما کہاں ہے؟ اے پرم آتما! اے بھگوان! اے خداؤں کے خدا!

کنول اخبار میں مگن تھی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کرشنا گرم چائے لے کر آ گئی۔ اس کے چہرے پر تھوڑی سی مسکراہٹ بھی نہ تھی۔ اس دوران میں وہ ایک لفظ بھی نہ بولی۔ اس نے کنول سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں چائے کس کے لیے بناؤں۔ میں اس ساری دیر اپنے سامنے رکھی چیزوں کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ میرے پاس بچے کا پرسکون نرم سانس بڑی ملائمیت اور یکسانیت سے چل رہا تھا۔ اس کے دونوں ننھے ننھے ہاتھوں کی مٹھیاں بند تھیں اور آنکھوں کی پلکیں کبھی کبھی کانپ جاتیں۔ اس کے چہرے پر کبھی بڑی معصوم مسکراہٹ پھیل جاتی اور پھر ایک سایہ سا اس مسکراہٹ کو مٹا دیتا۔ اس کے گورے ہاتھوں کی بند مٹھیوں پر آگ کی روشنی گلابی بن کر پڑتی تھی۔ آتش دان پر کرشن بھگوان کی مورتی تھی۔ مورتی کی سفیدی سے اُتری ہوئی سیاہی میں ایک ستارے کی طرح روشن لگ رہی تھی۔ میں دور تھا' اس لیے میں نے بھگوان کی آنکھوں میں نہیں جھانکا۔ جانے وہاں

کیا تھا۔ کون سے خواب تھے اور پھر میرے گرد قالینوں کی سرخی تھی۔ کمرے کی سادگی میں ایک بناوٹ تھی۔ کنول کماری ٹھاکریں، مجھے عدالت والی کنول کا وجود کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے لمبے بالوں کی چوٹی سامنے سے سیدھی گندھے ہوئے بالوں سے پُشت پر پڑ رہی تھی اور وہ اخبار میں ایک جھوٹے انہماک سے نہیں بلکہ ایک سچی محویت کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔

کرشنا نے چائے لا کر ایک تپائی پر رکھ دی۔ کنول نے پہلی بار آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پوچھنے لگی: "سردی تو ذرا کم اب ہو ہی گئی ہوگی۔ چائے پی لیں۔" میں آج بھی یہ سوچتا ہوں اور سمجھ نہیں پاتا کہ اس مسکراہٹ میں اس معمولی سی بات کہنے کے انداز میں کیا تھا کہ میرے دل نے ایک دم دھڑک کر بند ہونا چاہا تھا۔ پھر میں نے اس کے ہاتھ سے چائے لے لی۔

میرا دماغ خالی تھا۔ میں اس سکون میں اس اندھیرے اور ملگجے سرخ غبار کی روشنی میں ایک آسودگی پاتا تھا۔ ایک ایسی آسودگی جو اب تک میری زندگی سے دور تھی، جس سے میں ناآشنا تھا۔ میں چائے پیتا رہا اور خالی الذہن سا بیٹھا اپنے گرد طمانیت کی لہروں کو شانتی سے پھیلتے دیکھتا رہا۔ میں حیران تھا یہ کون سی قوت تھی، جس نے اس عورت کے دل سے خوف جیسی چیزیں نکال دی تھیں۔ میں ایک اجنبی رات کے اندھیرے میں برستی بارش میں بھیگتا ہوا اس کے گھر آیا اور وہ یوں بیٹھی تھی گویا اسے میرے وجود سے اور اس شر سے جو مرد کی فطرت میں ہے، بالکل کوئی علاقہ نہیں۔

ہم تینوں چائے پیتے رہے۔ بچے کی سانس کی یکسانیت اور مسکراہٹ ایک ابدیت لیے ہوئے تھی۔ اس کی ننھی مٹھیاں بند تھیں اور وہ اطمینان سے سویا ہوا تھا۔ باہر بارش اسی طرح مسلسل پڑ رہی ہوگی۔ میرے کوٹ میں سے پانی ایک بارش کی صورت میں زمین پر بہہ رہا ہوگا اور یہ خیال کہ تھوڑی دیر کے بعد اس گرم کمرے اور سکون سے نکل کر مجھے اس لمبی سڑک پر پانی کے ننھے جوہڑوں کو عبور کر کے تین میل دور اپنے گھر جانا ہوگا۔ میری ماں سو چکی ہوگی۔ اس کا بوڑھا نوکر جو چوکیدار کا کام کرتا تھا، اٹھ کر بڑبڑاتا ہوا دروازہ کھولے گا اور پھر سخت سرد کمرے کی تاریکی میں جب میں لیمپ کو روشن کروں گا تو بستر کی سردی میرے رگ و پے میں سرایت کر جائے گی مگر مجھ کو اپنے حواس کو مجتمع کر کے کنول کو رویندر کے خوفناک ارادوں سے مطلع کرنا تھا۔ میں لفظ ڈھونڈ رہا تھا۔

تین پیالے چائے پینے کے بعد کنول کی طرف دیکھ کر میں نے بات شروع کرنا چاہی، وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے آنکھیں جھکا لیں۔ ان آنکھوں کی چمک ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ نرمی اور وہ

سچائی جو ان نگاہوں کا حصہ تھی۔ میں نے گلا صاف کر کے بات کہنا چاہی۔ اس نے مسکرا کر کہا: "کہیے کیا بات ہے۔ آپ نے اتنی رات گئے تکلیف کیوں کی؟"

روشنی میں اس کے ہاتھوں کی نسیں فیروزے کی طرح چمک رہی تھیں۔ چہرے کی سفیدی آگ کی سرخی نرم گلابوں کی سی رنگت پیدا کر رہی تھی۔ میں نے اس لمحہ سوچا یہ عورت مخمل کی طرح نرم اور ملائم ہے۔ ریشم و حریر کی طرح عدالت کی قسم کی جگہ سے اس کا کوئی علاقہ نہیں۔ زندگی میں سوائے گھر کی چار دیواری کے یہ کسی شے سے آشنا نہیں۔ اس کی آواز میں ایک متانت ہے، سنجیدگی سی اور پھر وہ اس بے باکی کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے جو مردوں کی نگاہوں میں ہے، جو دنیا کی آنکھوں میں ہے۔

میں نے ٹھہر ٹھہر کر اپنا مطلب بیان کیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کنول کا رنگ زرد ہو جائے گا۔ وہ گھبرا جائے گی۔ اس کے حواس اڑ جائیں گے۔ کم از کم ہر دور میں مرد عورتوں سے یہی توقع رکھتے ہیں۔ نسائیت یہی ہے کہ خطرے کے ذکر پر عورتیں زرد ہو جائیں، گھبرا کر مردوں سے مدد کی درخواست کریں اور پھر مرد اپنی مردانگی اپنی برتری پر فخر محسوس کر کے سینہ پھلا کر چلے اور خدا کی بہترین مخلوق ہونے کا جو دعویٰ وہ صدیوں سے کرتا آیا ہے، اس پر اور زیادہ پختگی سے یقین کر لے۔ مگر کنول کی طمانیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی اور آخر میں کہنے لگی۔ مجھے افسوس ہے آپ نے اتنی تکلیف کی۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں مگر...... رویندر کمار اور اس کے باوا میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ آپ گھبرائیں نہیں اور پھر بھگوان میری حفاظت کرنے کو موجود ہیں۔ مجھے کوئی ڈر نہیں۔"

بات اتنی جلد ختم ہو جائے گی۔ اس کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ میرے پاس کہنے کے لیے کوئی لفظ نہ تھے۔ میں آگ کے سامنے کمبل اوڑھے بیٹھا اپنے آپ کو ایک دم بے حد بے وقوف اور اُلو سمجھ رہا تھا اور پھر میں نے سوچا، اب جانے کا وقت ہے۔ تب پہلی بار اس ساری گفتگو کے دوران میں مجھے احساس ہوا کہ بارش چھت پر بہت زوروں سے پڑ رہی تھی۔ روشن دانوں سے پھوار اندر آ رہی تھی۔ کنول اٹھ کر تصویروں کو ڈھانپتی پھر رہی تھی اور کرشنا نے بچے کو اپنی اُونی شال کے پلو سے ڈھانپ لیا تھا۔ باہر رات کا سناٹا تھا، تاریکی تھی۔ سردیوں کی تیز ہوا کے جھونکے تھے اور بارش تھی۔ آسمان سیاہ لگ رہا تھا، ایک کمبل کی طرح دبیز اور بھاری۔ پھر میں جانے کے لیے اٹھا۔

کنول بولی ''ٹھہرئیے میں آتی ہوں۔'' وہ اندر چلی گئی۔

اور پھر وہ اندر سے ایک کمبل اوڑھے ہوئے آئی۔ میں نے اپنے گرد لپٹے ہوئے کمبل کو اتارنا چاہا تو وہ مسکرا کر کہنے لگی۔ ''کیا کر رہے ہیں' اسے رہنے دیجئے۔ اسے اوڑھے رہیے۔'' میرے گیلے کوٹ کو بازو پر اٹھا کر وہ دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں نکل گئی اور بولی ''آپ چند منٹ اور انتظار کیجئے۔ میں گاڑی لے آؤں۔''

تب اس خواب سے جو میرے گرد لپٹا تھا میں جاگا۔ ''یہ بہت زیادہ ہے' آپ بتائیے میں لے آؤں گا۔'' میں نے آگے بڑھ کر کہا مگر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی تاریکی میں دھبوں کی طرح نظر آنے والے اصطبل کی طرف چلی گئی۔ پھر ٹارچ کی روشنی میں مجھے اصطبل کا دروازہ نظر آیا اور چند منٹوں کے بعد زرد سی کمزور کانپتی روشنی میں گاڑی برآمدے کی سیڑھیوں سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ کنول کی آواز آئی۔ ''اب آجائیے۔''

میں نے کہا ''یہ صریحاً ناانصافی ہے۔ میں کبھی آپ کو اجازت نہیں دوں گا کہ آپ ایسی اندھیری سیاہ رات میں مجھے پہنچانے جائیں۔'' کنول نے صرف یہی کہا ''جلدی کیجئے' آئیے۔''

مجھے بات کہنے کا وقت ہی نہ ملا۔ وہ کوچوان کی جگہ بیٹھی چابک دستی سے گھوڑوں کو ہانک رہی تھی۔ پھاٹک پر پہنچ کر اس نے اتر کر خود ہی دروازہ کھولا۔ بگھی کو باہر نکال کر دروازہ پھر سے بند کیا اور لمبی سڑک پر پانی کی روانی اور بارش کے ریلے میں کنول کماری ٹھاکر مجھے گھر پہنچانے چلی۔ میں دل ہی دل میں شرم سے کٹ رہا تھا۔ میں نے اپنی نادانی سے یہ بے جا تکلیف دی تھی اسے۔ گھر میں کرشنا اکیلی ہوگی' بچہ ہوگا۔ روشنی ہوگی' آتش دان میں آگ ہوگی اور کمرہ زندگی سے بھرا ہوا۔ میں نے جس طرح خطرے کو بہت بڑا سمجھا تھا' کنول کی ہنسی نے لمحوں میں اس خدشے کو مٹا دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا جس عورت میں یہ طاقت ہو کہ وہ اندھیری رات میں ایک بگھی کو بے خوف وخطر چلا سکے' اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہ سکے' وہ عورت نہیں کوئی دیوی ہے اور پھر اس کی مسکراہٹ کی ابدیت بچے کی مسکراہٹ کی ابدیت سے ملتی ہوئی تھی۔ دونوں زمانے کے خطروں سے بے خبر تھے۔ دونوں معصوم تھے اور دونوں کی حفاظت پرماتما کرتا تھا۔ ہم سب کی حفاظت بھگوان کرتے ہیں۔ پھر کنول..... مگر کنول تو کنول کماری تھی۔ سڑکوں پر روشنیاں نہ تھیں۔ ساری دنیا سیاہی کی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔

کنول کی آواز آئی۔ ''راستہ بتاتے جائیے' کس طرف کو مڑنا ہوگا۔''

مجھے اپنی آواز بھی بیگانی سی لگی۔ جب میں نے اس کو راہ بتانے کے لیے بولنے کی کوشش کی۔

گلی کے نکڑ پر میں اتر گیا۔ کنول نے آہستہ سے جھک کر خدا حافظ کہا اور گاڑی موڑ لی۔ شکریہ کے لفظ میرے گلے میں اٹک گئے۔ میں اسے کچھ نہ کہہ سکا۔ میں اپنی نادانی پر بہت شرمندہ تھا۔ وہیں کھڑا میں بگھی کی پچھلی روشنیوں کو سڑک کی طوالت پر اپنے سے دُور اور دُور ہوتے دیکھتا رہا۔ پہلے آدم کی طرح جو اپنی گم شدہ جنت کو اپنے سے دور ہوتے دیکھتا رہا ہوگا۔ میرے سینے میں بہت زوروں کا درد ہو رہا تھا اور پھر بارش میں شرابور میں نے جب گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو گھر میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ اندر سے آوازیں آ رہی تھیں۔ میں حیران تھا اور ماتا جی نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا' آج موہنا کا سانس اکھڑ رہا ہے۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ میں سر جھکائے اپنے کمرے میں چلا گیا' انہیں یہ بھی پوچھنے کا وقت نہ ملا کہ میں کہاں سے آیا تھا۔ اس رات موہنا مر گئی۔ میرے سینے میں درد کے ساتھ ساتھ کنول کماری ٹھاکر کی یاد تھی اور موہنا مر گئی۔ جانے کب سے ہمارے گھر میں تھی۔ پھر جب میں نے آنکھ کھولی ہے' اسے رسوئی گھر میں ہی دیکھا ہے۔ اوپر کا کام کرنے کے لیے ایک اور نوکر تھا۔ موہنا سارا دن رسوئی گھر میں بیٹھی چیخ چیخ کر اسے بتاتی رہتی' اسے آواز دیتی رہتی۔ ہوش سنبھالنے کے ساتھ مجھے اس کی آوازیں کبھی کبھار بری لگتیں۔ پھر اس کے بعد اور لوگوں کی طرح میں بھی اس سے مانوس ہو گیا۔ سارے گھر میں صبح کی روشنی کے ساتھ سب سے پہلے موہنا کی آواز سنائی دیتی اور پھر دن بھر سے رات بھیگنے تک وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد زور سے بولتی جو بھی نوکر کام کرنے کے لیے آتا' موہنا کی اس چیخ پکار سے تنگ آ کر تھوڑے دنوں میں چل دیتا۔ پھر ماتا جی نے کبھی موہنا کو کچھ نہیں کہا۔ انہوں نے کبھی اسے ڈانٹا نہیں۔ اصل میں ماتا جی اور موہنا کا رشتہ کچھ بہنوں کا رشتہ تھا۔ دونوں میں نوکر اور مالک کی جگہ ایک اپنائیت سی پیدا ہو گئی تھی۔ رسوئی میں حکم موہنا کا چلتا جو جی چاہتا پکاتی اور جس طرح چاہے پکاتی۔ ماتا جی کو مالکن کی بجائے بہن جی کہتی۔

دونوں ایک ہی گاؤں کی تھیں۔ ایک ہی گاؤں میں دونوں کا میکہ تھا اور پھر بیاہ کر بھی ایک ہی گاؤں میں آئیں۔ موہنا اہیرن تھی۔ اس کی آنکھوں میں بڑھاپے تک مرتے سمے تک جو چمک رہی ہے وہ میں نے صرف کنول کماری ٹھاکر کی آنکھوں میں دیکھی ہے۔ ماں کی آنکھوں میں شفقت کے ساتھ میں نے کبھی اور کچھ دیکھا ہی نہیں۔ پھر موہنا تو موہنا تھی اور رام دلارے کبھی

کبھار اب بھی اسے چھیڑ دیتا۔ چلو موہنا برہا گائیں اور موہنا کہتی ''بس تمہیں تو سوائے بیتے دنوں کی یاد کرنے کے اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ میں کہتی ہوں ہمارے اب کوئی برہا گانے کے دن ہیں۔تم کوئی کام کی بات کیا کرو اور رام دلارے کہتا' موہنا' پھر کہتا' موہنا! پھر کیا ہوا' اگر ہم بوڑھے ہیں' دل تو تمہارا ابھی بھی جوان ہے۔ دیکھا کیا لہک لہک کر دنیا دیدی کی شادی میں گا رہی تھیں۔ رام سے' تم نے تو پرانے دنوں کی یاد تازہ کر دی تھی۔''

رام دلارے بھی ایک زندہ دل انسان تھا۔ کنویں سے پانی نکالتے ہوئے گاتا رہتا۔ اس کی ٹھاٹ دار آواز گونجتی ہوئی جب ہمیں اپنے بازوؤں میں لٹکا کر چک پھیریاں دیتا تو مانو لگتا جیسے آنکھوں میں تارے گھوم گئے ہیں۔ آج بھی سب سے زیادہ اس کے گیت یاد ہیں۔ مجھے یاد ہے اس نے موہنا کے ہاتھ کا پکا کبھی نہیں کھایا۔ کنویں کی پکی منڈیر پر آٹا گوندھتا اور وہیں اینٹوں کے چولہے پر روٹی پکا لیتا۔ بڑی بڑی چار روٹیاں۔ ہم اس کے پاس بیٹھ کر دیکھتے رہتے۔ کبھی کبھار ہمیں ڈرانے کے لیے کہتا ''تم کو کنویں میں پھینک دوں گا۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔'' میں اور دنیا بھاگ کر ذرا دور جا کھڑے ہوتے۔ پھر زور سے ہنستا' کہتا'' کتنے بے وقوف ہو۔ میں تم کو پھینکوں گا تھوڑی' میں تم کو روٹیوں کے بعد پکا کر کھاؤں گا۔'' دنیا کہتی ''رام دادا تم کیسے کھاؤ گے ہمیں۔ پیٹ بھی کھا جاؤ گے؟'' اتنے زور سے ہنستا کہ کنویں پر پڑی چھت میں اس کی ہنسی لٹک سی جاتی۔ اس کے چپ ہونے کے بعد بھی دیر تک گونجتی رہتی۔ کہتا'' ہاں دنیو بیٹا سب کھاؤں گا' بالکل بھون کر'' بالکل پکا کر' دنیا ذرا نہ ڈرتی۔

''پھر کیا کرو گے رام دادا؟'' وہ پوچھتی۔

''ارے' ارے پھر کیا کروں گا۔'' وہ اپنا سر ہلا کر کہتا۔ اس کے کانوں میں بڑی بڑی بالیاں ہلنے لگتیں اور ہلکوروں سے اس کے گالوں سے چھو جاتیں۔ ''پتہ نہیں پھر کیا کروں گا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوتا مگر دنیا اسی طرح ایک ہاتھ منڈیر پر رکھے اپنے بالوں کی لمبی چوٹی کو ہلا کر بیٹھی رہتی۔

''اچھا سنو'' رام دلارے' دنیا کے بازو پکڑ کر کہتا'' پھر میں زور سے منہ کھولوں گا اور تم پھر اسی طرح باہر نکل آؤ گی۔''

دنیا نے اس بات کو ہزاروں بار سنا تھا مگر اسے ہر بار اس بات کے سننے سے جیسے نیا مزا آتا۔ میں نے کبھی نہیں پوچھا کہ رام دادا مجھے نہیں کھاؤ گے۔ مجھے معلوم تھا میں لڑکا تھا اور رام مجھے کبھی نہیں کھائے گا۔ اس نے خود ہمیں بتایا تھا کہ لڑکیاں بڑی نرم ملائم ہوتی ہیں' اس لیے انہیں کھایا جا سکتا ہے۔

ہم دونوں کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر گھمانے لے جاتا۔ راستے میں ہمیں پریوں' بھوتوں اور درویشوں کی کہانیاں سناتا۔ ماں نے کئی بار کہا تھا'' رام دلارے تم بچوں کو دیوتاؤں کی کہانیاں کیوں نہیں سناتے۔ یہ ہر وقت بھوتوں کی باتوں سے ان کا دھرم بھی نشٹ کر دو گے'' اور وہ ہنس کر کہتا۔ ''مالکن' دیوتا تو بہت دور ہیں۔ ان کی کہانیاں مجھے نہیں آتیں۔ بچے ضد کرتے ہیں تو جو یاد ہے کہتا جاتا ہوں۔'' ماں چپ ہو جاتیں بات آئی گئی ہو جاتی۔

پھر میں اور دنیا بڑھنے لگے۔ رام دلارے کے کندھوں میں جھکاؤ نہیں تھا مگر ہم دونوں بھی تو اب سیر پر چل کر جا سکتے تھے اور یوں دنیا نے اسکول کے ابتدائی سال اور میں نے ہائی اسکول پاس کر لیا۔

مجھے یاد ہے جس دن میرا نتیجہ نکلا' رام دلارے بہت خوش تھا۔ سارے میں گاتا اور ناچتا پھر رہا تھا۔ موہنا نے کئی بار کہا بھی' اب تمہارے ناچنے کے دن ہیں کیا اب تم نچلے بھی بیٹھا کرو مگر اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ وہ بڑا خوش خوش دعوت میں مشغول تھا اور تب میں نے پہلی بار زندگی میں رام دادا کا ناچ دیکھا جس کو لوک اہیر ناچ کہتے ہیں۔ وہ بجلی کی سی تیزی وہ چلت پھرت میں نے ادولے شنکر کے ناچ میں بھی نہیں دیکھی۔ رام دلارے اگر مہذب سوسائٹی کا رکن ہوتا تو اس کے فن کو آرٹ کا درجہ دے دیا جاتا مگر فن بھی غربت اور امارت کے اصولوں پر چلتا ہے۔ دنیا کے راستے ایک دوسرے سے کتنے قریب اور پھر کتنی دور ہیں۔

دعوت کے بعد میں نے کہا'' رام دادا تم بہت اچھا ناچتے ہو' مجھے بھی سکھا دو۔''

بولا' چھوٹے بابو یہ تمہارے کام کا ناچ نہیں' تمہیں دنیا میں اور بہت کچھ کرنا ہے' دنیا میں اور کتنی چیزیں ہیں جن کو سیکھ کر تم بڑے آدمی بن سکتے ہو۔ میں اہیر ہوں اور اہیر دھرتی کا بیٹا ہے۔ دھرتی کے بیٹوں کی چیزیں تمہارے کس کام کی۔

میں نے کہا رام دادا دھرتی ''تو کتنی پوتر ہے۔ وہ تو ماں ہے تم جس ماں کے سپوت ہو۔ میں بھی اسی زمین کا انسان ہوں اور دھرتی کے بیٹے دیوتاؤں کا ناچ سیکھتے ہیں کیا' اور پھر میں نے چپکے چپکے رام دادا سے خالی وقت میں اہیر ناچ سیکھنا شروع کیا۔

میں نے پوچھا'' رام دادا تم نے اتنا اچھا ناچ کتنے عرصہ میں سیکھا تھا۔''

بولا:'' جب سے میں بڑا ہوا میں نے اپنے بھائی بندوں کو ناچتے ہی دیکھا تھا۔ پھر سب سے اچھا تو موہنا ناچتی ہے۔''

اچھا' میں نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں رام پرانے زمانوں کی یاد میں کھو سا گیا۔ ''ہاں سب سے اچھا تو موہنا ہی ناچتی ہے بھیا۔ وہ تو بجلی ہے۔ اس کا مقابلہ تو کوئی نہیں کر سکتا' اس سے تو میں بھی ہار گیا تھا۔''

اب میرا تجسس بڑھ گیا تھا' مگر رام دادا روز مجھے کوئی اور گیت بتا دیتا۔ میرے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتا۔ اس نے مجھے کبھی نہ بتایا کہ وہ موہنا سے کیوں ہار گیا تھا۔

پھر دنیا کی شادی کے دن نزدیک آ گئے۔ ماں نے اس کو اسکول کی تعلیم بھی پوری نہیں دلوائی۔ ایک اچھا لڑکا تھا۔ برہمنوں ٹھاکروں کے لڑکوں کو تعلیم کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی نا' رام دلارے موہنا' ماں بابا' سب بے حد مصروف رہتے۔ دنیا اندر گھسی رہتی۔ اس کی سہیلیاں اُسے گھیرے رہتیں اور میں کالج سے آ کر اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ رام دلارے نے اب مجھے چوری چوری ناچ سکھانا بھی کم کر دیا تھا۔ وہ کنویں کی منڈیر پر بیٹھا گاتا رہتا' پاؤں سے تال دیتا رہتا اور کام کرتا رہتا۔

میں اس خاموشی سے تھک چکا تھا۔ گھر میں ہر طرف کپڑے پھیلے تھے۔ زیور کی باتیں ہوتی تھیں اور کوئی میری طرف متوجہ ہی نہ ہوتا۔ ناولوں کے سستے رومان دور از کار تھے۔ موہنا کی آواز لگاتار رسوئی میں سے آتی رہتی اور میں حیران ہوتا رہتا' اس سفید بالوں' سیاہ آنکھوں' ہر وقت چیخنے والی موہنا سے بھلا رام دادا کیسے ہار سکتا ہے۔

ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا۔ دادا آج تو میں تم سے پوچھ کر ہی چھوڑوں گا کہ تم موہنا سے کیسے ہار گئے تھے۔ تم جھوٹ کہتے ہو اور رام دلارے دادا ہنس پڑا تھا۔ آج موہنا بھی یہاں نہیں' رام دلارے بھی نہیں' میں اکیلا ہوں' مگر وہ لوگ زندہ یادوں کی طرح میرے گرد ہیں۔ موہنا' رام دلارے' ماں سب کے سب میرے گرد ہیں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ اس رات موہنا مر گئی۔ رام دلارے کو پورے اہیر ٹولے میں سے ہرا دینے والی موہنا' کھانستی ہوئی مر گئی۔ اس رات رام دلارے کتنا اداس تھا۔ ڈاکٹروں' حکیموں کا گروہ اس وقت اکٹھا ہوتا ہے جب کوئی امیر' کوئی بڑا آدمی مرتا ہے اور موہنا تو اہیرن تھی۔ کیا ہوا اگر اس کی کمر میں لوچ مرتے دم تک رہا اور اس کی یاد میں اتنے بڑے تھے' جتنے رام دلارے کو بھی یاد نہیں تھے۔

وہ موہنا جس کی آنکھوں میں سیاہی اماوس کی راتوں سے بھی کالی تھی۔ اس رات وہ

موہنا مر گئی جس نے گاؤں والوں کی لاج رکھنے کی خاطر اپنے مرے ہوئے پتی کی یاد کو پیچھے چھوڑ کر رام دلارے کو ہرانے کے لیے سہیلیوں کے مجبور کرنے پر تین گھنٹے اَن تھک ناچ سے رام دلارے کو ہرا دیا تھا۔ اس شام رام دلارے نے ان کے پاؤں کو چھو کر کہا تھا' دیوی تمہاری طرح کا ناچ ہمارے دیس میں کسی کو نہیں آتا اور پندرہ دن کے بعد موہنا لال چادر اوڑھے بابل گاتی سکھیوں کو چھوڑ کر ناچتی ہوئی رام دلارے کے پیچھے اپنا گاؤں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ مگر یہ تو یادیں تھیں اور یادوں سے کیا بنتا ہے۔ پھر موہنا کی زندگی کی ضرورت کسے تھی اور وہ زندہ بھی رہتی تو اس سے کیا ہوتا تھا۔ اُس رات میرے سینے میں بارش اور سردی نے مل کر درد کا واویلا مچا دیا۔ رام دلارے ساری رات سرہانے مری ہوئی موہنا کے پاس بیٹھا رہا۔ اور ماں پریشان سی حیران سی ڈاکٹروں کو یاد کرتی' میرے سینے پر گرم روئی اور تیل کی مالش اور ٹکور کرتی رہی۔

صبح ہونے تک درد میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور پھر شدّت کی سردی میرے رگ و پے میں سرایت کرتی گئی۔ میں بخار میں بے ہوش ہو گیا۔ اس دن جس دن عدالت کو کرشنا بوس اور رویندر کمار کے مقدمے کا آخری فیصلہ دینا تھا' میں بخار میں بھنتا اپنی چارپائی پر نیم بے ہوشی اور ہوش کے دائروں میں لپٹا کبھی رویندر کو کبھی کرشنا کو اور کبھی اس ننھے معصوم بچے کو اپنے خوابوں میں دیکھتا رہا۔ نہ جانے کیوں مجھے کنول کی شکل نظر نہیں آئی یا کبھی یوں بھی ہوتا کہ جن چیزوں کو اپنے خوابوں میں بسانا چاہو وہ اپنے سائے کو اور دور کر لیتے ہیں۔ روشندان میں سے آئی ہوئی دھوپ کی کرنیں میرے چہرے پر پڑنے لگیں۔ کمرے میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ جانے وہ کون تھے۔ موہنا اپنا لہنگا باندھے لال چادر اوڑھے میرے پاس سے گزر جاتی۔ نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھتی ہوئی۔ میں کوئی رام دلارے تھا؟ دھندلے سائے' روشنیاں' آوازیں' صورتیں میرا تمسخر اڑاتی ہوئی پیار سے مجھے دیکھتی ہوئی میرے پاس سے گزر جاتیں۔

سینے میں رہ رہ کر کوئی آرے چلاتا اور پھر میں ایک لمبی بے ہوشی میں کھو جاتا۔

جانے میں کب تک اس حالت میں رہا ہوں۔ آہستہ آہستہ میرے حواس لوٹ آئے۔ مقدمے کی عدالتی کارروائیاں کب کی ختم ہو چکی تھیں اور اس فیصلے کو جاننے کے لیے کوئی تردّد نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا جہاں کنول کماری ٹھاکر کی آہنی قوت ہو وہاں کوئی عدالت بھی فیصلہ خلاف نہیں کر سکتی۔ تندرست ہونے اور طاقت کے عود کرنے تک ایک لمبا عرصہ درکار تھا۔ ڈاکٹروں نے مجھے ایک ماہ تک کسی قسم کی ذہنی یا تفریحی کاوش سے روکے رکھا تھا۔ ماں کی آنکھوں کا نور میں ہی تھا۔ وہ

سارا دن ایک لمحے کے لیے بھی میری چارپائی سے نہ ہٹتی اور موہنا کی موت ایک ثانوی سی بات بن کر رہ گئی تھی۔ رام دادا کے گیت اب بھی کنویں کی چھت سے لٹکے ہوئے گونجتے رہتے اور ماں کہتی ''اسے اب بھی گیت سُوجھے ہیں۔ اہیر ہے نا گیت نہیں چھوڑ سکتا۔'' کبھی کبھار جب ماں ضرورتاً الگ ہوتی تو وہ میرے پاس آ جاتا۔ پوچھتا ''چھوٹے بابو گیت سنو گے؟'' اور میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہتا۔ میں نے پوچھا ''دادا تم موہنا کے بعد بھی گیت گاتے ہو۔''

رام دلارے کی ہنسی میں کتنی اداسی ہوتی تھی۔ کہتا ''بابو اہیر ہوں' کھانا نہ کھاؤں' پر گیت تو میرا جنم ہیں' ناچ میری زندگی ہے' دھرتی کا بیٹا ہوں' کھلی ہوا میں جو بول سیکھے ہیں' شہر میں انہیں کیسے بھلا دوں۔ کان پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر کے نہ گاؤں تو کیا ہے پھر گیت جو دھرتی کے سینے کی پکار ہے' اسے کیوں کر بھلا دوں' بتاؤ؟'' اس سوال میں اتنی بے کسی ہوتی' اتنی مایوسی کہ میرا دل بے اختیار اس سے لپٹ کر رونے کو چاہتا۔ پھر میں تندرست ہو گیا اور رام دادا موہنا کے پھول گنگا میں بہانے کے لیے چھٹی لے کر ہردوار چلا گیا۔ مدتوں میں نے رام دادا کا انتظار کیا۔ پھر اسے تو واپس نہیں آنا تھا' موہنا کے پھولوں کے ساتھ وہ خود بھی بہہ گیا۔ مہینوں اس کی خبر نہ آئی اور ماں نے کنویں پر نئے کہار کو مستقل رکھ لیا۔ رام دلارے کے سامان کی چیزیں اندر باقی چیزوں کے ساتھ بند کروا دیں اور یوں رام دلارے اور موہنا دونوں ہمارے گھر سے ہماری زندگی سے نکل گئے' پر جب ایک بار کوئی زندگی میں آ جائے تو نکلا نہیں کرتا۔ کئی لوگ بیماری کے دوران میں مجھ سے ملنے آتے رہے ہیں۔ پھر غصہ آیا یونہی کسی نے مجھ سے مقدمے کے فیصلے کا ذکر نہیں کیا۔ میں نے بھی کسی سے نہیں پوچھا۔ دل میں اس طمانیت کے سہارے امید کا چراغ سا روشن تھا کہ تندرست ہو کر اسی کمرے میں آتش دان کی گرمی کے سامنے دیوی اور کنول کے پھول کے عین سیدھے رخ کرشن بھگوان کی مورتی کے نیچے قالینوں میں بیٹھ کر اس گھر میں باقی روداد سنوں گا۔ کنول کی اپنی زبانی' اس کا کمبل ماں نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ برستی بارش اور اندھیری رات' کنول تو دیوی ہے جس کے پاس سے ڈر اور مصیبت کے لفظ چیختی ہواؤں کے خالی طوفانوں کی طرح نکل جاتے ہیں۔

سردیاں ایک بہت خوشگوار موسم اور بہار کے پہلے دنوں میں بدل چکی تھیں۔ جب میں نے غسلِ صحت کیا ہے' گھر میں موہنا کے نہ ہونے سے ایک اداسی تھی' کنویں پر رام دلارے کی جگہ نیا کہار موہن سنگھ آ گیا تھا۔ میں اپنے اخبار کے دفتر کو اور جانے کس کس شے کو کتنے دنوں کے بعد

دیکھوں گا اور یہ خیال کہ اس سرد تاریک رات میں خدا جانے کنول کماری کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کیا وہ بھی میری طرح سینے کے درد سے بے تاب ہو کر بیمار پڑ گئی ہوگی' اب مجھے بے تاب اور پریشان کیے دیتا تھا۔

وہ دن اتنا خوبصورت اور سہانا تھا۔ نرم ہوائیں' دھوپ کے جھونکوں کو بہا رہی تھیں۔ رنگ برنگ پھولوں سے دنیا میں آسمان کا حسن اتر آیا تھا۔ کرنوں کے آڑے ترچھے زاویے بنائے ہوئے سائے ٹھنڈے اور دل پسند لگتے تھے۔ لوگوں کے چہروں پر رونق تھی۔ مندر کی گھنٹیوں میں ایک گیت تھا جو کسی اور ہی دنیا سے آتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ماں مجھے پوجا کرنے کے لیے مندر لے جانا چاہتی تھی' پر میرے دل نے اب اپنا آستاں بدل ڈالا تھا۔ مجھے اندھیرے میں رکھی ہوئی مورتی کی آنکھوں میں کیا دکھائی دے سکتا تھا۔ میں نے انکار تو نہیں کیا' پر کشاں کشاں جب ماں کے پھولوں سے بھرے تھال کے قریب چل رہا تھا تو مجھے خوشبو میں بارش اور زمین کی باس معلوم دیتی تھی اور گلابوں کی سرخی میں ایک جانی پہچانی ملائمت محسوس ہوتی تھی۔ گہری سرخی میں سیاہی کا جو ہلکا سا پرتو ہوتا ہے' اس میں آنکھوں کی سیاہی گھلی ہوئی معلوم دیتی تھی۔ جب میں مورتی کے سامنے جھک رہا تھا' تو مجھے معلوم ہوتا تھا جیسے میں کسی اور ہی عظیم طاقت کے سامنے جھک رہا ہوں جو انسانی روپ میں کسی بہت ہی مظلوم چہرے کی ہنسی بن کر زندہ رہتی اور اپنے روپ بدلتی ہے۔

ماں بڑی نبّاض اور اُتم ہستی ہوتی ہے۔ اسے انجانے ہی دل کی تمناؤں کا احساس ہو جاتا ہے۔ اس نے چہرے پر کی بے یقینی کو دیکھ کر میری صورت پر لکھی اداسی کو بھی پڑھ لیا ہوگا کیونکہ اس کے بعد اس نے مجھے کبھی مندر جانے کو نہیں کہا۔

وہ سارا دن ملنے ملانے میں گزرا۔ دفتر کی میز اِتنے سب دنوں کے بعد سرد اور بے حس معلوم دیتی تھی۔ کام الجھا ہوا اور بڑا ہی مشکل لگتا تھا اور پھر ایسے بہت سے لوگوں سے اپنی بیماری کا ذکر کرتے کراتے جو گھر پر مجھ سے ملنے اور دیکھنے نہ آ سکے تھے' میں تھک سا گیا۔ آج بھی یہ بات کتنی ناقابلِ یقین لگتی ہے کہ پرانے اخباروں کو دیکھنے کی میں نے کوشش نہ کی۔ ایک آئندہ کی امید پر ایک دور کی روشنی پر میں نظریں جمائے اس شام کا منتظر رہا' جب دن کا سورج مغرب کی طرف جھکے گا' میں گھر جا کر شام کی چائے پیوں گا اور پھر اس کمبل کو لے کر جو میرے پاس امانت تھا' اپنی گاڑی میں بیٹھوں گا' اس رات کی طرح یہ سفر تکلیف دہ اور پریشان کن نہیں ہوگا۔ کنول کی کوٹھی کا پھاٹک کُھلا ہوا ہوگا۔ میں اپنی گاڑی برآمدے کے قریب کھڑی کر دوں گا اور پھر اس بڑے کمرے کا

دروازہ میرے لیے کھلے گا چونکہ شامیں اب بھی سرد ہو جاتی ہیں' اس لیے آتش دان میں آگ ہوگی۔ کرشنا اور اس کا بچہ وہیں قالین پر پاس پاس نظر آئیں گے۔ ایک گزری شام' فن کے عدیم المثال شاہ کاروں کی طرح میری نظروں میں گھومتی رہی۔ میں خوش خوش خواب کی سی کیفیت میں پھرتا کام کرتا اور لوگوں کے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔ دنیا' آج مجھے بڑی اپنی اپنی اور ایک ایسی جگہ لگ رہی تھی' جس سے محبت کرنا ہر ایک کا فرض ہے' جس کی محبت ایمان ہے۔ مندر میں مورتی کے سامنے جھکو یا نہ جھکو مگر دل کے اندر رکھی ہوئی اس دیوی کے درشن کرنے کا دھیان ہر لمحے مجھے دن کی طوالت کا شاکی بنائے دیتا تھا۔ مجھے لندن کی شامیں یاد آ رہی تھیں جب دن ایک دم شام سے جاملتا ہے اور جہاں صبحیں کہر سے چھپی ہوئی عمارتوں کی طرح کبھی نظر ہی نہیں آتیں۔ جہاں کی خوشگوار بہاروں کے دن جھکی ہوئی سرد شاموں سے چھوٹے اور سرعت سے گزرتے ہیں۔ شام کی سرخی میں رنگوں کی سہانی آمیزش تھی۔ طویل سڑک پر گرد ایک مرمریں غبار کی طرح لگتی تھی۔ سڑک کی سیاہی اور ڈوبتے سورج کی کرنوں میں چمکتی ہوئی لمبائی آگے ہی آگے درختوں کے ملتے ہوئے زاویوں کو کاٹتی مڑتی نتھے اور نیچے پلوں کے اوپر سے گزرتی...... کنول کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس لمحے کا انتظار مجھے کب سے تھا اور اب جب کہ میں جا رہا تھا' مجھے کوئی جلدی نہ تھی میرے دل میں سکون اور ٹھہراؤ تھا۔ طمانیت سی ایک چین سا جیسے اردگرد درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندوں کی آوازوں سے دل خوش کن گیت کی بدلتی ہوئی گت کا احساس سا ہونے لگے۔ گھوڑا اپنی رفتار سے چل رہا تھا۔ سامنے بیٹھا موہن سنگھ آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا۔ کبھی کبھار تو موہن سنگھ مجھے رام دلارے ہی لگتا تھا۔ اسی طرح کی بالیاں کانوں کی لٹکی ہوئی لوئیں' توانا مضبوط جسم' مگر ٹانگوں سے کچھ تھوڑی سی سستی' ایک ٹانگ کی نسیں پھولی ہوئی تھیں۔ میں نے بات کرنے کی خاطر پوچھا' "موہن سنگھ تم اس سوجے ہوئے پاؤں اور زخمی ٹانگ کے ساتھ کام کیسے کرتے ہو؟"

اس نے گھوڑے کو چابک مارا اور گاڑی کو تیز چلاتے ہوئے کہنے لگا: "بابو کام کرنا ہی پڑتا ہے اور پھر سانپ کا بس اپنا کام کر رہا ہے' میں کیا کر سکتا ہوں۔"

اتنا مختصر جواب تھا۔ میں پوچھنے کے لیے بے تاب ہو گیا کہ سانپ نے اس کو کب کاٹا ہے مگر میرا سوال زبان پر نہ آ سکا۔ سامنے کنول کی کوٹھی نظر آ رہی تھی اور میں خاموش ہو گیا۔

پھاٹک کھلا تھا۔ چوکیدار نے ادب سے پوچھا" آپ کو کس سے ملنا ہے۔ آپ کہاں سے آئے ہوئے ہیں؟"

میں نے اسے کمبل دے دیا اور کہا' "اپنی بی بی سے جا کر کہنا وہ صاحب آئے ہیں جنہیں آپ کو اسے واپس کرنا تھا۔"

گاڑی سے اتر کر جب میں اس کے پیچھے چلا تو میرا دل دھڑک رہا تھا۔ زبان خشک تھی' ہاتھ پاؤں میں ایک رعشہ تھا اور پاؤں ٹھیک سے نہیں پڑ رہے تھے۔

سیڑھیوں پر برآمدے کے قریب کھڑی کنول مل گئی۔ بولی" آپ نے خوب راہ دکھائی' اتنے دنوں کے بعد لوٹے ہیں' آیئے اندر آ جایئے۔"

میں ایسے پُرجوش استقبال کے لیے تیار ہو کر نہیں آیا تھا۔ حیران سا اپنی پریشانی پر قابو پاتا ہوا کنول کے پیچھے چلا گیا۔ کمرے میں آگ خوب روشن تھی مگر قالین پر نہ کرشنا تھی اور نہ اس کا بچہ۔ کنول نے اندر کھڑے ہو کر گھنٹی بجائی۔ ایک جوان لڑکی' سانولا رنگ' بڑی بڑی آنکھیں جھکی ہوئی سی' آ کر دروازے میں کھڑی ہوگئی۔

"نیرا بہن چائے نہ بنالوگی۔" کنول نے اس سے بڑے رسان سے کہا۔

سر جھکا کر بغیر بولے نیرا واپس چلی گئی اور کنول دوسری طرف کرسی پر میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تو اچھا آپ کمبل واپس کرنے آئے' اتنے دنوں بعد۔"

میں گھبرا رہا تھا' شرما رہا تھا۔ مجھے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ مجھے اپنی کمزوری پر شرم آ رہی تھی۔ مرد ہوتے ہوئے بھی میں اس رات کی سردی کو برداشت نہ کر سکا اور ایک طویل بیماری کے بعد اب اسے ملنے آیا ہوں۔ اس رات بھی میں نے اسے ناحق ہی تکلیف دی تھی' بارش کے ریلوں میں وہ مجھے چھوڑنے اکیلی تاریکی میں تین میل تک گئی تھی۔

"اصل میں میں بیمار ہو گیا تھا" میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

کنول نے اپنی پوری آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ بولی" بہت افسوس ہے اگر مجھے آپ پیغام بھجوا دیتے تو خیر اب تو آپ اچھے ہیں۔ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ مجھے آپ کو صحت مند دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔"

کمبل اس کی کرسی کی پشت پر پڑا تھا اور سیاہ کمبل کے مقابلے میں اس کے چہرے کی سفیدی اندھیرے پانی پر کنول کی طرح ڈول رہی تھی۔ پھر میں نے آہستہ آہستہ اسے اپنی بیماری کی طوالت کے متعلق بتایا۔ وہ انہاک سے سنتی رہی اور کہنے لگی۔ "اصل میں غلطی مجھ سے ہوئی۔ آپ

کو درد سے بچنے کے لیے کوئی گولیاں کھلا دیتی تو اچھا رہتا۔"

"اور آپ جو مجھے چھوڑنے گئی تھیں۔" میں نے موضوع بدل کر کنول کے متعلق بات کرنا چاہی۔

"ہٹائیے اس بات کو" اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ "بہر حال میری غلطی سے آپ بیمار پڑے۔"

میں نے شروع میں کہہ دیا کہ اس کا بات کرنے کا فیصلہ کن انداز ہی سب سے بڑی خوبی تھی۔ میں خاموش ہو گیا۔

خود ہی بولی کرشنا چلی گئی، اسے روبندر لے گیا ہے۔

میں نے پھر تان اس پر توڑنے کی غرض سے کہا" "آپ نے مقدمہ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا' اس کے علاوہ کیا ہو سکتا تھا۔ روبندر کا ہارنا ضروری تھا" حیران ہو کر بولی" "آپ بھی دوسروں کی طرح یہی سمجھتے ہیں کہ عورت سمجھ کر عدالت نے فیصلہ میرے حق میں کر دیا۔ اس کی آواز میں تلخی تھی۔"

"نہیں، میرا یہ مطلب نہیں۔" میں نے گھبرا کر اپنے موضوع کی وضاحت کرنا چاہی۔

"آپ کی ذہانت نے مقدمے کا رخ بدل دیا تھا۔"

میری ذہانت' وہ ہنستی ہوئی کرسی کی پشت پر پڑے کمبل سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ "کیا آپ کا اپنا خیال ہے کہ عورتیں ذہین ہوتی ہیں؟ آپ ایمانداری سے بات نہیں کر رہے۔"

کیوں میں سوال کے اچانک پن پر چونک پڑا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ راہ ایک دم مسدود ہو گئی ہے اور کنول کی باتوں کا جواب دینا سہل نہیں۔ "میں ایمانداری سے بات کہہ رہا ہوں۔ میں سوچتا ہوں آپ ذہین ہیں۔"

وہ ہنس کر بولی۔ "یہ بات بالکل الگ ہے۔ ویسے مجموعی طور پر آپ عورتوں کو ذہین نہیں سمجھتے، جہاں تک میرا ذاتی سوال ہے میں بھی اس تعریف سے خوش نہیں ہوتی۔ مرد ذہین عورتوں کو کوئی اچھا مقام نہیں دیتے۔ وہ عورتوں کے ذہن کی تعریف کرتے ہوئے انہیں اس جماعت سے خارج کر دیتے ہیں جو ان کے معاشرے کا نصف سے بھی زیادہ حصہ ہیں۔ ذہین عورتیں مردوں کے پہلو میں کانٹے کی طرح چبھتی ہیں۔ اور جب کانٹے کی خلش سے تنگ آ جاتے ہیں تو اسے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ جس طرح روبندر کے پتا نے کی تھی۔"

میں نے رکھ رکھاؤ کے انداز کو برطرف کر کے کہا سچ کہیے کیا ہوا تھا۔ مجھے جس بات کا ڈر تھا' وہ ہو کر ہی رہی۔ آپ کو کوئی نقصان تو نہیں ہوا۔ سارے واقعات سے مجھے آگاہ کیجیے۔

"گھبراتے کیوں ہیں" وہ میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ایسا تو اکثر ہوتا ہے تب ہی تو میں کہتی ہوں کہ مرد ذہین عورت کو اپنے نظام میں ایک کانٹا سمجھتے ہیں اور اسے پوری طرح نکالنے کی کوشش میں جان لگا دیتے ہیں۔ آدھی رات کو چار آدمیوں کا اکیلی عورت کے گھر میں حملہ کرنے کی نیت سے کود کر چوری سے آ جانا اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کے ذہن سے وہ خائف ضرور ہیں۔ روبندر کے پتا کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میں کنول ہوں اور میں زندہ رہنے اور نظام کو بدلنے کی جن راہوں پر چل رہی ہوں وہ ان کی راہوں سے بہت دور ہیں۔"

اس خیال سے کہ رات کے اندھیرے میں چار آدمیوں نے گھر میں کود کر کیا نہ کر دیا ہوگا' میں پریشان ہو رہا تھا۔ کنول کی باتوں کی لاپروائی کے باوجود مجھے خوف آ رہا تھا۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی نازک اندام اور معصوم سی تھی۔ ہمارے تصورات میں حسن کا جو مقام ہو سکتا ہے' وہ سارا کنول کے چہرے پر تھا۔ اس نے کیسے چار ہتھیار بند آدمیوں کا مقابلہ کیا ہوگا۔

نیرا چائے لے کر آ گئی۔ خوشبودار گرم چائے پیالے میں انڈیلتے ہوئے بھاپ کے بادلوں سے اٹھتے اور کنول کے نتھنے روشنی میں گہرے گلابی لگ رہے تھے۔ اس کی جھکی ہوئی آنکھوں کی لمبی پلکیں ریشمی کناروں کی طرح سفید چہرے پر پڑی تھیں۔ چمکیلی پیشانی پر دونوں طرف بنائے ہوئے سیدھے بال سیاہ اور دلآویز تھے اور میں سوچ رہا تھا یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کنول نے چار آدمیوں کا بیک وقت مقابلہ کر لیا ہوگا۔ وہ معمولی لڑکیوں کی طرح تھی۔ ہماری بہنوں کی طرح جو چوہے سے بھی خوف کھاتی ہیں۔ ہماری عورتوں کی طرح جو رات کو بلی کی میاؤں سن کر چیخنے لگتی ہیں اور گھر بھر کو جگا دیتی ہیں۔ پھر کنول کی بات پر یقین نہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نہ تھی۔ جب وہ کہہ رہی تھی کہ میں اکیلی تھی اور چار آدمی کود کر گھر میں ...... تو ٹھیک ہی ہوگا۔ مگر مقابلے کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ شاید ذہین عورتوں کے پاس عقل کا ہتھیار ہی سب سے زیادہ مضبوط اور کارآمد ہوتا ہے۔

کنول پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی" "آپ ناحق پریشان ہو جاتے ہیں۔ مجھے چار آدمیوں کا گھر میں گھسنا بالکل ایسے ہی لگا' جیسے چار شریر اور گستاخ بچے رات کو اپنی بہادری کا مظاہرہ کرنے کی خاطر مارے مارے پھرتے میرے گھر میں پناہ لینے آ گئے ہوں۔"

مجھے اس ساری شام میں پہلی بار کنول کی بات پر غصہ آ گیا۔ میں بولا کچھ نہیں' یہ لڑکی ان باتوں کو کتنا غیر اہم اور معمولی سمجھتی ہے۔ آخر وہ عورت ہے اور عورت کی عزت نازک ہے۔ نڈر ہونا اور بات ہے مگر کنول کو اپنی حفاظت کا سامان کرنا چاہیے۔ روبندر کے پتا اگر ایسے اقدامات پر اتر سکتے ہیں تو ان سے کوئی بات بعید نہیں کہ وہ کنول کو مروانے کی کوشش کریں۔

میں نے اپنے خیالوں سے تنگ آ کر موضوع کو پھر بدلا۔ میں نے کہا'' کام کی رفتار کیا ہے۔''

بولی'' آپ کس کام کا ذکر کر رہے ہیں؟''

میں نے کہا'' آپ کا کام عورتوں کی بیداری کا کام آپ کے جلسے اور جلوس۔'' میں نے ذرا تیزی سے وضاحت کر دی۔

ٹھہر ٹھہر کر بولی'' آپ لفظ خوب چن چن کر اور بڑھیا استعمال کرتے ہیں۔ عورتوں کی بیداری کا کام' جلسے جلوس'' وہ پیالی کو پھر بھرتے ہوئے ہنس رہی تھی۔

میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ آخر اس سے بات کس طریق سے کی جائے۔ سیدھی بات کرنے پر بھی وہ گڑبڑا دیتی ہے۔ اپنے سوالوں سے ہراساں کر دیتی ہے میں چکرا گیا اور خاموش رہا۔

چائے کا دوسرا پیالہ بھی ختم ہو گیا۔ وہ اٹھی اور کیرم بورڈ اٹھا لائی۔ بولی'' آیئے کھیلتے ہیں۔''

میں اور وہ دیر تک کھیلتے رہے۔ اس دوران میں کوئی بھی نہ بولا۔ صرف کھٹ کھٹ کی آواز تھی۔ آتش دان میں کوئلے بجھتے جا رہے تھے۔ سرخ انگاروں کے گرد سفیدی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ شمع دان میں رکھی ہوئی موم بتیاں جل رہی تھیں اور کرشن بھگوان کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔ دیوی کے ہاتھ میں سنگ مرمر کا کنول اُس بھیگی ہوئی رات سے زیادہ جاندار اور خوبصورت لگ رہا تھا۔ تصویروں کے سیاہ حاشیے چمک رہے تھے۔ قالین ہمارے پاؤں کے نیچے نرم اور آرام دہ تھے۔ سرخی میں ملی ہوئی سیاہی ایک غبار کی طرح قالین سے اٹھ کر ہمارے چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ کیرم کی گوٹیں بورڈ پر پھسل رہی تھیں۔ سرخ ملکہ ابھی تک عین درمیان میں پڑی تھی نہ میری کوشش اور نہ کنول کی اسے ہلا سکی۔ ایک ماہر کھلاڑی کی متانت سے کنول بے حس بے پروا بیٹھی کھیل رہی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ جان بوجھ کر ہار رہی ہے۔ گوٹ نشانے پر ہوتے ہوئے بھی سرے کے پاس سے نکل جاتی۔ اس کی آنکھوں میں سنجیدگی تھی اور دل میں شاید ہارنے کا دھیان۔

کھیل ختم ہو گیا' وہ ہار گئی تھی۔ کرسی کی پشت سے ہنس کر سر لگاتے ہوئے اس نے کہا'
'' ملکہ پر ہار جیت کا فیصلہ کتنی ناانصافی ہے۔ ملکہ پر ہی ہار جیت کا فیصلہ ہوتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

'' نہیں' ملکہ تو ایک گوٹ ہے جس کے اتفاق سے زیادہ طلب گار ہو جاتے ہیں۔ اس کی اپنی مرضی تو کوئی نہیں ہوتی جس میں طاقت ہو وہی اسے جیت لیتا ہے۔''

میں خاموش ہو گیا۔

وہ ساری شام اس پُرسکون بیٹھنے کے کمرے میں چھوٹی چھوٹی بے معنی باتیں کرنے میں گزر گئی اور جب میں واپس آ رہا تھا تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ کنول کماری ٹھاکر سے سیاست' زندگی یا پھر اہم موضوع پر گفتگو کی کوشش فضول ہے۔ بقول اس کے وہ ایک ذہین عورت تھی۔ مردوں کی عقلوں کے لیے ایک کسوٹی اور مرد جب ہارتا ہے تو کھسیانہ ہو کر ہر اس شے کو برباد کرنے پر تُل جاتا ہے' جس سے اسے شکست کا امکان ہو۔ صدیوں کی حکومت کے بعد مرد کے دماغ کو یہ بات دھچکا لگاتی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور بھی ذہین ہے۔ کوئی حکومت کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ وہ تو عورت کے وجود سے ہی انکار کرتے ہیں۔ ان کے خیالوں میں عورت ماں ہے' بہن ہے اور خاموش بے دام غلام ہے۔ لونڈی ہے' بہن ہے تو بھائیوں کے ناز اٹھانے کے لیے وہ زندہ رہے گی' بیوی ہے تو خاوند کے ستم سہنے کے لیے اور ماں ہے تو بچوں پر اپنی ساری زندگی لگا دے گی۔ بظاہر اس نظامِ زندگی کے خلاف کنول کا وجود ایک بغاوت تھا۔ مگر کیا کیجیے کہ مرد کا بوداپن اس نئے پن سے متاثر ہونے کے بجائے اسے برباد کرنے پر مُبتلا ہوا تھا۔ کنول کماری لوگوں کی نگاہوں میں خار بن کر کھٹکتی تھی۔ وہ اکیلی رہتی تھی۔ وہ مرد کے وجود کو نفی تصور کرتی تھی۔ سینے میں رہ رہ کر اس رات کی طرح درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر وہ درد اس درد سے میٹھا اور انوکھا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کسی نے میری ساری ہستی کو جذب کر لیا تھا۔ میں اپنے گرد و پیش کو بھول کر اس بے تابی کا تجربہ کر رہا تھا' جو نس نس کی درد کی اینٹھن بن کر رہتا ہے۔ رگ رگ میں زہر بن کر سرایت کرتا ہے جسے لوگ محبت کہتے ہیں۔ لگاؤ کہتے ہیں اور جس کے لیے کروڑوں لوگوں نے اپنی زندگیاں برباد کی ہیں۔

سوچنے کی بات تھی کنول کی زندگی میں میرا مقام کہاں ہو سکتا تھا وہ جس ٹھاٹ کی عورت تھی اس سے یہ توقع بے کار تھی کہ کبھی میرے معاملے پر سنجیدگی سے غور کرے گی اور پھر میں کون تھا؟

ملک کے اخبارات میں اس کا چرچا ہوتا تھا' اس کی شعلہ بیانی سے بڑے بڑے لوگ عاجز تھے۔ اس کی قادر الکلامی جب اسٹیج پر چڑھ کر وہ مجھ کو مخاطب کرتی تو سارے ہال میں خاموشی

چھا جاتی۔ اسٹیج پر صرف وہ نظر آتی۔ اس کی گہری گونج دار آواز' تقریر کی روانی میں ڈھلتے ہوئے لفظوں کو ایک نئی زندگی مل جاتی۔ دائیں بائیں ایک شعلے کی طرح جیسے کہیں اجنتا کے غاروں سے کوئی روح نکل کر کھڑی ہو گئی ہو مگر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔

میں اس کا کمبل دے چکا تھا۔ آتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اس نے مجھے بڑی آسانی سے الوداع کہا تھا مگر یہ نہیں کہا کہ پھر بھی آنا۔ آخر میں کون تھا جس کا اسے انتظار رہا کرے۔ میں اس کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ ایک ناچیز ذرّہ شاید جسے اس نے کبھی یاد بھی نہ کیا ہو۔ اسے سوچنے کے لیے اور بھی تو بہت سی باتیں ہیں۔ میں کیا ہوں اور پھر میں نے اپنے گردوپیش پر نظر ڈالی۔ کنول کماری اپنا جواب خود تھی۔

درد کا سب سے بہتر علاج مصروفیت ہے اور میں نے اس کے بعد اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی ہر ممکن طریق سے کوشش کی۔ اخبار کا کام بڑھا لیا۔ عورتوں کا ایک نیا صفحہ اس میں نکالا۔ یہ درپردہ میری ایک اور نئی راہ تھی۔ اب میں کنول کے پاس جا سکتا تھا۔ اس سے اخبار کے لیے کچھ لکھنے کی التجا کر سکتا تھا۔ اس سے مدد مانگ سکتا تھا۔ اسے یہ کہہ سکتا تھا کہ تم اس صفحے کو اپنی قیادت میں بہتر بنانے کے لیے کوئی رائے دو۔ سینکڑوں راہ کھل گئے تھے۔ ان دنوں میں کنول کو بھولنا چاہتا تھا اور میرا لاشعور ایسی کوششیں کر رہا تھا۔ اس سے دور رہنے کی تمنا اور اس کے قریب جانے کی کش مکش' دل ایسی اندھیری اور غیر معروف راہوں سے مطلب برآری کی کوشش کرتا ہے۔

کئی بار میں نے اسے لکھنے کی کوشش کی۔ ہر بار قلم چل نہ سکا۔ لفظ مل نہ سکے۔ راہ بجھائی نہ دیا۔ ہر بات میں اس کا انداز یاد آ جاتا' اس کی گفتگو کی سلاست یاد آ جاتی۔ پھر کیا فائدہ تھا' اتنے دنوں میں جس درد کا ایک ناقابلِ یقین حصہ کم ہو رہا تھا' اسے میں جا کر بڑھانے کے سامان کیسے کروں اور میں نے اپنے اخبار میں عورتوں کے حصے کی ترتیب کے لیے ایک اور خاتون کی خدمات حاصل کر لیں۔

شوبھا بینر جی پڑھی لکھی اور ڈگری یافتہ عورت تھی۔ اس کے رنگین آنچلوں کے ساتھ داستانوں کے ٹکڑے اُڑتے تھے۔ وہ مردوں کے حلقے میں کنول کماری ٹھاکر کی طرح نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ اسے قلم استعمال کرنے کا سلیقہ تھا اور جنسِ مخالف سے اپنی بات منوانے کا ڈھنگ بھی خوب آتا تھا۔ سب سے جاندار اس کی مسکراہٹ تھی۔ جدھر دیکھتی لوگ جھک جاتے۔ وہ اپنی فتح پر نازاں اور اس کے نشے میں مست رہتی تھی۔ میری نظرِ انتخاب اس پر اچانک ہی پڑ گئی

اور پھر اخبار کے مالک بھی جو شوبھا بینر جی سے بہت متاثر تھے اس کو اپنی اور اپنے اخبار کی خوش قسمتی تصور کرنے لگے کہ ایسی باا‌ثر معزز اور تعلیم یافتہ خاتون اس کے اخبار میں ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ملک میں ترقی ایک سیلاب کی طرح گھس آئی ہے۔ ہر طرف لڑکیوں کے سبز زرد' سرخ اور عنابی آنچل اڑتے ہیں۔ دنیا میں رنگ و بُو کا طوفان سا آ گیا ہے مگر میں تو ان دنوں کی بات کر رہا ہوں جن دنوں شوبھا بینر جی سوسائٹی میں اپنے رنگ اور خوش بیانی سے زندگی کی مظہر بن گئی تھی۔ سیٹھ بچھے جاتے' دفتر میں لوگ بہت زیادہ آنے لگے۔ اخبار یکا یک پستیوں سے نکل کر بامِ عروج پر پہنچ گیا۔ پھر یکایک شوبھا نے عورتوں کی اس جماعت کے خلاف ایک کالم میں کچھ لکھا جو مردوں سے برابر کے حقوق اس بنا پر طلب کر رہی تھیں کہ انہیں بھی مرد کی طرح معاشرے کی اعلیٰ رکن ہونے کا حق تھا۔ مضمون میں کھُلم کھُلا تو کچھ نہیں تھا مگر ویسے لفظوں میں یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ عورت کی زندگی اسی میں ہے کہ وہ مرد کے زیرِ سایہ رہے۔ وہ کمزور ہے' اس میں طاقت نہیں' اسے مرد سے الگ رہ کر سکون نہیں مل سکتا۔ مرد کی طاقتیں ہی عورت کو سنوار سکتی ہیں۔ پھر کچھ ان روایتوں کے بارے میں تھا جن پر دنیا آج تک چلتی رہی ہے۔ کچھ بُھولی ہوئی داستانوں کا حوالہ تھا۔ عورت زندگی کی قربان گاہ تک ہمیشہ بھینٹ چڑھتی آئی ہے' ہمیشہ شکست کھاتی آئی ہے۔ اسی ہار میں اس کی جیت ہے۔ میرا اصول تھا میں شوبھا کے کام سے تعرض نہ کرتا۔ ایڈیٹر ان چیف ہونے کے باوجود میں نے اس سے کبھی مضامین کا ایک لفظ بھی بدلنے کو نہیں کہا اور پھر یہ ہونے لگا کہ پریس میں میرے دیکھے بنا شوبھا خود ہی اپنا صفحہ بھیج دیتی جو چھپ جاتا۔ کبھی کوئی قابلِ اعتراض بات اس کے قلم سے آج تک نہیں نکلی تھی۔

اس دن اخبار پڑھ کر میں کشاں کشاں شوبھا کی میز کے قریب چلا گیا۔ بڑی خوش اخلاقی سے کہنے لگی' "بیٹھیے آپ کو کیا کام آن پڑا کہ آج میری طرف رجوع کیا۔"

میں سوچ رہا تھا کہ ان لفظوں میں شکایت ہے یا طنز۔ میں نے مضمون کا کالم اس کے سامنے رکھ دیا۔ پڑھ کر بڑی الجھی ہوئی سی میری طرف دیکھ کر بولی: "اس میں کتابت کی تو کوئی غلطی نہیں۔"

میں نے کہا: "نہیں مجھے کتابت سے غرض نہیں' مجھے نفسِ مضمون کے متعلق کچھ کہنا ہے۔" اس کی پیشانی چمک اٹھی۔ چہرے سے تکدّر کے آثار دور ہو گئے۔ بولی: "میں نے اپنی

طرف سے جو مختصر لفظوں میں ہو سکتا تھا' لکھ دیا۔ یہ عورتوں کا صفحہ ہے نا اور عورتیں کبھی اس بات کو برداشت نہیں کر سکتیں کہ ان کے آزادی کے حقوق کو تسلیم کرنے میں کوئی شک وشبہ کیا جائے۔"

میں پھر سوچنے لگا اسے کیسے سمجھاؤں کہ مجھے سرے سے اس بارے مضمون پر ہی اعتراض تھا۔

کہنے لگی: "یہی بات تھی یا کوئی اور؟"

میں نے کہا: "نہیں مس بینر جی مجھے آپ کے خیالات سے اختلاف ہے۔ آپ نے عورتوں کے حقوق آزادی کے خلاف لکھ کر اچھا نہیں کیا۔" حیرت سے آنکھیں کھول کر بولی۔ "یہ آپ کہہ رہے ہیں' آپ مرد ہو کر یہ باتیں کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا: "عورتیں صرف عورتیں ہی نہیں' مائیں' بہنیں اور بیٹیاں بھی ہیں۔ کیا آپ یہ برداشت کر سکیں گی کہ کوئی مرد آپ کو غلام کی طرح رکھے۔ پھر یہ بات بھی جانے دیجئے۔ معاشرے میں عورت کو جن مجبوریوں نے قید کر رکھا ہے اس کی آزادی اور رہائی کا وقت اب قریب آ گیا ہے۔"

ہنس کر بولی: "ہٹائیے ان باتوں کو یہ باتیں اصولی ہیں مگر روایتی نہیں۔ کیا کیجئے گا' عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دِلا کر۔ میں نے کہا سمجھ میں نہیں آتا آپ اپنی ہی جنس کے اس قدر خلاف کیوں ہیں۔ کیا آپ کو بُرا معلوم ہوگا کہ آپ کی طرح آپ کی باقی بہنیں بھی ترقی کے میدان میں نکل کر اخباروں میں اپنے خیالات کا مظاہرہ کریں۔ مردوں کے دوش بدوش چلیں' پارٹیوں میں شامل ہوں' ہنسیں' بولیں' مردوں کی منظورِ نظر ہوں۔"

میری بات سے وہ کٹ سی گئی۔ بولی: "ہر عورت کو اس لیے پیدا نہیں کیا گیا کہ مردوں کے کندھوں سے کندھا ملا کر چلے۔ پارٹیوں میں شامل ہو اور ہنسے' بولے۔ یہ تو اخلاق کی مضبوطی ہے جس کو نصیب ہو گئی۔"

میں نے کہا: "اخلاق کی مضبوطی کوئی دیوار تو نہیں' کسی وقت بھی ڈھے سکتی ہے اور پھر اس کا کیا ثبوت ہے کہ ہر عورت ان حالات میں بہتر یا بدتر ثابت نہیں ہو سکتی۔ صرف اس خیال کی بنا پر کہ عورتیں آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گی' انہیں اپنے حقوق کو طلب کرنے سے نہیں روک سکتا اور اخلاق کی بلندی تو جماعت سے زیادہ افراد پر منحصر ہے۔ یہ ہر انسان کا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ بہرحال اجتماعی طور پر جو ہو رہا ہے' اس کے خلاف لکھنا بے کار ہے۔ اخبار کے حق میں یہ بات

زہر ثابت ہوگی۔ میں تو آپ کو صرف مطلع کرنے آیا تھا۔ آپ کی مرضی۔"

ہنس کر بولی: "دیکھا جائے گا۔ اخبار رہے یا جائے میں اپنی پالیسی نہیں بدل سکتی' جو ہوگا وہ ہو کر رہے گا۔ میں آزادی کی اس تحریک کے خلاف ہوں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ آزادی لے کر مردوں کے دوش بدوش چل کر یہ کریں گی کیا؟"

میں واپس چلا آیا اور شوبھا بینر جی کے تیز لہجے سے مجھے معلوم ہو گیا کہ اصل میں اس کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ کنول کماری ٹھاکر اس جماعت کو منظم کر رہی تھیں۔ عورت اپنے سے بہتر عورت کو شاید برداشت نہیں کر سکتی اور ہر طرح سے انہیں نیچا دکھانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ شاید عورت کی سب سے بڑی کمزوری اس کا جذبۂ حسد ہے۔ وہ جھکتی ہے اپنے تخت سے اپنی حکومت سے دست بردار ہو جاتی ہے مگر دوسری عورت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ مرد مل کر بیٹھ سکتے ہیں' کام کر سکتے ہیں اور اپنی دوستیوں کی طرح دشمنی کو بھی ایک آن سمجھ کر نبھاتے ہیں اور شاید صرف یہی ایک بات ہے جو مردوں میں عورتوں سے زیادہ اور ان کی فضیلت کا باعث ہے۔

دوسرے دن زیادہ تیز اور واضح لفظوں میں شوبھا نے پورے صفحے عورتوں کی آزادی کے نقصانات اور تحریک کی خامیوں پر مدلّل بحث کی تھی۔ میں نے سیٹھ سے کہہ دیا کہ جتنی بھی خریدار عورتیں ہیں' ان میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اس سے اخبار کی پالیسی کو بہت نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے۔ سہ پہر کو سیٹھ دفتر میں آئے اور اکیلے ہی شوبھا کے کمرے میں چلے گئے۔ کوئی دو گھنٹوں کے بعد باہر نکلے تو کہنے لگے۔

"آپ کوئی فکر نہ کریں۔ شوبھا بینر جی کہہ رہی ہیں کہ اخبار کی آمدنی کی ذمہ دار وہ خود ہیں۔" اور پھر آہستہ سے سمجھانے کے انداز میں بولے "آپ کی ذمہ داریاں کافی ہیں۔ مجھے اس کا احساس ہے مگر شوبھا مانتی ہی نہیں' میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو حالات کی رفتار کے ساتھ بہنے کے لیے چھوڑ دیا۔"

تیسرے دن شوبھا نے واضح لفظوں میں کنول کماری ٹھاکر پر ذاتی حملے کیے تھے اور بتایا تھا کہ جس جماعت کی قیادت کنول کر سکتی ہے جس تحریک کو وہ منظم کر سکتی ہے اس کی کامیابی کے امکانات کم اور تقریباً ناپید ہیں۔ تحریک کی ہنسی اڑائی تھی۔

عورتوں کا صفحہ بظاہر تو شوبھا کی قیادت میں نکلتا تھا۔ مگر دراصل ایڈیٹر ہونے کی حیثیت سے یہ فرض مجھ پر عائد ہوتا تھا کہ میں ہر لفظ کا ذمہ دار ہو سکتا تھا' نہ جانے کنول کو مجھ سے کتنی شکایت

ہوا اور وہ ان لفظوں کو پڑھ کر کتنی ہراساں ہو۔ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ مجھے معذرت کرنے اور کم از کم اپنی حقیقت واضح کرنے کے لیے اس کے ہاں جانا چاہیے تھا اور پھر اس شام کو میں پیدل ہی کنول کے گھر کی طرف چلا۔ میں نے سوچا تھا اخبار سامنے رکھے وہ پریشان اور حیران سی ان لفظوں کو پڑھ کر اُداس سی بیٹھی ہوگی۔ میں جا کر اس سے تسلی کے چند لفظ کہوں گا۔ وہ خاموش ہوگی۔ اپنی پوزیشن سمجھاؤں گا۔ میں اصل میں اس ساری غلطی کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا تھا جو انجانے ہی شوبھا کر رہی تھی۔

پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہوئے سب سے پہلے مجھے وہی نظر آئی۔ گلاب کی کیاریوں کو پانی دے رہی تھی۔ ساڑھی کا پلو کمر میں اُڑسے ہوئے، فوارہ ہاتھ میں پکڑے وہ پانی کی دھار گلاب پر ڈال رہی تھی۔ پتوں پر پانی شبنم کے قطروں کی طرح لرز رہا تھا اور وہ بہت محویت سے آہستہ آہستہ اپنی سفید ساڑھی کو بچاتی چل رہی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ لمبی چوٹی، سیاہ ناگن کی طرح لٹک رہی تھی اور اُس شام کو مجھے احساس ہوا کہ وہ شان جو عام عورتوں میں ناپید تھی، کنول کی شخصیت کا ایک اعلیٰ جزو تھی۔ وہی شان اس کے گرد سب سے زیادہ زندہ شے تھی۔

وہ میرے وجود کا احساس کر کے مڑی اور کہنے لگی اچھا آپ آئے ہیں۔ دیکھئے میں کام کر رہی ہوں۔ آج مالی بابا اپنی بیٹی کو لینے اس کے سسرال گیا ہے نا۔ اس لیے میں گلابوں کی دیکھ بھال کر رہی ہوں۔ پھر ہم دونوں ان کیاریوں کے پاس کھڑے پھولوں، پودوں، زمین، بیجوں اور جانے کون کون سی باتیں کرتے رہے۔ تب اور بہت سی باتوں کی طرح میں نے اپنی دانست میں پہلی بار انکشاف کیا کہ کنول کو پھولوں سے عشق تھا، اسے دھرتی سے زمین کی ہر شے سے لگاؤ تھا اور میں سوچ رہا تھا اس عورت کو کسی اخبار اور کسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ یہ تو اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ گھر اور خوابوں کی تکمیل اس سے ہو۔ ایسی عورت جس کی ڈولی پیپل کی چھاؤں تلے سے آتی ہو جس نے ابٹن کی خوشبو اور مہندی رچے ہاتھوں کی باس سے گھونگھٹ اٹھا کر ادھر ادھر جھانکا ہو۔ کم از کم وہ کرختگی جو آزادی کے نام پر عورتوں میں آ جاتی ہے، اس میں کہیں نہ تھی۔ میں زندگی میں عورتوں سے ملتا رہا ہوں۔ کام کرنے والی، سیاست میں پاؤں دھرنے والی عورتوں میں ایک احساسِ برتری ہوتا ہے۔ ایک ایسی بے حسی سی جو پکار پکار کر کہتی ہے کہ ہم تو محض اصولوں اور مرد سے بدلہ لینے یا اس سختی سے زندگی کی راہوں پر چلنے کے لیے پیدا کی گئی ہیں اس لیے نہیں کہ عورتوں کی طرح گھر کی زینت بنیں اور چار دیواری میں رہیں۔ باہر کی ہوا اور سختی سے جس طرح مردوں کا

رنگ سفید سے گندم گوں اور سیاہی مائل ہو جاتا ہے، ایسی عورتوں کے چہروں پر بھی کچھ ایسا ہی رنگ ہوتا ہے۔ ان کی جلد کا نہیں ان کے اخلاق کا رنگ جو پکارتا ہے کہ ہم وہ ہیں جو ہم نے اپنے آپ کو بنایا ہے مگر کنول کے چہرے پر وہ نرمی ہے جو انتہائی رفعت کے وقت ایک خاص کیفیت کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ وہ بے بات ہر کام میں سیاست کو نہیں لے آتی۔ ملک کے سرکردہ حصوں میں باقی خواتین ایک خاص شان سے داخل ہوئی ہیں، مگر کنول میں وہ سب کچھ نہیں جو جماعتوں کی تنظیم اور خواتین کو متحد کرنے والی عورتوں کے چہروں کا جزو ہے۔ کیا کنول کماری ٹھاکر وہ نہیں جس کی مخالفت اخبارات کرتے ہیں اور جس کے متعلق رکیک ذاتی حملوں کی آڑ میں شوبھا بینرجی نے کیچڑ اُچھالا ہے۔

رُت بدل چکی تھی۔ ہوا میں ہر طرف بہار تھی۔ پیڑوں کی ہریالی سبزے کی طراوت آنکھوں میں گھسی جاتی تھی۔ پھولوں کی لالی اپنے جوبن پر تھی۔ زمین پھول اُگل رہی تھی۔ لان کے کناروں پر رنگوں کا ایک حاشیہ سا تھا۔ کنول نے چوکیدار سے کرسیاں باہر نکلوائیں اور ہم لان میں بیٹھ گئے۔ ابھی تک پھول ہی زیرِ بحث تھے۔ پھر باتیں بڑھتی گھٹتی زندگی کے اور زاویوں کو چھوتی ہوئی سیاست پر آ رُکیں۔ یکا یک کنول نے پکارا ''نیرا چائے لے آؤ بھائی۔''

میں نے کہا ''چائے رہنے دیجئے، میں آج ایک خاص بات کہنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

کہنے لگی ''مجھے پتہ ہے۔ پہلے چائے پی لیں۔ پھر باتیں کریں گے۔'' اس نے اجنتا کے غاروں کو دیکھا تھا۔ میں نے دیکھنے کی تمنا کے سہارے ان کے متعلق بہت کچھ کتابوں میں پڑھا تھا۔ دونوں پھر اجنتا پر باتیں کرنے لگے۔ ہندوستان کے پرانے زمانوں کی طرف آئے۔ باتیں پھر موجودہ دور کی سیاست کی طرف مڑیں۔ نیرا چائے لے کر آ گئی۔

کنول کے ہاں کی چائے میں ایک نرالی خوشبو ہے یا پھر یہ میرا واہمہ ہے اور پھر شام کی سُرخیاں رات کی گہری سیاہی سے گلے ملنے لگیں۔ اندھیرا زمین سے اُٹھ رہا تھا۔ آسمان کی روشنی سے ملتے ہوئے نیلی دھند کی صورت میں کانپ رہا تھا۔ شام کا اکیلا ستارہ افق کے قریب لرزتا ہوا اس پُرانی دنیا کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ شفق کے عنابی، مہتابی، اودے، گلابی رنگ اندھیرے میں ملنے لگے، گھلنے لگے، ہوا کے جھونکوں کے ساتھ گیت سے فضا میں تیرنے لگے۔ پرندوں نے درختوں پر بسیرا کیا۔ ان کی بولیاں ہمارے اردگرد گونجتے گونجتے خاموش ہو گئیں۔ میری ہمت جواب دے

رہی تھی۔ اس سے جو بات کہنے آیا تھا' وہ ان کہے رہ گئی اور اب گھرا اندھیرا میرے سر پر تیر رہا تھا۔ مجھے تین کوس چل کر گھر جانا تھا۔ ایسی خوشگوار ہوا جب بدن سے چھوتی ہے تو ایک سرشاری کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا تھا مگر اب جب کہ کنول اتنے رسان سے مالی بابا کی بیٹی کی شادی کی باتیں سنا رہی تھی' یہ کہنا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا پہلے اس کا نہ کہنا پھر میں نے ایک پاگل کی طرح یہ سوچ لیا شاید کنول نے آج کا اخبار ہی نہ پڑھا ہو۔ شاید ایسی باتیں سوچنے کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

میں نے جانے کی اجازت مانگی۔ بولی ''ٹھہریئے میں گاڑی لے آؤں۔'' میں نے ہمت کر کے کہا ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ رہنے دیجئے میں پیدل جا سکتا ہوں۔ راستے سے کوئی اور سواری لے لُوں گا۔''

کنول نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے کہا ''بتایئے آپ کیسی باتیں کرتے ہیں اور پھر آپ نہ آتے تب بھی میں سیر کرنے نکلتی۔ آج شہر کی طرف ہی سہی۔ آپ کو کیا اعتراض ہے۔''

میں نے کہا ''ایک شرط پر اگر آپ مجھے گھوڑوں کو ہانکنے دیں۔''

زور سے ہنس کر کہنے لگی ''اچھا یونہی سہی۔''

پھر کنول پچھلی طرف اور میں کوچوان کی جگہ بیٹھ گئے۔ خاموش شام میں سڑکوں کی طوالت بتدریج گھٹتی جا رہی تھی۔ میرا دل ایک انجانے سکون سے سرشار تھا۔ میرے دل کا درد ہلکا تھا۔ میں خود کو ایک بوجھ سے پہلی بار آزاد محسوس کر رہا تھا۔ سڑکوں پر اِکا دُکا راہ گیر تھے۔ شہر کا وہ حصہ نسبتاً کم آباد اور پھر غبار سے پاک تھا۔ میری دیوانی آنکھیں ایک ٹھنڈک محسوس کر رہی تھیں۔ وہ آگ جو مجھے جلاتی' آج اس کی گرمی کم تھی۔ سکون' جو مہینوں سے ناپید تھا' آج میرے گرد لہروں کی طرح ہلکورے لے رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا اپنے کو کھو کر میں پا بھی کیا سکتا ہوں' سوائے دکھ کے۔ اگر میں ساری عمر بھی کنول کے آستاں پر پڑا رہوں تو میں اس سے دل کا مدّعا نہیں کہہ سکتا۔ اکیلا پن میرا نصیب ہو چکا تھا۔ مرتے دم تک میں نے اپنے راز کی حفاظت کا ارادہ کر لیا اور کنول میرے راز کو سمجھ لے یہ تو ناممکن تھا۔

گلی کے موڑ پر میں اُتر گیا۔ کنول نے اسی طرح کوچوان کی جگہ سے جھک کر چابک ہوا میں لہرایا۔ مجھے خدا حافظ کہا اور اپنی راہ پر چلی گئی۔ میں گاڑی کی پچھلی بتیوں کو سڑک کی سیاہی پر اپنے سے اور دور ہوتے دیکھتا رہا اور پھر میں بھی واپس آ گیا۔ پھولوں کی خوشبو ہوا کی تازگی زندگی کی اس ندرت اور کنول کے قُرب نے مجھے ایک دم اپنے اس بودے پن سے بلند کر دیا تھا جس کے درد کو اینٹھن اور عشق کہا جاتا ہے۔ شاید یہ وقتی احساس تھا۔ بہرحال وہ ساری رات میرے لیے خوابوں اور اجالوں میں گزری' نرم چاندنی آسمان سے اتر کر میری آنکھوں میں گُھسی جاتی تھی۔ ستارے ہوا کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ مکان چاندنی میں دُھلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ہر شے زمین سے آسمان تک حسن اور نور میں نہائی ہوئی خاموش کھڑی تھی۔

اگلے دن شوبھا نے عورتوں کا صفحہ کھول کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا ''آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا میرے بیانات پر اخبار کی پالیسی پر اس سے کوئی خاص فرق تو نہیں پڑ رہا۔ عورتوں کی آزادی تو آپ کو یقیناً بری لگتی ہوگی۔''

میں خاموش رہا۔ پڑھتے ہوئے درد کی جلن سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کنول کے لیے ایسے لفظ سوائے ایک عورت کے کون استعمال کر سکتا ہے اور میں سوچ رہا تھا کیا پارٹیوں اور سیاست کی روح یہی ہے کہ ایک معصوم لڑکی کو یوں ستایا جائے۔ مانا اس نے کل مجھ سے کچھ نہیں کہا' پھر اس کے دل میں ضرور کوئی نہ کوئی گلہ ہوگا۔ میں کیا کر سکتا ہوں اس دوستی کا جو میں اپنے دل میں اس کے لیے محسوس کرتا ہوں۔ یہی تقاضا ہے کہ میں اس اخبار سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ یہ سب ناقابلِ عمل ہے۔ ایک ہی بات ہو سکتی ہے یا تو کنول سے دوستی رہے یا پھر اخبار سے۔ اخبار پر میرا مستقبل تھا۔ اس کم عمری کے باوجود میں ملک کے ایک سرکردہ روزنامے کا ایڈیٹر تھا اور یہ سعادت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے مگر ایک عورت کی عزت کا سوال بھی درپیش تھا اور میں عزت کی خاطر اپنا مستقبل برباد کرنے کو تیار تھا۔ میں نے اپنا استعفیٰ سیٹھ کو دے دیا اور اس شام کو پھر کنول کماری کے گھر گیا۔

مجھے دیکھ کر وہ گھبرائی نہیں۔ میرے آنے کی وجہ نہیں پوچھی۔ اسی میٹھی مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا اور مجھ سے بیٹھنے کے لیے کہہ دیا۔ میں خاموش تھا۔ بولی ''آپ گھبرائے ہوئے سے کیوں ہیں؟''

میں نے کہا ''میں نے استعفیٰ دے دیا ہے۔''

حیرت سے بولی ''کیوں؟''

میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا ''جو اخبار آپ کے خلاف ایسی باتیں لکھے' میں وہاں

کام نہیں کرسکتا۔ شوبھا بینر جی پر میرا کوئی اختیار نہیں، پر اپنے پر تو ہے اور میں آج اخبار سے الگ ہو گیا ہوں۔“

کنول بیٹھی تھی، اٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی، ”میں یہ کبھی برداشت نہیں کرسکتی کہ آپ جذبات کی رَو میں بہہ کر میری خاطر اپنا مستقبل برباد کریں۔ اگر آپ کو میری ذرا سی بھی پروا ہے تو ابھی جائیے اور سیٹھ سے اپنا استعفیٰ واپس لیجیے۔ آپ کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ یہ سمجھ کر کہ آپ کے اخبار چھوڑ دینے سے میری مخالفت رُک جائے گی۔ جائیے ابھی جائیے اپنا بنا بنایا مستقبل بگاڑنے کو کس نے کہا تھا آپ سے۔“

میں حیران رہ گیا۔ کوئی اور عورت ہوتی تو مسکرا کر شکریہ ادا کرتی اور پھر میری آئندہ زندگی کی باتیں کرنے لگتی مگر یہ کنول تھی۔ میں ہر نئے دن اس کے ایک نئے رخ سے آشنا ہو رہا تھا۔ وہ ایک ہیرے کی طرح اپنے ہر نئے رخ سے کسی اور ہی رنگ میں چمکتی تھی۔

خاموشی سے اٹھ کر میں اپنی گاڑی میں بیٹھا اور کنول کو لان پر پھولوں کی کیاریوں کو پانی دیتے چھوڑ کر چلا آیا۔ میں نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا۔ ٹھیک ہے مخالفت کا طوفان کچھ میرے علیحدہ ہو جانے سے رک تو نہیں سکتا تھا۔

پہلے یہ بات کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی اور اب پورے دفتر میں اس بات کا چرچا ہو گیا کہ میں نے کنول کماری ٹھاکر کی حمایت میں اخبار کو چھوڑنا چاہا تھا۔ اپنے کیے کی سزا بھگتنے کے لیے میں تیار ہو گیا۔

شوبھا بینر جی کے آنچل اور بھی تیز رنگوں میں لہرانے لگے۔ لوگ اُس سے ملنے آتے، اُس کی تعریفیں کرتے، اُس کے اعزاز میں پارٹیاں دی جاتیں۔ سیاسی حلقوں میں ایک شور و غوغا تھا جس کی ہر تان شوبھا بینر جی پر ٹوٹتی تھی۔ رئیس لوگوں کی موٹریں شوبھا کے دروازے پر کھڑی رہتیں۔ نام کا چیف ایڈیٹر میں تھا اور باگ ڈور شوبھا کے ہاتھ میں تھی۔ میں عضوِ معطل کی طرح کبھی کام نہ کرتا مگر کنول کا کہنا تھا اور اس کو اپنی حماقت سے دوسری دفعہ ناراض کرنے کا کوئی ارادہ میرے دل میں نہ تھا۔

کنول کی مخالفت نے اب ایک ذاتی رنگ لے لیا تھا۔ ہر مجمع میں جہاں کنول کی تقریر ہوتی، شوبھا کی طرف سے کوئی نہ کوئی نئی مصیبت کھڑی کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اصل میں جو محبت ملک کے دل میں اس سادہ معصوم مگر بااصول عورت کی تھی، شوبھا وہ محبت اور احترام سمیٹنا چاہتی

تھی۔ پگلی کو یہ معلوم نہ تھا کہ محبت تو ایک الگ شے ہے۔ اصولوں اور شہرت سے بلند اور بے نیاز لوگ جس کو چاہتے ہیں اس کی محبت کو دل سے نکالا نہیں کرتے۔ عوام جسے چاہتے ہیں اسے بہت عرصہ کے بعد ہی سہی، سر سے اتار پھینکتے ہیں۔

شوبھا کے ہاتھ میں ایسے مردوں کا ہتھیار تھا جو عورت کو ایک کھلونا سمجھتے ہیں۔ اپنے حریمِ عیش کی ایک شمع، جب جی چاہا پھونک مار کر بجھا دی۔ وہ ان سیاست دانوں ان رئیسوں کو اپنے دل کی ایک تمنا کی خاطر کنول کے خلاف استعمال کرنا چاہتی تھی۔

کنول نے نادار اور بے کس عورتوں کے لیے ایک ہوسٹل سا بنایا تھا۔ ملک میں چندے کی تحریک چلی۔ جلسہ ہوا اور تحریک کو بہتر کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی گئی۔ یہاں تک کہ حکومت کے کارکنوں نے باز پرس کی کہ کنول کماری ٹھاکر کس اصول کی بنا پر اس وسیع پیمانے پر چندہ اکٹھا کر رہی ہے۔ ملک کی دولت اسی طرح سمیٹنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ شوبھا اس ساری مخالفت کے تہہ میں کام کر رہی تھی۔ کنول سے نادار گھر کا حساب مانگا گیا۔ شوبھا نے اخبار میں سرخ حاشیے سے اس خبر کو شائع کیا اور پھر ایک بار پھر میں نے محسوس کیا کہ اخبار سے علیحدہ ہونا ایک ایماندار کی طرح میرا فرض تھا۔ حکومت کی طرف سے مخالفت کے اس طوفان کا مقابلہ وہ کس طرح کرسکتی ہے۔ وہ ضرور ہراساں ہوگی۔ میں اس کے پاس جاؤں گا۔

بہار گرمیوں کی بے کیف رت میں بدل چکی تھی...... مگر کنول کے چہرے پر رونق تھی۔

اس نے اسی دل آویز مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔

نیرا کو کہنے لگی، ”جاؤ آج وہ شربت لاؤ جو کل ہم نے بنایا تھا۔“ میں نے ہنس کر کہا ”یہ کام بھی سیاسی کاموں کا حصہ ہے۔“

بولی، ”میں عورت ہوں نا اور عورت کو یہ سب کام کرنے آنے چاہئیں مگر میں نے اور نیرا نے یہ مل کر بنایا ہے۔ نیرا مجھ سے زیادہ اور کام کرنے کا سلیقہ رکھتی ہے۔“

خوشگوار بو باس کا لذیذ شربت پی کر میں نے کہا ”آپ سے کچھ کہنا ہے۔“

ہنس کر بولی ”آپ تو بس کچھ کہنے کے لیے ہی تشریف لاتے ہیں۔ ہٹائیے ان باتوں کو آئیے آج کیرم کھیلیں۔“

اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں وہ تیزی سے اٹھ کر چلی گئی۔ وہ اور نیرا کیرم گوٹیں اور میز اٹھائے ہوئے آئیں۔ آج میں اسے ہرانا نہیں چاہتا تھا۔ میں بہت سستی سے کھیل رہا تھا۔

تھکن میری ہر حرکت سے ظاہر تھی۔ وہ نیم وا آنکھوں سے بڑی چابک دستی سے مہرے کو گوٹ کے پاس گزار دیتی۔ وہ ہارنا چاہتی تھی۔

ہم دونوں کے دلوں میں چور تھا۔ دونوں ایک ہی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ بچوں کی طرح گوٹوں کی کھٹ کھٹ میں کھوئے ہوئے باہر مخالفت کے طوفاں سے بے خبر اپنے آپ کو سکون اور امن کی گود میں سمجھے ہوئے۔

میں تھک گیا مجھ پر نیند سی طاری ہونے لگی۔ بورڈ پر صرف سرخ ملکہ بڑے وقار سے اکیلی پڑی تھی اور ہم دونوں باری باری اسے چھوئے بغیر نشانہ بنائے کھیل رہے تھے اور پھر ایک دم میں نے زور سے مہرے کو دھکیلا تو ملکہ باقی گوٹوں کے ساتھ جال کے اندھیرے میں کود گئی تھی۔ بہت دنوں کے بعد میں پھر جیت گیا تھا۔

کنول بولی'' آپ بہت ماہر ہیں۔ نیرا اور میں لمبی راتوں کو جب نیند نہیں آتی کھیلتے رہتے ہیں۔ نیرا ہر دفعہ مجھ سے ہار جاتی ہے۔'' میں نے یونہی بے سوچے سمجھے کہہ دیا'' جیت اصل میں ہار ہے اور ہار جیت۔''

کنول نے آہستگی سے پوچھا'' تو کیا آپ ہار گئے ہیں؟''

میں نے آہستگی سے جواب دیا' ہاں۔

بولی'' مجھے افسوس ہے میرا ارادہ آپ کو ہرانے کا نہ تھا اور آپ زندگی کے اصول کے خلاف کیوں چلتے ہیں۔ کیوں نیرا؟'' اس نے برآمدے سے اپنی طرف آتی ہوئی نیرا کو مخاطب کر کے کہا'' ہار ہار ہے اور جیت جیت۔''

اور پہلی بار میں نے نیرا کی بڑی میٹھی آواز سنی۔'' ہاں بی بی بات وہی ہے جو ہوتی ہے۔''

کنول میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔'' بس نیرا ایسے ہی بجھارتوں میں باتیں کرتی ہے۔ فلسفیوں کی طرح خوابوں کے دھندلکوں میں کھوئی رہتی ہے۔''

نیرا دوسری طرف منہ کر کے ہنسنے لگی۔ میں خاموش بیٹھا اسے تکتا رہا۔

میں نے کہا'' اب بہت ہولیا' آپ میری بات سنیں گی کہ نہیں؟''

وہ گوٹوں کو ڈبے میں ڈالتے ہوئے بولی:'' کیوں نہیں کہیے کیا سنائیں گے؟''

میں نے کہا'' اخبار جہنم میں جائے اور میرا مستقبل ڈوبے یا جائے میں یہ برداشت نہیں کرسکتا۔ آج آخری بار میں کہنے آیا ہوں کہ میں اخبار چھوڑ رہا ہوں۔ آپ کوئی بیان نہیں دیتیں کوئی بات ہی نہیں کرتیں۔ آپ مجھے اشارہ بھی کریں تو میں پروا کیے بغیر کوئی ایسی بات لکھ دوں جو اس سیاہی کو دھو ڈالے۔''

بولی'' افسوس ہے' آپ میں دھیرج نہیں ہے اور کام میں جذبات سے زیادہ سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ آپ کو میں اخبار کو چھوڑنے کے متعلق ایک بار بتا چکی ہوں۔ رہا میرا بیان' اس سے کیا بنے گا۔ خاموشی سب سے بہتر ہے۔ میں شوبھا کی باتوں کا جواب دینا ہتک سمجھتی ہوں۔ بات بھی درست ہے۔ نادار گھر چندے پر چلانا کون سی بڑی ہمت ہے۔ میں سارا جمع شدہ روپیہ حکومت کو واپس کر رہی ہوں۔ اگلے ماہ سے بے نوا عورتوں کا سارا خرچ میں اپنے ذمے لے رہی ہوں۔'' میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ یہ طویل ترین گفتگو تھی جو سیاست کے متعلق اس نے کبھی مجھ سے کی ہوگی۔

کنول کی ساری بات درست ہے۔ دھیرج مجھ میں ساری عمر نہیں آیا۔ کبھی کبھی پچھلے دنوں کی یاد سے دل یوں دھڑکتا ہے گویا سینے کی حدوں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ سانس گھٹنے لگتا ہے اور میں جسم میں سکت نہیں پاتا کہ اپنی جگہ سے ہل بھی سکوں۔ آج بھی جب ستارے آسمان میں زیادہ نزدیک معلوم دیتے ہیں اور پہلی راتوں کا چاند آسمان کی وسعتوں سے تیر رہا ہے' کھڑکی کے شیشوں پر بڑے بڑے کنول کے پھول زیادہ زندہ لگ رہے ہیں۔ بینا نے ایک بار بھولپن سے پوچھ لیا تھا'' بابا آپ کو اتنے بڑے بڑے سفید پھول ہی کیوں پسند ہیں؟'' دیکھیے گلاب سے زیادہ جلد تو یہ مرجھا جاتے ہیں اور پھر ان میں مہک بھی تو نہیں ہوتی۔ بابا یہ پھول تو پانی میں پیدا ہوتے ہیں اور اسی میں زندہ رہتے ہیں۔ دیکھیے میں سیاہ گلاب لائی ہوں۔ کہیں سے مانگ کر یہ آپ کے کمرے کی سفیدی میں بہت اچھے لگیں گے۔ کیوں بابا آپ کے لیے پھول آپ کے گلدان میں لگا دوں۔ میں بینا کو روک نہ سکا تھا۔ پھر اس سفیدی میں وہ سرخی مجھے تیز شعاعوں کی طرح معلوم دیتی رہی تھی۔ بینا تو اپنے سسرال میں کتنے دنوں سے چلی گئی ہے۔ گھر میں اس کے ہونے سے کتنی رونق رہتی ہے۔ مجھے یہی احساس کہ وہ گھر کے کسی حصے میں موجود ہے' کافی تھا۔ جب تک بینا میرے پاس رہی ہے' مجھے کنول کی یاد نے اتنا بے حس کبھی نہیں کیا۔ میں نے بینا کو ایک ننھے پودے کی طرح سینچا ہے اور ایک ننھے پھول کی طرح اس کو ذرا سی بچی سے بڑھتے شعور کی سیڑھیوں پر قدم رکھتے دیکھتا رہا۔ پھر اس کی وہ روح جو کنول سے ملتی جلتی تھی' خوبصورتی کا وہی احساس پھولوں سے

ویسا ہی عشق باتوں کا وہی انداز۔ آج سوچتا ہوں بینا کو میں نے اپنے دل میں اسی تخت پر بٹھایا تھا جو اصل میں کنول نے قبول نہیں کیا۔ کیسی عجیب باتیں سُنا رہا ہوں۔ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ دماغ کس طرف جا رہا تھا۔ بینا میری بیٹی ہے اور کنول۔ کنول کماری ٹھاکر تو آج مر چکی ہے اور اس کی راکھ شمشان کی سفیدی میں مل جائے گی۔ پھر کوئی جانے کون اِن پھولوں کو چنے گا اور گنگا کے پوِتر پانی میں بہا دے گا۔

گنگا شِو کی جٹاؤں سے نکلی ہوئی گنگا۔ ہندوستان کے سینے پر پاک دودھ کی دھار کی طرح۔ دیوتاؤں کا امرت مگر کنول کو تو ان باتوں پر یقین نہیں تھا۔ وہ تو ہر بات کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ اسے تو صرف ایک بات سے عشق تھا' اپنے نصب العین سے' اپنی منزل سے' منزل جس کا تعین اس نے خود کبھی نہیں کیا۔ کم از کم میرا تو یہی خیال ہے کہ زندگی کے سفر میں منزل کہیں نہیں ہوتی۔ سفر ایک اندھیرے سے دوسرے اندھیارے تک جاری رہتا ہے۔ گھنے جنگلوں' بلند پہاڑوں اور صحراؤں کے ساتھ ساتھ یہ سفر جاری رہتا ہے۔ زندگی کے سفر میں ایک ندی ہے جس کا منبع ڈھونڈنے کے لیے مسافر چلتا ہے۔ ایک سڑک ہے جس پر وہ چلتا ہے۔ سڑک اور ندی دو ساتھیوں کی طرح اپنا اپنا راستہ چلتے رہتے ہیں۔ ندی کے گیت سڑک کی خاموشی کے ساتھی ہوتے ہیں اور اس سڑک پر سے میں اور کنول اور بینا گزر جاتے ہیں' سڑک راہ ہے کوئی منزل تو نہیں۔

بینا میری سب سے بڑی اور پیاری بیٹی ہے۔ کنول کے پھولوں کی سی سفیدی اور پاکیزگی لیے ہوئے۔

وہ ہمیشہ بہت ذہین رہتی ہے۔ کبھی کبھار میرا جی چاہتا ہے' اسے کنول کماری ٹھاکر کے پاس لے جاؤں' اس سے کہوں۔ ''یہ میری بیٹی ہے' کیا تم اسے میرے لیے تربیت دو گی۔''

پھر میں کانپ جاتا۔ کنول کماری کی زندگی ایک صحرا ہے۔ اس میں ریت ہے' آندھیاں ہیں اور تیز چمک جو آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے۔ اچھا کیا میں نے' بینا تو ایک پھول ہے' اسے زندگی کی تلخیوں سے کیا غرض ہے۔ اسے زندگی کی سختیوں سے کیا واسطہ۔ وہ پانی کا پھول ہے جو پانی میں زندہ رہتا ہے۔

کبھی کبھار بینا مجھے کہتی: ''بابا آپ ہمیں کبھی کہانی نہیں سناتے' کہانی سنایئے۔''

ان دنوں آج کی طرح مجھے ایک ہی کہانی آتی تھی۔ کنول شہزادی کی کہانی۔ میں نے بینا کی فرمائش پر ہمیشہ وہی کہانی سنائی۔ سردیوں کی سرد شاموں کو کھانا کھا کر بینا میرے پلنگ کے قریب اپنی چھوٹی سی چارپائی پر لیٹ کر کہتی۔

''بابا ہم پھر پڑھیں گے' پہلے کوئی کہانی سنایئے۔''

میں کہتا ''بٹیا مجھے تو ایک ہی کہانی آتی ہے۔ بھلا بوجھو تو کون سی کہانی؟''

وہ ہنس کر کہتی۔ ''ہمیں پتہ ہے وہی کنول کے پھول کی کہانی' ہیں نا بابا؟''

''نہیں پگلی' کنول شہزادی کی کہانی۔'' میں اس کی تصحیح کرتا۔

''پھر کیا ہوا۔ کنول کا پھول نہ ہوتا تو اس میں شہزادی کیسے رہتی بابا۔''

''تمہیں تو ساری کہانی خود آتی ہے بینا۔'' میں کام میں لگنے کی کوشش کرتا۔

''کہاں بابا!'' وہ روٹھنے لگتی۔ ''مجھے تو صرف اتنا پتا ہے کہ ایک سفید پھول میں ایک شہزادی رہتی تھی۔ آگے کیا بابا!''

کہانی شروع ہو جاتی۔ میں لیمپ مدھم کر دیتا۔ کاغذوں کو ایک طرف دھکیل دیتا۔ قلم احتیاط سے قلم دان میں رکھ دیتا۔ پہلے کی بات ہے۔ دُور کسی ملک میں ایک صاف ستھرے پانی کے تالاب میں ایک کنول کا پھول کھلا۔ اس کی ننھی ننھی پتیوں پر شبنم کے قطرے تھے جو سورج کی پہلی کرنوں میں ہیروں کی طرح چمکتے تھے۔''

''ہیرے کیا ہوتے ہیں بابا؟'' بینا پوچھتی۔

''ارے بھئی' وہی چمکیلے پتھر جس میں سے روشنی نکلتی ہے جنہیں اندھیرے میں رکھنے سے روشنی ہوتی ہے۔ تمہیں کل ہی تو بتایا تھا۔''

''نہیں بابا ہر بات روز سُنایا کیجیے۔'' وہ اسی طرح جواب دیتی۔

''اچھا تو پھول کی پتیوں پر سورج کی کرنیں ہیرے کی طرح چمکتی تھیں۔ جب پھول ذرا بڑا ہو گیا تو اس میں ایک شہزادی آ بسی۔''

''کیسی شہزادی تھی وہ بابا؟''

''بڑی خوبصورت بینا' لمبی چوٹی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی۔''

''ناگن کاٹتی ہے بابا' بڑے زور سے کاٹتی ہے۔ بابا۔'' اور مجھے شوبھا بینرجی یاد آ جاتی ہے۔ سفید رنگ' بڑی بڑی آنکھیں۔

''بابا میری جیسی آنکھیں تھیں شہزادی کی؟ ہیں بابا؟''

''ہاں بینا تمہاری جیسی بڑی بڑی آنکھیں اور وہ اس گھر میں اکیلی رہتی تھی۔''

''مجھے تو بڑا ڈر لگے بابا اکیلے رہتے ہوئے۔''

''نہیں بینا شہزادیوں کو بالکل ڈر نہیں لگتا۔ لگنا نہیں چاہیے۔''

''تو پھر میں شہزادی نہیں ہوں بابا؟''

''تم بینا...... تم شہزادی نہیں ہو تم لڑکی ہو۔'' یہ کہانی بینا روز سنتی اور پھر مجھے ایک خیال آیا کہیں یہ بھی اس پہلی کنول کماری کی طرح شہزادی بننا نہ چاہے۔

تب میں نے کہانی بدل ڈالی تھی اور بینا نے کہانیوں میں دلچسپی لینا ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں نے کئی بار خود کہا ''بینا چلو تمہیں کہانی سناؤں بہت لمبی سی اچھی شہزادیوں کی کہانی۔''

بینا کہتی ''نہیں بابا ہم تو پڑھیں گے۔ ہمیں کہانیاں اچھی نہیں لگتیں۔'' میں ٹپٹا سا گیا تھا۔ آخر میری بیٹی ہو کر یہ کہانیوں میں کیوں نہ دلچسپی لے' بچے تو کہانیوں کے رسیا ہوتے ہیں اور یہ کہانی ہی نہیں سنتی۔ بینا کے روپ میں ایک کنول کو پھر سے جوان کر رہا تھا۔ بچی سے میری والہانہ محبت میری بیوی کو ہمیشہ کھلتی رہی ہے اور پھر جب بینا نے ذرا ہوش سنبھالا ہے تو میری بیوی نے اس میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ اس کا خیال کرنا بالکل بھلا دیا۔ حال یہ ہوتا کہ اس کے بالوں میں کنگھی نہیں ہے' اس کے کپڑے میلے ہیں مگر نروپما کو کبھی خیال نہ آیا۔ کئی بار اس نے مجھ سے اشارتاً کہا بھی کہ اور بچے بھی تو ہیں تم نہ جانے اس میں کیا دیکھتے ہو کہ ہر وقت اس کے گرد رہتے ہو۔ اسی کا مستقبل' اسی کی تعلیم تمہارے پیشِ نظر ہے۔ کیا باقی اولاد تمہاری نہیں ہے۔ کیا باقی بچوں کی زندگیوں سے تمہیں کوئی واسطہ نہیں ہے؟

میں مانتا ہوں قصور میرا تھا مگر میں دل کا کیا کرتا۔ میں نے ایک نئی کونپل کی طرح بینا کو حفاظت سے رکھا۔ پالا اور بڑا کیا تھا۔ مجھے دیوانگی کی حد تک اس سے محبت تھی۔ وہ اسکول سے واپس آتی تو میں اسے دیکھتا رہتا۔ جہاں جاتی میری نظریں اس کا تعاقب کرتی رہتیں۔ اسے دیکھ کر میرا چہرہ بھی کھل اٹھتا' اسے رنجیدہ دیکھ کر میرے چہرے پر مایوسی چھا جاتی۔ کبھی کبھار وہ کام کرتے میں نظریں اٹھا کر مجھے دیکھتی اور اپنی طرف دیکھتا ہوا پاتی تو ہنس دیتی۔ پھر بڑی ہونے تک اس کی ہنسی جھجک میں بدل گئی اور پھر وہ مجھ سے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

اس میں شعور کب پیدا ہوا' اس کی مجھے خبر نہیں مگر یوں ہوتا کہ میں کمرے میں منتظر ہوتا کہ وہ آئے گی اور چائے پئیں گے۔ اس کے انتظار میں چائے ٹھنڈی ہو جاتی مگر وہ چپکے سے ماں کے پاس اندر چلی جاتی۔ دیر کے بعد میں نوکر کو آواز دے کر پوچھتا بینا آئی ہے یا نہیں اور معلوم ہوتا

بینا کب کی اندر بیٹھی ہے۔ ماں کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹا رہی ہے۔

میں نروپما سے جا کر الجھ پڑتا کہ بینا کو کام میں کیوں لگا رہی ہے۔ وہ ابھی اسکول سے آئی ہے۔ نروپما نے بہت دنوں سے اس کے اور میرے معاملے میں دخل دینا چھوڑ دیا تھا۔ بینا خود ہی کہتی: ''بابا میں نے تو آپ ہی ماں سے یہ کام لے لیا تھا' آپ ناحق ناراض ہو رہے ہیں۔''

میں شرمندہ ہو جاتا۔ کمرے میں واپس آ جاتا اور بینا کا انتظار کرنے لگتا۔

وہ پھر بھی نہ آتی۔ چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو جاتی۔ بدمزہ ہو کر کسی ریستوران میں چائے پینے کے لیے چلا جاتا۔ مارا مارا سڑکوں پر پھرتا۔ دوستوں کے گھروں میں مجھے اتنی خوشی دکھائی دیتی کہ اپنے بدمزہ دل اور بے کیف روح کو لے کر وہاں بچوں کو دیکھ کر میرا دل گھبرا جاتا؟ ہنستے مسکراتے باتیں کرتے زندگی سے بھرپور بچے مجھے بہت پیارے لگتے اور پھر مجھے بینا یاد آ جاتی۔ اصل میں بینا سے رُوٹھ کر گھر سے باہر آتا تھا اور پھر مجھے یاد آتا کہ کنول کماری نے بھی تو ہمیشہ مجھ سے ایسا ہی سلوک کیا ہے بینا اور کنول میں مجھے خطرناک حد تک مشابہت نظر آنے لگی تھی۔

گڑیوں کے کھیل جو لڑکیوں کا محبوب مشغلہ ہے' اس کی طرف بینا نے کبھی دھیان نہیں دیا۔ جب اس نے سلائیاں پکڑنی سیکھی ہیں تو سب سے پہلے تینا کے لیے سوئٹر بنایا تھا۔

تینا ہماری نوکر شاموں کی بیٹی تھی۔ بڑی حسین شکل' چمکیلی آنکھیں اور پھرتیلی حد سے زیادہ کسی سے کوئی کام کہو' کہیں سے وہ نکل کر سامنے آ جاتی۔ سائے کی طرح ارد گرد یہاں کہیں موجود رہتی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا بینا کو آواز دیتا۔

''بینا بیٹی پانی تو دے جانا۔''

پانی لے کر تینا آتی۔ تینا مجھے اس لیے کبھی نہیں بھائی۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تینا نے سب سے پہلے بینا کے ہاتھ کا بنا ہوا سویٹر پہنا تھا۔ میری بیٹی کے ننھے ہاتھوں کا بُنا ہوا سویٹر پہن کر شاموں کی بیٹی تینا کتنی خوش تھی۔ اس دن بینا نے کہا تھا ''بابا آپ کے لیے بھی میں سویٹر بُنوں گی۔ تھوڑا سا اور سیکھ کر اچھا سا سوئٹر۔ آپ میرے ہاتھ کا بُنا ہوا پہنیں گے نا۔ کیوں بابا۔'' اور میں نے اپنے روٹھے ہوئے دل کو بڑے دنوں کے بعد منا کر کہا تھا۔ ''ہاں بینا تمہارے ہاتھ کا بُنا ہوا سویٹر پہنوں گا۔''

پھر آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا اور بینا کنول کے پھول کی طرح آہستہ آہستہ بڑی ہوتی گئی جیسے روشنی پانی کی لہروں پر لرزتی ہے۔ خوبصورتی اس کے چہرے پر کانپتی رہتی اور تب میں

نے یقین کر لیا کہ اپنی اس جاذبیت کے باوجود لڑکوں سے اور مردوں کی پوری جنس سے نفرت بھی اسے کنول کی طرح' دیوتاؤں کے عطیہ کی طرح ملی ہے۔ کنول کماری ٹھاکر کی طرح وہ بھی کسی مرد کو نہیں چاہے گی۔ وہ اس کا اپنا باپ' بھائی اور شوہر ہی کیوں نہ ہو۔

اور اس انکشاف کے بعد میں آج کی طرح ساری رات جاگتا اور کانپتا رہا۔ میری اپنی بیٹی' میری بینا قدرت مجھ سے کون سا انتقام لے رہی ہے۔ ایک عورت کو میں نے بھگوان کے روپ میں چاہا تھا' وہ مجھ سے بے پرواہ رہی اور دوسری دیوی میری اپنی بیٹی ہے جو مجھے مرد سمجھ کر میرے وجود سے نفرت کرتی ہے۔ اسے تینا سے' روی سے اور آس پاس گھروں کے نوکروں کی لڑکیوں سے محبت ہے۔ وہ ان کے کام کرتی ہے' اپنی چیزیں آنکھ بچا کر انہیں دے آتی ہے کیونکہ ایک دن نروپما نے بہت ہی تنگ آ کر مجھ سے کہا "تم اپنی بینا کو روکتے کیوں نہیں ہو' اپنے نئے جوتے اٹھا کر روی کو پہنا دیئے ہیں۔ میں نے لاکھ منع کیا ہے' رکتی ہی نہیں تھی۔ تمہاری بیٹی ہے نا۔ میں اسے کیا کہوں گی۔ تمہاری چہیتی کو۔"

نروپما کو کوئی ایسا موقع مل جاتا تو میرے بھولے ہوئے زخم کرید دیتی۔ مجھے بینا کے طعنے دیتی۔ اس کی ہر غلطی گویا میری غلطی اور اس کا ہر قصور میرا تھا۔

میں نے بینا کو بلایا تو آئی اور مجھ سے دور کھڑی ہو کر بولی "کیا کہنا ہے بابا مجھ سے؟"

"بینا میں نے سنا ہے تم ماں کی بات نہیں مانتی ہو۔ تم اسے تنگ کرتی ہو اور تم نے اپنے نئے جوتے اٹھا کر روی کو دے دیئے ہیں۔" "بابا۔" اس نے زخمی ناگن کی طرح غصے سے میری بات کا جواب دینے کے لیے سر اٹھایا۔ "میرے پاس تو کتنے ہی جوتے ہیں روی ننگے پاؤں گھومتی تھی۔ سردی میں اس کے پاؤں سُوج جاتے تھے۔ کیا ہوا جو میں نے اسے اپنے جوتے دے دیئے تو۔"

"بینا۔" میں نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "پھر ماں سے تو پوچھ لیا ہوتا۔ تم اس کی بات نہیں مانتی ہو تو اسے رنج ہوتا ہے۔ میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ تمہاری وجہ سے گھر میں جھگڑا ہو اور تمہاری ماں پریشان ہو۔"

"بہت اچھا بابا۔" اس کا مختصر سا جواب تھا اور وہ بغیر میری طرف دیکھے باہر چلی گئی۔

اور یوں بینا مجھ سے دور ہوتی گئی۔ وہ اب بھی میرے کمرے میں سوتی' میرے پاس بیٹھ کر اپنے اسکول کا کام کرتی مگر ایک رشتہ' الفت جو میں اپنے اور اس کے درمیان محسوس کرتا تھا' ٹوٹ سا گیا۔

وہ تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اس کی چوٹیاں لمبے موبافوں میں گُندھی کندھوں پر لٹکتی رہتیں۔ جیسے ایک پھول جلد جلد تیزی سے اپنی پتیوں کی روشنی کو سمیٹ کر مخملیں نرمی میں ڈھل رہا ہو۔ اسکول میں اس نے کتنے ہی انعام حاصل کیے۔ مباحثوں میں ہمیشہ اوّل رہی۔ کھیلوں کے ڈھیروں انعاموں سے اس کی الماری بھر گئی۔ ذہانت کا سب سے پہلا انعام اسے ملا مگر اس نے اور بچوں کی طرح کبھی فخر سے آ کر مجھ سے یہ نہیں کہا: "بابا آج میں نے یہ جیتا ہے۔" چپکے سے میری میز پر رکھ دیتی اور خود کام میں لگ جاتی۔ میں پوچھتا۔

"بینا یہ کیا ہے؟"

تو کہتی "آج ہی ملا ہے بابا۔ آپ کو دکھانے کے لیے لائی ہوں اسے۔"

ابھی اس نے ہائی اسکول بھی پاس نہیں کیا تھا کہ اسے ایک مضمون پر حکومت کے مقابلۂ مضامین میں تیسرا انعام ملا جس دن وہ سرٹیفکیٹ اور روپے اسے ملے ہیں میں بہت خوش تھا۔ سرٹیفکیٹ دیکھ کر میں نے آہستہ سے کہا: "بالکل اس کی طرح۔" بینا نے تیزی سے پوچھا: "کس کی طرح بابا۔ آپ کس کا ذکر کر رہے ہیں بابا؟"

میں خاموش ہو گیا۔

بولی "بتاتے کیوں نہیں ہیں بابا میں کس کی طرح ہوں؟"

میں اسے کیا بتاتا اس سے کیا کہتا' میں نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔

وہ میرے کندھے پر لٹک گئی اور کہنے لگی۔ "نہیں بابا میں تو پوچھ کر چھوڑوں گی۔" اس کا کندھے پر لٹکنا مجھے اس کے بچپن کی یاد دلا دیتا تھا۔ اس نے مجھ سے زور دے کر کوئی بات نہیں منوائی۔ جب بھی اسے کسی شے کی اشد ضرورت ہوتی' میرے کندھے سے لٹک جاتی اور تب تک نہ چھوڑتی جب تک میں اسے وعدہ نہ دیتا۔

"اچھا بینا۔" میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔

وہ اپنے دوپٹے کو سنبھال کر دونوں ہاتھوں کو پیچھے کیے کھڑی ہو گئی۔ "تو بتایئے۔"

میں نے کہا۔ "بینا یہ بات تمہارے پوچھنے کی نہیں۔"

وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھ کر کام کرنے لگی۔ اس نے مڑ کر میری طرف نہیں دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے پھر کہا: "بینا آؤ تمہیں بتائیں۔" وہ خوشی سے کاپی رکھ کر میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔ بولی "آپ کس کی بات کر رہے تھے؟" میں نے سوچ لیا تھا کہ بچی کے دل میں

بات نہ بتانے سے جو بدگمانی پیدا ہوگی اس کا واحد علاج یہی ہے کہ میں اسے کچھ نہ کچھ بتا دوں۔

''بھئی بینا!'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''ایک تھیں کنول کماری ٹھاکر جن کو میں جانتا تھا۔ وہ تمہاری طرح بہت اچھے مضمون لکھتی تھیں اور بولنے میں ان کا مقابلہ کوئی مرد بھی نہ کر پاتا تھا۔ تمہاری طرح کی تھیں بالکل۔'' میں اپنی دانست میں بہت کچھ بتا گیا تھا۔

کچھ راز ایسے ہوتے ہیں جن کو بتا کر دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور کچھ راز ایسے ہوتے ہیں جن کے بعد دل سُونا ویران اور اداس لگنے لگتا ہے۔ کنول کماری ٹھاکر کا نام بتا کر مجھے یوں معلوم ہوا کہ ایک طلسم تھا جو ٹوٹ گیا۔ ایک خواب تھا جس پر میں جاگتے ہوئے بھی یقین کرتا رہا تھا۔ اور اب بیداری میں اس خواب کے سائے بھی میرے دماغ سے مٹ گئے تھے۔ کنول اپنی ساڑھی کا پلو اپنے گرد لپیٹتی ہوئی باتیں کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے' اپنے لاپرواہ انداز کے ساتھ مجھے یاد آ رہی تھی۔

بینا نے پوچھا: ''تو کہاں ہیں وہ کنول کماری ٹھاکر بابا؟''

''مجھے معلوم نہیں بینا۔ وہ تو ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک گھومتی رہتی ہیں' جانے کہاں ہوں گی؟''

''آپ نے ان کو کب دیکھا تھا بابا؟''

''بہت دن ہوئے بینا جب تم ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔''

''وہ کیسی تھیں بابا؟'' بینا نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

''بہت اچھا بولتی تھیں' بہت اچھا لکھتی تھیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''نہیں بابا' میں پوچھتی ہوں ان کی شکل کیسی تھی؟''

''شکل۔'' میں چکرا گیا۔ ''تمہیں کیا لینا ہے اس کی شکل پوچھ کر۔''

''آپ بتائیے تو سہی۔'' اس نے زور دے کر پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''سفید تھیں' بہت سفید جیسے کنول کے پھول۔ آنکھیں بڑی بڑی ہوں گی۔ لمبا قد تھا۔ ناگن کی طرح سی سیاہ چوٹی تھی۔''

''چلتی کیسے تھیں بابا؟'' بینا مجھ سے ایک ایک بات پوچھ رہی تھی۔

''بھئی جیسے تم چلتی ہو جیسے میں چلتا ہوں جیسے ساری دنیا چلتی ہے۔'' میں نے بات ختم کرنے کی غرض سے جواب دیا۔

اس دن کے بعد بینا کو گویا ایک موضوع ہاتھ آ گیا۔ انعام لا کر میری میز پر رکھ دیتی۔ میں دیکھتا تو کہتی ''کیوں بابا یہ بھی اُن جیسا ہے نا میرا کام۔''

''کس جیسا؟'' میں انجان بن کر پوچھتا۔

''ان کی طرح کا۔ کنول کماری ٹھاکر کی طرح کا۔''

انجانے ہی کنول میری طرح بینا کے دل کی یاد بن گئی تھی۔ بینا اور میں پھر نزدیک ہونے لگے۔ میں نے سالوں کے بعد بینا سے اپنے دل کی ایسی باتیں کہہ دی تھیں جو اِن سالوں میں میرے دل میں جادو کے پھولوں کی طرح بند رہی تھیں۔ جب ان پھولوں کو ہوا دو تو وہ دوبارہ لہلہانے لگتے ہیں۔ ان میں سرخی نرمی ملائمت اور رنگ دوبارہ لوٹ آتا ہے۔ میرا دل انہی دنوں کی طرح یادوں سے گھائل ہونے لگا اور میں باتیں کرنے کے بعد اُداس ہو جاتا۔ بینا کے سو جانے کے بعد پہروں چھت کو تکتا رہتا۔ اندھیرے میں کڑیاں تک نظر نہ آتیں' بس میں ہوتا اور میرے گرد لامتناہی اندھیرا ہوتا۔ اندھیرے میں میرا دم گھٹنے لگتا اور بے معنی لایعنی خیالات اور ایسے ممکنات کا تصور دماغ کو زنجیروں میں جکڑ لیتا جن کی بظاہر کوئی توقع نہ تھی۔ کنول کو میں کھو چکا تھا۔ کنول میرے لیے کسی اور ہی دنیا کی باشندہ تھی۔ کنول کہاں ہو سکتی تھی' برسوں سے اس کا نام اخباروں میں نہیں سنا تھا۔ جانے وہ کہاں تھی اور کس حال میں تھی۔ جانے اس نے کبھی مجھ سے پگلے کا نام بھی یاد کیا ہو کہ نہ کیا ہو۔ میرا دل سکڑنے لگتا اور دوسری چارپائی پر میرے قریب بینا سوئی رہتی۔ اس کا نرم چلتا ہوا سانس مجھے اندھیرے میں روشنی بن کر چھت سے ٹکراتا محسوس ہوتا۔ رات کی سیاہی میں سے صورتیں نکل کر میرے قریب گھومنے لگتیں۔ سائے رینگتے اور کھڑکیوں کے شیشوں پر بنے ہوئے کنول کے سفید پھولوں کے درمیان سے ستارے جھانکتے۔ جیسے کنول کی سیاہیوں سے زندہ ہو ہو کر شراروں کی طرح آسمان کی وسعتوں میں پھیل رہے ہوں۔ بانجھ دھرتی کی کوکھ سے روپ سفیدی کی صورت میں نکلتا اور رات سناٹے کی تاریکی کے سہارے ہولے ہولے قدم رکھتی' میرے پھولوں کی کیاریوں پر سے گزرنے لگتی۔ وہ کنول کے پھولوں پر سے بھی گزرتی' کنول جو کسی تلیا سے باہر آئے ہیں۔ دھرتی کی تابنا کی جب پھولوں کے روپ میں ڈھل نہ سکی تو میرے مالی نے اسے ایک ننھے سے تالاب میں بدل دیا۔ اس تالاب میں ہر وقت پانی بھرا رہتا ہے جو سیاہ راتوں میں اور بھی سیاہ لگتا ہے اور اس اندھیارے پر کنول تیرتے رہتے ہیں۔ اس تاریکی سے کنول جھانکتے ہیں۔ کنول جو راتوں کو اور زیادہ روشن ہوتے ہیں اور ہوا کے جھونکوں سے

ہلکورے کھاتے پانی کے اندھیارے پر اُجالا بنے تیرتے ہی رہتے ہیں جیسے زندگی کی ممکنات افق کے قریب ابدیت کے اندھیرے سے چھو جاتی ہے۔ ایک نہ دکھائی دینے والی چھوٹی سی لکیر اندھیرے اجالے کو جدا کرتی ہے مگر روشنیاں رقصاں لرزاں اندھیرے کے دامن پر زندہ رہتی ہیں۔ کنول پانی کے اندھیرے پر، کیونکہ کائنات کا مظہر ابھی زندہ ہے۔

نہ جانے بینا نے کنول میں اتنا خیال کیوں لگا دیا تھا۔ وہ ہر کام کے بعد ملتجی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی اور کہتی ''کیوں بابا یہ بھی تو میں نے ان کی طرح کیا ہے نا؟''

اب ہمیں نام لینے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ میں سمجھ جاتا تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

کبھی کبھی میں سوچتا، میں آنکھ بند کر کے بنا سوچے بینا کی ہر بات کا جواب دینے کے لیے کہہ دیتا ہوں کہ ہاں یہ ایسا ہی ہے۔ کیا ہوا اگر بینا کسی زمانے میں زندگی کے کسی چکر میں شراروں کی طرح گردش کرتے انسانوں کے اس جمِ غفیر میں اگر کنول کو دیکھ پائے تو دل کہتا، تمہاری بینا اس سے بہتر ہے اچھی ہے، دماغ کہتا ہے وفا کے اصولوں کے خلاف ہے، تم کسی کو اس سے بڑھانے کا حق نہیں رکھتے، چاہے وہ تمہاری اپنی بیٹی ہی کیوں نہ ہو۔

پھر میں اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے اپنے سوالوں کے جواب خاموشی سے ڈھونڈتا، مجھے کبھی بھی کسی صورت میں بھی بینا اور کنول کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔

ان دنوں میں شدّت سے منہمک ہو کر پرانی ہندو تہذیب اور روایات پر ایک سیر حاصل بحث اور ایک ضخیم حاصل کتاب لکھ رہا تھا۔ ہمارے ہندو معاشرے کا بیشتر حصہ وہ بہادر رانیاں اور کماریاں ہیں جنہوں نے ملک کی حفاظت، قوم کی حفاظت اور سب سے بڑھ کر روایات کی حفاظت کی ہے۔ جنہوں نے ان کی خاطر اپنی جانیں لڑا دی ہیں اور جب رات کو لیٹتا تو میرے ذہن میں ایک ہی خیال آتا۔ کنول بھی تو کماری ہے۔ ان مہارانیوں اور کماریوں کی شہرت اس لیے ہم تک پہنچی کہ وہ اس مرتی مارتی دنیا کے ایک بہت اچھے دور میں پیدا ہوئیں۔ جب مردوں میں بھی آن تھی۔ جب ان میں بھی عورت کے لیے عزت کا جذبہ تھا۔ جب وہ بہن بیٹی اور بیوی میں تمیز کر سکتے تھے اور آج، آج بھی اسی طرح کنول کماری پیدا ہوتی ہے مگر مرد ایک سیٹھ کی صورت میں، حکومت کے ایک اعلیٰ رکن کی صورت میں دھوکہ دیتا ہے، اسے نیچا دکھانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ تھک کر کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ جاتی ہے اور اس طرح ایک ایسی کہانی جو دراصل بہادری کی کہانی ہے، ختم ہو جاتی ہے۔ میرا دل اتنے سالوں کے بعد پھر کنول کو دیکھنے کو چاہتا تھا کہ

ایک اصل راج کماری اِدھر اُدھر آس پاس کہیں موجود ہے۔ اس کی کہانی تو سب سے دلچسپ اور قابلِ توجہ ہوگی۔ کاش وہ مجھے مل جائے۔ کاش میں پھر اس کو پا سکوں مگر میں کاش تو یوں کہہ رہا ہوں جیسے میں ان سب سالوں اسے بُھلا رہا ہوں۔ وہ ہمیشہ میری یادوں پر خواب بن کر میرے گرد موجود رہتی ہے۔ ہاں بینا نے اس میں ایک نئی زندگی ڈال دی تھی۔ وہ میرا سانس بن گئی تھی۔

دن گزرتے گئے زندگی رینگ رہی تھی، چل رہی تھی اور اسی طرح بینا نے ہائی اسکول پاس کر لیا۔

نروپما میں اب انتظار کرنے کا حوصلہ نہ تھا اور اس نے میری رائے کا کوئی لحاظ نہ کرتے ہوئے بینا کو گھر پر بٹھا لیا۔ اس کے خیال میں وہ لڑکی کافی جوان ہو گئی تھی۔ اس کے خاندان میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے اب اور باہر پھرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ برادری میں ناک کٹ جائے گی، اس کا بھی کوئی خیال ہے۔ پچھلا زمانہ بھلا تھا کبھی کسی نے عورت کو گھر سے باہر نہیں نکالا تھا۔ کبھی لڑکیاں یوں دندناتی نہیں پھری تھیں۔ نروپما کی اپنی شادی چودہ برس کی عمر میں ہو گئی تھی۔ اس سے زیادہ اب اور پڑھنا بے کار کی بات ہے۔ بینا چاہے میری لاکھ لاڈلی ہو۔ آخر ماں کا بھی تو کوئی حق ہے اور یوں بینا کو گھر میں بٹھا لیا گیا۔

بینا نے اپنے طور پر لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ نروپما اور اس کی ماں، برادری کے لوگ ہر ایک سمجھا چکے تھے مگر میری بیٹی میری طرح بودی نہیں ضد کی پکی تھی۔ اس نے اس وقت تک کھانے سے انکار کیے رکھا، جب تک نروپما اس سے وعدہ نہ کر لے کہ وہ اسے کالج میں داخل کروا دے گی اور آخر کو نروپما کو ہار ہو گئی۔

جس دن میں اسے کالج داخل کروانے گیا ہوں، صبح بڑی سہانی تھی۔ میرا دل ایک انجانی خوشی سے بھرا ہوا تھا۔ ہوا کے جھونکے، خوشگوار اور بدن کو نرمی سے چھوتے ہوئے پاس سے گزر جاتے۔ آسمان سے سرُت دھوپ کے ساتھ پڑ رہی تھی۔ نیلاہٹ میں زندگی اور چمک میں ایک ابدیت لگتی تھی۔ میرے قدم اتنے ہلکے پھلکے پڑتے تھے۔ میرا دل گا رہا تھا۔ مجھے بُھولے ہوئے پرانے گیت یاد آ رہے تھے۔ ان کی دھنیں میرے ذہن میں دوبارہ ڈھل رہی تھیں۔ مجھ میں دس پندرہ برس پہلے کی طاقت اور تمنائیں لوٹ رہی تھیں۔ میں اس حیرت انگیز تبدیلی پر خود ہی حیران تھا اور پھر پہلو میں چلتی ہوئی بینا کو دیکھ کر میں سوچ رہا تھا، یہ میری بچی ہے اتنی تندرست، توانا اور دل و دماغ کی پختگی کے ساتھ

یہ بچی میری تھی؟ میں اس کا باپ تھا۔ میں نے اسے ایک بے کس اور بے حس گڑیا سے ایک دیوی کی طرح بڑھتے دیکھا تھا۔ اس پودے کو میں نے پالا تھا۔ یہ کنول کے ننھے پھول' پانی کی لہروں پر لرزنے والی روشنی کی طرح ایک کھلا ہوا خوبصورت پھول اور روشنی کی لہر بن گئی تھی۔

کالج آ گیا۔ میں نے چپڑاسی سے کہا۔ ''میں اپنی بیٹی کو داخل کروانے آیا ہوں اور مجھے پرنسپل سے ملنا ہے۔'' اس نے جواب دیا' ''پرنسپل صاحبہ مردوں سے نہیں ملتیں۔ آپ لڑکی کو اندر بھجوا دیں۔''

بینا اندر چلی گئی۔ میں دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ میرا خیال ہے پڑھی لکھی عورتیں مردوں سے اتنا ڈرتی جھجکتی اور دبتی نہیں ہیں اور پھر میں یونہی ملنے تو نہیں چلا آیا تھا۔ میں ذمہ دار باپ تھا اور اس میں کیا ہرج ہے اگر بینا کے ساتھ مجھے بھی پرنسپل کو دیکھنے کا موقع مل جائے۔ مجھے کنول بری طرح یاد آ رہی تھی۔ میرا دماغ الجھ رہا تھا۔ وہ بھی عورت تھی اس نے کبھی مردوں سے ایک ڈر اور خوف محسوس نہیں کیا۔ اس نے مردوں کو کبھی اتنی سی بھی اہمیت نہیں دی۔ نہ جانے یہ عورت پڑھ لکھ کر بھی جنسِ مخالف کی طاقت سے اتنا خوف کیوں کھاتی ہے۔ کنول کے چھوڑے ہوئے اثرات نے مجھے کچھ نرالا سا بنا دیا تھا۔ مجھے ان عورتوں سے یونہی کدر سا ہو جاتا جو مردوں کو اتنی اہمیت دیتی ہیں کہ ان سے ملنے سے انکار کر دیں' انہیں یہ احساس دلا دیں کہ وہ بھی کچھ ہیں۔ وہ بھی کوئی حقیقت رکھتے ہیں۔ وہ ایک اعلیٰ' الگ اور افضل مخلوق ہیں۔ وہ دیوتاؤں کی اولاد اور عورت پر حکومت کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ میں مرد ہو کر ایسی باتیں سوچ رہا ہوں مگر میں تو ان وقتوں کی باتیں کر رہا ہوں جب میں بینا کو کالج میں داخل کروانے گیا تھا۔

پھر چپڑاسی مجھے بلانے آیا۔ میں حیران تھا۔ میری باریابی کا کیا موقع تھا' میں کیوں طلب کیا گیا تھا۔

چلمن اٹھا کر اندر قدم رکھتے ہی تو چمکیلی میز کے دوسری طرف کنول کماری ٹھاکر کو دیکھ کر میرا قدم وہیں کا وہیں رہ گیا۔ میرا دل اتنے زور سے دھڑکا کہ مجھے اندیشہ ہوا شاید رک جائے گا۔ میری آنکھوں کے آگے دھندی چھا گئی۔ مجھے جو دکھائی دیا وہ ایک خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ اتنے سالوں کے فاصلے سے کنول کماری پرنسپل بنی اس چمکیلی میز کے دوسری طرف اپنی اس مخصوص مسکراہٹ سے نہیں بیٹھ سکتی۔ یہ میری نظر کا دھوکا تھا مگر یہ کنول کماری ٹھاکر سے میری تیسری ملاقات تھی۔

کنول نے اسی طرح جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو' جیسے پندرہ سال پہلے اس نے ایک بڑا بچہ سمجھ کر مجھے جھڑک نہ دیا ہو' کہا' ''اچھا تو بینا آپ کی لڑکی ہے۔''

مجھے اس کی وہ ہنسی یاد ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنا والہانہ انداز یاد ہے' جب میں نے جھک کر اس کے قدم چھونے چاہے تھے اور اس نے ایک دیوی کی سی آن بان اور ایک بڑی بہن کے سے وقار سے اپنے قدم سمیٹ کر مجھ سے کہا تھا' ''کیا کرتے ہیں آپ۔ بیٹھ جائیے یہاں سے آپ قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ ابھی آپ کو بہت کچھ سیکھنا ہے۔''

اور میں نے جواب دیا تھا۔ ''آپ مانیے یا نہ مانیے۔ میں نے جو دل آپ کی بھینٹ چڑھایا ہے وہ پاکیزہ' سچا اور معصوم ہے۔''

اس نے کہا تھا: ''پاکیزہ ہے' سچا ہے' معصوم ہے' مگر ایماندار نہیں۔''

پھر میں چلا آیا تھا۔ میں سچ مچ ایماندار نہیں تھا۔ میں نے کنول کے خوابوں میں شرکت تو ضرور کی تھی مگر ہمیشہ آخر میں میرا ایک مقصد رہا تھا' کنول کی ذات میرا مطمعِ نظر رہی تھی۔ میں نے واقعی ایمانداری سے کام نہیں لیا تھا۔

کنول نے اس چمکیلی میز کے دوسری طرف بیٹھے ہوئے پھر سوال کیا۔

''بینا آپ کی لڑکی ہے؟'' اس سوال میں چھپا ہوا پھر ایمانداری کا وہی سوال تھا۔ میں یقیناً ایماندار نہیں تھا۔ میں نے زندگی کا سودا اپنی ساری محبت کنول کی بھینٹ چڑھا کر ایک اور عورت سے کر لیا تھا۔ وہ عورت جو بینا کی ماں تھی میرے گھر کی مالک تھی جو میری زندگی میں شریک تھی مگر میرے خوابوں کی راہ اس کی راہ سے الگ تھی جو میرے لیے اندھیرے کی اس دنیا میں رہتی تھی جہاں میرے دماغ کی روشنی کا گزر نہیں ہو سکتا تھا اور بہت سے لوگوں کی طرح میں نے ایک صاحب نصیب ایک حاشیہ نشین چن لیا تھا۔

''جی ہاں۔'' میں نے بہت مشکل سے جواب دیا۔

''آپ اسے اتنی دیر سے داخل کروانے کیسے لے آئے۔ داخلے کے دن کب کے گزر چکے ہیں۔ میں اس کو رکھ لیتی ہوں مگر اس شرط پر کہ اگر رجسٹرار کی طرف سے اجازت مل گئی تو آپ خود بھی کوشش کر دیکھیے۔ جتنی جلدی ممکن ہو یہ کام ہونا چاہیے۔''

وہ کاغذوں پر دستخط کرنے میں مصروف ہو گئی۔ بینا کو اندر بھجوا دیا گیا۔

میں جانے کے لیے اٹھا تو کنول نے کہا' ''آج شام کو چائے میرے ساتھ پیجئے' میں

یہیں رہتی ہوں۔" اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ وہ بدستور سر جھکائے اپنا کام کرتی رہی۔ میں چلمن اٹھا کر باہر نکل آیا۔

دھوپ کا سنہرا پن پھولوں کے رنگوں اور پودوں کی نرم ڈالیوں پر چمک بن کر سمٹ آیا تھا۔ ہوا سبز درختوں کو جھکاتی سایوں کے زاویوں کو گھٹاتی بڑھاتی سبک روی سے ہریالی پر لہرا رہی تھی۔ بیلوں سے لٹکے ہوئے پھول چاندی کی گھنٹیوں کی طرح آہستہ آہستہ ڈول رہے تھے۔ برآمدے کے ستون سے لپٹی عشق پیچاں کی بیل میں ناگن کی سی دلآویزی اور سحر تھا۔ سرخ بجری میں گہرا رنگ اور غبار میں ایک خوشبو تھی اور ان سب چیزوں کے اوپر جھکا ہوا نیلا آسمان اور نیچے جھک آیا تھا جیسے اُفق کہیں نزدیک ہو' آسمان زمین سے مل رہا تھا۔ زمین کی سوندھی باس شہد آ گئیں سانس کی مدہوش کن جاذبیت کی طرح سکوت میں تحلیل ہوتی ہوئی اردگرد پرواز کر رہی تھی' کیاریوں میں پانی چمکتا چھپتا جذب ہو رہا تھا' ننھی خوبصورت تتلیاں مٹھاس سے مدہوش ہو کر ہولے ہولے پھولوں پر اڑ رہی تھیں۔ ایک بے نام اور نامعلوم سی بھنبھناہٹ سے فضا پُر تھی۔ دنیا ایک دم اتنی جاذبِ نظر اور قابلِ پرستش جگہ بن گئی تھی۔ ساری دنیا ایک مندر کی طرح مقدس لگنے لگی تھی اور میں اپنے آپ کو ایک ایسی روح کی طرح محسوس کر رہا تھا جو زمانے کی تہوں کے نیچے سے نکل کر اپنے مسکن کو ایک نظر دیکھنے کے لیے چلی آئی ہو۔ کنول کماری ٹھاکر نے مجھ سے پوچھا تھا۔ "بینا آپ کی لڑکی ہے؟"

اور پھر دوسری بات کہی تھی۔ "آج شام کو چائے میرے پاس پیجئے۔"

شام کو آنا اپنے وقت پر ہوا۔ وقت بڑی آہستگی سے گزرا۔ قدرت کو کسی کے دل کی دنیا اور جذبات سے کیا غرض ہے۔ قدرت تو ایک پُرغرور ملکہ کی طرح اپنے سونے کے بجرے پر لیٹی ہواؤں' گیتوں' روشنیوں' خوشبوؤں' بہاروں' خوبصورتیوں سے گھری نیل کی سطح پر سیر کرتی رہتی ہے اور اس کے گرد سازوں کے چھپے ہوئے نغمے جوان غلاموں کی طرح ہاتھ باندھے' آنکھیں جھکائے کھڑے رہتے ہیں۔ مسکراہٹیں اس پر اپنا سایہ کیے رہتی ہیں' لہروں کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ سنہرے بادلوں کے رنگ اپنے پرتو سے اس کا حسن نکھارتے ہیں۔ ملکہ کی نگاہیں آسمان کی بلندیوں اور زمین کی پستیوں میں لاپرواہی سے پھرتی ہیں اسے میرے تمہارے کسی کے ارادوں' دھڑکنوں سے کیا غرض۔

کنول میری منتظر تھی۔ لان میں سیاہ کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک میز پر کیرم بورڈ رکھا تھا۔

برساتیں اپنی خوشگوار سی نمی کو پیچھے چھوڑ گئی تھیں۔ فضا میں سردی کا احساس نہیں تھا۔ ہوا میں بہار کی سی نرمی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی بولی: "آیئے آیئے آپ وقت پر آ پہنچے ہیں۔"

میں کچھ جھجکتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں جھکی جاتی تھیں۔

بولی: "آپ بینا کو کیوں ساتھ نہیں لائے۔ بڑی سمجھ دار بچی ہے آپ کی۔ میں نے جب آپ سے کہا تھا تو میرا مطلب تھا وہ بھی آئے گی۔"

پہلے وقت لوٹ آئے تھے۔ میری زبان پر گنگ تھی۔ میں جواب کیا دیتا' صرف اتنا کہا۔

"آپ مجھے بتا دیتیں تو میں بینا کو بھی ساتھ ہی لے آتا۔"

ہنس کر کہنے لگی "آئندہ احتیاط کیجئے۔"

میں نے کہا: "احتیاط کی خاص ضرورت ہے۔"

بولی "احتیاط سے آپ کیا سمجھے؟"

میں ہنس کر خاموش ہو رہا۔

پھر برآمدے میں کسی نے آ کر جھانکا۔ کنول نے کہا "نیرا مہمان آ چکے' چائے لے آؤ۔" نیرا ابھی تک کنول کے ساتھ تھی۔ میرا دل یونہی دھڑک رہا تھا۔ پگلا ہے نا۔ کبھی کبھی تو یونہی دھڑکتا ہے۔

یہ سوچ کر آیا تھا کہ کنول کہے گی تم نے شادی کر ہی ڈالی تو یہ حقیقتاً شکایت کا پہلو ہو گا' مگر وہ تو کنول تھی' پوچھنے لگی۔

"بینا کے علاوہ باقی بچے کون کون سی جماعتوں میں پڑھتے ہیں۔ ذہین ہیں یا نہیں۔ ان کو کیسی کہانیاں پسند ہیں۔ کون سے کھیل پسند ہیں؟" ان کا خیال تھا میں بچوں کے موضوع پر اس سے خوب کُھل کر باتیں کروں گا۔ سوالوں کے جواب ضروری سمجھ کر میں مختصراً اسے بتاتا گیا۔ بچوں کی خوبصورت اور رنگوں سے باتیں پھولوں کی طرف چل نکلیں جو اس کا محبوب ترین موضوع تھا۔ کہنے لگی: "مالی بابا اب بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ میں نے نیا مالی رکھا تو ہے مگر کام سب بابا کی ہدایت کے مطابق کیا جاتا ہے۔ میں ہر چند کوشش کرتی ہوں مگر وہ آرام سے نہیں بیٹھتا۔ وہ کہتا ہے جس دن میں بیٹھ کر صرف بتانے کا کام کرنے لگا میں مر جاؤں گا۔ میرے ہاتھوں میں س وقت تک طاقت رہے گی جب تک میں ان کو استعمال کرتا رہوں گا۔ سیڑھی اٹھائے کبھی درختوں کی نگرانی کرتا

اور مردہ شاخوں کو کاٹتا پھرتا ہے، کبھی نئے بیجوں کو زمین میں دباتا اور نئی نئی کیاریاں بناتا ہے۔"

اتنے میں مالی بابا ادھر سے گزرا۔ مجھے دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتا ہوا آگے چلا گیا۔

میں نے کہا: "شاید پہچانا نہیں اس نے مجھے۔"

کنول کہنے لگی: "نہیں پہچان تو اس نے ضرور لیا ہے مگر کام ختم کرنے کے بعد واپس آئے گا۔"

اور چند منٹوں کے بعد وہ میرے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا: "بابا کیسے رہے اتنے سالوں؟"

بولا: "سال تو گزرتے معلوم نہیں دیتے، البتہ درختوں کی دیکھ بھال میں چھ ماہ گزر گئے ہیں مگر ان پر وہ جوبن ہی نہیں آ چکتا جس کا میں منتظر ہوں۔"

میں نے کہا: "اس سے پہلے کہاں تھے؟"

حیران ہو کر بولا: "چھ ماہ پہلے میں پرانے گھر میں تھا۔ جب بی بی آئیں تو ادھر چلا آیا"

اور یوں مجھے معلوم ہوا کہ کنول کو کالج میں آئے صرف چھ ماہ ہوئے تھے۔ اس سارے عرصے میں وہ کہاں رہی، اس کا جواب پوچھنے کے لیے میں تیار نہ تھا۔

پھر چائے آ گئی۔ ان پندرہ سالوں میں نیرا کے چہرے پر الہڑپن کی جگہ سنجیدگی نے لے لی تھی۔ بس اتنا ہی فرق ہوا تھا۔ وہی نمکین چہرہ، وہی آنکھیں چال میں کوئی فرق نہیں۔

کنول نے پرانے دنوں کی طرح چائے بنائی اور پیالہ میری طرف بڑھا دیا۔ وہی پرانی خوشبو بھاپ بن کر چائے سے اٹھ رہی تھی۔

میں چائے کی بھاپ کے پردے میں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بالوں کی سیاہی میں پرانی چمک، ہنسی میں پرانی مٹھاس، مسکراہٹ میں وہی انداز اور زندگی، باتوں میں تازگی۔ مجھے لگ رہا تھا پندرہ برس پندرہ لمحوں کی طرح میرے اور اس کے درمیان حائل ہیں۔ پندرہ لمحے جیسے میں نے چائے کی پیالی پیتے پیتے ایک جھپکی سی لی ہو اور جاگا ہوں تو کنول سامنے موجود تھی۔ بس ایک بات تھی جو تبدیلی ظاہر کرتی تھی۔ معصومیت کی جگہ تجربے کی سختی نے جگہ لے لی تھی مگر یوں کہ دونوں مل کر چہرے پر ایک نرالا نور بن گئے تھے۔ ایک ایسی روشنی جو اندھیرے کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتی اور ہر اُجالے کو چمکانے میں مدد دیتی ہے اور وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے سوچا میں روشنی کو اپنانے کی کوشش کرتا رہا تھا، میں کنول کے پاؤں کی خاک بھی نہیں تھا۔ میں زمین کی سیاہی اور وہ

آکاش کی روشنی تھی۔ روشنی اور تاریکی ملتے ضرور ہیں مگر ایک لکیر ان دونوں کو الگ رکھتی ہے اور میں وہ لکیر تھا۔ اسے مجھ سے الگ رہنے پر ہی اپنی ہستی کو قائم رکھنا تھا۔ اگر کنول ان دنوں مجھے قبول کر لیتی تو نروپما کی طرح آج وہ بھی بچوں کے گھیرے میں گھبرائی ہوئی پریشان حال ماں ہوتی جسے دن کے کسی لمحے بھی گھر اور خیالوں سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ جسے چین کی نیند بھی کبھی نصیب نہیں ہوتی، جسے اپنے متعلق سوچنے کا موقع ہی کبھی نہیں ملتا۔

نروپما ہندوستانی عورت ہے جس کے لیے پتی دیوتا ہے، گھر سورگ ہے اور اس کے نزدیک باہر کی دنیا کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ جب تک اس کا پتی خوش ہے، سہاگ کے پھولوں کی تازگی اور باس دیوتا کے دماغ کو معطر رکھتی ہے، سورگ قائم ہے۔ اگر پھول مرجھا گئے تو دیوتا روٹھ گئے، سورگ نرک بن گیا۔ زندگی پھر بھی اپنی ڈگر پر چلے گی، صرف یہ فرق ہوگا کہ سہاگن اپنے آپ کو کبھی کبھی ابھاگن کہہ لے گی۔ کبھی فرصت ملنے پر رو لے گی، مگر بچوں کے فکر اُن کے دھندے میل جول برادری اسے کب اتنا وقت دے سکتے ہیں کہ وہ اس بات پر غور کرے۔ دیوتا رُوٹھیں چاہے نہیں، پجارن تو پھول چڑھاتی رہے گی، مسکراہٹوں کے یا آنسوؤں کے دیپ جلتے رہیں گے مسکراہٹوں کے یا آنکھوں کے۔ جوت میں تیل چاہے پریم کا ہو چاہے من کی کُڑھن کا اور دونوں کو تو بہرحال گزرنا ہے گزر جاتے ہیں۔ میں نروپما سے ناراض کبھی نہیں ہوا۔ پھر میں نے اسے سورگ کی اپسرا بھی نہیں سمجھا۔ وہ جو کچھ میرے لیے کرتی ہے، اس میں زیادہ اس نام کی لاج کی خاطر کرتی ہے جو سماج نے اسے دیا ہے۔ میں نے کبھی بھی اس سے اس کے دل کی بات نہیں پوچھی۔ اس نے کبھی نہیں بتائی اور یوں دن گزرتے جا رہے ہیں۔ نروپما بھی ہندوستان کی عورت ہے اور کنول کماری ٹھاکر بھی، مشرق کی اس زندگی کی تصویریں ہیں جس میں عورت کو حیا کی پتلی، مُروّت کی مورتی اور نہ جانے کیا کچھ کہا گیا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دونوں ایک تصویر کے دو پہلو ہیں۔ نہ جانے کون سا پہلو زیادہ اثر کرنے والا اور زیادہ قابلِ رشک ہے یہ تو دیکھنے والے کی نظر ہے اپنی اپنی پسند ہے، اپنا اپنا خیال ہے۔

چائے ختم ہوگئی۔ نیرا برتن اٹھانے آئی اور کنول نے کیرم بورڈ سامنے رکھ دیا۔

میں نے کہا "اتنے عرصے میں کھیل آپ کے لیے پرانا نہیں ہوا۔"

ہنس کر بولی "کھیل پرانا کیسے ہو سکتا ہے۔ تازگی، جدت اور دلچسپی یہ تینوں چیزیں پرانی سے پرانی چیز کو زندہ رکھتی ہیں اور یہ تینوں موجود ہیں۔" میں نے کہا "کیسے؟"

"کیسے۔ تو کیا آپ کیرم نہیں کھیلیں گے؟"

کھیلوں گا تو ضرور پر ان پندرہ سالوں کے عرصے میں کئی اور نئے کھیل نکل آئے ہیں۔ تاش ہے' معزز سوسائٹی کی عورتیں تو آج کل تاش میں' نئے قسم کے کھیلوں میں زیادہ لگی رہتی ہیں۔ آپ ابھی تک پرانی ڈگر پر چل رہی ہیں۔"

بڑی متانت سے بولی "میں پندرہ سال پہلے کی عورت ہوں اور رواج بھی پرانے ہیں۔ مجھ میں بنیادی طور پر کوئی شے نہیں بدلی' پھر میرے لیے یہ کھیل کیسے پرانا ہو سکتا ہے۔ ہر روز وہی جینا وہی جاگنا ہوتا ہے۔ سورج چاند تو لاتعداد صدیوں پہلے کے بنائے ہیں۔ کیا یہ پرانے نہیں ہو رہے؟"

"آپ کی منطق کے سامنے میری کیا چلے گی' آیئے کھیلیں۔"

"مجھے معلوم ہے جب آپ عورت کو منطقی سمجھ کر اس کے سامنے خاموش ہوتے ہیں تو دراصل اسے اس دنیا سے دور دھکیلنا چاہتے ہیں یا اسے کوئی اور شے سمجھتے ہیں۔ یہ تو روزمرہ کی باتیں ہیں' کوئی گہرا فلسفہ نہیں ہے۔ اسے آپ نے منطق کیوں کہا۔" وہ بورڈ پر ترتیب سے گوٹیں لگا رہی تھی۔ سرخ ملکہ کو درمیان میں رکھ رہی تھی۔

میں نے کہا: "کون پہلے شروع کرے گا میں یا آپ؟ آیئے پہلے ٹاس کر لیں۔"

کہنے لگی "میاں میرے ساتھ کھیل میں نئی باتیں نہیں چلیں گی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی مہمان ہونے کی حیثیت سے کھیل کو پہلے آپ شروع کیجیے۔ کھٹ کھٹ گوٹیں اِدھر اُدھر چاروں کونوں میں ڈبکی ہوئی' مہرے کی چوٹوں کے ساتھ جال میں کود رہی تھیں۔ ملکہ بھی اپنی جگہ سے کبھی اِدھر کبھی اُدھر جا رہی تھی۔ میں مصروف تھا' اپنا پورا دھیان لگا کر میں کھیل رہا تھا۔ کنول لاپرواہی سے بیٹھی مہرے کو اپنی سفید سفید انگلیوں سے دھکیل رہی تھی۔ سفید گوٹیں اس کی تھیں اور سیاہ میری اور سیاہی ننھے دھبوں کی طرح بورڈ پر کہیں کہیں نظر آتی تھیں۔ سفید گوٹیں ابھی تک پھیلی ہوئی تھیں اور پھر میری آخری گوٹ بھی غائب ہو گئی۔ میں نے ملکہ کو جیتنے کی کوشش کی۔ آج میں اس بات سے لاپرواہ تھا کہ وہ جیتے۔ آج جانے کیوں میں جیتنا چاہتا تھا۔ کنول بڑے تیقن اور ٹھہراؤ سے گوٹوں میں نظریں لگائے بیٹھی تھی۔ میں صرف ملکہ کے لیے کوشش کر رہا تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے سفید گوٹیں اور اس کے بعد ملکہ بھی کنول کے حصے میں آ گئی۔ میں پژمردہ سا ہو گیا۔

کہنے لگی "کیا ہارنے سے جی اداس ہو گیا ہے؟"

میں خاموش رہا۔

بولی "آپ ہی تو کہا کرتے تھے کہ ہار جیت ہے اور جیت ہار ہے۔"

مجھے بہت دنوں پہلے کی کہی ہوئی اپنی ایک بات یاد آ گئی۔ سالوں پہلے کی بات جب کنول ہارنے اور مہمان کو جیتنے دینے میں بڑی خوبی سمجھتی تھی۔

میں نے کہا: "ہار جیت تو قسمت کی بات ہے۔ انسان کوشش کرتا ہے کوشش اور کامیابی تو بڑی دور دراز اور الگ چیزیں ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جو کوشش کرے وہ ضرور کامیاب ہو گا۔"

کہنے لگی' ہم سب اسی سہارے زندہ ہیں کہ کوشش کریں گے تو کامیاب ہوں گے۔ اگر آخر میں اتنا سا سہارا بھی نہ ہو تو اندھی امیدوں اور تاریک راہوں کے یقین پر کون چلتا رہتا ہے۔ کامیابی کی روشنی جو انجام پر ملے گی' سب اسی کے لیے چلتے ہیں۔"

میں نے کہا: "آپ جن راہوں پر چل رہی ہیں وہاں روشنی ہے کیا؟"

کہنے لگی: "کچھ کہہ نہیں سکتی۔ دکھائی تو نہیں دیتا سجھائی تو کچھ نہیں دیتا' صرف امید کا سہارا ہے۔"

شام کی سرخیاں درختوں میں سے جھانک رہی تھیں۔ آسمان پر بادلوں میں آگ لگی تھی اور شعلوں سے مغرب لالہ زار بن گیا تھا۔ پرندوں کے بسیرا کرنے سے ایک شور فضا کے سکوت میں مل گیا تھا اور پھر دوسری طرف سے ایک گھنٹی کی تیز اور آہستہ پڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔ کنول کہنے لگی "اب تو مجھے کام ہو گا۔"

میں جانے کے لیے اٹھا بولی "ٹھہریئے میں آپ کو کچھ دیتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اندر چلی گئی اور پھر برآمدے کی سیڑھی پر کھڑے ہو کر بولی "یہ کاغذات ہیں آپ ان کو پڑھ لیجیے گا" اور پھر بغیر میری طرف دیکھے واپس چلی گئی۔

روشنی مدھم ہو چلی تھی' میری چھتری کا وہ سرا جس پر لوہا منڈھا ہوا تھا' سڑک پر کھٹ کھٹ کی ایک ہنگم صدا پیدا کر رہا تھا۔ اپنے کاروانوں سے پیچھے چھٹے ہوئے پرندے تیزی اور خاموشی سے میرے سر پر اڑتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی کوا تیزی سے کائیں کر کے غوطہ سا لگاتا اور پھر اور زیادہ تیزی سے اُڑنے لگتا۔ ننھی ننھی چڑیاں گیندوں کی طرح لڑھکتی خاموش گھروں کو جا رہی تھیں۔ زمین سے کافی بلندی پر ایک نیلی دھند اور دھول فضا میں لہرا رہی تھی۔ دور تک پھیلے ہوئے

کھیتوں پر سکوت بیٹھا ہوا معلوم دیتا تھا۔ درختوں کی ڈالیوں میں کسی پرندے کے بیٹھنے سے ہی ہلکی سی جنبش ہوتی تھی۔ پتے شاخوں پر سر جھکائے ہوئے لیٹے تھے۔ دن بھر کا غبار زمین پر جمع ہو رہا تھا۔ سڑک کے ساتھ ساتھ بہتی ندی میں پانی کے ننھے بھنور بھی کم ہو گئے تھے اور لہریں سونے لگی تھیں۔ بہاؤ میں بادلوں کی سرخی کا عکس ابھی تک لرز رہا تھا۔ کہیں کہیں کسی گہرے سرخ بادل کا سایہ ایک شمع کی طرح لہر کے ننھے سے کٹاؤ میں دیئے کی لو کی طرح چمکتا اور پھر تھرتھرا کر بجھ سا جاتا۔ زرد پتے بہے چلے جاتے تھے۔ بے بس کشتیوں کی طرح درختوں کی ٹوٹی ہوئی شاخیں انہیں بہائے لیے جا رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے ٹڈے اپنے پروں سے جال سا بنتے ہوئے تیز تیز ٹانگیں چلاتے کنارے کی گھاس کے ساتھ لیٹ جاتے۔ مسلسل چر چر کی آواز یہ یاد دلا رہی تھی کہ رات آ گئی ہے۔ ایک اور دن، زندگی کا ایک خوبصورت دن ختم ہو گیا ہے۔ یہ دن میرے لیے ماضی کو واپس لایا تھا۔ جانے ان کاغذات میں جو کنول کماری نے دیئے تھے کیا تھا، گھر جا کر شمع کی روشنی میں ہی ان کا مطالعہ کر سکتا تھا اور پھر میں نے جیب کو ہاتھ لگا کر دوبارہ ان کو ٹٹولا۔ وہ وہیں پر تھے۔ چھڑی ہلاتا ہوا جب میں گھر میں گھسا ہوں تو دروازے پر بینا ملی۔ بولی: ''ہم کب سے آپ کی راہ دیکھ رہے تھے، کدھر چلے گئے تھے آپ دنیا بوا آئی ہوئی ہیں؟''

''دنیا کب آئی ہے؟'' میں نے یونہی پوچھ لیا۔

''آپ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد۔ آپ کہاں سے آئے ہیں بابا اور جیب میں یہ کیا ہے؟''

میں نے کہا ''جیب میں کچھ نہیں کاغذات ہیں۔ میں ایک پرانے دوست سے مل کر آ رہا ہوں اور ہاں بھئی، ہمیں مٹھائی نہ کھلاؤ گی تم تو آج کالج میں داخل ہو گئیں نا۔''

باتیں کرتے ہم آنگن میں پہنچ چکے تھے۔ دنیا دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ تقریباً پانچ سال بعد مجھ سے ملی تھی۔ کتنی کمزور ہو گئی تھی، میں نے تو اسے پہچانا بھی نہیں تھا۔ زرد اور کمزور میرا دل بھر آیا۔ یہ وہی بہن تھی جس کو رام دلارے نے کندھوں پر بٹھایا تھا۔ میری اکلوتی بہن، ماں کے مرنے کے بعد سے میں نے اسے آج دیکھا تھا۔ دنیا میرے کندھے سے لگی رو رہی تھی۔ جانے اسے کیا دکھ تھا۔ اس کی سسکیاں مجھے بے تاب کر رہی تھیں۔ میری دنیا۔

دنیا کا نام ہماری دادی اماں نے رکھا تھا۔ دنیا کرشن بھگوان کی بانسری دنیا یعنی مدھر

تانوں کو دل میں چھپائے رکھنے والی بھگوان کے پوتر اور زندگی بخش ہونٹوں کو چھونے والی دنیا۔

دادی ماں کی بہت لاڈلی تھی۔ جب سے اس نے پاؤں چلنا سیکھا تھا، اس کی آنکھوں نے بُرے بھلے کی پہچان شروع کی تھی۔ وہ بڑی ماں کے ساتھ روز مورتی کے چرنوں میں پھول چڑھاتی اور ننھے ننھے ہاتھوں سے مندر کی سیڑھیوں کو دھوتی تھی۔ ماں بڑی دھرماتما اور بھگوان کی سچی بھگت تھی۔ اسے دنیا سے کوئی اتنا لمبا چوڑا علاقہ نہیں تھا۔ گھر کے کسی کام میں اس نے کبھی دخل نہیں دیا۔ بڑی سی مالا لئے ہوئے جاپ کرتی تھی اور گھر کی پرانی بالکنی میں بیٹھی آنکھیں بند کیے بھگوان کے نام کا سمرن کرتی تھی۔ ماں کو میں نے سفید بے داغ ساڑھی کے علاوہ کبھی کوئی رنگین کپڑا پہنتے نہیں دیکھا۔ وہ ہماری ماں سے بولتی بھی بہت کم تھی اور اگر یہ کہا جائے کہ کبھی بولی ہی نہیں تو ٹھیک ہوگا۔ میں اوپر چلا جاتا۔ ماں کے گرد اپنے کھلونے پھیلائے کھیلتا رہتا مگر ماں مجھے کبھی منع نہ کرتی۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر اپنی مالا کو ٹھہرا کر کبھی مجھ سے یہ کہتی ''جاؤ یہاں شور نہ کرو'' اس کے لیے تو میں گویا ایک مٹی کی مورت تھا جس میں جان نہیں تھی۔ کبھی میں یونہی کھڑا اسے دیکھتا رہتا۔ اس کے صرف ہونٹ ہلتے تھے۔ سفید بڑی سی مورتی جس کی آنکھوں کی پلکیں کبھی کبھی حرکت کرتی تھیں اور ہونٹ متواتر ہلتے رہتے اور نیچے آ کر میں اپنی ماں سے پوچھتا۔ ''بڑی ماں بولتی کیوں نہیں، بڑی ماں آنکھیں کیوں نہیں کھولتی؟''

اور ماں جواب دیتی۔ ''تم اوپر جا کر بڑی ماں کو تنگ مت کیا کرو، وہ پوجا کرتی ہیں۔''

میں نے ہولے ہولے اوپر جانا اور دادی ماں کی بند آنکھوں اور ہلتے ہونٹوں میں کوئی دلچسپی لینا چھوڑ دیا اور پھر دنیا پیدا ہوئی۔

جس دن سے دنیا کا نام سنا ہے، بڑی ماں بڑی آہستگی سے سیڑھیاں اوپر نیچے آئی لڑکی کو دیکھا، اس کے منہ میں گُڑ کی بنائی ہوئی گھٹی دی اور کہنے لگی، اس کا نام دنیا ہوگا اور یوں میری بہن کا نام دنیا رکھا گیا۔

میں نے اور دنیا نے اپنے گرد موہنا اور رام دلارے کو اپنی ماں کو اور بابا ہی کو دیکھا تھا۔

دنیا نے پاؤں چلنا سیکھا تو اسے بالکنی میں بڑی ماں کے پاس چھوڑ دیا جاتا اور پہروں میں گھر میں پریشان سا گھومتا رہتا۔ کھلونوں کو انتقاماً توڑتا اور پٹختا رہتا۔ پٹ کر میں اونچے سُروں میں گلا پھاڑ کر روتا رہتا اور پھر سو جاتا۔ ماں کے پاس بڑی رونق رہتی۔ ہمسائے کی لڑکیاں عورتیں، بہوئیں اکٹھی رہتیں، ماں کی باتیں بڑی اچھی اور آواز بڑی پاٹ دار تھی۔ کبھی کبھار کوئی عورت مجھے بھی

بلاتی پاس بٹھاتی اور پیار کرتی مگر باتوں کے ریلے میں مجھے بھلا دیا جاتا۔ چارپائیوں پر سردیوں کی دھوپ میں کھٹ کھٹ سروتے چلتے' زبانیں چلتیں اور باتوں کا دریا سا رواں رہتا۔ دنیا تو بڑی ماں کی بھگت بنی ہوئی تھی۔ اکیلے پن سے گھبرا کر میں اوپر پہنچ جاتا تو ننھی سی دنیا کو دیکھتا کہ ماں کے ساتھ بڑی مالا کے مقابلے ایک چھوٹی سی مالا لئے آنکھیں بند کیے' بھگت کا سمرن کرتی ہوئی میرے پاؤں کی آہٹ پا کر آنکھیں کھول لیتی' ہنس پڑتی اور مالا کے کئی موتی اس کے ننھے سے ہاتھ سے چھوٹ جاتے' بڑی ماں کا ڈر اتنا تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ آنے کو نہ کہہ سکتا۔

جب ذرا اور بڑی ہوئی تو بڑی ماں نے گھر پر بھگوان کی مورتی کو چھوڑ کر مندر جانا شروع کر دیا۔ دنیا اور ماں مندر کی سیڑھیوں کو دھوتیں۔ بڑھاپا اور بچپن دوش بدوش بھگوان کے مندر کی سیڑھیاں دھوتے ہوئے' اس کے چرن چھوتے ہوئے' بڑی ماں کے ساتھ ننھی دنیا یوں لگتی جیسے ایک ننھی ذرا سی کونپل ہی صرف اس سوکھے ہوئے درخت کے آس پاس زندہ ہے۔ خزاں کے دامن میں ایک ہری پتی' اجڑی بہاروں کے قریب ایک سرخ اور جاندار پھول۔ دنیا کو کتنے منتر یاد تھے اور وہاں اور پھر وہ بڑی ماں کے پاس کیا کرتی رہتی تھی کسی کو معلوم نہیں۔ ان دنوں میں نے چھوٹی ماں کو اداس دیکھا ہے۔ عورتیں باتیں کرتیں تو سب اداس ہو کر کبھی کبھار کہتیں ''دادی نے لڑکی کو اتنی چھوٹی سی عمر میں بھگت بنا دیا ہے'' اور چھوٹی ماں کی آنکھوں میں آنسو تیر جاتے۔ کہتیں ''میں نے دنیا کو اس لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ دیوداسی بنے پر بڑھاپے کی ضد کے سامنے میں ہار گئی ہوں۔''

ان دنوں مجھے معلوم نہیں تھا' دیوداسی کیا ہوتی ہے۔

پھر ایک دن آیا جب میں نے سارے گھر میں کہرام مچا دیکھا اور بڑی ماں بھی سیڑھیوں سے اتر کر بجائے مندر کے جانے کو میرے بابا کے ساتھ مری ہوئی بوا کے گھر گئی۔ عورتیں کھڑی کھڑی پیٹ کو مار رہی تھیں۔ سینے کوٹ رہی تھیں۔ بڑے بڑے لہنگے پہنے لمبے لمبے گھونگھٹ کاڑھے آنگن میں عورتیں بھری تھیں۔ اس دن پہلی بار میں نے دنیا کو اپنے قریب دیکھا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ ''بھیا ان عورتوں کو کیا ہو گیا ہے؟''

ماں نے ہمیں ہمسائے کے ساتھ کہیں کسی اور کے گھر بھیج دیا۔ دوپہر تک ہم دونوں کھلونوں سے کھیلتے رہے' پھرتے رہے' پھر ''بڑی ماں کے پاس جاؤں گا'' کہہ کر دنیا رونے لگی تھی اور روتے روتے کسی عورت کے کندھے سے لگی سو گئی۔ رات کو ہم واپس آئے تو گھر میں بڑی

ہولناک اداسی تھی۔ دنیا جاگ کر اوپر چلی گئی۔ بڑی ماں بالکنی میں بیٹھی اس طرح چپ تھی۔ مانو جیسے وہاں سے ہلی ہی نہ ہو۔

اور پھر تیسرے دن بڑی ماں بھی مر گئی۔

دنیا اور میں قریب آ گئے۔ وہ میرے کھلونوں کو بڑے شوق سے دیکھتی۔ مجھ سے باتیں پوچھتی اور تب پہلی بار مجھے معلوم ہوا تھا کہ دنیا بڑی اچھی اور بڑی دلچسپ جگہ ہے۔ ہم دونوں خوشی سے پھدکتے' ننھے پرندوں کی طرح خوش رہتے۔ رسوئی میں گھس کر موہنا کو تنگ کرتے اور وہ ہماری' عورتوں میں گھری ہوئی باتیں کرتی ماں کو آوازیں دیتی۔ ہم بھاگ جاتے اور رام دلارے کے پاس کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ کر اسے بڑی روٹیاں پکاتے دیکھا کرتے۔ ان دنوں شام کو رام دلارے کے مضبوط کندھوں پر بیٹھے سیر کو جاتے ہوئے بڑا مزا آتا۔

نہر کے پانی میں بھنور پڑتے۔ ہم کناروں سے چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھا کر پانی میں ڈالتے اور بھنوروں کے ساتھ پتھروں سے پیدا شدہ چکروں کو بہتے دیکھا کرتے تھے اور گھر آتے ہوئے رام دلارے ہمیں کہانیاں سنایا کرتا۔ دنیا کے گھنگریالے بال ہوا میں اڑتے ہوئے ہوتے۔ وہ پوچھتی ''رام دادا اتنے بڑے جن سے تمہیں ڈر نہیں لگا؟''

اور رام دلارے جھک کر کہتا ''دنیا' دیدی میں تو جن سے بھی بڑا ہوں' میں تو مہاجن ہوں۔''

''تمہارے سینگ کہاں ہیں؟ تمہارے تو دانت بھی بڑے نہیں ہیں۔ تم جن نہیں ہو سکتے۔''

''ارے دنیا دیدی میں نے سینگ اتار کر رکھے ہوئے ہیں اور دانت بھی جب تم بڑی ہو جاؤ گی تم کو جن بن کر بتاؤں گا۔''

سچ مچ وہ اپنے ننھے ہاتھوں کو مارے خوشی کے ملنے لگتی۔ ''بڑا مزا آئے گا ناں رام دادا جب تم جن بنو گے۔ پھر میں تو تم سے ذرا بھی نہیں ڈروں گی۔''

''کیوں!'' رام دلارے اسے کندھے سے اتارنے لگتا۔ ''کیوں نہیں ڈرو گی۔ میں جن کا ہے بنوں گا اگر تم نہیں ڈرو گی۔''

''اچھا اچھا۔'' وہ چیخ کر کہتی۔ ''ڈروں گی ضرور ڈروں گی۔''

موہنا کی چیخ و پکار ماں کی باتیں اور رام دادا کی کہانیاں سنتے سنتے بچپن بیت گیا۔ یہ

بڑی ماں کے جپ اور سمران کا اثر تھا کہ وہ تنہائی پسند اور دوسروں سے الگ الگ رہتی تھی۔ اس کی بہت سہیلیاں بھی نہ تھیں اور وہ کود پھاند جو لڑکپن میں لڑکیوں کے حصے میں لڑکوں سے بھی زیادہ آتی ہے اس کا بھی دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بڑی خاموش طبع اور پژمردہ رہنے والی لڑکی جب بڑی ہوئی تو مجھ سے بھی دُور ہوتی گئی۔ اپنی کتابوں میں مگن اپنے خیالوں میں لپٹی، بڑی ماں کی چھوڑی ہوئی بھگوان کی مورتی کو طاق میں رکھے، وہ اس پر سے ہار پھول نچھاور کرتی رہتی۔

اور پھر کرشن بھگوان سے دنیا کا بیاہ ان دنوں ہو گیا جب دنیا نے ابھی ہائی اسکول بھی پاس نہیں کیا تھا۔ میں دنیا کا بڑا بھائی تھا۔ پھر میں نے بھی اس کے پتی یعنی کرشن بھگوان کو پسند نہیں کیا۔ وہ بڑا زرد رو، خاموش اور اُداس صورت لڑکا تھا۔ سہرے کی سنہری تاروں میں اس کی صورت پر صرف بڑی بڑی آنکھیں ہی تھیں جو روشن تھیں۔ اتنی اُداس آج تک میں نے کسی مرد کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ اس کا باپ بڑا امیر آدمی تھا۔ خوب بڑی سی جائیداد تھی اور کرشن گوپال سات بھائیوں میں سے بڑا تھا۔ دنیا کے گھر میں ہونے سے مجھے سہارا ملا رہتا تھا۔ اس کی خاموشی کے باوجود بڑی ماں کی بالکنی میں بیٹھ کر کبھی ہم دونوں خوب ہنستے۔ میں مذاق مذاق میں بھگوان کی مورتی کے سامنے ناچتا اور دنیا ہنستی ہنستی دوہری ہو جاتی۔ باہر سے آ کر میں اوپر جاتا۔ سردیوں کی ٹھنڈی اور بڑی منحوس شاموں کو اس کے بستر میں بیٹھ کر چائے پینے اور اسکول کی استانیوں کا ذکر سننے میں بہت مزا آتا۔ ان دنوں میں سوچا کرتا تھا کیا ہی اچھا ہو زندگی پر ایسی لاتعداد ہی شامیں کھڑی رہیں اور میں اپنی پیاری بہن دنیا کے پاس بستر میں بیٹھا چائے پیتا ہنستا اور باتیں کرتا رہوں۔

گھروندے بنانے اور خواب دیکھنے کی عادتیں انسان میں بہت پرانی ہیں۔ بچپن میں ریت کے گھروندے بناتا ہوا انسان بڑھاپے تک ریت کے گھروندوں میں دلچسپی لیتا رہتا ہے۔ مٹی سے کھیلتا رہتا ہے۔ اکثر مجھے خیال آتا ہے کہ دھرتی اصل میں ہماری ماں ہے۔ ہمارے گرد ریت کے ڈھیروں سے سب کچھ ظاہر ہے۔ یہ دنیا ایک جادو کا قلعہ ہے کہ پھول پر کوئی سانس لگتا ہے اور اس میں سرخی اور رنگ کی شوخی حسن بن کر پھیلنے لگتی ہے۔ خشک زمین پر پانی برستا ہے اور چاروں طرف ہریالی سی کھل جاتی ہے۔ نرم ہوائیں دامنوں کو چھونے لگتی ہیں تو گیت سے فضا میں پھیل جاتے ہیں۔ ہمارے گرد ہر شے ریت میں سے نمودار ہوتی ہے اور ہمارے پاؤں کے نیچے روندے جانے والے ذروں میں مل جاتی ہے اور پھر اس ریت کے سائے تلے درختوں کی ہریالی

میں ظاہر ہوتی ہے۔

وہ خواب جو میں نے اپنی بہن دنیا کے پاس سردیوں کی کہرآلود شاموں میں بیٹھ کر دیکھے تھے، پھر خواب خواب تھے، جھوٹ ہی تھے، ان میں سچ کہاں سے آتا۔ وہ اصلیت سے کب ٹکراتے۔

بچپن میں موہنا نے ایک کہانی سنائی تھی۔ صرف پہلی، آخری اور ایک کہانی پپیہے کی اور کوئل کی کہانی۔

کس طرح ایک سوتیلی ماں نے دو بہن بھائیوں کو پپیہے اور کوئل کی شکل میں بدل دیا تھا اور کوئل اپنے بھائی کو پکارتی پھرتی ہے۔ بنوں اور جنگلوں میں ماری ماری درختوں کی ڈالیوں میں نوحے کرتی ہے کوکو۔ کوکو۔ اور کوکو۔ کہاں ملے گی۔ اسے بہن کی آواز کہاں سنائی دے گی۔ وہ تو اپنی بہن کو پکارتا رہتا ہے۔ راتوں کی تاریکیاں دن کی روشنیاں اسے کہیں سے ذرا سا سہارا نہیں دے پاتیں۔ وہ پکارتا ہی رہتا ہے۔ معصوم اور بے تاب ننھا سا پپیہا۔

مجھے یاد ہے موہنا کی اس کہانی کے بعد مجھے کتنا ڈر لگا تھا۔ میں روز ڈرا ڈرا، سہما سہما اُٹھتا اور سب سے پہلے دنیا کو دیکھتا، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی نے اس کے سر میں کیل گاڑ کر اسے کوئل بنا دیا ہو۔ ماں کو کنگھی کرتے وقت بڑے غور سے دیکھتا، کہیں وہ دنیا کے سر میں کوئی شے گاڑتی تو نہیں۔ بچپن بیت گیا اور اسکول کی اصلی کہانیاں اس ننھی سی مصیبت کی داستان سے ٹکرا کر اس کے جادو کو پاش پاش کر گئیں۔ ہم دونوں اس کہانی کو یاد کر کے خوب ہنستے۔ میں کہتا دنیا مجھے ہمیشہ بہت ڈر لگتا رہا۔ کہیں تم کوئل نہ بن جاؤ اور دنیا ہنس کر کہتی، پھر بھیا اس کے لیے تو ضروری تھا کہ ماں بھی سوتیلی ہو۔ ہماری ماں تو اصلی ہے۔ بالکل اپنی ماں اور ہم دونوں قہقہے لگاتے بستر میں بیٹھے چائے پیتے اور باتیں کرتے کبھی کبھار مجھے پھر خیال آتا کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا کو کوئل بنا کر کوئی مجھ سے جدا کر دے گا۔ پھر کرشن گوپال ایک فولادی کیل بن کر دنیا کی صورت بدل کر اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ اتنے بھرے پُرے گھر میں، میں اکیلا رہ گیا۔ زندگی ایک دم بہت اداس اور بے کیف ہو گئی۔ دنیا کے بعد میں بڑی ماں والی کھلی اور پرانی بالکنی میں جاتا، چوری چوری چپکے چپکے دم سادھے ہوئے جیسے میں کانٹوں پر چل رہا ہوں۔ جیسے ہر قدم پر پائل بج اٹھیں گے۔ جیسے مندر کی ہزاروں گھنٹیاں ایک دم چیخ اٹھیں گی اور مجھے اس بالکنی میں آتا دیکھ کر اپنی خاموشی کا جادو توڑتے ہوئے پا کر شور مچا دیں گی۔ کلس کے پیچھے سے چاند کی کرنیں الٹی ہو کر روشندان سے سیدھی بھگوان کی آنکھوں میں پڑتیں اور

طاق میں پڑی ہوئی مورتی کی آنکھوں میں سیاہی اور بھی گہری ہو جاتی۔ دودھیا چاندنی میں سنگ مرمر کی مورتی چمک اٹھتی اور روشنی اور نرم روشنی میں گھلنے لگتی۔ دنیا اور بڑی ماں کی صورتیں اور ان کے پیچھے اندھیرے میں کئی اور انجانی روحیں نظر آتیں۔ ماں بھی آنکھیں بند کیے ہوئے دنیا بھی آنکھیں بند کیے ہوئے۔ روشنی اور بڑھ جاتی۔ ایک طوفان سا چاروں کونوں میں پھیل جاتا اور میں سوچتا شاید یہ سہارا بھی میرے پاس نہیں رہے گا اور بھگوان کا یہ طاق خالی ہو جائے گا۔ بالکل میرے دل کی طرح خالی۔ کرنوں کے چھوٹے سے سکڑتے دائرے میں مورتی کے بازوؤں میں نیلی رگیں سی مچلتیں اور میں سوچتا شاید بھگوان نیند سے جاگ رہے ہیں۔ شاید اب انگڑائی لے کر اٹھیں گے اور ان کی منجمد مسکان خوشی بن جائے گی۔ وہ طاق سے نیچے اتریں گے مگر وہاں طاق پر بھگوان کی مورتی میری آنکھوں سے آنکھیں ملائے اس طرح میرے دل کو ٹٹولتی رہتی۔

چمک میں زندگی کروٹ نہ بدلتی۔ بانسری میں مدھر گیت قید رہتے اور میں سوچتا بھگوان ایک ہی آسن جمائے تھک تو نہیں گئے اور آج مجھے معلوم ہے بھگوان کی دنیا سے گیت اس طرح پھیل نہ سکے جس طرح میری بہن دنیا کے دل کو خوشی کے گیت چھو نہ سکے۔ دادی ماں کی دنیا' بھگوان کی دنیا' دونوں خاموش رہیں 'اُداس اور زندگی سے دور۔ بچپن تمام یادوں کے ساتھ میری آنکھوں میں گھوم گیا۔ جب میں نے دنیا کو سسکتے اور اپنے سے لگے پایا۔ مجھے وہ پرانے دنوں کی چھوٹی سی دنیا لگی۔ بھگوان کی مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھنے والی بڑی ماں کے قریب بیٹھی چھوٹی سی مالا ہاتھ میں لیے ہری نام کا سمران کرنے والی دنیا۔ گھر میں سب طرف اداسی سی تھی۔ نروپما بھی بڑی اداس اور خاموش سی رسوئی سے اٹھ کر میری طرف آ گئی۔ بچے سہم کر کھڑے تھے اور سب سے چھوٹا اُپی اپنی ماں کا پلو کھینچ کر پوچھ رہا تھا' ماں یہ کون ہے جو بابا کے گلے سے لگ کر رو رہی ہے۔ مگر نروپما اس کی بات کا جواب دیئے بغیر اس کی طرف متوجہ ہوئے بنا وہاں کھڑی تھی۔ جب میں اور دنیا آنگن میں کھڑے رو رہے تھے۔

آج صبح سے میں بہت خوش رہا تھا۔ آج میں کنول کماری ٹھاکر سے مل کر آ رہا تھا۔ اور دنیا کے رنگ میری نگاہوں میں بڑے جاذب نظر اور گہرے تھے' آج طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک خوشی سے زمین کا ذرہ ذرہ میری نگاہوں میں رقصاں رہا تھا۔ جب میں چھڑی ہلاتا گھر کی طرف آ رہا تھا تو میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان سمجھ رہا تھا۔ اپنے آپ سے مطمئن۔ میرے گرد ہر شے نکھری ہوئی اور زندگی کے گیت سے پُر تھی۔ شام کو کنول سے

مل کر واپس آتے ہوئے مجھے خاموش کرنوں میں پریوں کے پائل سنائی دیئے تھے۔ خوشی جب آسمان کو چھونے لگتی ہے تو فضاؤں کے تمام گیت خاموش سازوں کے کُل نغمے غیر مری گھنگروؤں کی ساری جھنکاریں انسان کے فانی کانوں میں چپکے چپکے گھس آتی ہیں اور روح کو چھیڑنے لگتی ہیں۔ آتے ہوئے پہلی یا دوسری کا چاند آسمان کی پیشانی پر ایک خوبصورت جھومر کی طرح لگ رہا تھا اور بلندیوں پر درختوں کی کونپلوں کو چھوتی ہوئی ہوا اس کو چھو رہی تھی۔ خوشی کے چند لمحوں کی قیمت گراں ہوتی ہے کیا؟ یا پھر خوشی کے لمحے اس یاد کو تازہ کرتے ہیں کہ دنیا میں غم بھی اپنی تھاہ نہیں رکھتے اور زمین کے اس ننھے سے ٹکڑے سے اس چھوٹے سے جزیرے سے غم کے سمندر کی لہریں آ کر ٹکراتی ہیں۔ اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں یا انجانے میں جن ہواؤں کو ہم خوشی کا سانس سمجھتے ہیں وہ دراصل غم کی پیغامبر ہوتی ہیں۔

میں نے دنیا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ نروپما کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر سب طرف ایک ہی خاموشی تھی۔ پانچ سالوں میں میری خوبصورت اور خوش باش بہن کا یہ حال ہو جائے گا۔ وقت کتنی آہستگی سے گزرتا ہے اور جب گزر جاتا ہے تو کیسے ایک آن ایک لمحہ سا لگتا ہے۔ مجھے لگتا تھا ابھی کل ہی کی بات ہے' ماں کے مرنے پر وہ اپنے سسرال سے آئی تھی۔ اپنے چھوٹے سے بیٹے کو گود میں اٹھائے۔ وہ کتنی اچھی لگی تھی۔ چہرہ زندگی سے بھرپور' گال سرخ انگارہ' بچہ صحت مند اور پیارا سا۔ کرشن گوپال کے چہرے پر سے بھی زردی کا وہ رنگ گم ہو گیا تھا۔ اس کی اداسی بھی اب قدرے بدل گئی تھی۔ وہ باتیں بھی کرتا تھا۔

ہم سب کو ماں کے مرنے کا بہت افسوس تھا مگر ماں نے ہماری زندگیوں میں کبھی اتنی گہری دلچسپی نہیں لی تھی۔ اس کے گرد ہمیشہ محلے کی عورتیں اور بہوئیں جمع رہتیں۔ دنیا کو بیاہ کر تو وہ بہت فارغ ہو گئی تھی۔ محلے میں کہیں لڑائی جھگڑا ہو' ماں کو فیصلے کے لیے بلایا جاتا۔ لڑکے بگڑنے لگتے تو ماں کو ہی معاملے میں دخل دینا پڑتا۔ کسی باپ کو بیٹوں کی ناقدری کا گلہ ہوتا تو وہ ماں سے ہی آ کر شکایت کرتا۔ محلے میں کسی رشتے کا فیصلہ کرنا ہوتا تو ماں کی صلاح ضروری سمجھی جاتی۔ زندگی کی اس روانی میں جب بابا اتنے خاموش رہے تو ماں کی مصروفیت کہاں سے اتنا وقت لاتی کہ ہماری بھی اسی پیار سے دیکھ بھال کرتی۔ جتنی محبت سے وہ محلے اور آس پاس کے لوگوں کو دیکھتی تھی۔ جوان لڑکیاں' البتہ ماں سے بہت خوف کھاتی تھیں اور پھر موہنا کی چیخ و پکار' آنگن میں عورتیں بھری ہوتیں کوئی بات ہو رہی ہوتی اور موہنا رسوئی میں بیٹھے بیٹھے کسی بات کی

تردید کرتی باتوں کا رخ پلٹ جاتا وہ ایک ہاتھ میں توے پر ڈالنے کی روٹی لیے ہوئے دروازے تک آتی اور بات بڑھا کر واپس چلی جاتی۔ صبح سے شام تک کے اس میلے میں ماں کو ہماری طرف توجہ دینے کی فرصت کہاں سے ملتی۔

ماں نے اپنی محبت سارے محلے میں بانٹ دی تھی۔ اوروں کے حصے میں ہم سے زیادہ ہی آئی اور اس لیے ماں کے کھونے کا جتنا افسوس ہمیں ہوا اس کے برابر ہی باقی لوگوں کو ہوا اور میں دنیا کو اُداس دیکھ کر کہتا تھا۔ دینو پرماتما تمہیں ہر طرف سے سکھی رکھے۔ اگر زندگی میں تمہیں کبھی ضرورت ہوئی تو تم اپنے میکے کو آباد ہی سمجھو میں ابھی زندہ ہوں تم روتی کیوں ہو اور پھر جب ماں کو شمشان لے جایا گیا تھا تو ماتم کرتی ہوئی دنیا کی آواز میں وہ کرب نہ تھا جو سب کچھ کھو دینے پر انسان کے رونے اور بین میں مل جاتا ہے۔ چند دنوں کے بعد کرشن گوپال اور اپنے بچے بہاری کو لے کر دنیا چلی گئی تھی۔

اور آج پانچ سال کے بعد میں نے دنیا کو پھر دیکھا تھا۔ وہ بے بسی سے رو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی زردی تھی جو کبھی کرشن گوپال کی صورت پر ہوا کرتی تھی۔ میں نے ادھر سے ادھر دیکھا مگر اس کا بچہ کہیں بھی ساتھ نظر نہیں آیا۔ سہمی ہوئی کمزور اور مایوس دنیا میری اپنی دینو میرے سامنے کھڑی تھی۔ دینو جس کے ساتھ میں نے بچپن گزارا جس کی خاموشی کے باوجود میں کبھی کبھی زور سے ہنس پڑتا تھا جس کے بستر میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ کہر آلود شامیں کبھی ختم نہ ہوں زندگی پر ایسی لامتناہی شامیں پھیلی رہیں۔

بینا سارے چھوٹے بہن بھائیوں کو اکٹھا کر کے کسی کمرے میں لے گئی۔ اُپی نروپما کی گود میں چڑھ گیا اور ہم سب آنگن میں بیٹھ گئے۔ میں نے روتی ہوئی دنیا کو ایک ہاتھ سے بازو کے حلقے میں لے لیا اور اس سے پوچھا ''آخر روتی کیوں ہو میں زندہ ہوں' تمہارے دکھ کیا ہیں' کچھ بتاؤ تو سہی تم اتنی بے قراری سے کیوں رو رہی ہو؟ میری بہن میری دینو پانچ سال کے عرصے میں تم نے مجھے کبھی ایک لفظ نہیں لکھا۔ میں نے تمہاری بابت کچھ نہیں سنا۔ میں ہمیشہ یہ سوچتا رہا ہوں کہ متھرا میں تمہارا جی بہت لگ گیا ہے۔ تم اکلوتے بھائی کو بھی بھول گئی ہو اور پانچ سال کے بعد تم بغیر اطلاع دیئے یوں آئی ہو گویا ایک لمبے سفر کی تھکن تمہارے چہرے پر ہے' کیا تم اتنے سال پیدل چلتی رہی ہو؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ دینو کچھ تو بولو؟'' اور دنیا میرے کندھے سے لگی سسک رہی تھی۔ اس کے آنسوؤں کی نمی اس کا سانس اپنے گلے کے قریب لگتا محسوس ہوتا تھا۔

میرے دل میں ایک ٹھنڈی سانس' شام کی ہوا کی طرح چکر لگا رہی تھی۔

اور دنیا نے چیخ کر کہا' آنسوؤں کی روندھن سے لڑتی ہوئی آواز مجھے چیخ ہی معلوم دیتی تھی۔ ''تم نے ماں کے مرنے پر کہا تھا کہ اگر تمہیں ضرورت ہوئی تو تمہارا میکہ آباد ہی ہوگا' میں اپنے میکے میں واپس آ گئی ہوں۔''

''دنیا!'' میرا دل بھر آیا۔ ''دنیا مجھے بتاؤ تمہیں میری ضرورت کیوں پڑی ہے۔ کرشن گوپال کہاں ہے۔ بہاری کہاں ہے اور تم اتنی کمزور کیوں ہو گئی ہو؟''

''بھیا! اتنے سالوں خوشیوں کے ساتھ مصیبتوں کے خلاف لڑتے لڑتے نڈھال ہو کر مجھ میں اب اور لڑنے کی سکت نہیں رہی۔ میں تمہارے گھر میں ایک لونڈی بن کر رہوں گی۔ مجھے سسرال واپس مت بھیجنا۔''

میری بجائے نروپما نے بڑھ کر اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ بولی۔ ''دنیا تم روتی کیوں ہو۔ پرماتما تمہارے گھر کو بھی آباد رکھے۔ تم اس گھر کی رانی ہو۔ یہ گھر تمہارا ہے۔ سسرال کا گھر تمہارا سب سے اپنا ہے۔ پھر اگر تم یہاں رہنا چاہو تو ہم سب تمہاری خدمت کرنے کو تیار ہیں۔ تم مجھے بینا کی طرح پیاری ہو۔

اور پھر رات ستاروں کی چندری اوڑھے پائل جھنکاتی دھیرے دھیرے بڑھتی آ رہی تھی۔ کوٹ کی جیب میں کنول کا دیا ہوا کاغذات کا پلندہ ایک بھاری بوجھ کی طرح لگ رہا تھا اور میں وہاں بیٹھا سوچ رہا تھا' کنول نے ٹھیک ہی کیا ہے۔ پندرہ سال پہلے کی اور آج کی کنول میں کتنا کم فرق ہے۔ پندرہ سال پہلے کے چہرے پر صرف سنجیدگی بڑھ گئی ہے۔ چال میں اور زیادہ متانت اور وقار آ گیا ہے۔ پندرہ سال پہلے میں جس عورت کے قدموں پر جھک سکتا ہوں' آج بھی محبت مانگنے کے لیے جھک سکتا ہوں اور یہ عورت جو میری بہن ہے پانچ سال پہلے ایک شاداب پھول کی طرح خوشبوؤں کی چمک سے سب کو اپنی مخملیں سطح کا احساس دلا رہی تھی اور اب پانچ سال' پانچ دن بن کر اس پھول سی زندگی کا رنگ اور مسرت کی تازگی چھین لے گئے۔ اس کے چہرے کی پژمردگی اس بات کی علامت ہے کہ زندگی نے اس کے ساتھ وفا نہیں کی۔ سالوں نے اسے پھول بنا کر کانٹوں میں گھسیٹا ہے' یوں کہ کانٹے اس کے انگ انگ میں باقی رہ گئے ہیں۔ وہ حلاوتیں اور خوشیوں کی نمکینیاں اس کے چہرے پر کہاں ہیں؟ اس کی امیدیں کہاں ہیں؟ اس کی ہنسی کہاں ہے؟ یہ میری بہن ہے۔ میری اکلوتی بہن جس کو کرشن اس لیے لے گیا تھا کہ اسے اپنے دل کی رانی بنا کر

رکھے گا جس کو ہم نے روتے ہوئے اس لیے رخصت کیا تھا کہ سہاگن بن کر یہ خوشیوں کے چہرے پر چمک بنے اور پانچ سالوں میں یہ زرد مدقوق' بیمار اور تھکی ہوئی عورت بن کر میرے گھر آئی تھی کہ میں اسے اپنی لونڈی بنا کر رکھوں۔ وہ سسرال نہیں جائے گی۔ اس کے آنسو دنیا کی سسرال اس کے لیے ایک بھٹی ثابت ہوئی۔ چھ کنواری اور ایک بیوہ نند کا بوجھ سنبھالے سنبھالے اس کی کمر جھک گئی تھی۔ اتنے بڑے کنبے میں کہاں کرشن گوپال کی صحت سدا کی گری ہوئی اور گھر والوں کے لیے باعثِ پریشانی رہی ہو۔ دنیا کو ساس نندوں اور پتی کی خدمت میں دن رات جان لڑانی پڑتی تھی۔ دیوروں اور نندوں کے لیے صبح چار بجے سے اٹھ کر رسوئی گھر میں گھسے' دنیا کو پکاتے یا نمٹتے شام ہو جاتی اور کسی سے اتنا بھی نہ ہو پاتا کہ اس سے جھوٹوں پوچھ لے کہ تم نے کھانا کھایا' تم نے آرام کیا۔ اس گھر میں کبھی کمر سیدھی کرنے کا وقت بھی نہیں ملا۔ صبح چار بجے سے کام کرتے کرتے رات کے گیارہ بج جاتے۔ بہاری کو دیکھنے کا وقت بھی نہ ملتا۔ جب تک کنواری نندیں گھر میں تھیں' کبھی کبھار سانس لینے' ہنسنے بولنے کا وقت ملتا تھا مگر جب روپا بیوہ ہو کر میکے آ گئی' دنیا پر سختی بڑھ گئی تھی۔ روپا کی زبان میں جادو تھا اور ماں سارا وقت اس کی دلجوئی کا خیال کر کے اس کی بربادی کا رونا روتی' دلاسے' پیار اور چاؤ سے بیٹھی بیٹی کے سہاگ کا ماتم کرتی' اس کے آگے پیچھے پھرتی' سارا گھر روپا کے مزاج سے ڈرتا تھا۔ کہتے ہیں سونا چوٹ کھا کر پھیلتا ہے اور لوہا آہن کے نیچے بھی اسی طرح مضبوط رہتا ہے۔ روپا میں اس کے دکھ کے بعد کوئی دھیرج نہیں آیا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر آنسو بہانے لگتی اور ماں اس کے گلے سے لگ کر اسی دلجوئی کے خیال سے اونچی آواز میں بین کرنے لگتی۔ بہنیں بسورتیں اور تھوڑی دیر کے بعد گھر خاصا ماتم کی مجلس بن کر رہ جاتا۔ ہولے ہولے چھوٹی بہنوں نے روپا کے اس گھڑی گھڑی بین اور رونے پیٹنے سے بیزار ہو کر اس کا حال پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ تمام اپنے اپنے کاموں میں اسی طرح مگن رہتیں اور ماں بیٹیاں آنگن میں بیٹھی ان لوگوں کی جان کو روتیں جن کی دعاؤں سے روپ کشور مر گیا تھا۔ گھر میں ہر وقت مرے ہوئے پتی کا تذکرہ ہوتا اور روپا کی ہر وقت کی دلجوئی ایک عذاب بن کر روح پر استوار رہتی۔ ساس کو اپنی کنواری بیٹیوں سے تو کوئی گلہ نہ تھا مگر بہو سے اب وہ انجانے ہی بہت جلنے لگی تھی۔ دنیا کا کھانا اس گھر میں رہنا اور چلنا پھرنا اسے زہر لگنے لگا تھا۔ روپا بھی اس پر وقت بے وقت رعب گانٹھتی اور بہاری کو یونہی ڈانٹتی رہتی جس بچے کی ماں کو سارا دن رسوئی اور چولہے کے دھندے سے چھٹکارا نہ ملے' وہ کیا کر سکتی ہے۔ بچہ بگڑتا گیا۔ اس کی عادتیں خراب ہوتی

گئیں۔ وہ ضدی چڑچڑا' شریر اور گستاخ ہوتا گیا اور ساس نند دونوں آنگن میں بیٹھ کر آنے والی عورتوں اور ہمسائیوں کے سامنے دنیا کو پھٹکارتیں۔ ہائے ہائے کیسی ماں ہے' بچے کا منہ بھی نہیں دُھلایا جاتا۔ بچے کے کپڑے بھی نہیں بدل سکتی۔ کرشن گوپال کی تیمارداری روپا نے اپنے ہاتھوں شروع کر دی۔ بہن نے بیمار بھائی کی حفاظت اور دیکھ بھال کی خاطر اسی کمرے میں چارپائی ڈلوائی اور رہا سہا جو ذرا سا آسرا تھا' وہ بھی جاتا رہا اور زندگی ایک مسلسل عذابِ جہنم بن کر رہ گئی۔ کپڑے دھوتے روٹی پکاتے جب دن گزرتے ہوں اور کوئی تسلی کا ایک لفظ کہنے والا نہ ہو تو وقت کیسے گزرتا ہے۔

یہ سب ماں کے گزرنے کے بعد ہوا۔ ساس نے سوچا اب میکے میں کون ہے جو پوچھے گا۔ لے دے کر ایک بھائی ہے' اتنی دور جس کو اپنے گھر باہر سے ہی فرصت نہیں' بہن کی خبر کو کیا آئے گا۔ ہمارے گھروں کی سختیاں کچھ ایسی ہوتی ہیں جو بظاہر سختیاں نہیں لگتیں جو زندگی کے چکر میں ایک مرکز بن جاتی ہیں اور جن کے خلاف کوئی حرف شکایتِ زبان پر نہیں لا سکتا۔ بھائی کو کیا لکھتی' ہندوستانی عورت تھی۔ مرے ہوئے ماتا پتا کی عزت کا خیال تھا۔ روپا نے بھائی کے دل میں بھابی کے خلاف فضول شُبہات بٹھانے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ کرشن گوپال نے ایک دن دنیا کو بہت برا بھلا کہا۔ وہ بیمار تھا ورنہ اسے پیٹتا بھی اور پھر دنیا ایک سائے کی طرح آہستہ آہستہ گھٹنے اور گھلنے لگی۔ پڑھی لکھی ہونے کے ساتھ حساس تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس گھر میں رہنا موت ہے' مگر موت سے بدتر اس عذاب سے مر کر ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ وہ تو اس دکھ کی کشتی کو کنارے لگا لیتی مگر روپا نے کسی بات پر رنجیدہ ہو کر ایک دن اسے مارا اور ساس نے رو رو کر سینہ کوٹ کر فریاد کرنی شروع کر دی۔ کرشن گوپال غصے سے اٹھا اور چلتا ہوا آنگن میں آ گیا۔ روپا رونے لگی اور اپنی بربادی کے بین کرتی ہوئی بھائیوں سے ایک گھر کی فریادی ہوئی۔ ساس نے کہا میں اپنے بیٹے کو پھر سے بیاہ لوں گی اور انہوں نے دنیا کو گھر سے نکال دیا۔ بہن کی پناہ بھائی کے گھر میں ہوتی ہے' اس کا تھا بھی کون۔ میکہ ماں کے دم سے آباد تھا۔ میں زندہ تھا مگر نروپما بھی تو گھر میں موجود تھی۔ بہت سوچ کے بعد وہ میرے پاس آ گئی۔

میں بھی رونے لگا۔ دادی ماں کی لاڈلی' ہری نام کا سمران کرنے والی دینو کو دکھ یوں پریشان کرے گا۔ میرا خون کھولنے لگا۔ میرا دل چاہتا تھا' اسی وقت اڑ کر جاؤں اور کرشن گوپال سے پوچھوں وہ کون ہوتا ہے میری بہن سے بُرا سلوک کرنے والا۔ درد اور دکھ کے بوجھ سے میرا

سر پھٹنے لگا اور میں سوچتا ہوا لیٹ گیا۔ دنیا میرے پاس رہنے کو تو رہے مگر اپنے اجڑے گھر اور بچھڑے بچے کا خیال اسے ہر گھڑی ستائے گا۔ وہ راتوں کو روئے گی اور تکیے کو آنسوؤں سے بھگو دے گی۔ نروپما کی ذاتی شرافت پر مجھے بھروسہ تھا' پھر بھی دنیا کے گھر کی بات کیا ہوگی۔ میں خاموشی سے چپ چاپ اس دکھ کو نہیں سہہ سکتا تھا۔ میری اکلوتی بہن اس پریشانی میں رہے۔ خیالوں کے کارواں دماغ میں چلے آتے تھے۔ نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ میز پر کاغذات بکھرے پڑے تھے اور الماری میں لٹکے ہوئے کوٹ کی جیب میں کنول کماری ٹھاکر کے دیئے ہوئے کاغذات پڑے تھے اور معاً میرا خیال اس کی طرف مڑ گیا۔ اس دکھ اور مصیبت میں سوائے کنول کے کوئی میری مدد نہیں کر سکتا۔ پھر مجھے کرشنا بوس اور رویندر کمار کا مقدمہ یاد آ گیا اور میں نے دل کی تسلی کے لیے کنول کے نام کو اپنے دماغ میں محفوظ کیا اور نہ جانے کب نیند نے میری یاد پر غلبہ پا لیا۔ میں سو گیا۔

صبح کی روشنی میں مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ دنیا تو بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی ہے۔ اس کی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں اور رخساروں کی سرخی زردی سے بھی ایک سفیدی میں تبدیل ہو گئی ہے۔ وہ بار بار کھانستی ہے اور چلتے ہوئے ڈول جاتی ہے۔ میرے دل کے گرد ایک آگ لگ گئی۔ پانچ سالوں اپنے کو اس کی حالت سے بالکل بے خبر رکھنے پر میں اپنے کو لعنت ملامت کرتا رہا مگر اب یہ سب بعد از وقت تھا۔ رات میں نے سوچا تھا کنول سے جا کر صلاح کروں گا۔ دنیا کا مستقبل کس طرح سنوارا جا سکتا ہے۔ اس کا گھر کیسے آباد کیا جائے' مگر اب یہ ساری باتیں دور از کار معلوم ہوئیں۔ دنیا کی شکل پر کھنڈی ویرانی کو دیکھ کر مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ زندگی اور موت کے سنگم سے گزر کر موت کی راہ پر تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ کھانستے ہوئے وہ سفید ہو جاتی' بے خوابی اور کام کی زیادتی سے اس کے بازو جھک گئے تھے۔ پانچ سال پہلے کی ہنستی اور گلاب کے شگفتہ پھول کی سی دینو کہاں تھی۔ میں اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو نہیں تھمتے تھے اور تب پہلی بار بہنا بھی مجھے ایک بوجھ معلوم ہوئی۔ ایک ایسا پہاڑ جس کو میں اُٹھا نہ سکتا تھا' جس کو میں کہیں رکھ نہ سکتا تھا جو میرے سینے پر پتھر کی سل تھی۔ اپنی بیٹی کا پیار' اپنی بہن کا پیار سب عذاب بن گئے۔ دنیا کا نصیبہ پھوٹ گیا تھا' اس کی خوشی کا چمن اُجڑ گیا تھا۔ روپا نے وفا کی پتلی دنیا کو مار کر گھر سے اس لیے نکال دیا تھا کہ اب اس کی بیماری چند دنوں میں موت پر ختم ہونے والی تھی۔

مجھ میں ہلنے کی ہمت نہ رہی۔ میں ایک مفلوج کی طرح کمرے میں بیٹھا مستقبل کے

اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہاں کوئی امید نہ تھی۔ دنیا کے لیے میں کیا کر سکتا تھا۔ دنیا ایک بھوت لگتی تھی۔ شمشان کی ایک آوارہ روح۔ اس کے لمبے بال جن کو ماں نے دودھ سے دھو کر پالا تھا اور جن کی سیاہی ناگن کو شرماتی تھی۔ اتنے ذرا ذرا سے اور رُوکھے تھے' اس کے ہاتھوں کی ابھری ہوئی نسوں سے لگتا تھا وہ کوئی پرانی بڑھیا ہے جو کسی جادو سے دوبارہ زندہ ہو گئی ہے۔ بینا نے مجھ سے آ کر پوچھا: ''بابا بوا تو بہت بیمار لگتی ہیں۔ ساری رات کھانستی رہی ہیں۔'' میں اسے کوئی جواب نہ دے سکا۔ میں وہیں میز کے پاس بیٹھا' اپنے آپ کو ایک ایسا آدمی محسوس کر رہا تھا جس کی ساری امیدیں ایک رات میں جل گئی ہوں' جس کے دل میں کچھ بھی باقی نہ رہا ہو۔ بہن کا تھا ہی کون؟ ایک میں تھا اس کا میکہ میرے دم سے آباد تھا۔ میں نے اتنے سالوں بہن کی خبر نہ لی۔ اس کی مصیبت اور زندگی کے اس مسلسل عذاب میں اس کے کام نہ آیا۔ مجھے دادی ماں یاد آ رہی تھی۔ مجھے ماں یاد آ رہی تھی۔ میں نے دنیا کی سدھ نہ لی تھی اور اب ...... کنول کماری ٹھاکر اور باقی سارے خیالات میرے دماغ سے پر لگا کر اڑ گئے۔ مجھے کچھ یاد نہ رہا' میں اسے یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میرا دل اس کی حالت دیکھ کر ہل گیا ہے۔

نروپما دروازے کی دہلیز پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ بولی ''چائے تو پی لو۔''

میں نے اس کی طرف اپنا سر اٹھا کر دیکھا۔ میری آنکھوں میں لکھی ہوئی حسرت کو اس نے پڑھ لیا ہوگا۔ بولی ''دنیا دیدی کو ہسپتال بھی لے جاؤ گے کہ نہیں؟''

دنیا میری طرف پشت کیے بیٹھی تھی۔ میں نے کمرے کے اندر جا کر کہا۔ دینو اٹھو گی نہیں' مگر وہ اسی طرح لیٹی رہی۔ اس کا سارا جسم ہل رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ میں اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے بالوں کی خشکی میرے ہاتھ کی پشت سے ایک پتھر کی سختی بن کر ٹکرائی۔ وہ گداز بازو سوکھ گئے تھے۔ کندھوں کی ہڈیاں ڈھیلے بلاؤز میں سے ابھری ہوئی تھیں اور جتنا چہرہ مجھے نظر آ رہا تھا اس پر خون کی ایک بوند بھی نہ تھی۔ انگلیاں خالی تھیں۔ مجھے معلوم ہے دنیا کے پاس اتنی انگوٹھیاں تھیں کہ وہ سب کو ایک ہی بار پہن بھی نہ پاتی تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ اس نے روکنے کی کوشش کی مگر وہ کھانسی پر قابو نہ پا سکی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی مگر یوں کہ آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی' کھانسنے کی شدت سے منہ پر ساری سرخی آ گئی تھی۔ جسم بری طرح ہل رہا تھا اور بکھرے ہوئے بال' ایسی تو کبھی دادی بھی نہیں لگی اور یہ میری بہن دنیا تھی۔ میں کس لیے جی رہا تھا۔ میری بہن اس حالت میں مر رہی تھی اور میں زندہ تھا۔ میں اپنے دل کی

خوشیوں کے پیچھے دیوانہ وار گھومتا رہا تھا۔ اپنے نام کی، اپنی شہرت کے لیے اگر میرا گھر نہ ہوتا تو جانے دنیا کہاں ہوتی۔ کہاں جا کر مرتی۔ وہ اب سسرال والوں کے لیے ایک بوجھ بن گئی تھی اور اسی لیے روپانے سب سے بڑی اور بیوہ نند نے اسے گھر سے نکال دیا۔ ساس اور نندوں کی خدمت کرنے کے قابل وہ کسی طرح بھی نہیں تھی۔ میرا دل سینے میں ایک کمزور پتے کی طرح ہل رہا تھا۔

وہ چارپائی پر ایک موہوم یاد کی طرح بیٹھی اپنے پہلے وجود کا سایہ معلوم ہوتی تھی۔ آنسو میری آنکھوں میں امنڈ آئے۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ نروپما بھی اس کی حالت سے متاثر تھی۔ وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ اُپی جو اس کے پلو سے لگا لگا یہاں آیا تھا، چیخ کر بھاگ گیا۔ مجھے دنیا کا بہاری یاد آ گیا۔ جانے دنیا کا دل اپنے بچے کو دیکھنے کے لیے کیسے بے تاب ہو رہا ہوگا۔ وہ ایک ایسے مسافر کی طرح لگ رہی تھی جو گاڑی کے انتظار میں لیٹا لیٹا تھک کر بیٹھ گیا ہو اور جسے دل کی گہرائیوں میں اس بات پر یقین ہو کہ گاڑی کبھی نہیں آئے گی۔ وہ ناحق منتظر ہے اور پھر بھی اس مسافر خانے سے باہر جانے والے کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھ رہا ہو۔ یونہی کسی امید کے بغیر، کسی آس کے بغیر۔

''بھیا۔'' دنیا نے میرے ہاتھ پر اپنا سوکھا ہوا ہاتھ رکھ دیا۔ ''تم اپنے کام پر کیوں نہیں گئے دن تو بہت چڑھ آیا ہے۔ میرے پاس کیوں بیٹھے ہو۔'' میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں نے اس کو گلے سے لگا لیا۔

دنیا تو مسرتِ مجسم تھی۔ اسے باتیں کرنے کے لیے لفظ نہیں ملتے تھے۔ یا باتیں کرنے کی قدرت وہ محسوس نہیں کرتی تھی۔ وہ چپ چاپ چارپائی پر بیٹھی رہی۔ نروپما کہنے لگی: ''دیدی، اٹھو منہ ہاتھ دھو کر کچھ چائے پی لو۔''

دنیا بولی..... ''بھابی مجھے کچھ نہیں کھانا، سالوں سے صبح کو چائے پینے کی عادت نہیں رہی۔''

''پھر بھی اٹھو تو سہی۔'' نروپما نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر کہا۔

ساڑھی دنیا کے جسم پر ایک لکڑی کے وجود پر لٹکے ہوئے ریشم کی طرح لگتی تھی۔ وہ سہارے کے بغیر اٹھتی ہوئی ڈول گئی۔ مجھے لگا کہ رات جب وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹی تھی تو پہلے دنوں کی محبتوں کا سارا جوش اس کے انگ انگ میں واپس آ گیا تھا۔ ورنہ اس دنیا میں جو اٹھتے ہوئے کانپ رہی تھی، کہاں سے اتنی طاقت آئی۔ نروپما اور وہ دونوں دو مختلف عورتیں تھیں، مگر میری بہن

میں تو قدم اٹھانے کی طاقت نہ تھی۔ جانے وہ کیسے مجھ تک پہنچ گئی۔ یا یوں ہوا ہوگا کہ جب تک منزل سامنے نظر نہیں آئی، آبلہ پا مسافر چلتا رہتا ہے اور منزل سامنے آ جائے تو اس کی تمام طاقتیں جواب دے جاتی ہیں مگر میں تو دینو کی منزل نہ تھا۔ دینو کو آگے جانا تھا، زندگی کے سفر میں کوئی بہن بھائی کے گھر آ کر بیٹھ نہیں جاتی۔ اس کی حالت سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی غیرت نے اسے روکے رکھا ہوگا، ورنہ اس حالت تک پہنچ کر آنے کا مطلب کیا تھا۔ وہ اب بھی کبھی نہ آتی، اگر اسے گھر سے نکال نہ دیا جاتا۔

اس کی قسمت ہی ایسی تھی۔ ورنہ ماں نے جب کرشن گوپال کو دیکھ کر دنیا کی شادی کا فیصلہ کیا تھا، تو وہ بہت خوش تھی۔ کاش آج ماں یہاں ہوتی۔ دادی ماں کی لاڈلی پوتی کا کیا حال ہے۔ ہری کا سمران کرنے والی ننھے ہاتھوں سے مندر کی سیڑھیاں دھونے والی لڑکی کے ہاتھ سوکھ گئے تھے۔ نہ جانے بھگوان کہاں تھے اور وہ طاقتیں جن پر یقین کے سہارے ہم بڑھتے ہیں، کہاں تھیں۔ زندگی کی کہانی میں دنیا کے لیے کیا لذت تھی، اس کے سر پر دکھوں کے کیل گاڑے گئے۔ موہنا کی کہانی کیا سچ ہونے والی تھی۔ دنیا کوئل بن کر اڑ جائے گی اور پھر ڈال ڈال پات پات اس کی حسرت بھری صداؤں سے گونج اٹھے گی، مگر وہ پکارے گی۔

کیسے؟ وہ تو خاموش کوئل ہوگی جو اپنے پروں کو سمیٹ کر درختوں کی اونچی چوٹیوں کو چھونے والے، جھکے ہوئے نیلے آسمان میں دیکھا کرے گی۔ اسے تو کسی کو بھی نہیں پکارنا تھا۔ اس کا اپنا کون تھا۔

دس دن بعد اسپتال میں دنیا کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ اس نے اتنے دنوں مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا، کبھی بہاری کا نام نہیں لیا۔ کبھی کرشن گوپال سے ملنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ اسے اپنے بچے کو دیکھنے کی حسرت ہوگی۔ جس دن میں نے اسے ڈاکٹر کو دکھایا ہے، اس نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا تھا کہ بیماری آخری اسٹیج سے بھی آگے گزر چکی، مگر ہم اپنی سی کوشش کریں گے۔ ہم امید کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا کرتے اور پھر پرماتما شاید اس دکھ کو ہی دوا بنا دے۔ شاید آپ کی بہن زندہ رہنے اور دو چار سال اور جینے کے قابل بن جائے مگر وہ دو چار دن بھی دنیا نے بڑی مشکل سے گھسیٹے۔ آنکھیں بند کیے پلنگ پر لیٹی رہتی اور جب آنکھیں کھولتی تو ان میں میرے لیے اتنی احسان مندی ہوتی، اس نگاہ میں اتنی زبانیں ہوتیں کہ میں شرمندہ ہو جاتا۔ مجھے دنیا بھول چکی تھی۔ میں صرف دنیا کی پٹی سے لگا ہوا، چاہتا تھا کہ اسے موت کے مضبوط ہاتھوں

سے چھڑالوں۔ میں پہلے بھی بھولا رہا تھا اور اب بھی ہمیشہ ایک دوسرے اندھیرے میں کود گیا ہوں۔ میں نے کبھی ان روشنیوں کو نہیں دیکھا جو کہیں دور دور تاریکیوں کو کاٹتی ہیں۔ نروپما میرے لیے پریشان تھی۔ مرتی ہوئی بہن سے میں اس بیماری کے جراثیم نہ لے لوں جو مہلک ثابت ہوں اور مجھے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائیں۔ اس نے دبی زبان سے ایک دو بار کہا بھی سہی مگر میں نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ یہ کیسی عورت ہے کہ مجھے دنیا سے جدا کرنا چاہتی ہے اور آج سوچتا ہوں' عورت کو اپنا سہاگ سب سے پیارا ہوتا ہے۔ اسے خوشیاں عزیز ہوتی ہیں' کوئی بھی رونا نہیں چاہتا' کوئی بھی آہوں کے دھوئیں سے اپنے دنوں کو تاریک نہیں کرنا چاہتا مگر میں تو سخت جان ہوں۔ مجھ پر کمزور اور لاچار دنیا کا ایک اثر ہوتا۔ پھر دنیا کے جراثیم تو اس کے دل کو چاٹ رہے تھے۔ اس کے جسم کو کھوکھلا کر رہے تھے انہیں کب اتنی فرصت تھی کہ وہ میری طرف توجہ دیں۔

میں نے کرشن گوپال کو تار دیا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ دنیا کی حالت نازک ہے۔ وہ بہاری کو لے کر آ جائے اور وہ دسواں دن تھا' وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا تھا اور دنیا کی آنکھیں ہر گھڑی دروازے پر پڑی ہوتیں' اسے بھی انجانے ہی اپنے بچے کا اور اپنے پتی کا انتظار تھا۔ اگر اسے اپنے گھر سے اپنے پتی سے کوئی انس نہ ہوتا تو وہ کبھی بھی سالوں ایک عذاب سے بے قرار ہو کر بھی اسی دہلیز سے بندھی نہ رہتی۔ اس نے تو مجھے بھی کوئی لفظ نہیں کہا۔ کبھی اپنی حالت سے آگاہ نہیں کیا۔

میں نے گھبرا کر کرشن گوپال کو ایک اور تار دیا۔ نروپما بھی بہت پریشان تھی۔ بینا نے ان دنوں کالج سے چھٹی لے رکھی تھی۔ مجھے کسی بات کی خبر نہیں تھی مگر دن کی روشنی میں' میں اسے اکثر دیکھتا۔ وہ چوری چوری دروازے میں سے جھانکتی اور اگر نروپما وہاں نہ ہوتی تو وہ اندر آ جاتی۔ دنیا کے سرہانے کھڑی ہو کر تکتی۔ بوا اور پھر آنسو اس کی آنکھوں سے گرنے لگتے۔ میں تو کچھ سمجھ نہ سکتا تھا' کچھ سوچ نہ سکتا تھا۔ ایک مشین کی طرح ڈاکٹر کے بتائے ہوئے نسخے دنیا کو پلاتا رہتا۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ پانچ سال دنیا نے جو دکھ برداشت کیے ہوں گے۔ وہ اب ماضی کے پردوں سے نکل کر میرے گرد گھومنے لگتے۔ نیند میری آنکھوں سے غائب ہو گئی تھی۔ دنیا میرے گرد ایک کمرے میں گھس آئی تھی۔ ایک کمرے میں سارے عذاب اور ساری سختیاں بند تھیں۔ دنیا نے کبھی ہائے نہیں کیا۔ دکھ اور درد کی بے تابی سے وہ کانپ جاتی۔ اس کے ہونٹ بھی بھینچ جاتے۔ کھانستے کھانستے وہ بے حال ہو جاتی۔ اس کا چہرہ بالکل سفید ہو جاتا مگر اس نے کبھی شکایت نہیں

کی۔ ہندوستان کی عورت تھی نا اور پھر وہ شکایت کس سے کرتی۔ اپنی دانست میں ہم نے بیاہ کر اس سے ہمیشہ کے لیے فراغت پالی تھی اور پھر دنیا کے ان چکروں میں کون ٹھہر کر کسی سے دریافت کرتا ہے کہ تم کون ہو اور کن منزلوں کی طرف دوڑ رہے ہو' تمہارے دکھوں میں' میں بھی شریک ہوں۔ ہمدردی کے دو بول اگر میں نے ان تمام سالوں دنیا سے نہ کہے تو کون اس کا پرسانِ حال ہو سکتا تھا۔

اس رات نروپما مارے تھکن کے گھر چلی گئی تھی۔ بینا میرے پاس آ کر جا چکی تھی۔ بظاہر آج رات سکون سے اور راتوں کی طرح گزر سکتی تھی مگر دل کو کوئی آرے سے کاٹ رہا تھا۔ مجھے انجانے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ آج کچھ ہونے والا ہے مگر میں گھڑی گھڑی دنیا پر جھک کر اسے دیکھتا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلتیں تو کمزور سی ہنسی اس کے ہونٹوں پر آ جاتی اور مجھے وہ ہنسی یاد آ جاتی جب میں سردیوں کی کہر آلود شاموں کو اس کے بستر میں بیٹھ کر برستی بارش کو بالکنی کے کنگروں سے آنسوؤں کی طرح ٹپکتے دیکھتا اور سوچتا کاش یہ شام کبھی ختم نہ ہو۔ یہ شام لامتناہی بن جائے پھر ہم رام دلارے کو یاد کرتے۔ جانے رام دادا سادھو بن گیا ہے' گنگا کے کنارے بیٹھا دھونی رمائے' رام دادا آج بھی کہانیاں سناتا ہوگا۔ اسے کہانیاں کہنے کا بہت شوق تھا' ایسی کہانیاں جو اس کے اپنے دماغ کی اختراع تھیں' جن میں وہ خود ہی ہیرو تھا اور خود ہی ہیرو کی تیز تلوار کا شکار۔

مگر دنیا کی زندگی پر وہ کہر آلود شامیں ایک ہمیشگی کا سایہ بن کر پھیل گئیں اور اس رات تو وہ شام لامتناہی بن گئی۔

وارڈ کے باہر لمبے برآمدے کی ٹین کی چھتوں پر بارش مسلسل پڑ رہی تھی۔ جب بوندیں تیزی سے پڑتیں تو آواز ڈراؤنی ہو جاتی اور جب بارش ذرا تھم جاتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے کوئی سرگوشیاں کر رہا ہو' جیسے چپکے چپکے کوئی رو رہا ہو۔ درختوں میں تیزی سے گزرتی ہوئی ہوا سے فضا ماتم کی صداؤں سے بھر جاتی' کبھی بادلوں کی گرج سنائی دیتی اور پھر ٹپکتی ہوئی چھتوں پر تیزی سے بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی' جیسے کوئی ٹین کی چھتوں پر تیزی سے بھاگ رہا ہو۔ زمین سے تہہ در تہہ زمانوں سے چھٹکارا پا کر آوارہ روحیں چیخ رہی ہیں' ہنس رہی ہیں۔ اور تیزی سے بھاگ رہی ہیں۔ بستر میں دنیا کا جسم رہ رہ کر سفید چادروں اور کمبلوں کے نیچے کانپ جاتا۔

''دنیا۔'' میں نے آواز دی۔ ''آؤ باتیں کریں۔ تم سارا وقت خاموش لیٹی رہتی ہو۔''
مجھے خوف سرد رد کی طرح اپنے جسم میں گھستا محسوس ہو رہا تھا' اس نے آنکھیں کھولیں اور میری

طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ چادر کے نیچے سے اپنا کمزور ہاتھ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے وہ ہاتھ پکڑ لیا۔

کمزور اور نحیف آواز میں کہنے لگی: ''بھیا تمہیں موہنا یاد ہے۔''

''ہاں۔'' میں کانپ گیا۔ ''وہ رات بھی تو ایسی ہی طوفانی رات تھی۔ بارش، سردی، تیز ہوا اور پھر کھانستی ہوئی موہنا مر گئی تھی۔''

''تمہیں موہنا کی آنکھیں یاد ہیں۔'' دنیا نے پھر پوچھا۔ ''کتنی روشن تھیں وہ آنکھیں۔ مجھے موہنا کی ساری شکل بھول چکی ہے پر اس کی آنکھیں نہیں بھولتیں۔''

''دینو چلو آؤ کوئی اور باتیں کریں۔ دادی ماں کی باتیں۔''

کہنے لگی: ''کیا لوگے دادی ماں کی باتیں کر کے، میں تو اب ان کے پاس جا رہی ہوں۔''

میں نے کہا: ''تم کیوں ایسی مایوسی کی باتیں کرتی ہو۔''

بولی۔ ''اپنے دن تو اب بیت گئے ہیں۔''

مجھے گلے میں ایک تیز جلن ہو رہی تھی اور کنپٹیاں پھٹ رہی تھیں۔ میں کچھ نہ بولا۔ مجھے اپنی آواز پر اعتبار نہیں تھا۔ آنسو تیزی سے میری آنکھوں میں جمع ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور میرے ہاتھ میں رکھا ہوا اس کا ہاتھ اتنا بے جان اور درخت کی ایک سوکھی شاخ کی طرح لگ رہا تھا۔ کتنی بار میں نے اس ہاتھ کو پکڑ کر آنگن سے اوپر کی بالکنی تک کا راستہ طے کیا تھا۔ ان دنوں یہ ہاتھ کتنا نرم اور گداز تھا اور آج یہ ہاتھ سوکھ گیا تھا۔ جیسے خون کے سارے سوتے خشک ہو گئے ہوں اور زندگی کی ندی سوکھ گئی ہو۔

دنیا پھر بولی: ''بھیا ایسی راتیں جب طوفان چیخ رہا ہو، بارش پڑ رہی ہو اور ہوا، کواڑوں کو دھڑ دھڑاتی ہوئی چلے مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ میں ایک ایسی چڑیا کی طرح محسوس کرتی ہوں جو خوشی سے آہستہ آہستہ کانپ سکتی ہو۔ میں بارش کی زبان کو سمجھتی ہوں اور بند ہوائیں جو اپنے دامن لہرا کر گاتی ہیں، مجھے لگتا ہے دنیا کے قید خانے کے بھاری دروازے آہستہ آہستہ کھل گئے ہیں۔ میری روح اس لطف کو محسوس کرتی ہے، کیا تم یوں نہ کرو گے کہ دروازہ کھول دو۔''

میں چپکے سے اٹھا اور دروازہ کھول کر پھر آ بیٹھا۔

دنیا حسرت بھری نظروں سے باہر اندھیرے میں دیکھتی رہی۔ ہوا کا ایک بھیگا ہوا ریلہ بھیگی ہوئی نمی کو لے کر اندر در آیا۔ پردے ایک طرف ہو گئے جیسے کسی غیر مرئی ہاتھ نے ان کو چن کر

الگ کر دیا ہو۔ میری بہن کے چہرے پر خوشی، دیے کی آخری لو کی طرح تھرتھرانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں پیار امنڈ آیا اور ہونٹ مسرت سے کانپنے لگے۔ میں نے کہا: ''دینو میں اب دروازہ بند کرتا ہوں، یہ سردی تمہارے لیے نقصان دہ ہے۔''

ہنس کر کہنے لگی: ''میرے لیے سردی نقصان دہ ہے۔ رہنے دو بھیا دروازے کو کھلا رہنے دو اور کھڑکی بھی کھول دو۔ میں ان ہواؤں کو اپنے انگ انگ سے چھوتے محسوس کرنا چاہتی ہوں۔ آزادی کا سانس، قید سے چھٹکارا پائی ہوئی بوندوں کا سانس میرے جسم سے چھونے دو۔''

میں نے کہا: ''دنیا سردی بہت ہے۔'' مگر میں نے کھڑکی کھول دی۔ وہ بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور کمبلوں کو بھی اتار کر ایک طرف رکھنے لگی۔

''کیا کرتی ہو دینو کیوں پاگل بنتی ہو، کیا مرنے کا ارادہ ہے۔'' یہ لفظ میرے منہ سے یونہی نکل گئے۔

کہنے لگی: ''مرنے سے یوں ڈراتے ہو جیسے میں زندہ ہوں اور پاگل تو ہم سب ہیں تم جو مجھے زندگی کی طرف واپس گھسیٹنا چاہتے ہو، تم پاگل نہیں ہو کیا؟''

سوچتے ہو بستر میں لٹا کر مجھے زندہ کر سکو گے۔ سچ بتاؤ کیا تمہارے دل میں اس سارے علاج اور مصیبت کے باوجود مایوسی نہیں ہے کہ میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں چند دنوں اور چند گھڑیوں کی مہمان ہوں۔ اپنے آپ کو دھوکہ دینے سے فائدہ؟''

بستر پر کمبلوں اور چادروں کے بغیر بیٹھی وہ ایک ضدی بچی کی طرح لگ رہی تھی۔ میں نے خاموشی سے اٹھ کر کمبل اس کے گرد لپیٹ دیا، مگر اس نے ایک جھٹکے میں کمبل اتار کر الگ کر دیا اور بولی: ''نہیں مجھے آخری بار اس کھلی ہوا میں تو سانس لینے دو، اسے تو محسوس کر لینے دو۔ آج مجھے بھگوان بھی یاد آ رہے ہیں۔''

''کون بھگوان؟'' میں ہارے ہوئے انسان کی طرح اپنی جگہ بیٹھا پوچھ رہا تھا۔

''کون بھگوان۔'' دینو نے یوں کہا جیسے وہ میری آواز کی نقل کر رہی ہو۔ ''وہی بھگوان جو مجھے دادی ماں نے دیا تھا۔ وہی مورتی جو ماں کے گھر میں طاق پر پڑی رہتی تھی۔ تمہیں بھگوان کی آنکھوں کی سیاہی یاد نہیں ہے؟ مجھے لگتا ہے جب اندھیرا ہر طرف چھا جاتا ہے تو بھگوان کی آنکھ ہر ایک کو دیکھتی اور اس کی نگاہ ہر ایک کو چھو جاتی ہے، اس بتی کو بھی بجھا دو مجھے بھگوان کی آنکھوں میں آنے دو مجھے اس سیاہی میں سما جانے دو۔''

میں نے ایک بندھے ہوئے انسان کی طرح اٹھ کر بتی بھی بجھادی۔ باہر بارش زوروں سے پڑ رہی تھی۔ بارش کا ریلہ پھوار بن کر کمرے میں بھی آ جاتا۔ بادل کی سیاہی اور گہری ہوگئی تھی۔ درخت تیز ہوا میں جھکے جاتے تھے۔ سائیں سائیں کے شور سے فضا بھری ہوئی تھی۔ کتنی ڈراؤنی رات تھی۔

میں خاموشی کے بوجھ تلے اپنے دل کو دَبتے اور سکڑتے محسوس کر رہا تھا۔ چھتوں پر سے پانی نالیوں کے راستے زور سے زمین پر گر رہا تھا۔ ہم دونوں صداؤں میں گھرے ہوئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا زندگی کا ایک چکر ہے۔ سمندر زمین کی آغوش میں لیٹا رہتا ہے اور کبھی سمندر آسمان کو چھونے لگتا ہے۔ ہمارے سروں پر گرتا ہے جیسے روح ایک جنم سے دوسرے اور ایک سے دوسرے چکر میں گردش کرتی رہتی ہے۔ مجھے نروان' مکتی اور آتما کے سارے ڈھکوسلے لگ رہے تھے اور بیک وقت میں سب پر یقین بھی رکھتا تھا۔

''دنیا۔'' میں نے اندھیرے میں کانپ کر کہا۔ ''میں بتی جلانا چاہتا ہوں' اندھیرے میں گھبرا گیا ہوں۔''

ہنس کر بولی: ''جلالو تمہیں تاریکی سے ڈر لگتا ہوگا۔ تم نے روشنیوں میں جینا سیکھا ہے۔ تمہیں کبھی اندھیرے سے واسطہ نہیں پڑا۔'' اس کی آواز کا طنز ایک نشتر کی طرح میرے دل کو چیر گیا۔

میں نے بتی جلائی۔ برآمدے کے ستون کے ساتھ لپٹی عشقِ پیچاں کی بیل سے ایک پھول ٹوٹ کر ہوا کے ساتھ کمرے کے اندر آ گیا تھا اور اب پتھریلے فرش پر لڑھک رہا تھا۔ کاسنی پھول' ننھا سا کانپتا ہوا تازہ ٹوٹا ہوا پھول۔

دنیا نے دیکھا تو بولی: ''بے چارہ پھول ہوا کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا سکا۔ لاؤ اسے مجھے دو۔'' میں نے پھول اسے پکڑا دیا۔ دیر تک اسے اپنے ناک سے لگائے وہ اس موہوم خوشبو کو سونگھنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر بولی۔ ''ذرا سی خوشبو تھی وہ بھی میں نے سونگھ لی ہے۔ کل تک یہ خوشبو اس بند پھول میں تڑپ رہی ہوگی۔ آج اسے زندگی کے راز کا پتہ لگ گیا ہے۔''

میں نے کہا: ''زندگی کا راز کیا ہے جو پھول کی سمجھ میں آ گیا ہے۔''

بولی: ''کتنے بھولے بنتے ہو ارے تم کو تو مجھ سے بہت زیادہ باتیں معلوم ہیں۔ زندگی کا راز میں کیا بتاؤں۔ اس پھول سے پوچھو۔ میں نے پھول پکڑ لیا۔ کیا پھول کا ٹوٹنا ہی اس کی زندگی کا راز تھا؟''

''نہیں اس کی خوشبو پھیل کر اب کائنات کی ان باقی خوشبوؤں میں مل گئی ہے۔ اس کی پتیوں میں بند گیت اب کھل کر ناچ کے ان چکروں میں مل گئے جو ہوا کے پاؤں میں ہیں۔ اب پھول آزاد ہو گیا ہے۔ ایک بیل سے چھٹ کر وہ زندگی کی وسیع گھن گرج میں مل گیا ہے۔ کیوں میں نے کوئی جھوٹ کہا ہے؟''

کھانسی کا دورہ زور سے پڑا اور وہ نڈھال ہو کر بستر پر گر گئی۔ میں نے کمبلوں سے اسے ڈھانپ دیا۔ کھڑکی بند کر دی اور دروازے کو بھی۔ وہ متواتر کھانستی جا رہی تھی۔ اس کا سانس اکھڑنے لگا۔ میں ڈر گیا۔

اسے دوائی پلانی چاہی تو اس نے سر ہلا کر پینے سے انکار کر دیا۔ بولی: ''کیا ہی اچھا ہوتا میں بھگوان کا کوئی بھجن سن سکتی۔ آج دادی ماں کے دیے ہوئے بھگوان کی روشنی سے میری آنکھیں ٹکرا نہیں سکیں۔'' وہ زور زور سے کانپ رہی تھی اور اس کا سانس اور زیادہ بگڑ رہا تھا۔

میں ڈر گیا اور ڈیوٹی پر نرس کو جا کر میں نے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کہا۔

دنیا بولی: ''تم یہ سب دوڑ دھوپ کس لیے کر رہے ہو۔ کیا مجھے سکون سے مرنے بھی نہ دو گے۔ اب تم ڈاکٹروں اور نرسوں کو بلا کر میرے گرد اکٹھا کرو گے کہ جب میں مرنا چاہوں تو تم بھی مجھ سے دور ہو۔ میں غیر لوگوں کے سامنے نہیں مروں گی' مجھے اپنے اور بھگوان کی آنکھ کے نور کے سامنے مرنے دو' میں منت کرتی ہوں بھیا۔''

''تم بولو نہیں دینو بس تھوڑی دیر میں تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

وہ ہنس کر چپ ہو گئی اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ اس کے چہرے پر سانس کے رکنے کا کرب اور آنے والی موت کی مسکان روشنی اور اندھیرے کی دوڑ کی طرح بڑھ اور چھپ رہی تھی۔

ڈاکٹر نے اپنا رین کوٹ اتار کر نرس کو پکڑاتے ہوئے کمرے میں آ کر کہا: ''آج رات مریض کی حالت سدھر گئی تو پھر ٹھیک ہونے کے امکانات ہیں'' اور پھر وہ چپ ہو گیا۔ ان کہی باتیں نصیب کا فیصلہ بن کر خود ہی بول اٹھتی ہیں۔

دنیا چپ چاپ لیٹی تھی۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد بھی اسی طرح لیٹی رہی۔ بارش رک گئی تھی۔ بادل تیزی سے چاند کے سامنے سے اڑ رہے تھے۔ تیز تیز جلد جلد جیسے بڑے بڑے جن اپنی پریوں کو اٹھائے بھاگے جا رہے ہوں۔ بادلوں کے کنارے روپہلی گوٹوں کی طرح چمک رہے تھے اور رات بھاگ رہی تھی۔ میں گھڑی گھڑی اٹھ کر اس کی نبض کو چھوتا اور اس کی پیشانی پر اپنا

ہاتھ رکھتا۔ وہ صرف مسکرا دیتی، جیسے پھول صبح کی خوشبو کے لگنے سے مسکرانے لگتا تھا۔ نہ جانے اس کے چہرے پر اس سفیدی میں سرخی کہاں سے آ گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ آج اسے بہاری یاد نہیں آ رہا۔ کیا اسے اپنا بچہ یاد نہیں آ رہا۔ وہ ان تمام یادوں سے بچنے کے لیے زندگی اور موت کی باتیں کر رہی ہے۔ وہ پھولوں اور ہواؤں کی باتیں کر رہی ہے۔ اس کے جی میں آج رات جانے کون سے طوفان ہیں۔ کون سی اَن کہی باتیں ہیں، میں اس کا بھائی ہوں پر دل کی باتیں کون جان سکتا ہے؟

اور پھر جب صبح کو اسپتال کے قریب مندر میں کیرتن ہو رہا تھا۔ دور مسجدوں میں اذانیں ہو رہی تھیں۔ دنیا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اس کی نگاہوں میں الوداعی مسکراہٹ حسرت اور احسان مندی کی نرمی تھی۔ میں ان نظروں کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ میری اپنی دینو میری اکلوتی بہن میں ان نظروں کا مطلب سمجھتا تھا۔ میں نے اس کا خشک ہاتھ، ہاتھ میں لے لیا اور دنیا نے کہا: ''اچھا بھیا۔'' اس کی آنکھوں کی تاریکی بھگوان کی آنکھوں کی تاریکی سے مل گئی۔ دنیا میری اپنی ماں جائی بہن جو پانچ سال کے بعد ایک خوشگوار شام کو مجھے ملی تھی، مجھ سے بچھڑ گئی۔

دنیا مر گئی مگر کرشن گوپال بہاری کو لے کر نہ آیا۔ کوئی اس کے سسرال سے اسے لینے نہیں آیا۔ میں نے ایک اور تار دیا اور ہم زندہ دنیا کی جگہ ایک ہڈیوں کے ڈھانچے کو اسپتال کے وارڈ سے نکال کر گھر لے آئے۔ وہاں کمرے میں کھلی کھڑکیوں سے ہوائیں آج بھی اندر آتی ہوں گی۔ پھول آج بھی ٹوٹ کر کمرے کے فرش پر لڑھکتے ہوں گے اور زندگی کا کارواں رواں دواں آج بھی چلتا ہے مگر دینو بھگوان کی آنکھوں کی سیاہی میں چھپ گئی۔ میں کتنا اکیلا ہوں۔ کبھی کبھار بارش کے ریلے کے ساتھ ایک انجان خوشبو میرے گرد پھرنے لگتی ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ خوشبو اس دنیا کی نہیں ہے۔ وہ خوشبو پھول کی خوشبو کی طرح دنیا کی ہے جو زندگی کے اس بڑے دائرے میں گھومتی ہے جو آزاد ہے مگر میں پوچھتا ہوں اس ایک زندگی نے اس کے ساتھ کیا وفا کی؟ دنیا نے کیا گناہ کیا تھا۔ بھگوان یا ہماری ساری زندگی کی ساری بنیاد ہی سرے سے غلط ہے۔ ہمارے رواج، ہماری اقدار، ہمارا معاشرہ، غلطی کس میں ہے، یہ کون جانتا ہے؟

کئی مہینوں کے بعد کنول کماری ٹھاکر اور پھر میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ اس کے بہت بار بلانے پر میں آج آیا تھا۔ دنیا کے مرنے کے بعد وہ پُرسے میں بھی ہمارے گھر نہیں آئی تھی اور میں اس سے زیادہ نہیں چاہتا تھا۔ میں نے وہ کاغذات بھی بنا دیکھے اسے واپس کر دیئے تھے اور اس

لیے آج میں خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھ بھی رہا تھا۔ میں اس سے بولنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر میں آ گیا تھا۔ وہ بھی خاموش تھی۔ ہمیشہ کی ذہین اور بات کو بڑی تیزی سے پلٹنے والی کنول کو آج پتہ نہیں چل رہا تھا۔ وہ مجھ سے کیا کہے۔ میں برآمدے کے سامنے کیاریوں میں اُگے ہوئے پھولوں کو دیکھ رہا تھا جن پر تتلیاں آہستہ آہستہ اڑ رہی تھیں۔ فضا پر ایک کیف اور غنودگی طاری تھی۔ بھنورے پھولوں پر بیٹھے رس چوس رہے تھے۔ ہوا بڑی نرمی سے جسم کو چھو رہی تھی۔ آج کالج کی چھٹی کا دن تھا۔ بڑی سی عمارت پر جھکا ہوا نیلا آسمان بہت نیلا لگ رہا تھا اور کنول کی سفید ساڑھی کا پلو بڑی آہستگی سے کرسی سے لٹکتا ہوا ہل رہا تھا۔ وہ تکلیف دہ خاموشی دونوں پر طاری تھی جس کو توڑنے کا میں کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا اور جسے توڑنے کی کوشش کرنے کے باوجود، وہ ایک کشمکش میں تھی۔

نیرا نے آ کر کہا: ''چائے نہیں پئیں گی بی بی؟''

کنول نے مجھ سے پوچھا: ''چائے پیجیے گا یا شربت؟''

میں نے کہا: ''میں کچھ نہیں پیوں گا۔''

بولی: ''کیوں نہیں پئیں گے؟''

میں نے کہا: ''میری مرضی۔''

بولی: ''یہاں آپ اپنی مرضی کے لیے آئے ہیں کیا؟''

میں نے کہا: ''میں پابند بھی تو نہیں ہوں اور پھر آپ کا پابند تو بالکل نہیں ہوں۔''

کہنے لگی: ''خوب ہے نیرا، دونوں چیزیں لے آؤ، جوان کا جی چاہے گا، پی لیں گے۔''

نیرا چلی گئی۔

کنول بولی: ''آپ مجھ سے ناراض ہیں کیا؟''

میں نے کہا: ''ناراض ہونے کا حق میں نہیں رکھتا، بلایا ہوا آیا ہوں، کہیے کیا کہنا ہے۔''

اس نے کرسی کی پشت سے سر لگا لیا بولی۔ ''ہم پر حق تو کسی کو بھی نہیں ہے۔ یہ حق میں نے اپنے باپ اور بھائی کو بھی نہیں دیا تھا۔ اس امانت کی میں اکیلی محافظ ہوں۔ پھر بھی آج جی چاہتا ہے آپ ناراض ہو لیں میں قصوروار ہوں۔''

میں نے کہا: ''آپ نے کیا قصور کیا ہے۔ البتہ میں ہی اس قابل نہیں تھا کہ آپ کی ہمدردیاں میرے لیے ہوتیں۔''

بولی: ''ہمدردی تو ایک نشتر ہے جو زخم کو اور بھی کریدتا ہے۔ میں ہمدردیوں کی قائل ہی نہیں ہوں۔''

میں نے کہا: ''جس بات کی قائل آپ نہیں ہیں اس کا وجود تو دنیا سے ناپید نہیں ہوسکتا۔ آپ کے نظریے وقتی طور پر صحیح ہوسکتے ہیں۔ مگر اب قانون نہیں بن سکتے۔ زندگی میں ایک دوسرے کے سہارے سے دن بسر ہوتے ہیں۔ میں نے بے پرواہ ہوکر دیکھ لیا ہے۔ اس نقصان کی تلافی میں نہیں کرسکتا' اس لیے میں اب بدل رہا ہوں۔ اپنی زندگی کی راہ کو ہموار کررہا ہوں۔ جس راہ پر ہم پہلے چلتے تھے' وہ اتنی الجھی ہوئی نہیں ہوتی تھی۔ اس انفرادیت' ذاتی نظریوں اور چیزوں کے متعلق اپنی اپنی رائے نے ساری زندگی کو برباد کردیا ہے۔ وہ اپنا پن جو ہر دل میں دوسرے کے لیے تھا' وہ اب کہیں نظر نہیں آتا۔ میں آپ کے خیالات کا قائل نہیں۔''

کنول سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔ بولی۔ ''میں نے آپ کو بحث کرنے کے لیے نہیں بلایا۔ میں آپ سے ایک صلاح لینا چاہتی ہوں۔ ایک مشکل کام میں مدد' آپ کے اپنے اخبار ہیں۔ آپ کے خیالات کی قدر ہوتی ہے اور میں معاشرے کے موجودہ نقائص پر ایک پُرزور تحریک چلانا چاہتی ہوں' اس میں آپ کی مدد درکار ہے۔''

میں نے کہا: ''معاشرے کی ان غلطیوں نے میری بہن کی جان لی۔ مجھ سے زیادہ کوئی موجودہ نظامِ حیات کا دشمن نہیں۔ اگر آپ کوئی سلسلہ شروع کردیں گی تو میری تمام تر کوششیں آپ کے ساتھ ہیں۔''

بولی: ''یہ سن کر مجھے دلی رنج ہوا ہے کہ آپ کی بہن کو ہمارے سماج کے غلط اصولوں نے برباد کیا۔ میں خود ہی حاضر ہوتی مگر زمانہ بہت برا ہے۔ اس سے نہ ڈرتے ہوئے بھی ڈرنا پڑتا ہے اور جب زمانے کی زبان کُھل جائے' جب دنیا الزامات گھڑنا شروع کردے تو کوئی روک نہیں سکتا۔''

ان سب مہینوں کے بعد مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ کنول کی اپنی مجبوریاں ہیں اور وہ اپنی تمام طاقتوں اور ترقی پسند نظریوں کے باوجود ایک لڑکی تھی جس کی عزت ایک نازک حباب کی طرح عوام کی زبانوں کا شکار ہوسکتی تھی۔ پہلی بار مجھے دنیا' کنول اور بینا ایک جیسی اور ایک ہی سطح پر نظر آئیں۔ لڑکیاں' بے بس اور معصوم روحیں۔ کنول نے اپنے بازوؤں کی طاقت کے سہارے عام زندگی سے اونچا اڑنے کی کوشش کی تھی' مگر پندرہ سالوں کے تجربے نے اس پختگی کے رنگ کے ساتھ ساتھ اسے زیادہ تجربہ کار اور محتاط بنادیا تھا۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ''بینا نے مجھے آپ کی بہن کی زندگی کی جو ادھوری کہانی سنائی۔ اس کی خالی جگہوں کو پُر کرکے میں نے جو کہانی ترتیب دی ہے' وہ بڑا دکھ دینے والی ہے۔ کیا دنیا کے سسرال سے آج تک کوئی نہیں آیا۔''

میں نے کہا۔ ''اس کے مرنے کے پانچ دن بعد اس کی ساس اور پتی کرشن گوپال آئے تھے۔ مجھ سے ناراض تھے کہ میں نے بجائے اسپتال میں داخل کرنے کے اسے واپس کیوں نہیں بھیج دیا۔ میں انہیں کیا کہتا' خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ دنیا نے ایک زرخرید لونڈی کی طرح سسرال والوں کی خدمت کی اور دن رات کے کام نے جب اس میں ایک بچے کی سی طاقت بھی نہ رہنے دی تو اسے مار کر گھر سے نکال دیا گیا۔''

میں باتیں کررہا تھا اور کنول کی آنکھوں سے آنسو گررہے تھے۔

بولی۔ ''پھر تم اس معاشرے اور نظامِ حیات کو گھسیٹ رہے ہو جس میں تمہاری اپنی بہن ان سختیوں کے ساتھ ماردی گئی۔ اصل میں وہ تو بہت پہلے مرچکی تھی۔ وہ تو اس دن ہی مرگئی تھی جس دن تم نے اس کو بیاہ دیا۔''

میں نے کہا۔ ''باقی لوگوں کی بیٹیاں بھی زندہ رہتی ہیں۔ ان کی قسمت میں خوشیاں ہوتی ہیں۔ میری اپنی بیوی نروپما ہے۔ کیا وہ اتنی دکھی ہے؟ آپ اپنے گرد اتنے لوگوں کو دیکھتی ہیں۔ کیا وہ سب اتنے ہی دکھی ہیں۔ دنیا کی قسمت ہی پھوٹ گئی تھی۔ میں اپنی مری ہوئی ماں کے سر کوئی الزام دینا نہیں چاہتا۔ ماں نے کرشن گوپال کے باپ کی دولت سے مرعوب ہوکر یہ نہیں سوچا تھا کہ اتنا بڑا خاندان ہے اور اکیلی دنیا ہے۔''

اصل میں مجھے معلوم نہیں ہورہا تھا کہ میں کنول سے کیا کہوں۔ دکھ جو اتنے دنوں میں کچھ کم ہوگیا تھا۔ اب پھر سوتوں کی طرح ابل رہا تھا۔ میرا سر چکرا گیا تھا۔ میں دوبارہ اتنا ہی پریشان ہوگیا تھا' جتنا دنیا کے مرنے کے دن تھا۔

کنول نے کہا۔ ''زندگی کی بنیادیں بدلنے کی ضرورت ہے' کام کی اور کوشش کی ضرورت ہے۔ عام ذہنی سطح کو بدلنے کی ضرورت ہے اور میں یہ کام کروں گی۔ دنیا کو تو آپ کا سہارا مل گیا اور نادار گھر کو جسے آج سے پندرہ سال پہلے میں نے چلانا چاہا تھا اور جسے شوبھا بینر جی نے واویلا مچا کر بند کروادیا تھا' اس میں دنیا کی طرح کئی اور معصوم عورتیں مصیبت کے دن کاٹ رہی تھیں۔ نہ جانے آج وہ کہاں گئی ہیں۔ ان پندرہ سالوں میں مجھ پر کیا بیتی اور آپ کی طرح کے مردوں کی

قلابازیاں کھاتی ذہنیتوں کے کرشمے میں نے نہ دیکھے۔ آپ کو کیا معلوم' اصل میں جینا چاہو تو کوئی یہاں جینے نہیں دیتا۔ یہاں تو مرنا بھی مشکل ہے۔ یہاں تو زندگی ایک عذاب بن گئی ہے۔ اخلاق کی گرتی ہوئی دیوار اس کو سنبھالنے کی ضرورت ہے۔''

وہ خاموش ہو گئی تھی۔

نیرا چائے لے کر آ گئی۔

کنول بولی۔ ''میں نے کبھی آپ سے نہیں کہا' کہ یہ نیرا کہاں سے میرے پاس آئی اور کون ہے۔ اصل میں آپ اصلاح کے معاملے میں میرے نزدیک نہیں ہوئے اور نہ ہی آپ نے ان خیالات میں کبھی کوئی دلچسپی لینے کی کوشش کی ہے ورنہ آج سے بہت پہلے میں آپ کو بتا دیتی کہ نیرا کون ہے اور ایسی ہی ہزاروں مایوس اور بے کس عورتیں کس قصرِ مذلت میں گر جاتی ہیں۔ آپ دنیا سے دنیا بہن کا انتقام لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کیا آپ کام کر کے اپنی باقی بہنوں کو اس عذاب سے چھٹکارا دلوائیں گے۔ اپنے دل کو تھوڑا سا وسیع کیجئے۔ ہمارے گرد اس مرتی مارتی دنیا میں جو کچھ بھی ہے' اس کو درست کرنے کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''میں تیار ہوں مگر کام کیا ہو گا کہہ نہیں سکتا۔ اپنے کمزور اور مایوس دل کے ساتھ طاقت کہاں سے لاؤں؟''

کنول کہنے لگی۔ ''طاقت آپ مجھ سے لیجئے۔ کام میں کروں گی' آپ اپنے نام سے اس تحریک کو فروغ دیجئے۔ میں منظرِ عام پر جانا نہیں چاہتی۔ میں خاموشی سے کام کرنے کی خواہاں ہوں۔''

برآمدے میں بیٹھے میں اور کنول معاشرے اور اصلاح کی باتیں کر رہے تھے۔ پر دنیا کے لیے یہ کس فائدے کی باتیں تھیں اور سامنے ایک خشک پیڑ کی ننگی شاخوں پر چڑیاں بیٹھی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا' ہمارے گھروں کی لڑکیاں چڑیاں ہیں' جو شروع سے آخر تک زندگی کی ایک تنہائی سے دوسری تنگ پیڑوں پر بیٹھی رہتی ہیں' خاموش' چپ چاپ' منتظر۔ مشرق کی زندگی کا یہ چیختا چلاتا نظریوں اور رواجوں کا ایک سمندر جو ان کے گرد موجیں مارتا ہے' غلطی کہاں پر ہے اور ہم اس دائرے میں مصیبتوں کے کون سے نقطے کے سامنے ہیں۔ ہماری زندگی کا مجموعی انتشار اور بے چینی' سیاستوں کی تحریکیں' ملک کی آزادی کی تحریکیں' ہندو مسلم فساد کی تحریکیں' ہمارا ملک ایک مجسم تحریک بن کر رہ گیا تھا۔ ایک ایسا اضطراب تھا جو کنول کماری ٹھاکر کے گرد چکر لگاتا تھا مگر کنول کو چھو نہیں

پاتا تھا۔ کیا وہ اس ساری زندگی کا محور تھی جو قائم ہے۔ حرکت نہیں کرتا اور اپنی جگہ پر مستقل ہے۔

کنول کرسی سے اٹھ کر برآمدے کی سیڑھی پر کھڑی تھی۔ اس کی چوٹی اسی ناگن سی چمک سے لہرا رہی تھی اور سفید ساڑھی کا لمبا پلو زمین کو چھو رہا تھا۔ ہم دونوں باتوں کے بعد خاموش رہے۔ جیسے کچھ سوچ رہے ہوں یا کہنے کے لیے کچھ باقی نہ رہا ہو۔

یکایک وہ میری طرف مڑی اور کہنے لگی۔ ''کرشنا سے ملو گے؟''

''کرشنا! میں کرشنا سے ضرور ملوں گا مگر وہ یہاں کہاں؟'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''نیرا!'' کنول نے دروازے میں کھڑے ہو کر پکارا۔ ''بڑی بی بی کو بھیج دو۔''

کرشنا کیوں یہاں پر آئی' وہ کیوں یہاں پر کنول کے گھر میں تھی' وہ کیسے یہاں پہنچی۔ یہ سوال میرے دماغ میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے اور میں کرسی کی سختی اور پشت کی سردی کو اپنے جسم میں لہروں کی طرح تحلیل کرتے محسوس کر رہا تھا۔ ایک ایسی بے چینی جو میں نے اس سے پہلے دنیا کے مرنے پر بھی محسوس نہیں کی تھی' جسم کی نسوں میں اینٹھن بن رہی تھی۔

دروازے کا پردہ اٹھا کر کرشنا برآمدے میں آ گئی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ پندرہ سال اگر کنول پر کوئی اثر نہیں کر سکے تھے تو یہ ان کی بے ہمتی ہے ورنہ کرشنا کے سفید ہوتے ہوئے بالوں اور لٹے ہوئے حسن میں پندرہ بہاروں کی جھاڑی ہوئی خاک اور پندرہ خزاؤں کی خشک سالی اور زیادہ واضح تھی۔ وہ لٹا ہوا شباب اور ویران چہرہ' ان آنکھوں کی حیرت اور مایوسی۔ ایک ہنسی جو دل سے نہیں بس ہونٹوں پر ہمیشہ منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک سوال جو پیشانی پر لکھا جاتا ہے اور جس کا جواب کوئی بھی نہیں دے سکتا۔

میں نے اٹھ کر اس کے قدم چھو لیے۔ کنول اسی طرح ہماری طرف پشت کیے برآمدے کی سیڑھی پر رکھے ہوئے فرن کی پتیوں پر جھکی ہوئی تھی۔ میں حساس ہوں پر اتنا نہیں کہ ہر گھڑی میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگیں۔ کرشنا کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے میں لٹی پٹی دنیا کو کمزور اور مایوس دنیا کو اپنی بہن کو پھر سے اپنے سامنے زندہ دیکھ رہا ہوں اور میرا دل گھبرا گیا۔

''بیٹھ جائیے بھیا۔'' مجھے کرشنا کی آواز آئی۔ وہ دوسری کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔

میں اس سے کیا کہتا' میں اس سے کیا پوچھتا' میں اپنے سامنے زمین کو دیکھ رہا تھا۔ برآمدے کی صاف زمین پر بوگن بیلا کے بے بو پھولوں کی پتیاں بکھری تھیں جیسے رخساروں کی سرخی خاک میں ملی ہوئی پاؤں تلے روندی ہوئی۔ میری نظروں کے دائرے میں کرشنا کے پاؤں

تھے۔ پاؤں کی انگلیاں تھیں۔ سفید دھوتی کا پلو تھا۔ بے کنارے کی سفید سے دھوؤں والی دھوتی میری نگاہیں زمین کو نہیں چھو سکتی تھیں۔ میں کرشنا کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت اپنے میں نہیں پاتا تھا۔

ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ کنول مڑی اور بولی۔ ''تم بات کیوں نہیں کرتے۔'' اس کی ہنسی بڑی تلخ اور بات میں زہر ملا ہوا تھا' نہ جانے اس کے دل میں کون سے نشتر تھے جو میرے دل میں چبھونا چاہتی تھی۔

کرشنا نے کہا: ''تم ہی کوئی بات کرو نا' تم اتنی خاموش ہو اور پیٹھ موڑ کر کیوں کھڑی ہو۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔''

کنول نے کرسی کو زور سے دور گھسیٹا اور بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''سمجھ نہیں آتا کیا بات کروں۔ کبھی کبھار تو لگتا ہے جیسے باتیں ختم ہو گئی ہیں۔ کرشنا تم سناؤ زندگی کی سختیوں نے تم کو بہت کٹھور کر دیا ہوگا۔ میں تو نرم دل ہوں' محسوس کرتی ہوں۔''

کرشنا ہنس پڑی۔ بولی۔ ''جب تک انسان انسان رہتا ہے وہ محسوس کرتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ پتھر بن جاتا ہے۔ پھر زندگی کی خزاں اور اس کی بہاریں اس پر کوئی اثر نہیں کر پاتیں۔ سختیاں انسان کے دل کو اتنا نرم کر دیتی ہیں کہ وہ پگھل کر بہہ جاتا ہے یا پھر اسے پتھر ہی بنا دیتی ہیں اور مجھے تو اب کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ ان سالوں نے میرے بالوں کی سیاہی کو سفیدی میں بدل دیا ہے۔ میرے چہرے کی نرمی کو ذرا درشت بنا دیا ہے۔''

''بس بتاؤ' میں کیا باتیں کروں کنول رانی۔''

کنول کی آنکھوں میں' میں نے پہلی بار آنسو دیکھے۔ چند لمحے پہلے میں جس عورت کو پتھر سمجھ رہا تھا' وہ عورت رو رہی تھی۔ کرشنا کی بے کنارے کی دھوتی ہل رہی تھی اور وہ پھولوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے کسی کی آنکھیں پتھرا گئی ہوں اور وہ ایک ہی جانب دیکھتا جائے۔ جیسے مندر میں مورتی کی آنکھیں ایک ہی طرف دیکھتے دیکھتے وہیں جم گئی ہوں۔

کنول نے پھر کہا: ''کرشنا کو دیکھتے ہیں نا۔ شکر کیجیے دنیا ایک عذاب سے چھوٹ گئی۔ اس نے زندگی کی مصیبتوں کے مقابلے میں اپنے کو گرا دیا اور سختیاں اس کو روندتی ہوئی نکل گئیں۔ کرشنا سخت جان تھی بچ گئی۔ اس نے مصیبتوں کا مقابلہ کرنا چاہا اور اس کا دل بھی زخمی ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں مفلوج ہو گئے۔ یہ ایک بندھی ہوئی ذلیل عورت کی طرح زندگی کے دس سال گزار

آئی ہے۔ آپ جاننا چاہیں گے کہ اس نے یہ سال کہاں گزارے۔ میرے پاس تو کرشنا آج صبح ہی پہنچی ہے۔''

میرے پاس اس بات کا کیا جواب تھا۔

کرشنا اسی طرح اپنے سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ شاید دل کبھی پتھر نہیں بن سکتا اور دکھوں کے ذکر سے دکھ پھر تازہ ہو جاتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ان باتوں سے کیا سمجھوں اور موت سے بڑا عذاب کوئی ہو سکتا ہے کیا؟

کرشنا نے کہا: ''میں کسی کی بہن نہیں ہوں۔ کوئی میرے لیے آنسو کیوں بہائے۔ میں کسی کی بیٹی نہیں ہوں' کوئی میرے لیے بے قرار کیوں ہو' میں کسی کی ماں نہیں ہوں کوئی میرے لیے بے قرار کیوں ہو۔ میں اس دنیا میں ایک آوارہ روح ہوں' کوئی بھی یہ کیسے جان سکتا ہے کہ میں نے دس سال کس عذاب میں اور کہاں گزارے ہیں۔''

''یوں نہ کہو کرشنا۔'' کنول نے اٹھ کر کندھے سے پکڑ لیا۔ ''اب تو مصیبت ختم ہوئی اور اب تمہاری ہمتیں جواب دے رہی ہیں۔ اب تم مایوس ہو رہی ہو۔ جب وہ دور ختم ہو گیا۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ تم اس طرح اپنی مصیبتوں کو یاد کر کے بے حال ہونے لگو۔ میں تو تمہاری اس ہمت کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنا چاہتی ہوں۔ میں اور تم مل کر ایک کام کریں گے۔ تمہاری سختیاں ایک سبق ہیں' تم کس لیے ناامید ہوتی ہو۔''

کرشنا نے پکڑ کر کنول کو اپنے سامنے کر لیا اور بولی۔ ''ناامید کس لیے ہوئی ہو۔ یہ پوچھو تمہیں امید کاہے کی ہے؟''

میں پریشان ہو رہا تھا کہ کرشنا کی ویران شکل میں مجھے اپنی دنیا کی روح نظر آ رہی تھی۔ یہ پہیلیاں میں بوجھ نہیں سکتا تھا۔

اور پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''بھیا میں نے یہ دس سال جیل کی تنہائی میں کاٹے ہیں' عذاب میں کاٹے ہیں اور آخر میں کنول کماری ٹھا کر کہتی ہے میں ناامید کیوں ہوں۔ کیا امید رہ گئی ہے میرے لیے۔ مستقبل میں کیا پڑا ہے میرے لیے؟''

میں بیٹھا تھا' کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا ''کس جیل میں' اور کس لیے؟''

کرشنا ہنس پڑی بولی۔ ''آپ بچوں کی طرح پریشان ہو گئے جیل کا نام سن کر۔ یہ دنیا بھی ایک بڑا جیل خانہ ہے اور چھوٹے پیمانے پر اس کو کال کوٹھری کہہ لیجیے۔'' اس کی ہنسی بڑی تلخ تھی۔

"مگر کیوں؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"اس لیے کہ میں نے رویندر کمار کو قتل کر دیا تھا۔ روز روز کی سختیوں سے تنگ آ کر میں نے رویندر کمار کو جو میرا پتی دیوتا تھا' مار دیا تھا۔ پھر مجھ پر مقدمہ چلا اور عورت سمجھ کر میری جان بخشی اس طرح کی گئی کہ مجھے 14 سال کی قید ملی اور یہ سال میں نے جیل میں بسر کیے اور اتنی لمبی چوڑی دنیا میں سوائے کنول کے میرا کون ہوتا' اس لیے میں یہاں چلی آئی۔ یہی میری کہانی ہے۔ مجھے اور تو کچھ نہیں کہنا' کنولا رانی تم لوگوں نے چائے بھی نہیں پی۔ بیٹھ جاؤ میں تمہیں چائے بنا کر دوں۔"

میرے جسم میں سکت نہ تھی اور کرشنا نے چائے کی پیالی بنا کر جب میرے ہاتھ میں پکڑانا چاہی تو اس کی انگلیوں کی سختی میرے جسم میں پھیل گئی۔

"ارے بھائی تم لوگ تو پتھر بن گئے ہو۔ زندگی نے کسی کی جھولی میں ہمت ڈالی ہے اور کسی کی جھولی میں آرام۔ میں تھی ہی کس قابل' سوائے اس کے میرے ساتھ اور کیا سلوک ہو سکتا تھا۔ کاش وہ لمحہ میری زندگی میں نہ آتا جب میں نے عورتوں کی بیداری کا کام کرتے ہوئے رویندر کو دیکھا تھا۔ وہ لمحہ زندگی کے سمندر میں ڈالے ہوئے ایک پتھر کی طرح لامتناہی لہریں پیدا کر کے غائب ہو گیا اور میں ان لہروں میں ان چکروں میں گھر گئی۔ میں اس لمحے کو بھول سکتی ہوں اور نہ ہی ان لہروں سے نجات حاصل کر سکتی ہوں۔"

پیالوں پر مکھیاں بھنبھناتی رہیں۔ کرشنا نے کہا "کتنی مدتوں کے بعد یہ چائے نصیب ہوئی ہے۔ خدا کی کتنی بڑی نعمت ہے یہ چائے۔ اس کو ضائع نہ کرو۔ دس سال کے طویل عرصے کے بعد اگر یہ چائے مل گئی تو بہت بڑی نعمت ہے اور آخر ہم نے بھگوان کے ہاں کوئی جمع تو کروا نہیں رکھا' وہ جو دے دے اس کی دین ہے' ہم گلہ کریں تو کس سے' الزام دیں تو کس کے سر؟"

کنول کی آنکھوں میں تازہ آنسو آ گئے۔

کرشنا نے کہا: "کنولا رانی روتی کیوں ہو۔ تم نے اپنی سی ہمت کی تو تھی مگر تم اسی لپیٹ میں آ گئیں۔ اصل میں دنیا کے مکروفریب سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ دنیا تمہیں تمہاری نگاہوں میں خود مجرم بنا دے گی۔ تم بھلے کے لیے جو کام کرنا چاہو وہ آخر میں تمہیں معلوم ہو گا' ایک غلطی تھی۔"

اور مجھے عرصے پہلے کی ایک رات یاد آ رہی تھی۔ جب بارش مسلسل ہو رہی تھی اور میں کرشنا کے پاس آتش دان کے قریب قالین پر بیٹھا تھا اور ایک ننھا سا بچہ مٹھیاں بند کیے سویا ہوا تھا جو کبھی مسکرا رہا تھا' کبھی اس کے چہرے پر خوابوں کے سائے دھندلے ہو جاتے تھے۔

اس ساری شام کرشنا ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی اور آج وہ مسلسل بول رہی تھی۔ خاموشی میں اس دن' اس کے دل کی آواز تھی۔ آج بھی فضا میں اس کی صدا تھی۔ اس دن بھی ہمارا موضوع سخن وہی تھا اور آج بھی کرشنا ہماری زندگیوں کے جزیرے کے گرد ایک نرم رو سمندر کی لہروں کی طرح رواں دواں تھی۔

کرشنا پھر بولی۔ "تم دونوں اتنے خاموش کیوں ہو؟ پہلی بار اس مصیبت کو مجسم دیکھ رہے ہو۔" وہ ہنس پڑی۔

"کرشنا بس کرو۔" کنول نے زور سے کہا۔ "آؤ کوئی اور باتیں کریں۔"

"کنولا انصاف کی بات ہے۔ میں اتنے سالوں بعد تمہیں ملی ہوں۔ مجھے یہی باتیں کرنے دو یا تم کوئی اپنی بات سناؤ اپنی سی کہو۔ تم نے یورپ کی زندگی کے پانچ سال کیسے گزارے تھے۔ آزاد فضا میں سانس لے کر وہاں کی یونیورسٹیوں کے روایتی کمروں کو دیکھ کر پہلی بار تم نے کیا محسوس کیا تھا؟"

"نیرا اور چائے لاؤ۔" کنول نے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر آواز دی۔

کرشنا نے کہا: "اب تمہاری نیرا بھی ڈھل رہی ہے۔ اس کی روح پر ایک بڑھاپا طاری ہے۔"

وہ ہمیشہ خوش رہنے والی الہڑ نیرا صبح سے بہت خوش ہے۔

"نہیں کرشنا' نیرا تو ویسی ہی ہے تم بدل گئی ہو۔"

"اچھا۔" کرشنا نے یوں کہا جیسے اسے کچھ سمجھ آ گئی ہو اور پھر وہ چپ ہو گئی۔ جیسے واپس اپنے خوابوں کے دیش میں چلی گئی ہو۔ کنول نے مجھے بتایا تھا کہ نیرا بھی کوئی ایسی مصیبت زدہ لڑکی ہے جو زمانے کے سیلاب میں بہتی بہتی اس کے پاس چلی آئی ہے اور جس کی زندگی کی حکایت عبرتناک ہے۔

دنیا' کرشنا' نیرا۔ کیا عورت کا وجود ہمارے معاشرے میں ایک ناسور ہے۔ عورت جو ہمیشہ رواں دواں ہماری زندگیوں میں انجام میں شریک اور ابتدا میں شامل رہی ہے' کیا وہ بہن اور بیٹی کی بجائے ایک زہر بن سکتی ہے اور ہمارے گرد یہ تلخیاں' غلطی کہاں ہے اور غلطی کیوں ہے۔ میں نے اپنی کتاب کو پھر سے ترتیب دینے کا ارادہ کر لیا۔ کنول ٹھیک ہی تو کہتی ہے کہ دُکھتے ہوئے ناسور کئی ہیں اور ان کی صحت مندی کا بار اٹھانے کے لیے کسی مرد کے کندھے چاہئیں۔ کنول نے

پہلے تحریکوں میں حصہ لے کر دیکھ لیا تھا۔ کام کرنے کا وہ طریق درست نہ تھا اور اسے پس منظر میں رہ کر تنظیم کرنی چاہیے۔ باقی کام میں کروں گا۔ میرا دل غم اور غصے سے کھول رہا تھا۔ مجھے اپنی دنیا بری طرح یاد آ رہی تھی اور یہ بات کنول ہمارے ہاں پُرسے میں نہیں آئی‘ میں بھول چکا تھا۔

بادل گھر آئے تھے۔ سفید بادلوں نے آسمان کو گدلا کر دیا تھا۔ بادلوں کے ننھے ٹکڑے کبوتروں کے نرم پروں کی طرح افق تک پھیلے ہوئے تھے اور کہیں بادلوں کے کنارے پہاڑوں کی طرح بلند تھے۔ کہیں گہرے غاروں اور نشیبی وادیوں کی صورتیں نمایاں تھیں۔ ریت کے بڑے بڑے ٹیلوں پر ہوا کے چلنے سے جو نقش و نگار بنتے ہیں‘ اسی طرح آسمان پر بھی ننھی ننھی لہریں تھیں۔ سفید چمکیلی بھربھری ریت کی سی لہریں جس پر پاؤں رکھو تو اندر ہی اندر دھنستے چلے جاؤ۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان سفید لہروں پر پڑی ریت پر چلوں مگر آسمان کے کنارے دور تھے اور میں کسی طرح بھی جنت کی وادیوں میں نہ جا سکتا تھا۔

سامنے کے درخت کی سوکھی شاخوں پر اور زیادہ چڑیاں جمع ہو گئی تھیں اور مسلسل بول رہی تھیں۔ ہوا کے ایک جھونکے کی طرح اڑ کر ایک سے دوسری شاخ پر اڑ کر بیٹھ جاتیں‘ چپ ہو جاتیں اور پھر بولنے لگتیں۔ پھول خوشبو کے بوجھ سے لدے ہوئے جھول رہے تھے اور بوگن بیلا کی پتیاں کاغذی پھولوں کی طرح برآمدے کے فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔

کرشنا نے کہا: ”کنول تمہارا بھگوان کدھر ہے اور وہ راگ کی دیوی کدھر ہے؟ آج میں نے انہیں آتش دان پر نہیں دیکھا۔“

کنول بولی۔ ”بھگوان تو سونے کے کمرے میں طاق میں براجمان ہیں اور راگ کی دیوی میرے پڑھنے کے کمرے میں ہے۔“

کرشنا نے کہا: ”میں نے سوچا تھا بھگوان بھی اب ریٹائر ہو گئے ہیں اور راگ کی دیوی کا کام ختم ہو چکا ہے۔“

کنول ہنس پڑی اور بولی۔ ”راگ دنیا میں اتنا ہے کہ میں اس کو اپنے کانوں سے سن سکتی ہوں۔ ویسے کیا فرق پڑتا ہے۔“

نیرا اور چائے لے آئی۔

کرشنا بولی۔ ”کیوں نیرا تمہارے گیت تو اب سننے ہی نہیں جاتے کیا انہیں بھول گئی ہو۔“

نیرا نے شرما کر منہ دوسری طرف پھیر لیا اور کرشنا میری طرف مخاطب ہو کر بولی۔ ”بھیا

نیرا کی آواز میں ایک جادو ہے۔ تم سنو تو مانو سنتے ہی جاؤ۔ اتنا رس ہے اس کے گلے میں۔“

”اچھا۔“ میں نے کچھ کہنے کے لیے کہا۔

کنول بولی۔ ”سننے کو جی چاہتا ہے کیا کرشنا؟“

کرشنا بولی۔ ”نہیں پھر کبھی سہی۔ آج تو میں نے یونہی کہا تھا۔ سالوں پہلے گھر میں نیرا کے بول دن رات سنے جاتے تھے اور بات سچ ہے اس کے گلے میں جتنا رس ہے‘ وہ کسی کے گلے میں نہیں۔“

کرشنا اور کنول اٹھ کھڑی ہو گئیں۔ ہوا اب تیزی سے چلنے لگی تھی اور سرخ پھولوں کی پتیاں ایک جھونکے کے ساتھ بکھر گئی تھیں۔ میں نے اجازت چاہی۔ میرا دل جانے کو نہیں چاہتا تھا مگر جانا ضروری تھا۔ دوپہر قریب تھی اور پھر بادل جھک آئے تھے۔ ان کا رنگ بدل گیا تھا‘ شاید بارش ہونے والی ہو۔

کنول بولی۔ ”پھر سوچ لیجیے گا۔ آپ کا اخبار اگر یہ کام کرے گا تو اس کا انجام بھی بخیر ہو سکتا ہے‘ ورنہ ساری عمر جو ناکامیاں میرے نصیب ہوئی ہیں‘ وہی ہمیشہ رہیں گی۔ گو میں ناکامیوں سے گھبراتی نہیں ہوں اور ملک کی باقی تحریکوں کی طرح میرے خیالوں کا انجام بھی ایک صدی کے بعد ہی ابھرے گا۔ پھر بھی کام کرنا تو ضروری ہے نا۔“

ہوا اور زور سے چل رہی تھی اور جب میں نکلا ہوں تو فضا میں نمی تھی۔ پانی کے قطرے اِکے دُکے گر رہے تھے۔

کالج سے شہر کو جانے والی سڑک پر مڑا ہوں تو ایک موٹر تیزی سے میرے قریب سے گزری اور پھر تھوڑی دور جا کر رک گئی۔ کسی عورت نے اپنے پھولے ہوئے بالوں والا سر باہر نکال کر کہا۔ ”ہیلو۔“

میں نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ شوبھا بینرجی مجسم مسکراہٹ بنی موٹر کا پٹ کھول کر نکل رہی تھیں۔

”آپ.....“ میرے منہ سے صرف اتنا نکل سکا۔

”ہاں میں۔ گھبرا کیوں گئے ہیں۔ اتنے سالوں میں مجھے بھول بھی گئے۔ میں شوبھا ہوں۔ شوبھا سرکار۔“

”باہر نکلیے۔ آپ کو ایک پرانے ساتھی سے ملاؤں۔ موہن بابو۔“

ایک شخص دروازہ کھول کر اترا اور ہاتھ میری طرف بڑھا کر کھڑا ہو گیا۔ شوبھا کہنے لگی۔

''یہ ہمارے دوست ہیں۔ میرے پتی کے دوست من موہن۔'' میں نے اپنا تعارف خود ہی کروا دیا۔

میرا مخاطب ایک جوان شخص تھا۔ کثرتِ شراب نوشی سے جس کی آنکھیں ایک خاص طرح کی ہو گئی تھیں۔ پپوٹے ڈھلک آئے تھے۔ نچلا ہونٹ بہت سرخ اور بے حد موٹا تھا۔ پان کی سرخی اس کے لبوں سے ہونٹوں کے کناروں کی طرف پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بڑھیا سوٹ پہنے تھا۔ اپنے آپ سے مطمئن اور نازاں۔ شوبھا نے کہا ''مجھے چاندنی میں تاج دیکھے مدتیں ہو گئی تھیں، آج موہن بابو آ رہے تھے، میں نے کہا ذرا ساتھ رہے گا، ان کے ہمراہ چلی چلتی ہوں۔ آج سارا دن گھومیں گے اور رات کو تاج دیکھ کر واپس ہو جائیں گے مگر بادل گھر آئے ہیں اور شاید میری تمنا پوری نہ ہو سکے۔ سنائیے کیا حال ہے؟ آپ ان دنوں جو اخبار چھوڑ کر گئے تو آج تک کہیں نظر ہی نہیں آئے۔ کنول کماری ٹھاکر کہاں ہیں؟'' وہ یہ کہہ کر ہنس پڑی۔ میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

خود ہی بولی۔ ''میں تو تحریکوں میں حصہ لیتے لیتے عاجز آ گئی ہوں۔ جلسوں کی صدارتیں، میٹنگیں، جان پر ایک مسلسل عذاب کی طرح سوار رہتی ہیں۔ میرے شوہر یونہی بڑے مصروف آدمی ہیں۔ ہر دوسرے مہینے یورپ کے سفر پر جانا پڑتا ہے۔ اکثر میں ان کے ہمراہ چلی جاتی ہوں اور کبھی کبھار تو میں اتنی مصروف ہوتی ہوں کہ جا ہی نہیں سکتی۔''

''آپ کہاں رہتے ہیں؟'' کنول نے مل کر شوبھا سے ملنا یکے بعد دیگرے دو متضاد جذبوں سے دوچار ہونا تھا۔ شوبھا نے پوچھا۔

میں نے اپنے گھر کا پتہ بتا دیا۔

بولی: ''آئیے ہم آپ کو چھوڑتے ہیں۔ چلیں شام کو آپ ہمارے ساتھ تاج دیکھنے چلیے گا۔ پچھلی باتوں کو بھول جائیں۔ آئیے ہم صلح کر لیں۔''

موہن اتنے عرصے میں ہماری گفتگو (جو مجھ سے زیادہ شوبھا کی گفتگو تھی) سے بیزار ہو کر دفع الوقتی کے لیے سیٹی بجاتا ہوا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ شوبھا اس سے مخاطب ہوئی۔ کیوں موہن بابو انہیں بھی شام کو تاج نہ لے جایا جائے۔''

''کیوں نہیں، کیوں نہیں۔'' موہن نے انگریزی زبان میں بڑی ادا سے کہا۔ ''ضرور ضرور۔'' مگر وہ بڑی پُرحسرت نظروں سے شوبھا کو دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا: ''دو انسان زیادہ اچھی طرح سے تاج کو دیکھ سکتے ہیں اور پھر یہ بھول بھلیاں تو ہے نہیں، میں تو تاج کے شہر میں رہتا ہوں، چاندنی راتیں بھی اکثر آتی ہیں۔''

شوبھا اور موہن دونوں ہنس پڑے۔ بولے۔ ''نہیں ہمیں احسان مند کرنے کے لیے ہی سہی، آپ ضرور چلیے گا۔''

وہ مجھے بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتی ہوئی موٹر تک لے گئی اور دھکیل کر دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے اپنا اخبار تو بڑے ٹھاٹ سے شروع کر رکھا ہے۔ ہماری باتیں بھی اس میں لکھ دیا کیجئے۔''

میں خاموش رہا۔

باہر دفعتہً بادل پھٹ گئے تھے اور قوسِ قزح کے رنگ آسمان پر نمایاں تھے۔ شوبھا کی موٹر تیزی سے اڑی جا رہی تھی۔ جیسے وہ اس رنگین دروازے کے پار کسی دوسرے ملک کو جانا چاہتی ہے۔ کسی نئے دیس کو۔ اور پلٹے ہوئے بادلوں کے عقب سے زندہ روشن اور جاندار سورج کی کرنیں نہر کے پانی پر چمک اور چاندی بن کر بچھی جاتی تھیں۔

''میرا گھر آ گیا۔'' میں نے اتر کر رسماً کہا۔ ''کیا آپ نہیں آئیے گا؟''

شوبھا بولی۔ ''نہیں اب نہیں شام کو ہم آپ کو لینے آئیں گے۔ تیار رہئے گا۔ بادل چھٹ گئے ہیں۔ آج چاندنی بہت حسین ہوگی۔''

میں نے کہا۔ ''میں عرض کر چکا ہوں۔ میرا جانا بے کار ہے۔''

شوبھا نے زور سے ہاتھ ہلا کر چیریو کہا اور موٹر تیزی سے آگے چلی گئی۔

گھر میں بینا میری منتظر تھی۔ اس نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ بہت دنوں کے بعد وہ خوش خوش اپنے کالج کی باتیں سنا رہی تھی اور میں خیالوں میں، مگن اس کی باتیں سنتا کھانا کھا رہا تھا۔ کنول اور شوبھا دو متضاد خیال!

قوس و قزح کافی دیر تک آسمان پر لٹکتی رہی۔ پھر اس کے رنگ مدھم پڑ گئے۔ بہت دنوں بعد میں نے خیالات کی نئی ترتیب کے تحت اپنی کتابوں کے مسودے نکالے اور ان میں تبدیلیاں کرنے کی خاطر چھانٹ کر الگ کرتا گیا۔ بینا میری طرف دیکھتی ہوئی اپنی موسیقی کی کتاب سے راگ ودیا پر نئے اثرات کا ایک مضمون پڑھ رہی تھی اور کہیں کہیں پوچھتی جاتی تھی۔

"بابا مجھے نیا ستار کب لے کر دیں گے۔ بابا ہماری پرنسپل آپ کی بہت پرانی دوست ہیں؟" میں کنول کماری کی باتیں سنتا اپنا مسودہ دیکھتا جا رہا تھا۔

بہت دنوں بعد میں نے کنول کا نام بینا سے یوں سنا تھا۔ آج میری صورت پر چھائی ہوئی پریشانی کم ہو گئی ورنہ میری بیٹی تو مجھ سے بات ہی بہت کم کرتی تھی۔ اسے بوا کے مرنے کا اپنی جگہ افسوس تو ضرور تھا مگر میری بڑھی ہوئی خاموشی نے اس کو محتاط کر دیا تھا۔ وہ روز کالج سے آ کر میری صورت کو دیکھتی تھی اور اپنے کاموں میں مگن رہتی۔ آج جو میں خوش تھا تو وہ بھی خوش تھی سو وہ بھی مدتوں کی دبی ہوئی باتیں مجھے سنا رہی تھی۔ پچھلی بھولی باتیں یاد کر کے مجھے بتاتی جاتی تھی اور تبدیلی پر حیران ہو رہی تھی۔ اس نے دروازے کے سامنے موٹر رکتے دیکھا تھا، پوچھنے لگی۔

"بابا کون لوگ آپ کو چھوڑنے آئے تھے؟"

میں نے کہا: "بینا جب تم پیدا نہیں ہوئی تھیں، تب یہ لوگ مجھے جانتے تھے۔ آج اتفاقاً مل گئے۔ رات میں ان کے ساتھ تاج دیکھنے جا رہا ہوں۔"

"رات...... وہ کیوں بابا؟"

"ارے بینا تمہیں پتہ نہیں رات کو تاج اتنا حسین ہوتا ہے کہ کیا کہیے۔"

"آپ ہمیں تو کبھی نہ لے گئے۔" بینا نے شکایتاً کہا۔

"جب تم ذرا بڑی ہو جاؤ گی تو میں کسی رات جب چاندنی رات خوب چھٹکی ہوئی ہوگی، تاج دکھانے لے جاؤں گا۔"

"ہم بڑے ہونے تک آپ کا انتظار نہیں کریں گے۔ ہم خود جا رہے ہیں کسی دن تاج دیکھنے اور پھر ہم ٹھاٹ سے لال قلعہ بھی دیکھیں گے۔ ہماری ہسٹری کی پروفیسر کہہ رہی تھیں کہ تمہیں متھرا بھی لے جائیں گے اور جانے کہاں کہاں بابا۔ ہم تو اب بہت سیر کیا کریں گے۔ پتہ بھی ہے آپ کو۔"

"توبہ توبہ۔" میں ہنس پڑا۔ "تم تو بس سیر کرنے کالج گئی ہو۔ پڑھنے کا کام کیا کم ہے۔ میں تمہاری پرنسپل سے شکایت کروں گا دیکھنا۔"

"ہوں۔ کیا کیجئے گا شکایت کر کے وہ تو خود ہی ہمیں کہتی تھیں کہ ولایت میں سب طالب علم یورپ کا چکر لگاتے ہیں اور خوب سیر کرتے ہیں۔"

"تو گویا تمہاری پرنسپل سمندر پار بھی ہو آئیں۔" میں نے [illegible] دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اور کیا۔" بینا نے بڑے وثوق سے کہا۔

"کچھ اچھی باتیں بھی بتاتی ہیں تمہاری پرنسپل کہ بس سیر کرنے کو کہا کرتی ہیں۔" میں نے شرارتاً بینا سے پوچھا۔

"وہ اتنی بہت اچھی باتیں کہتی ہیں۔ آپ ان سے پڑھیں تو حیران رہ جائیں۔ اتنا اچھا پڑھاتی ہیں۔"

"تو گویا پڑھی لکھی بھی ہیں۔"

"نہیں بابا ہم نہیں آپ کو بتاتے، آپ تو ان کو اچھی طرح جانتے ہیں اور پھر بھی پوچھے جاتے ہیں۔"

"بھئی یہ تو ان دنوں کی بات ہے، بینا جب وہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ تمہاری طرح بے کار میں اپنے بابا کو تنگ کرتی اور ستار سیکھتی تھیں۔"

"اونہہ بابا آپ تو مذاق کرتے ہیں۔ ہم اب بالکل بھی نہیں بتایا کریں گے کوئی بات آپ سے۔"

"واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ پھر ہماری تم سے لڑائی ہو جائے گی بینا۔"

میں اور بینا ایسی باتیں کرتے اور کنول کا ذکر ایک دوسرے سے کہتے رہتے۔ مجھے معلوم تھا جس دیوانگی سے میں نے کنول کو چاہا تھا، وہ دیوانگی میرا ساتھ چھوڑنے والی نہیں اور جس چاہت کو اس نے ایک بار ٹھکرا دیا۔ وہ دوبارہ دل میں جگہ نہیں بنا سکتی۔ میں اور وہ صرف ایک سطح پر مل سکتے تھے اور وہ سطح قومی کاموں کی تھی۔ اصلاح کی تھی، تحریکوں کی تھی، رفاہِ عامہ کی تھی۔ عورتوں کے حقوق کی حفاظت کا جو بیڑا اس نے اٹھایا تھا، اس کی تھی۔ میرے دل میں کام کرنے کے جذبے کے ساتھ کہیں ڈھکی چھپی ایک تمنا چپکے چپکے بڑھ رہی تھی اور وہ تمنا کنول کے قریب اس کے خیالات سے یک جہتی کی تھی۔ اس کی نگاہوں میں بلند ہونے کی تھی۔

آج سیاہ رات میں ستارے زیادہ روشن اور قریب ہیں اور پُروا ہے کہ چلی جا رہی ہے۔ جیسے کنول کماری ٹھاکر کا ملنا اسے کوئی بڑی بات نہیں لگتا۔ میں سوچ رہا ہوں۔ میں سالوں کے بعد اپنا وہی سوال لے کر کنول کے دُوار پر جاتا ہوں اور کنول نے میرے کشکول کو کبھی وعدوں سے نہیں بھرا، وہ وعدے کرتی تو وعدے جھوٹے ہوتے، اپنی راہوں کو ستاروں کے غبار کے

بجائے سورج کی زندہ روشنی سے سجا چکی تھی۔ اس میں کسی دوسرے کو ساتھی بنانے کی تمنا نہ تھی اگر وہ مجھے کچھ دے دیتی تو ان دنوں مجھے اس کا شعور نہیں تھا۔ محبت کرنے کا شعور تو انسان کو بچپن سے آ جاتا ہے۔ پھر اسے سنبھالنے کا' اس امانت کو دوسروں کی نگاہوں سے چھپانے کا سبق اسے نہیں آتا۔ میں بھی اور مردوں کی طرح محبت کے کھلونوں سے تھک کر انہیں توڑ دیتا۔ محبت کے ٹوٹے ہوئے بت جیسے اور لوگوں کے گھروں کے سامنے ردی چیزوں کے ڈھیر میں پڑے رہتے ہیں۔ میرے گھر کے سامنے بھی پڑے رہتے۔ آج تمنا کی ہیشگی نے میرے دل کو ایک بیمار کے دل کی طرح کمزور کر دیا۔ میں مایوس نہیں ہوں۔ کنول نے زندگی کے آخر میں مجھے مایوسی سے بچا لیا ہے۔

محبتیں تو راہ میں خودرو پھول کی طرح آتی ہیں۔ ہر انسان ہر مقام پر جھک کر' ہر پھول کو سونگھنے کے لیے رک نہیں سکتا۔ یہ سبق میں نے کنول سے سیکھا ہے۔ شوبھا کی دلنواز مسکراہٹ جو دعوت سوال تھی۔ شوبھا کے پھولے ہوئے بال' اس کا پینٹ شدہ چہرہ' اس کا مغربی اندازِ گفتگو یہ سب محبت ہی تو تھے ورنہ وہ مجھے اپنے ساتھ تاج لے جانے کبھی نہ آتی۔

رات کو چاند ستاروں کے جھرمٹ سے بڑی سج دھج سے نکلا۔ مشرقی شاعروں کا روایتی معشوق گلگشت چمن کے لیے اور ستارے چھپ کر اس کی آنکھوں کی تاب نہ لا کر آسمان کی نیلاہٹ کی چادر اوڑھ کر اوجھل ہو گئے' تب شوبھا مجھے لینے آئی۔

میں نے کہا بھی تھا مگر وہ لینے آ گئی۔

من موہن بابو بڑے رُوٹھے ہوئے انداز سے مجھے ملے۔ ان کی آواز کی سردی اور رویے کی کشیدگی سے میں نے سمجھ لیا کہ یہ سب شوبھا کی شرارت ہے۔ وہ مجھے خود گھسیٹ رہی ہے' ورنہ صرف تاج دیکھنے کے لیے وہ مجھے کبھی ساتھ نہ لیتی۔ وہ دل میں مجھے کوس رہا ہو گا کہ کمبخت کہیں مر بھی نہیں چکتا' کہاں آ ٹپکا ہے۔ میں نے انکار تو بہت کیا تھا مگر ایک تیز خوشبو کا بھبکا اپنے پہلو سے آیا اور ایک تیز بدبو کا جھونکا موٹر کے سامنے سے۔ من موہن شاید پئے ہوئے تھا اور شوبھا محبوبی و انداز کی ملکہ بنی میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ میں نے پرائی عورت کو کبھی اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ننگے پاؤں پر چمکیلے موتیوں کے زیور تھے۔ کانوں میں ہیرے کے بڑے بڑے آویزے تھے جو بات کرتے ہوئے سر کی جنبش سے ہلتے اور رخساروں کو چھو لیتے۔ شوبھا حسین تھی' جب میں نے اسے پہلے دیکھا تھا تو ہو سکتا ہے اگر میں کنول کو نہ دیکھ چکا ہوتا تو اپنا دل اس پر نچھاور کر دیتا کیونکہ ان دنوں میں اپنے خیالوں کے لبادے کو لیے سرِ راہ کھڑا تھا۔ وہ خطرناک طور پر

حسین تھی۔ اسے حسن کا احساس تھا۔ جسم کے دلآویز خطوط میں ایک جاذبیت تھی اور اس لیے وہ ہندوستان کی بہت سی تحریکوں کی رہنما تھی۔ رہنمائی کے لیے حسین ہونا اور دولت مند ہونا ضروری ہے' چاہے کسی یونانی کے قول کے مطابق پہلی خوبی انسان کو مغرور اور دوسری جاہل اور پست بنا دیتی ہے۔ شوبھا کے قلم میں طاقت تھی۔ زبان میں جادو تھا اور بات منوانے کا ڈھنگ سب سے زیادہ تھا۔ اس لیے وہ عورتوں کی ایک محبوب رہنما بن گئی۔

یہ کون پوچھتا ہے کہ کسی رہنما کی ذاتی برائیاں اور خوبیاں کیا ہیں۔ اس کی تو صرف وہ زندگی دیکھی جاتی ہے جس میں اس کا ظاہر سامنے آتا ہے۔ اس کی شخصیت تو وہ ہوتی ہے جو وہ دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے اور اپنے کو کون بنا سنوار کر سامنے نہیں لاتا۔ ہر شخص لیڈر بننے کی صلاحیت رکھتا ہے' اگر اسے موقع مل سکے تو۔

شوبھا بڑی تیز آواز میں پچھلے دنوں کی باتیں دہرا رہی تھی۔ سڑک کے دورویہ درختوں کے لمبے سائے سڑک کو ڈھانپے ہوئے تھے اور یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ہم کسی پراسرار وادی کے حسین راستوں پر بھٹک گئے ہیں۔ چاندنی کے لمبے لمبے لہریوں پر سے موٹر اچھلتی کودتی بھاگی جا رہی تھی۔ زردی مائل نیلاہٹ کے کناروں سے چمکیلے ستارے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ من موہن موٹر کو چلاتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے۔ سرد ہوا کے جھونکوں سے چھوتی ہوئی تیز رفتار موٹر ایک بہت پیاری آواز پیدا کر رہی تھی۔ ہم تاج پہنچ گئے۔ میں نے اس سے پہلے کسی عورت کے ہمراہ تاج کو چاندنی رات میں نہیں دیکھا تھا۔ میری بیوی نروپما خالصتاً مشرقی عورت ہے۔ گھر سے باہر سیر سپاٹے کی خاطر جانا وہ آج بھی معیوب سمجھتی ہے۔ اس کے علاوہ عورتیں میری زندگی میں نفی کے برابر ہیں۔ طبعاً میں اتنا رومان پسند نہیں ہوں کہ خیالوں کے تانوں بانوں سے جنت بنا ڈالوں۔ مگر اس رات جب چاند آسمان میں آہستہ خرام بجرے کی طرح تیر رہا تھا اور تاج کے باغوں پر آسمان بہشتوں کا گمان ہو رہا تھا' مجھے یہ جگہ اتنی نئی معلوم دی کہ میں اس کے نئے پن سے مسحور ہو گیا۔ سامنے چاندنی میں نہایا ہوا سنگِ مرمر کا خواب آور مقبرہ تھا' اس کے لاکھوں ٹکڑوں میں الگ چاند رقصاں تھے اور وہ ہیرے کی ایک بہت بڑی کنی معلوم ہو رہا تھا۔ خاموش میناروں میں الجھا ہوا چاند ٹھہرا ہوا لگتا تھا۔ روشنی ان باغوں کی تاریکیوں میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی اور تالابوں میں نئے تاج تھے۔ چاندنی اور سنگ مرمر کی چمک ایک نیلی سی دُھند میں ایک روشن سے غبار میں ہر پتھر کی سطح پر تیر رہی تھی۔ باغوں کے اندھیروں کے درمیان شاہ جہان کا تحفہ ایک کلی کی

طرح کھلا ہوا تھا اور خوشبو ہوا میں ملی اس کے گرد نثار ہو رہی تھی۔ لمبے درخت' بلند میناروں کے مقابلے میں بہت چھوٹے معلوم دیتے تھے۔

میرے پہلو میں شوبھا چل رہی تھی جس کو میں پہلے شوبھا بینرجی کی طرح جانتا تھا۔ عورتوں کے صفحے کی ترتیب دینے کے لیے اخبار کی ترقی کی خاطر جسے میں نے اپنے سٹاف میں لیا تھا اور جو سارے اخبار پر چھا گئی تھی۔ آج جب میں نے پھر سے عہد کیا تھا کہ میں عورتوں کے سوال کو اپنے اخبار کے ذریعے اُبھاروں گا' شوبھا ایک موڑ پر پھر مجھ سے ٹکرا گئی تھی۔

شوبھا مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ ''آپ نے پہلے بھی تاج کو اکثر چاندنی میں دیکھا ہوگا' کیا کبھی کنول آپ کے ساتھ آئی ہیں؟''

''کنول کون کنول؟'' میں سوال کے بھونڈے پن سے بیزار ہو گیا تھا اور یہ سوچے بغیر کہ میں ان کے ساتھ آیا ہوں' میری آواز میں کرختگی تھی۔

''اوہ آپ کتنے خفا ہو گئے ہیں۔ وہی کنول کماری ٹھاکر' جس کی خاطر آپ نے اخبار چھوڑا تھا۔'' شوبھا نے ہنس کر کہا۔

''کنول ان سب باتوں سے بلند ہے کہ وہ چاندنی راتوں میں میرے ہمراہ تاج دیکھنا چاہے۔ وہ عورت ہے۔''

اور میں نے دیکھا کہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ شوبھا بہت اداس ہو گئی۔ موہن نے اپنے ڈھلکے ہوئے پپوٹوں والی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ایسی نظر سے جو کہہ رہی ہو' کہتے تو ٹھیک ہی ہو۔

مگر اس نے بات پلٹنے کی خاطر کہا''' اخباروں کی باتیں چھوڑ کر مجھے یہ بتائیے کہ محبت کے اس عدیم المثال تحفے کو بنانے میں کتنے مزدوروں کی زندگیاں ختم ہوئیں' کتنی دولت صرف ہوئی' آپ بتائیے شوبھا جی۔''

شوبھا بھی اپنی اداسی کو چھپانے کی خاطر اور یہ بتانے کے لیے کہ اس نے میرے نشتر کی چبھن محسوس نہیں کی' کہنے لگی' ''تاج کے شہر میں رہنے والوں کو زیادہ اچھی طرح معلوم ہوگا۔''

میں نے کہنے کو تو بات کہہ دی تھی مگر اب پشیمان ہو رہا تھا' آخر یہ ضروری نہیں کہ ہر عورت کنول کماری کی طرح اپنے کو لیے دیئے رہے اور دوسروں سے بہت بلند ہو۔ زندگی میں خوشیاں بھی تو عورت کے دم قدم سے قائم ہیں اور پھر آج تاج کا یہ نیا پن کبھی مجھے ایک جادو کی طرح نہ لگتا اگر شوبھا ساتھ نہیں ہوتی۔

''شاہ جہان کے وقت تو بہت پہلے گزر گئے اور مزدوروں پر تو ہر دور میں ظلم ہوتا رہا ہے۔ تاج کی عظمت اس لیے کم نہیں ہوسکتی کہ اسے ایک خود مختار بادشاہ نے بنوایا تھا اور اس پر بے انداز روپیہ خرچ ہوا ہے۔'' میں نے جوش سے کہا۔

موہن زور سے ہنس پڑا۔ بولا۔ ''یہی تو کمی ہے دماغ میں خیالات ہوں تو ہر شے ایک خاص سطح پر لا کر دیکھنے سے سارا لطف جاتا رہتا ہے۔''

''ارے بھائی مزدوروں کو کون پوچھتا ہے۔ ان پر ظلم نہ کیا جائے تو دنیا کا نظام درہم برہم ہو جانے کا خدشہ ہے۔''

ہم تاج محل کے وسیع ایوانوں میں گھوم رہے تھے۔ ستونوں کے لمبے سائے مرمریں غبار میں لپٹے ہوئے چُپ چاپ کھڑے تھے۔ شوبھا کے سفید بازوؤں پر زیوروں کی چمک نیلی تھی اور کانوں میں لمبے آویزے بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ اس کی ساڑھی کے قوس و قزحی پلو کا کونا ہولے ہولے اڑ رہا تھا اور پھر چبوترے پر کھڑے ہو کر جب وہ اونچے میناروں کی طرف دیکھ رہی تھی تو لگ رہا تھا' جیسے اس کے سنگ مرمر کے بازوؤں سے دو پر ابھی نکلیں گے اور وہ اڑ کر آسمان کی وسعتوں میں غائب ہو جائے گی۔ کائنات کا رنگ یقیناً عورت کا مرہونِ منت ہے اور زندگی میں پہلی بار مجھے ان کہانیوں کی سچائی معلوم ہوئی جو مذہب کا پس منظر ہیں۔ جن میں شو کی عظمت پاربتی کے ذریعے اور آدم کی بڑائی حوا کی وساطت سے ظاہر کی گئی ہے۔ بے شک عورت نہ ہو تو رنگ پھیکے اور چاندنی بے کیف لگے' دنیا میں کوئی جاذبیت باقی نہ رہے۔ کنول بھی تو چاندنی کا پھول ہے اور کنول کماری کی سفید ساڑھی چاندنی کے رنگ کی ہے۔ مجھے کنول کماری یاد آ گئی۔ جیسے ملہاروں اور بسنت راگوں کو ملا کر ایک تان بنائی گئی ہو۔ وہ سروں پر ایک مضراب تھی' اس کے دیکھنے سے زندگی کے چشمے سے راگ بہنے لگتا ہے۔ مجھے دنیا حیرت انگیز طور پر ایک بہت بڑا سا ساز لگ رہی تھی' پھر دور سے خاموشی کو توڑتی ہوئی کسی ساز کی ہلکی سی صدا آئی۔ ہم تینوں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا' اس ساز کے ساتھ کسی گیت کی آواز بھی مل گئی۔ ہلکی خاموشی سی جیسے خوابوں کے دیش میں کوئی ہمیں بلا رہا ہو اور شوبھا خواب میں چلنے والوں کی طرح ہمیں وہیں چبوترے پر چھوڑ کر آواز کی طرف چلنے لگی۔ موہن نے میری طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں سوال تھا' جو میری سوالیہ نگاہوں سے ٹکرا گیا۔ چبوترے کی چوڑی چمکیلی سیڑھیوں سے اترتی ہوئی شوبھا گھنے باغوں کے اندھیرے کی طرف بڑھتی رہی اور ہم جادو کے زور سے ٹھہرائے ہوئے انسانوں کی طرح اس

کی صورت کو چاندنی کے غبار سے باغوں کے نیم اندھیرے میں غائب ہوتا دیکھتے رہے۔

ساز کی ہلکی صدا آتی رہی۔ گیت آسمان سے برس رہا تھا۔ فضا میں ملا تھا۔ بیقراری اور کیف کی ایسی کیفیتیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور پھر وہ ساز رک گیا۔ صدا تھوڑی دیر تک ہمارے گرد ہوا میں لٹکی رہی اور پھر تھم گئی۔ ہم جیسے جاگے ہوں' شوبھا کو ڈھونڈنے کے لیے تیزی سے تاج کی چمک کو پیچھے چھوڑ کر باغوں کی طرف بڑھ گئے۔ اس لمحے میں اور من موہن دو نئے متعارف شخص نہیں لگ رہے تھے۔ ہم دونوں کے پاؤں تیزی سے سبزے پر پڑ رہے تھے۔ میں اور وہ دونوں شوبھا کو ڈھونڈنے جا رہے تھے۔ ہمارے دلوں کے جذبوں میں ایک آسمان اور زمین کی دوری تھی مگر ہم دونوں ایک ہی عورت کی طرف بڑھ رہے تھے جیسے آج شام کو ایک ہی عورت کے ہمراہ آئے۔

کیاریوں' بیلوں' پھولوں کو روندتے ہم آدم کے کھوئے ہوئے بیٹے تاج محل کے باغوں میں گھومتے رہے۔ درختوں کے نیچے خاموشی تھی اور چاندنی تھی۔ سایہ تھا اور روشنی تھی۔ پتوں سے چھن چھن کر شاخوں سے پھسل پھسل کر چاندنی سبزے پر پڑ رہی تھی اور غمناک زمین کے اندھیرے میں جذب ہو رہی تھی۔ ایک درخت کے گھنے اندھیرے میں دو سائے نظر آئے اور ہم تیزی سے اس طرف بڑھے۔ دور سے ہی ہم کو شوبھا کی آویزوں کی جھلک نظر آ گئی تھی۔ میرے اور موہن دونوں کے دلوں میں ایک ہی خیال تھا۔ یہ دوسرا کون ہو سکتا ہے؟ دوسرا نسبتا تاریک سایہ۔

شوبھا اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے کھڑی تھی۔ ستار ایک طرف پڑا تھا اور دوسرا سایہ چپ تھا۔

میں نے قریب جا کر کہا: ''شوبھا دیوی' شوبھا دیوی۔'' شوبھا نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ کانپتی ہوئی چاندنی ایک پتے کو ہٹا کر اندر آئی اور اس کی آنکھوں کے آنسو مجھے دکھائی دیئے۔ وہ کیوں رو رہی تھی۔

موہن مجھ سے چند قدم پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے جھک کر شوبھا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور بولا۔ ''شوبھا واپس نہیں چلو گی۔ کافی دیر ہو گئی۔'' شوبھا نے اس کے ہاتھ کو زور سے جھٹک دیا اور بولی۔ ''چلے جاؤ یہاں سے مجھے چند لمحوں کا سکون نہیں لینے دیتے۔ مجھے ہر وقت کیچڑ میں گھسیٹتے ہو چلے جاؤ۔'' اس دوسرے وجود میں پہلی بار حرکت ہوئی۔ کھلے بالوں اور جٹاؤں میں چھپے

دوسرے انسان نے ہاتھ بڑھا کر ستار کو اُٹھا لیا۔

شوبھا نے بے قراری اور تیزی سے ہاتھ بڑھا کر ستار کو پکڑ لیا اور بولی۔ ''نہیں رگھوناتھ' ابھی نہیں' ابھی مت جاؤ' تھوڑی دیر ٹھہرو۔''

اور رگھوناتھ نے آنکھیں اٹھا کر ہماری طرف دیکھ کر بہت آہستہ سے کہا: ''شوبھا اب تم جاؤ' لوگ تمہیں لینے آئے ہیں' انہیں پریشان مت کرو۔'' اس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔

''نہیں رگھوناتھ ابھی نہیں رگھوناتھ' ابھی نہیں۔ میں نے زمانوں کے بعد تمہیں دیکھا ہے۔ رگھوناتھ مجھے اپنی شکل پر ایک نظر تو ڈال لینے دو۔'' شوبھا کی آواز کے درد سے میرا دل بھر آیا تھا۔

رگھوناتھ نے ستار رکھ دیا اور بولا۔ ''دیکھ لو۔''

شوبھا بہت بے قراری سے رو رہی تھی۔ اس کی سسکیاں روکے نہیں رکتی تھیں اور وہ دوسرا وجود جس کو وہ رگھوناتھ پکارتی تھی' درخت کے تنے کے سائے کے ساتھ پشت لگائے خاموش بیٹھا تھا۔ جیسے وہ کوئی بھوت ہو' جیسے شمشان سے آئی ہوئی کوئی آوارہ روح ہو۔

موہن نے میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں کو معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ شوبھا کو یکایک کیا ہو گیا ہے۔ اور وہ کیوں رو رہی ہے۔ وقت خاموشی سے گزرتا گیا۔

شوبھا کی سسکیاں اس کے سارے جسم کو ہلا رہی تھیں۔ موہن میں اب انتظار کی تاب نہ تھی' اس نے پھر کہا: ''شوبھا اب چلنا چاہیے' رات کافی گزر گئی اور عورت نے جو موٹر میں بیٹھ کر اس شراب کے نشے میں دھت شخص کے ساتھ دوپہر کو کہیں سے آئی تھی' روتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ''تم کیوں یہاں کھڑے ہو' تم مجھے ہر لمحے زمین کی گہرائیوں میں اندھیروں میں گھسیٹتے ہو۔ مجھے دو آنسو بھی بہانے نہیں دو گے کیا۔ چلے جاؤ یہاں سے۔''

رگھوناتھ نے پھر اپنے ستار کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بولا: ''شوبھا تم ان لوگوں کو ناحق پریشان کر رہی ہو۔''

''نہیں رگھو ابھی نہیں' پرماتما کے لیے ابھی نہیں' مجھ پر رحم کرو رگھو' بیٹھ جاؤ۔''

وہاں کھڑے ہونا بے کار سمجھ کر میں واپس جانے کے لیے مڑا اور موہن بھی' ہم دونوں ہارے ہوئے جواریوں کی طرح انہیں اندھیروں اور اجالوں کو پھاندتے دوبارہ چبوترے کی طرف واپس آ رہے تھے۔ چوڑی سیڑھیوں پر آ کر ہم بیٹھ گئے۔ ہمارا منہ چاند کی طرف تھا اور محبت کی

سب سے بڑی یادگار تاج ہماری پشت پر۔

موہن ایک عام آدمی کی طرح مہنگائی، تجارت اور زندگی کی باتیں کر رہا تھا۔ کاروباری، جہازوں کی، ایسی باتیں جو ہر شخص وقت گزارنے کے لیے دوسرے سے کرتا ہے۔ ہم دونوں یہ باتیں کسی عام بازار میں بیٹھ کر بھی کر سکتے تھے مگر تاج کا سارا حسن اس ایک لمحے ہمیں بھول چکا تھا۔ شوبھا ان درختوں کے سایوں میں ایک جٹادھاری شخص کے سامنے بیٹھی رو رہی تھی۔ نہ جانے وہ کون تھا؟

ماضی کی یادیں اتنی زبردست ہوتی ہیں کہ حال کے روغن کو پاش پاش کر دیتی ہیں۔

دوپہر کو اپنے پہلو میں شوبھا کو بٹھائے موٹر چلاتے ہوئے یہ شخص سوچ رہا ہوگا کہ وہ دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہے اور اس لمحے وہ موسم کی خرابیوں، پٹرول کی کمی اور خوراک کے فقدان، قحط کے آثاروں کی باتیں یوں کر رہا تھا، گویا زندگی میں یہی چیزیں باقی ہوں۔

میں تو شوبھا کا دوست بھی نہ تھا۔ میں تو سرِ راہ ایک معمولی جاننے والے کی طرح بھی اسے نہیں جانتا تھا اور یہ دوسرا شخص۔ اپنے آپ سے مطمئن، اپنے پر نازاں، عیش و آرام کا دلدادہ شوبھا کے پتی کا دوست اس کے دل کی حالت کیا ہے۔ یہ مجھے کیا معلوم تھا؟

چاند ایک ملاح کی طرح تاریک رات کے سمندر کو عبور کر رہا تھا۔ چاندنی کے بادبان بوجھ کے نیچے کراہ رہے تھے۔ نہ جانے کون سے ساحل کی تلاش میں کون سے دیس کی کھوج میں یہ مسافر چل رہا تھا۔ کسی ایسی محبوبہ کی تلاش جو دیوں کی دھیمی روشنی میں خاک پر بیٹھی اس کی منتظر ہوگی۔ چاندنی بادبانوں کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔ چاند کی محبوبہ کے گھر میں دیئے کی لو بجھنے والی ہوگی اور اس کے کانپتے ہوئے طویل سائے کچی دیواروں پر پڑ رہے ہوں گے۔

کہیں سے کوئل کا نغمہ چاندنی کے ساتھ لپٹا ہوا ہمارے گرد اڑنے لگا اور شوبھا ایک نادار عورت کی طرح سر جھکائے سیڑھیوں کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ میں اور موہن اٹھ کر خاموشی سے اس کے ساتھ چلنے لگے۔ راستے میں اس نے کوئی بات نہ کی اور جب میرا گھر آیا تو وہ بھی میرے ساتھ ہی اتر گئی۔ موہن جلدی سے موٹر کا پٹ کھول کر باہر آیا۔ بولا: ''شوبھا کیا کرتی ہو؟''

اور شوبھا نے اس کی بات کی طرف کوئی دھیان نہ دیتے ہوئے کہا۔ ''صبح مجھے یہاں سے لے جانا۔''

میں نے کہا: ''شوبھا دیوی آپ موہن بابو کے ساتھ چلی جایئے، میں بامنت کہتا ہوں۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چاند کی روشنی میں ہم دونوں وہاں کھڑے تھے۔ دونوں مجبور اور بے بس۔

موہن نے کہا: ''شوبھا میں ابھی واپس جا رہا ہوں۔ ہوٹل سے سامان لے کر تم بھی میرے ساتھ چلو۔ شوبھا نے سر ہلا دیا اور بولی: ''کیا اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ صبح مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ میں ہوٹل نہیں جا رہی۔''

موہن کے ہاتھ اس کے پہلوؤں پر یوں گر گئے جیسے وہ سب کچھ ہار گیا ہو۔ دیر تک وہ وہاں کھڑا رہا اور پھر دل سے کچھ فیصلہ کرتے ہوئے بولا۔

''بہت اچھا، صبح تیار رہیے گا، میں آؤں گا۔'' اور موٹر کے پٹ کو تیزی سے بند کر کے بیٹھ کر چلا گیا۔

شوبھا نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور بڑے سکون سے کہنے لگی۔ ''کیا یہاں سے اس وقت کوئی گاڑی دہلی نہیں جاتی؟''

میں نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا: ''ایک مسافر گاڑی اب سے ایک گھنٹہ بعد جاتی تو ہے مگر وہ کل پہنچے گی۔'' ذرا دیر سے کہنے لگی۔ ''بس اتنا کافی ہے میں جاؤں گی۔ کیا آپ اسٹیشن تک پہنچانے آئیں گے؟''

میں خاموشی سے اس کے پہلو میں چلنے لگا۔ وہ اپنے خیالوں میں لپٹی ہوئی کلی کی طرح میرے ساتھ چلتی رہی۔ رات کافی جا چکی تھی۔ سڑکوں پر کوئی سواری بھی نہیں تھی۔ جب ہم اسٹیشن پر پہنچے ہیں تو مسافر گاڑی تیار ہو رہی تھی۔ شوبھا نے ٹکٹ خریدا اور پھر مجھ سے کہنے لگی۔ ''اب آپ جایئے میں خود ہی گاڑی میں بیٹھ جاؤں گی۔''

میں نے کہا: ''اگر من موہن بابو صبح آئیں تو انہیں کیا کہوں، بتاتی جایئے۔''

''انہیں؟ کیا وہ آپ سے میری بابت پڑتال کریں گے۔'' وہ ساری شام میں پہلی بار ہنس رہی تھی۔ ''انہیں کہہ دیجیے گا۔'' ''میں عورت بننے کی کوشش میں واپس چلی گئی ہوں۔''

میں سٹپٹا گیا۔ میرا نشتر کام کر گیا تھا۔

اسے چھوڑ کر واپس آتے ہوئے مجھے لگ رہا تھا جیسے ماضی پھر جاگ گیا ہے اور پرانے دن، دماغ میں بیدار ہو کر اُدھم مچا رہے ہیں۔

مجھے پرانے دنوں کی شوبھا یاد آ رہی تھی۔

صبح موہن بابو کے موٹر کی آواز سن کر میں بیدار ہوا۔ جب اسے میں نے بتایا کہ شوبھا رات ہی چلی گئی تھی تو وہ ہنس پڑا اور بولا: ''وہ بھی سایوں اور چاندنی کی طرح بدلتی رہتی ہے۔'' پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ''عورت ایک معمہ ہے جس کو کوئی حل نہیں کر سکتا اور ہم لوگ جو عورتوں کے تعاقب میں زندگیاں گزارتے ہیں' بے وقوف ہیں۔ آدم کے بیٹوں سے حوا کی بیٹیاں زیادہ چالاک ہیں۔'' وہ اپنے سوٹ کی نمایاں کریز پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کے ڈھلکے ہوئے پپوٹوں کے پیچھے آنکھوں میں غم اور اداسی کی جھلک تھی۔ پھر بھی وہ ہنس رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''اتنی صبح آپ کو تکلیف دینے کی معافی چاہتا ہوں۔'' کل کے موہن میں اور آج کے موہن میں بہت فرق تھا۔ آج موہن شوبھا کی عدم موجودگی میں ایک سنجیدہ سلجھا ہوا اور بڑا مہذب انسان لگ رہا تھا۔ کل جو وحشت اس کے چہرے پر برس رہی تھی' آج اس کا پتہ بھی نہ تھا۔ عورت کی موجودگی میں مرد ایک خونخوار بھیڑیا بن جاتا ہے اور ایک بھوکے کتے کی طرح حق برتری جتانے کی خاطر اپنے تیز دانتوں سے دوسرے کی کھال ادھیڑنے کے لیے بھی تیار رہتا ہے اور عورت کی عدم موجودگی میں وہ ایک دم مہذب اور بااخلاق انسان بن جاتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا' عورت کا وجود اس دنیا کے نظام کو درہم برہم کرنے کے لیے نہ ہوتا۔

پھر موہن بابو اپنی موٹر میں بیٹھ کر چلا گیا۔ صبح کی خوشگوار دھوپ میں اس کی موٹر سڑک کی چمکیلی سطح پر پھسلتی ہوئی میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

شوبھا سے اچانک اس دوسری اور دلچسپ ملاقات کا اثر بہت دنوں میرے دماغ پر رہا ہے۔

اور جب میں کام کی مصروفیت اور زیادتی میں اسے تقریباً بھول چلا تھا' کسی پہاڑی مقام سے اس کا خط آیا۔ لکھا تھا۔

''میری زندگی کی کہانی کو مختصراً تو آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ میں نے زندگی شروع کی تو آپ نے مجھے دیکھا تھا اور پندرہ سال بعد بھی وہ چمک دمک میرے جلو میں چلتی ہے۔ اس بات کو بتانے کے لیے کافی ہے کہ میں یعنی شوبھا بینر جی خوش و خرم زندگی کے میدان میں گھوم رہی ہوں۔ مجھے ہر موڑ پر مسرت ملی ہے۔ میں نے کئی زندگی کے پیالوں میں تلخی ڈال کر وہاں سے مسرت چرالی ہے۔ بعینہٖ جیسے اور لوگ دنیاداروں کی طرح ہوا کے سانس سے اپنے لیے دوسروں کی خوشیاں بھی

سمیٹ لیتے ہیں مگر تاج محل کو چاندنی رات میں دیکھنے جاتے ہوئے آپ نے مجھے اداس مجبور اور روتے ہوئے پایا پھر میں اپنے بچاؤ کی خاطر اتنی تیزی سے واپس چلی گئی کہ آپ کو معلوم بھی نہیں ہو سکا ہوگا کہ تاج کے باغوں میں اس دن جو شخص مجھے ملا وہ کون تھا' میں اس سے وہاں کب ملی۔ اندھیرے کے اس کنج سے ساز کے ساتھ میرے لیے کیا پیغام تھا' جس پر میں کھنچی چلی گئی۔ ہر ذہین انسان کے دماغ میں یہ سب سوال پیدا ہوتے اور میں ذرا حیران نہیں ہوں گی۔ اگر ان سوالوں نے چند دنوں آپ کو پریشان رکھا ہو۔

رگھو ناتھ میرا ماں جایا بھائی ہے۔ اس کی میری ماں ایک ہی تھی۔ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں تا کہ آپ باور کر لیں کہ رگھو میرا بھائی ہے۔ بالکل اپنا بھائی' سال کیسے نکلے چلے جاتے ہیں اور میں وہ نہیں ہوں جو برسوں پہلے کواڑ پکڑ کر یوں کھڑی ہوگئی تھی' گویا میری زندگی وہی تھی۔ میکے کے گھر میں مجھے رکھنے کی ساری طاقت اسی کے ساتھ بندھی تھی۔ پھر ماں نے کواڑ میرے ہاتھوں سے چھڑا لیا اور گلے مل کر مجھے ڈولی میں سوار کراتے ہوئے چیخ پڑی تھی۔ اس کی وہ چیخ آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ ایسی چیخ جو زندگی کا سرمایہ اپنے ہاتھوں دوسروں کے حوالے کرنے پر ایک بے بس عورت کے منہ سے نکلی تھی۔ زندگی تو تب ہی بیت گئی تھی۔ جب میں نے میکے کے گھر کے آنگن سے باہر جھانکا تھا۔ جب میرے پاؤں میں بچھوے بجے تھے۔ جب ڈھولک پر تھاپ پڑی تھی اور سکھیوں نے آنے والی بہار کا خیر مقدم کرنے کے لیے وداع کے گیت گائے تھے۔ چھوٹے سے گھر میں اندر باہر کتنی رونق تھی۔ مہمانوں کے آنے والوں کی' بدھائی دینے والوں کی' ایک تانتا سا بندھا رہتا تھا۔ ان دنوں رگھو میری ساڑھی کا آنچل پکڑ کر کہتا ''شو تم اندر کیوں بیٹھی ہو' تم باہر کیوں نہیں چلتیں۔'' اب میں بھی کبھی اس کے ننھے ہاتھوں کی مضبوطی کو یاد کرتی ہوں تو کانپ جاتی ہوں کاش رگھو ذرا بڑا ہوتا۔

پھر ایک مستانی رت میں کہاروں کے کندھوں پر میری ڈولی اس کے پیچھے چلی جو مجھے لے جانے آیا تھا۔ روتے روتے میری آنکھیں سوج چلی تھیں۔ ڈولی میں بیٹھی نائین مجھے تسلی دیتی اور پانی پلاتی تھی۔ میرا اسرال کا گاؤں دور تھا اور راہ میں سورج ڈوب گیا تھا۔ پیپل تلے میری ڈولی رکھ کر براتی ستانے لگے تھے۔ تب ہوا پتوں سے سیٹیاں بجا رہی تھی۔ ہمارا گاؤں بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا۔ نائن نے پردہ اٹھا کر باہر جھانکا تھا۔ سورج کی روشنی نے بادلوں میں آگ لگا دی تھی اور قریب کے گاؤں سے نیلا دھواں نکل کر گھروں سے اوپر دھند بن کر پھیلا ہوا تھا' جیسے

رنگ برنگے لہریئے اور قوس قزح آپس میں مل گئے ہوں۔ میری ساڑھی کا زرکا پلو میرے پاؤں تلے دب کر بے ڈھنگی سلوٹوں میں سلا گیا تھا اور مہندی کی سوندھی سی خوشبو زمین کی باس سے مل کر ڈولی میں پھیل گئی تھی۔ اُبٹن کا سانس کپڑوں میں رچا ہوا تھا۔ بھگوان کی مورتی کے سامنے سے اٹھائے ہوئے پھولوں کا فرش میرے پاؤں تلے بچھا تھا۔ میری چوٹی میں لگے گھنگرو ذرا سی حرکت پر بج اٹھتے اور پاؤں میں پڑے بچھوؤں سے گیت ناچ اٹھتے۔ میں ہلتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔ میری چولی پر ٹکے ستارے شام کی سرخی میں چمک رہے تھے۔ مجھے نائن سے آنکھیں ملاتے بھی لاج آتی تھی۔ میں گیتوں اور گھنگروؤں کی آہٹوں میں قید تھی۔

اس رات کا ایک ایک لمحہ میرے سینے میں آباد ہے۔ وہ رات ہی تو میرے دامن میں بچ گئی ہے۔ دو زندگیوں کے درمیان ایک ننھا سا پل جس پر کھڑے ہو کر میں نے دن سے رات کے اندھیارے میں جھانکا اور پھر اس میں کود گئی۔ صرف وہی رات ہے جہاں روشنیاں رہتی ہیں' دھڑکتی رہتی ہیں۔ صرف وہی ایک رات ہے۔ جب میری قُم قُم کی بندیا مانگ کا سیندور اور چہرے پر لگی افشاں اکٹھے مل کر چمکے تھے۔ وہ چمک جو میرے ہاتھی دانت کی کلائیوں سے گداز بازوؤں تک بھرے چوڑے میں تھی' ان پیروں میں کہاں؟

اس رات نتھ جھک جھک کر میرے مسی لگے ہونٹوں کو چومتی رہی۔ ٹخنوں پر بندھی پائل کے گھنگرو بجتے رہے۔ وہی ایک زندہ رات' جب زمین پر چلنے والی نرم ہواؤں نے آسمان کے چمکتے ستاروں کو بلندی پر جا کر چھو لیا تھا' وہی رات جب آکاش کی روشنیاں اکٹھی ہو کر میرے دل میں اتر آئی تھیں۔ وہ رات جب ڈولی میں سوئی نائن کے خراٹوں کے ساز پر میرے خیال ناچ رہے تھے اور پہلی راتوں کا چاند بسنت رت کے ساتھ آسمان پر تیر رہا تھا' کوئل کی کوک نے اس رات دل میں بڑی ہلچل مچا دی تھی' ستارے دور دور تک پھیلے تھے اور اپنی چولی پر لگے اندھیرے میں چمکتے ستاروں کو دیکھ کر مجھے لاج آ رہی تھی۔

میں یہ سب اتنی تفصیل اس لیے لکھ رہی ہوں کہ میں دھرتی کے سینے کی دھڑکن' موسموں کی پیاری بیٹی اور گاؤں کی لاج تھی۔ میں یہ اس لیے بتانا چاہتی ہوں کہ میں ایک ایسی دھرتی ہوں جس پر کسی نے ہل چلانے کا سوچا تھا' میں ایک ایسا پتھر ہوں جس کو کسی فن کار نے مورتی بنانے کے لیے منتخب کیا تھا۔

مگر ہل چلانے والا اسی رات سانپ کے زہر سے مر گیا۔ الاؤ کے گرد لیٹے ہوئے

براتیوں میں سے صرف پرشوتم کو سانپ نے منتخب کیا اور ڈس لیا۔ مورتی بنانے والا فن کار ابھی پتھر کو ہاتھ بھی نہیں لگا پایا تھا کہ کسی غیبی ہاتھ نے پیچھے کھینچ لیا۔ قصور کس کا ہے؟ مجھے بتاؤ' قصور کس کا ہے؟ اونچے آکاش میں آندھیوں کے پروں پر اڑنے والے دیوتاؤ تم ہی بتاؤ قصور کس کا ہے؟ اور پھر جانتے ہو بانجھ دھرتی کی کوکھ سے روپ نکلا اور مجھے لے اڑا۔ یہ بھی ایک لمبی داستان ہے۔ شمشان اور قبرستان کی مٹی بڑی زرخیز ہوتی ہے اور سبزے کا روپ بجھے ہوئے شعلوں سے بڑا گہرا رنگ چراتا ہے۔ تمہارے مندروں میں بیٹھے بھگوان مجھے کبھی یہ نہیں بتاتے کہ پرشوتم کو بلا کر مجھے میکے اور سسرال کے گھر کے درمیان بے آسرا چھوڑ کر اس کو کیا ملا تھا۔ مگر میں بھگوان سے پوچھوں بھی کیوں؟

ایک بسنت سے دوسرے بسنت تک' ایک نرم جاڑے سے دوسرے گلابی اور لطیف موسم تک' سوچو تو سہی کتنا لمبا عرصہ ہے۔

گاؤں گوکل کا تٹ نہیں تھا کہ وہاں بانسری کے سُر میرا دل رکھنے کو کافی ہوتے۔ وہاں صرف مندر کا کلس تھا اور میں تھی۔ میری ساس نے کڑھنے اور گھلتا دیکھنے کے لیے گھر میں نہیں رکھا تھا۔ دوسری سہاگنیں میرے سائے سے لاکھ پرہیز کریں' پر بیوہ ساس نے میرا بڑا پالن کیا۔ اسے مرے ہوئے پُرشوتم کا پیار بھی مجھی پر نچھاور کرنا تھا۔ اس کی محبت نے مجھے ماتا پتا اور ننھے بھائیوں کی یاد بھلا دی۔ مجھے رگھو بھول گیا۔ مجھے ماں بھول گئی۔

اور پھر انہی دنوں گاؤں میں ایک جوگی آیا۔ اس کی لمبی لمبی جٹاؤں میں نرمی تھی اور چہرے پر بلا کا حسن تھا۔ کیرتن کے سمے گاؤں کی بہوئیں اور بیٹیاں اس کی آواز پر جھوم جاتیں۔ میں تو پوجا کے لیے بھی رات کے سمے جایا کرتی تھی۔

اور ایک دن مورتی کے پیچھے اندھیرے سے اٹھ کر کسی نے دیئے کی لو کو بجھا دیا۔ میں کانپ گئی۔

تب جوگی نے مجھے کہا ''یہ تپ کی زندگی کس کام کی۔ ابھی تو اتنے زمانے پڑے ہیں۔ نروان اور شانتی تو من کو کھولنے سے ملتی ہے۔'' میں اس کا مطلب نہیں سمجھی۔ پر پھر میں رات کے سمے کبھی پوجا کے لیے بھی نہ گئی۔ میں نے اپنی ساس کی دی ہوئی مورتی کے سامنے بیٹھ کر مہینوں آنسو بہائے۔ جن دنوں مورتی کی سفیدی میرا سنگار بن گئی اور بھگوان کے بھگت کے بول مجھے زندگی کی اونچی نیچی راہوں پر گھسٹنے لگے اور آج سوچتی ہوں۔ مندر کا کلس نہ ہوتا اور بھگوان کا بھجن

کرنے کے لیے درشنوں کے کارن اگر مندر میں جانا نہ ہوتا تو میں ان طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے گھر سے کبھی نہ نکلتی۔

دوسری رات میں اکیلی تھی۔ روپ کی دولت کے ساتھ بھگوان کا بھگت مجھے چھوڑ گیا تھا اور میں اکیلی تھی۔ یہ پہلی ٹھوکر تھی جو مجھے بھگوان کے چرنوں میں بیٹھے پجاری نے ماری تھی۔ بتاؤ میں ان بھگوان سے کیا پوچھوں اور کیوں پوچھوں؟ شاید یہ بھی بھگوان کی مرضی تھی۔ ان دنوں میں ایک بے سہارا تنکے کی طرح کئی کناروں کی متلاشی ہوئی' کئی تیز موڑ میری زندگی میں آئے اور پھر...... یہ بھی ایک لمبی داستان ہے۔ دیکھو تو سہی کتنی داستانیں میری زندگی پر یکے بعد دیگرے پھیلی ہوئی ہیں۔

میں نے سوچا اگر میں دھرتی ہی ہوں تو میں پاؤں میں کیوں لیٹی رہوں۔ پھر میں نے روپ بدلے۔ ہواؤں کے کندھوں پر سوار ہو کر خوشبو بن کر میں نے دور دور چکر لگایا ہے۔ پھول بن کر میں کئی دامنوں کی زینت رہی ہوں۔ مندر کی مورتی بن کر بھی میری تمنائیں پوری نہیں ہوئیں اور نئے نئے روپ بدلتے بدلتے تھک کر میں پھر دھرتی بننا چاہتی ہوں۔ میں ایسی مٹی تو نہیں بن سکتی جس کو لوگ ماتھے پر چڑھائیں پھر ایسی مٹی تو بن سکتی ہوں جس کو لوگ پاؤں تلے روندیں' جس کی نجات یونہی ہو سکتی ہے۔ دھول بن کر دھرتی کا دھرم پاؤں تلے لیٹنے اور دکھ سہنے میں ہے۔ دھرتی کو دکھ کے ہلوں سے برابر کیا جا سکتا ہے اور پھر اس پر بیج ڈالے جاتے ہیں' تب کرنیں اس کے سینے میں سے زندگی کا پیغام لے جاتی ہیں اس کی خوشبوئیں...... پر اسے بھی جانے دو۔

جن دنوں میں نے اپنا میکہ چھوڑا تھا رگھو ان دنوں جوان نہیں تھا' جوان ہو رہا تھا' میرے بابا کے گیت اس کی بانسری سے بھی لے بن کر نکلتے تھے۔ میرا اماں جایا رگھو۔

بابا مر گئے۔ رگھو کو جوانی میں ایسا دھکا لگا تھا گاؤں میں اس کا رہنا میری وجہ سے دوبھر ہو گیا۔ ماں اور وہ دونوں جگہ جگہ دھونی رمائے دیس دیس گھومتے رہے۔ پھر ماں نے گنگا کے کنارے پران تیاگ دیے اور رگھو بنوں میں مارا مارا پھرتا رہا اور وہ چاندنی رات جب میں نے رگھو کو دوبارہ دیکھا' میں اگر مر جاؤں اور میری راکھ شمشان میں بکھر جائے تو تب بھی میں اس لے کو پہچان لوں گی' جو لے رگھو کے ستار میں ہے۔ جو اکلوتی لے اس کی بانسری میں ہے' ہزاروں سال بعد بھی وہ گیت مجھے زندہ کر دے گا۔ کیونکہ وہ گیت انوکھا اور نرالا اور اپنا ہے۔ وہ گیت میرا اور رگھو کا ہے۔ وہ ہم دونوں کی امانت ہے۔ وہ ورثے میں ہمیں ملا ہے۔

پر رگھو نے اس دن بھی اس رات بھی اپنی شو کے ساتھ اپنی اکلوتی بہن کے ساتھ بات کرنے سے انکار کر دیا۔ تم نے تو دیکھا کیا وہ جٹادھاری سادھو نہیں لگتا؟ اور مجھے اب اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی ہے۔ سوچتی ہوں یہ گناہ کے تانے بانے جو میرے گرد بُنے جا چکے ہیں' بہت مضبوط ہیں۔ میں ان کو توڑنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ میں میکے کے سکون اور سسرال کے گھر کی عزت کو واپس نہیں لا سکتی۔ میں نے دونوں جگہوں کو برباد کر دیا' پر کوئی مجھے بتائے میرا قصور کتنا ہے۔ بھگوان کی مورتی سے پوچھنا اگر تم کبھی اس کے سامنے جھکتے ہو تو؟

میں رگھو کو کہاں ڈھونڈوں۔ اے ستاروں بھرے آسمان کے اوپر خلاؤں میں رہنے والی روحو ایسی تاریکی میں تم ہی کوئی بات کرو' تم ہی بتاؤ ہیروں کے زیور اور طلائی کپڑوں میں چھپی ہوئی شوبھا اپنے جٹادھاری بھائی کو کیسے مل سکتی ہے۔''

مہینوں کے بعد کرشن گوپال کا خط آیا۔ اس میں ایک بلٹی تھی' صرف یہ کہ دنیا کے کپڑوں کے بکس بھجوائے جا رہے تھے۔ بہاری اچھا تھا اور خوب خوش تھا۔ میں نے اسٹیشن جا کر دنیا کے بکس لیے اور انہیں گھر لے آیا۔

نرو پما نے احتیاطاً بینا کو اندر بلا لیا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ بوا کے کپڑوں سے بیماری کے جراثیم نکل کر اس کی بیٹی کے دامنوں سے چمٹ جائیں۔ میں نے اپنے کمرے کی تنہائی میں صندوق کھولے۔ تہہ در تہہ جہیز کے کپڑے ماں کے ہاتھوں کے کپڑے' دادی ماں کے ہاتھوں کے ٹکائے ہوئے کپڑے' جنہیں عورتوں کی طرح دنیا نے حفاظت سے بند رکھا تھا اور جنہیں کھولنے اور کھول کر پہننے کا وقت اپنی مصروف زندگی میں نہ مل سکا۔ دوسرے صندوق میں معمولی روزمرہ کے پہننے کے کپڑے' دھوتیاں اور ایسی چیزیں تھیں جنہیں اس نے استعمال کیا ہوگا۔ میں نے ایک ایک کپڑے کو نکال کر دیکھا۔ میں نے کپڑوں کو آنکھوں سے لگایا۔ اس کی چیزوں کو پیار سے بھینچا۔ یہ میری اپنی بہن کی مری ہوئی بہن کی نشانیاں تھیں۔ میری جوانی کی ایک تصویر تھی۔ بہاری کے فوٹو تھے اور آخر میں ایک پرانی سی کاپی تھی۔ میں نے کاپی کو کھولا۔ تاریخ وار اپنی زندگی کے حالات درج تھے۔ دنیا کو اپنی نشانی چھوڑنے کا وقت ہی مل سکا تھا۔ میری آنکھیں اس شام آنسوؤں سے دھندلی ہو گئی تھیں۔ مجھے کاپی کے حروف ٹھیک سے دکھائی نہ دیتے تھے۔ اس کی مختصری ایک ہی طرح کے دکھوں سے مزین زندگی کے حالات۔ بہاری کی زندگی سے لے کر اپنے گھر سے نکالے جانے کے دن تک کے واقعات' ایک ایسی عورت کی ڈائری جو اس نے دوسروں کی نگاہوں سے

پوشیدہ صرف اپنی تنہائی کے لمحوں کو گزارنے کے پہلے لکھی ہوگی۔ یہ اس لیے تو نہیں تھی کہ کوئی دوسری آنکھ اسے دیکھے اور دوسرا شخص اسے پڑھے۔ مگر میں تو اس کا اپنا بھائی تھا۔

میں نے کاپی نکال کر علیحدہ رکھ لی اور صندوق بند کر دیئے۔ وہ صندوق آج بھی میرے کمرے میں رکھے ہیں۔ وہ صندوق اس اندھیرے میں بھی مجھے اپنے پیچھے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں دنیا کے بچپن سے جوانی تک، خوشی کی گھڑیوں سے مرنے کے لمحوں تک کی داستان پوشیدہ ہے۔

اور میں سوچتا ہوں یہ تمام عورتیں جو میرے قریب سے گزریں جنہوں نے مجھ سے گفتگو کی، ان سب سے بلند تو وہ تھی جو اسپتال میں مجھ سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی مرگئی اور جس کی آنکھیں آخر وقت تک دروازے کی طرف لگی رہیں، شاید کرشن گوپال آجائے، شاید اس کا بیٹا بانکے بہاری آجائے۔ اس کو ترستے ہوئے مرنا تھا، تو میں بھی تم سے پوچھتا ہوں اے بلندیوں پر رہنے والے خشک و تر کے خدا، اسے پیدا کیوں کیا تھا؟ تم تو کہتے ہو تمہارے کام میں کوئی نہ کوئی بھلائی ہے، پر مجھے یہ تو بتاؤ اسے یوں سسکتے ہوئے مارنے میں تمہیں کیا ملا؟ اور اس دوسری عورت کو ایڑیاں رگڑ کر مارنے سے تم دنیا میں کون سی نیکی کا اضافہ کر رہے تھے۔ وہ دوسری عورت جو دنیا کے کمرے کے قریب دوسرے کمرے میں اس رات سے پہلی رات کو بے یار و مددگار مرگئی، جس کی چیخیں اتنی دلدوز تھیں کہ اپنی ساری برداشت کی قوتوں کے باوجود دنیا بھی رو پڑی تھی اور میں تمام وقت کانوں میں انگلیاں دیئے بیٹھا رہا تھا۔ تمہارے نظام میں ہر شے اس محور کے گرد گھومتی ہے جس کو تم نے قسمت کا نام دیا ہے۔ پھر یہ دونوں اور ان کی طرح کی اور بہت سی معصوم اور مظلوم ہستیاں آخر کون سے نقطے کے سامنے آجاتی ہیں کہ یہ چکر انہیں پیس ڈالتا ہے۔ کیا تمہارا چکر اندھا ہے۔ تمہارے چرنوں میں جو آنسوؤں کی آرتی چڑھائے اس کو بھی تمہاری پتھریلی ٹھنڈی مسکراہٹ کی لہریں مار ڈالتی ہیں، جو تم سے رُوٹھا ہوا ہو اس کو بھی تم پیس ڈالتے ہو۔ نہ جانے تم کیسے خوش ہو سکتے ہو کہ اپنی ساری قوتوں کے باوجود انسان تمہیں خوش کرنے کا ڈھنگ نہیں جانتا؟

چند دنوں بعد پھر شوبھا کا خط آیا، لکھا تھا۔

تمہارے اخبار میں پندرہ سال پہلے کی یادوں کو تازہ کرنے کی ہمت ہے۔ اصل میں تم سے مل کر مجھے سارا بچپن ماضی اور جانے کیا کیا واپس مل گیا ہے۔ یوں کہ ہر شے لوٹتی ہوئی محور پر الٹی حرکت کرتی نظر آتی ہے۔ آج سے پندرہ سال پہلے جن راستوں کی تازگی نے مجھے اپنی طرف

کھینچا تھا، وہ آج خزاں کے پتوں اور ویرانی سے اَٹے پڑے ہیں۔ دولت کے جس جادو نے بڑے پن کے جس طلسم نے مجھ پر اپنا وار پھینکا تھا اس کے پھندے گھس گھس کر اتنے سالوں میں خود ہی کمزور ہو گئے اور ٹوٹ رہے ہیں۔ جب میں پہلے اس راہ پر چلی تو میرے ہم نشیں لاتعداد تھے اور آج جب لوٹ رہی ہوں تو اکیلی ہوں۔ راہوں کی خاک، گزرگاہوں کی دُھول میری پیشانی پر جمع ہے۔ پہلی بار دیکھ رہی ہوں کہ جن راہوں سے ہم گزر آتے ہیں ان کی ساری جاذبیت وقتی اور سارا سنگار بے کار ہوتا ہے۔ زندگی کی راہیں بھی گزارتے وقت اتنی جاذبِ نظر اس لیے دکھائی دیتی ہیں کہ ہم انہیں اپنے خیالوں سے کسی بادشاہ کی آمد کی خوشی سمجھ کر سجاتے ہیں اور جب خود وہاں سے گزرتے ہیں تو اپنے کو کتنا بلند اور خوش قسمت خیال کرتے ہیں۔ شکست ہمیشہ ویرانوں سے گزرتی ہے، اگر آج سے پندرہ سال پہلے کا وقت ہوتا تو میں پھر تمہارے نظریوں کے خلاف واویلا مچاتی، تمہارے اخبار کو بند کروانے اور اپنا اثر ڈال کر تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی شاید اور اگر مجھے رگھو نہ ملتا تو شاید میں بدلتی بھی نہ۔ یکایک میری نگاہوں کے سامنے سے کسی نے دھند ہٹا دی ہے اور مجھے دوسرے کنارے پر کوئی بھی نظر نہیں آتا جو میرا منتظر ہو، میں اس ویرانے میں کس قدر اکیلی ہوں۔

تم عورتوں کے حقوق کے لیے اپنے اخبار میں دُھواں دھار ایڈیٹوریل لکھ رہے ہو۔ تم ملک کے رواجوں کے خلاف ایک تحریک چلا رہے ہو۔ سچ کہنا عورتوں کی آزادی کے اتنے حامی کب سے بنے ہو؟ مجھے تو تمہارے لفظوں کے پیچھے کنول کماری ٹھاکر کی تصویر نظر آ رہی ہے۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا کہ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو میں یہ سب کچھ نہ لکھتی مگر وقت بدل چکا ہے۔ کنول کہاں ہے۔ یہ تم مجھے نہیں بتاؤ گے۔ چلو میں پوچھتی بھی نہیں مگر مجھے آج تمہاری تاج کو چاندنی میں دیکھتے ہوئے کہی ہوئی بات یاد آ رہی ہے۔
وہ عورت ہے۔ تم اسے عورت سمجھتے ہو۔ میں اسے دیوی کہتی ہوں۔ بولو اب تو خوش ہو۔

کنول کا نام سن کر آج سے دو سال دو ماہ پہلے بھی میرے سینے میں حسد کی آگ بھڑک اٹھتی، مگر آج میرا دل ٹھنڈا ہے۔ جیسے کمرے کی ہر شے ٹھنڈی ہے۔ جاننا چاہتے ہو کہ کنول کا نام سن کر میں جل کیوں جاتی تھی، اس لیے کہ کنول عورت ہے۔ ہر پستی کو بلندی سے خدا کے واسطے کی دشمنی ہوتی ہے۔ مت سمجھنا کہ مجھے ہر گھڑی اپنی اس گراوٹ کا احساس نہیں تھا مگر یہ احساس اور بھی گہرا شدید اور قاطع بن جاتا، جب میں کنول کا نام سنتی تھی۔ میں نے ایک بیمار کی طرح صحت کے

بستر پر پڑے پڑے ایڑیاں رگڑی ہیں کہ میں انہیں راہوں سے عزت کے اس دائرے میں قدم رکھ سکوں اور جب ایک محال میرے سامنے تھا تو دوسرا محال دور نہیں تھا۔ میں دوسرا کنارہ اپنے بس میں کرنے لگی۔

تم آدمی مل کر اس تحریک کو چلانا چاہتے ہو۔ چہ خوب۔ آدمی بھی عورتوں کے حامی بن گئے۔ آدمی بھی عورتوں کو آزاد کرنے کے حق میں ہیں؟ عورت آزاد ہو گی تو قید ہو گی۔ عورت بڑھے گی تو گھر سے گئی عورت چلے گی تو اپنی ہر حرکت سے گہرا اور تاریک جال اپنے گرد بُنے گی۔ کیا تم اپنے آپ کو نہیں سمجھتے' کیا تم مرد کی فطرت سے واقف نہیں ہو؟ کیا تم مرد نہیں ہو؟

میری زندگی ایک عبرتناک داستان ہے اور بڑھتی ہوئی آزادی کے غُلغلوں میں میری عبرت ناک داستان ایک تازیانے کا کام دے گی۔ میری زندگی معاشرے کے ناسوروں سے بھری پڑی ہے۔ میری زندگی ان سب داستانوں کا مجموعہ ہے جو مرد تخلیق کرتا ہے۔ اگر کہو تو میں اپنی زندگی کے حالات تمہیں لکھ بھیجوں۔ کنول کو شاید انہیں پڑھنے کا اشتیاق ہو گا کیونکہ اس کا نام میری زندگی کے پہلے سالوں میں ایک انگارہ بنا ہوا تھا۔ تم نہیں بتاؤ گے مگر مجھے معلوم ہے' کنول تمہارے قریب ارد گرد ہی کہیں موجود ضرور ہے' ورنہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ تمہارے اخبار میں عورتوں کے لیے یہ لے دے مچائی جاتی۔ یہ مرد کی فطرت کے خلاف ہے۔

ہوا کے جھونکوں سے میرا پلو اُڑ رہا ہے۔ میرے جسم میں کوئی شے رہ رہ کر کانپ اٹھتی ہے۔ میں کسی سے پوچھوں کیا' اس جسم میں کوئی شے ایسی بھی رہ گئی ہے۔ کوئی گرمی کوئی روح جس کو باہر کی سردی کپکپا دیتی ہو؟

کنول سے کہنا تم بھی دھرتی ہو اور میں بھی۔ کیا ہوا جو تم ماتھے پر چڑھانے کے لیے ہو۔ میں پاؤں کی دھول بن کر مندر میں جا سکتی ہوں۔

شوبھا

میں نے شوبھا کو لکھ بھیجا کہ اس کی زندگی کے حالات ہمیں ہر حال میں راہ دکھلانے اور نظریے تجویز کرنے میں مدد دیں گے۔ اس کے تجربے ہمیں کھلی آنکھوں سے آگے بڑھنے میں مدد دیں گے۔ یہ ہماری انتہائی خوش قسمتی ہو گی کہ شوبھا جیسی مقتدر ہستی نے ہماری مدد کا وعدہ کر لیا ہے۔ ہم ایک امانت کی طرح ان حالات کو رکھیں گے' یہ ہمارا راز ہو گا۔

اس خط کے جواب میں شوبھا نے لکھا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں اور تمہارے لیے وہ مردہ حالات کس حد تک فائدہ مند ہوں گے۔ میں کسی سے ڈرتی نہیں ہوں۔ راز یا نہ راز اس سے مجھے کوئی علاقہ نہیں۔ عزت تو اس دن لٹ گئی تھی جس دن میں نے مندر کے اندھیرے میں جوگی کی بات سنی تھی اور خاموش رہی تھی۔ جانتے ہو عورت کی عزت کتنی نازک ہے۔ وہ مرد سے بات کرتے سے غیر مرد کی بے باک آنکھ کا' اس کی تیز نگاہ کا سامنا کرتے ہی جاتی رہتی ہے؟ سوچتی ہوں' سخت حیرت سے تم میرے یعنی شوبھا کے یہ لفظ پڑھ رہے ہو گے' اس لیے کہ اس سے عجیب بات دنیا میں کبھی نہیں ہوئی کہ میرے جیسی بے باک عورت ایک آن میں ایسی متضاد باتیں کہے۔

عورت کو جب مردوں سے جا و بے جا تعریف کروانے کی خواہش ہونے لگے تب اس کے پردے میں عورت سو جاتی ہے اور طوائف جاگتی ہے' اس لیے یہ پوچھتی ہوں' تم طوائف سے عزت کی باتیں سن کر کانپ نہیں گئے کیا؟

میں نے جتنی دنیا اتنے سالوں میں دیکھی ہے' میں نے شریف زادیوں کو گرتے' غریبوں کو بے نیازی سے بلند کام کرتے دیکھا ہے۔ میں ہمیشہ کی طرح آج بھی سوسائٹی کے دل میں رہتی ہوں۔ ان باتوں کو لکھتے سے یہ مت سوچنا کہ باقی دنیا بھی مجھے ایسا ہی سمجھتی ہے جیسا میں اپنے کو کہہ رہی ہوں مگر بات یوں ہے کہ یہ حمام ہے اس میں سب ننگے ہیں۔ ہر ایک دوسرے کو جانتا ہے اور ایک دوسرے سے نگاہیں چراتا ہے۔ حسن کی جلوہ طرازیاں' عشق کی نیرنگیاں' بے باکیاں' کیا کیا گنواؤں' تم اگر اصلاح شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہو تو خدا کے لیے کسی اور کنارے سے شروع کرو۔ تم اگر حقیقتاً ملک کے بہی خواہ بننے کا ارادہ رکھتے ہو تو نئی پود کا علاج کرو۔ میں جب جوان لڑکیوں کو نو عمر لڑکیوں کو بے باک ہوتے دیکھتی ہوں تو اپنی ساری پستی کے باوجود کانپ جاتی ہوں اور اس لیے تم سے بامنت کہتی ہوں یہ قعرِ مذلت کے کنارے جتنے بھی نئے جمع ہونے والے ہیں ان کو بچاؤ۔ ان کو روکو۔ کیا تم سنگ بنیاد کو بدلنے کا بیڑا نہیں اٹھا سکتے؟

کنول کماری آج کہاں ہے؟ کنول کی سی بیٹیاں تو کم پیدا ہوتی ہیں اور میری طرح کی عورتیں سینکڑوں ہیں۔ تحریک کی مخالفت نئے ارادوں کے خلاف آواز نہ جانے اور کون اُٹھائے۔ بہرحال میں اپنی ساری راہ کے ساتھ تمہارے ساتھ ہوں۔ میں اپنی زندگی ایک مثال کے طور پر تمہارے سامنے پیش کر سکتی ہوں تا کہ تم تازہ واردانِ بساط ہوائے دل کو میرے زخم دکھا سکو۔ میں

ایک ایسی لاش بننے کے لیے تیار ہوں جس کو چیر پھاڑ کر انسانی دل اور جسم کے اندرونی حالات کا جائزہ لے کر انہیں درست کیا جا سکے۔

مانتی ہوں راہ دور ہے اور تم لوگ اس کے انجام تک بیٹھ نہیں سکتے پھر بھی میری لاش تم سب کے کاموں سے آگے نکل جائے گی۔ انسانیت کی خدمت کا جذبہ اگر تمہارے دل میں ہے تو میرا دل بھی اس سے معمور ہے۔ میں اپنے آپ کو پیش کرتی ہوں اور سوائے اس کے میرے دامن میں کچھ اور نہیں۔

مجھے لکھو کہ تم کہاں سے اپنی اصلاح کا دائرہ شروع کرنے والے ہو۔ اس کے مطابق حالات مرتب کر کے تمہیں بھیجتی رہوں گی۔

کنول کو میرے پیغام پہنچا دیا کرو۔ میں ایک کمزور کی طرح اس سے رحم اور معافی کی طالب نہیں ہوتی۔ میں نے اس کی شہرت کو جو نقصان پہنچایا' وہ ایک عمر کے لیے کافی ہے مگر کیا ہی اچھا ہو وہ ایک دریا دل دشمن کی طرح میری غلطیاں بھول جائے۔ بھولنا بھی ایک نعمت ہے۔ اگر دشمن کی غلطیاں بھلائی جا سکیں۔

تم مرد ہو اور مردوں کے خلاف کوئی بھی بات سن کر یقیناً جل اٹھو گے۔ کیا کروں کہ عورت کی کہانی میں مرد کا نام بار بار آتا ہے۔ اس کہانی کی تکمیل اور تخریب مرد کے نام سے ہے۔ آخر خدا کسی اور طریق سے بھی دنیا بنا سکتا تھا' اسے حوا کو آدم کی پسلی سے نکال کر کیا ملا۔ دیکھتے ہو دل کے قریب سے جو امانت نکلی اس کا کیا حشر کر رہا ہے وہ۔ باقی تمہارے خط ملنے پر۔"

شوبھا

دوسرے دن شوبھا کا ایک اور خط ملا۔ یقیناً میرا جواب ابھی اس تک پہنچا نہیں ہوگا۔ اس نے اس خط میں کیا لکھا؟ میں نے خط جلد جلد کھولا۔

"کل ایک خط سپردِ ڈاک کیا تھا اور چند دنوں تک مزید کچھ لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتی' مگر جو حالات اس کے بعد پیش آئے' سوچتی ہوں وہ بھی شاید تمہاری اصلاحی تحریک میں مفید ثابت ہوں۔ آج کل میں زندگی کے ہر کام کو تمہاری اصلاحی عینک سے دیکھنے لگی ہوں اور چیتھڑے جمع کر کے گدڑی بنانے والے فقیر کی طرح مجھے ہر واقعہ تمہاری تحریک آزادی میں ایک خوبصورت اضافہ لگتا ہے۔ کہو کیا کہتے ہو؟

شام کو میں سیر پر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ میرا شوفر بہت گھبرایا ہوا آیا اور بولا "غضب ہو گیا' آپ لوگ مجھے بچا سکتے ہیں تو بچا لیجئے۔"

میں گھبرا گئی۔ نہ جانے اس نے کیا کر دیا ہے۔ میں نے کہا: "کچھ بتاؤ تو سہی کیا کر کے آئے ہو تم اور کیا غضب ہو گیا؟" کمبخت خوب جواں اور گٹھے ہوئے جسم کا تنومند آدمی ہے۔ میری ساڑھی کندھے سے ذرا نیچے ڈھلک آئی تھی۔ میں اپنے جوڑے میں نیلراج کی ایک ڈنڈی دبا رہی تھی۔ دونوں ہاتھ اس میں لگے تھے اور وہ باتیں کرتے ہوئے بری طرح مجھے بھی گھور رہا تھا۔ ایک شیطانی مسکراہٹ اس کے چہرے پر تھی۔ میں سٹپٹا رہی تھی۔

میں نے کہا: "جلد کہو جو کچھ کہنا ہے۔"

بولا: "آج ایک بڑھیا کو موٹر کے نیچے دابتا آیا ہوں۔"

میں نے کہا: "موٹر بھگا لائے تھے یا کسی نے نمبر نوٹ کر لیا؟"

بولا: "اس پاس صرف دو مزدور تھے اور کوئی نہ تھا۔ نمبر کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔ پر پتہ چل جانے پر مجھے پھانسی کی سزا ملے گی کیا؟" میں نے یہ پہلا حادثہ کیا ہے نا اسی لیے گھبرا رہا ہوں۔ روز روز موٹروں سے انسانوں کو کتوں کی طرح روندنے والے تو اس طرح نہیں گھبراتے۔"

میں نے اسے دلاسا دیا اور کہا تم چپکے بیٹھے رہو میں خود ہی پتہ کرتی ہوں اور پھر میں موٹر لے کر وہاں پہنچی' جہاں پر شوفر نے بتایا تھا لوگ لاش کے ادھر اُدھر سے دور ہٹ کر گزر رہے تھے۔ موٹر کے پہیے ایک طرف کے جسم کو کچلتے ہوئے گزر گئے تھے۔ کپڑوں کے چیتھڑے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ کسی اچھے گھرانے کی ہوگی۔ پاس کی کوٹھی سے جا کر میں نے پولیس کو فون کیا۔

اور تھوڑی دیر میں پولیس کی ایمبولینس کار آ گئی۔ یہ سب چند منٹوں میں ہو گیا۔ جسم میں خون بہت کہاں تھا جو بہتا۔ ایک ننھے سے سرخ تالاب میں بڑھیا کے بال بھیگے ہوئے تھے۔ اس کی جو آنکھ بچ گئی تھی وہ بند تھی اور اچھا ہاتھ یوں کھلا تھا' گویا بھیک کے لیے دراز کیا گیا ہو۔ موت کے بعد تک دستِ سوال دراز تھا۔

اسپتال میں ادھر اُدھر کی کوٹھیوں کو فون کیے گئے۔ شاید اس لاوارث بڑھیا کا کسی کو پتہ ہو کہ وہ کون تھی اور تمہیں سن کر حیرت ہوگی کہ فون کے جواب میں ڈائریکٹر جنرل کی بیگم نے کہا کہ لاش اس کی ساس کی تھی اور میاں کے آنے تک لاش کو بالکل نہ چھیڑا جائے۔ وہ خود آ تیں مگر مصروف ہونے کے باعث نہ آ سکیں گی۔

مجھ سے زیادہ بے حس لوگ اس دنیا میں ہیں' یہ جان کر میں تھوڑی مطمئن ہوگئی۔

میں اخلاقی فرض سمجھتے ہوئے دو گھنٹے وہاں کھڑی رہی۔ ڈائریکٹر جنرل آئے اور ماں کے کچلے ہوئے سر کو روندے ہوئے جسم کو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں ٹپکے۔ سرکاری کارروائی کے بعد انہیں لاش سپرد کر دی گئی۔ میں اس سے نئی نئی متعارف ہو چکی تھی اور عزاداری کے لیے جانا ضروری تھا۔ میں لاش کے ہمراہ ہی چلی گئی۔ ایک گڑیا کی طرح بجی سجائی عورت نے دروازے سے نکل کر کہا' آج شام بھی برباد گئی۔ میری طرف دیکھ کر اس کی آنکھیں اور زیادہ کھل گئیں۔ مختصراً یہ بتا کر کہ مجھے سیر کو جاتے ہوئے بوڑھی عورت کی لاش دکھائی دی تھی' میں جانے کے لیے اٹھی' ڈائریکٹر کی بیوی نے کہا' مرنا تو سب کو ہی ہوتا ہے' پر ہماری ساس ہر کام بے وقت کرتی تھیں۔ آج بھی بے وقت ہی مر گئیں۔ میں نے ان کو بہت روکا تھا' مگر وہ مجھ سے روٹھ کر چلی تھیں۔

جو بات اپنے تجربے سے بعید ہو اس کو باور بہت دیر سے کیا جاتا ہے۔ میں نے پوچھ ہی لیا: ''آپ کی ساس کیا آپ سے خوش نہیں رہتی تھیں۔''

کہنے لگی: ''بوڑھے لوگوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔'' اور پھر ہنس کر بولی: ''بوجھ ٹل گیا۔ آج کی شام برباد گئی۔ ہم سب پکچر دیکھنے جا رہے تھے۔'' تب سے اب تک سوچ رہی ہوں اولاد ایک نعمت ہے یا بڑھاپا ایک حقیقی لعنت...... میں خود ہمیشہ ان جھگڑوں سے آزاد رہی مگر زندگی کے اس حشر میں کہیں تو کوئی سیاہ نقطہ ہے جو چپکے چپکے بڑھتا پھیلتا رہتا ہے اور اس کو تاریک کر دیتا ہے۔ مجھے خواب میں بھی وہ بند آنکھ وہ دست سوال دراز نظر آتا ہے۔ ایک عمر کی مشقت کے بعد زندگی نے ہمیں تمہیں اور اس بڑھیا کو کیا دیا؟ ہر گھڑی دل کی کچلن سے تو موٹر کے پہیئے ہی مہربان نکلے۔ عذاب سے رہائی تو مل گئی' مگر پھر بھی دل کو تسلی نہیں ہوئی۔ نہ جانے دل کو کس دن ایک مختصر مگر جامع جواب ملے گا' جو اس کی ساری دھڑکنوں کا حل ہوگا۔ اے بھگوان' اے خدا' اے پرم آتما میں کہاں جاؤں۔ خیر باقی باقی۔''

شوبھا

اس خط کو پڑھ کر مجھے دیر تک اپنی دادی ماں اور ماں یاد آتی رہیں۔ دادی ماں کی مالا اس کا میری نام کا سمرن بند آنکھیں اور بالکنی کے کنگرے پرانے گھر میں اب کون ہوگا۔ دادی ماں کی

آتمارات کو بے قراری سے اپنے ویران گھر میں پھرتی ہوگی۔ اسے کوئی نظر نہیں آتا ہوگا۔ کہتے ہیں روحوں کو چین نہیں ملا کرتا۔ جب تک انہیں کوئی اپنا دکھائی نہ دے اور میں اس سوال کو حل نہیں کر پاتا کہ روح جب اس بڑے حصے میں مل جاتی ہے' جب موت کے بند نروان اور مکتی کے اور چکروں میں گھومتی ہے' جب کسی اور شکل میں جنم لیتی ہے تو وہ گھومتی کیوں ہے؟ یا پھر وہ دوسرا خیال ٹھیک ہے کہ ایک ہی چکر کے بعد جسم کے ایک فانی دائرے سے گھوم کر دوسرے دائروں میں اس کا وجود نہیں ہوتا' ان مسائل کو حل کرنے کے لیے عقل نہیں ایک روشنی چاہیے۔ گیان کی روشنی جو کسی کو نصیب نہیں ہوتی اور پھر زندگی کے یہ دائرے یہ پتھر سے نکلنے اور پھیلنے والی لامتناہی لہروں کی سی اداسی' یہ ابتدا اور انتہا سے بے خبری' ہم اندھوں کی طرح اندھیرے میں راہ ٹٹول کر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری مضحکہ خیز اور ناکام کوششیں۔

کنول مجھ سے کہتی تھی تم لوگ عورت کو اس لیے ہی کیوں دیکھتے ہو کہ وہ مرد کے لیے زندہ ہے۔ اس کی اپنی الگ کوئی زندگی کیوں نہیں ہے۔ اس کا اپنا ایک الگ وجود ہے۔ تم اس کو دیکھو گے تو بیٹی کی حیثیت سے' بہن بنا کر بیوی اور ماں کی طرح۔ کیا عورت ان حالتوں کے علاوہ ایک عورت نہیں ہے۔ اگر تم ایک مرد بن کر زندہ رہتے اور ترقی کرتے ہو تو کیا عورت' بہن بیوی بیٹی کے رشتوں سے بلند ہو کر نہیں رہ سکتی۔ تم نے اپنی عقل کے جو پیمانے بنا لیے ہیں' انہیں عورت کی شرافت' اس کی عزت اور اس کی ہستی کے ناپنے کے لیے کیوں مقرر کرتے ہو؟

اور میں کنول کماری ٹھاکر کی اس بات کا جواب کبھی نہ دے سکتا۔

کنول نے جو راہ شروع کی تھی وہ یہی تھی' ان الگ راہوں سے دنیا قائم کردہ شاہراہوں سے' اپنے لیے باقی دنیا کے لیے ایک الگ نظریہ اور نظامِ حیات۔

میں نے اس سے یہ کہا تھا کہ دنیا اتنی پرانی ہے' اس کی کہنگی اس کی سچائی کی دلیل ہے' تم اس سارے نظریوں کے خلاف لڑ نہ سکو گی۔

اور کنول کا صرف یہ جواب ہوتا تھا' میں آخری وقت تک اس نظام کے خلاف جدوجہد کروں گی۔

کرشنا بھی پاس سے بول اٹھتی' مجھے بتاؤ محبت کے علاوہ کوئی اور راہ نہیں ہے' جس سے ہم اپنی انفرادیت قائم رکھ سکیں۔ کوئی ایسی راہیں نہیں ہیں جن سے ہم اپنے آپ کو پا سکیں۔ کیا

عورت کی نجات اسی میں ہے کہ وہ تیز موڑوں اور ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے راہوں پر کسی کا انتظار کرتی رہے۔ کیا وہ محبت سے بلند نہیں ہو سکتی؟

کنول کہتی: ''نہیں کرشنا میں محبت کو تو ایک نقطۂ روشنی بنانا چاہتی ہوں۔ محبت کے بغیر ہستی ایک بے کار شے ہے مگر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان بے کار کے نظریوں کو پسِ پشت ڈال کر ایک الگ راہ، ایک حقیقت ہمارے پیشِ نظر ہو۔''

اور دونوں کے سوال مل کر مجھے پریشان کر دیتے۔

پھر خود ہی دونوں کہتیں۔ ہم بھی کیسی پاگل ہیں۔ ایک مرد سے اس سوال کا جواب پوچھتی ہیں..... ''مرد جو اپنی ہستی کی برتری جتانے کے لیے ہر راہ پر عورت کے وجود کو ٹھوکر لگاتا آیا ہے۔''

میں معذرت پیش کرتا کہ میں نے کبھی کسی عورت کے وجود کو نہیں ٹھکرایا۔ باقی دنیا کے الزامات مجھ پر کیوں عائد کیے جا رہے ہیں۔

کنول ہنس پڑتی۔ کرشنا بھی ہنس دیتی۔ دنیا کا انجام دیکھتے ہوئے ہم لوگ آج کل مشترکہ خاندان کے خلاف مسلسل مضامین شائع کر رہے تھے۔ لوگ ہمارے مضامین کی حیرت انگیز سچائی اور پھر بھی ناقابلِ عمل تجویزوں پر انگشت بدنداں تھے مگر ہندوستان میں مشترکہ خاندان ایک ایسا شیرازہ تھا کہ اگر اس کو کھولا جائے تو سارے اوراق پریشان ہو جائیں گے۔ بڑی اینچ پینچ راہوں سے؟ ارے مضامین پر اعتراضات ہو رہے تھے۔

آج سوچتا ہوں کنول تو ایک فنکار تھی۔ ڈی ایچ لارنس کے لفظوں میں۔ صرف واحد عورت جو خالصاً دوسروں سے بلند اور اصلاً الگ اور تنہا تھی جو حقیقتاً زندگی کو ایک فن بنا سکتی ہے جس کے رشتے باقی دنیا سے ایک تفریح ہیں۔ بچوں کی محبت اور عام زندگی کی راحتیں اس کے لیے جھوٹ تھیں، اسے خدا نے اس لیے پیدا نہیں کیا تھا کہ وہ دوسروں سے مدغم ہو کر اپنی ہستی کو دوسروں کے اندر سمو دے وہ تو دوسروں سے بلند اور الگ رہنے کے لیے بنائی گئی ہے، چاہے اس کے تجربات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ کنول میں کچھ بات تھی دوسروں سے الگ دوسروں سے عظیم نہیں مگر دوسروں سے مختلف اگر وہ عام سطح سے بلند ہوتی تو میں اس سے کبھی ملتا نہ رہتا، کبھی اس دیوانے جذبے کو آج تک اپنے دل کی گہرائیوں میں ایک ستارے کی طرح روشن نہ پاتا۔ یہی تو بات ہے کہ میری تمہاری ہر سطح پر اتر سکتی ہے۔ میری تمہاری ہر ایک کھال کے اندر گھس کر ہم سب

کے مشاہدوں کو اپنانے کا ڈھنگ جانتی تھی اور اس کے باوجود وہ سب سے مختلف تھی۔ اس کی عظمت کا احساس کبھی اس کے سامنے نہیں ہوتا تھا، مگر یوں کہ تم اس عظمت کو جو اس کا سب سے بڑا عجز و تھی، محسوس کرتے تھے۔

میں نے گھنٹوں اس کے پاس گزارے ہیں۔ اس کی ہنسی میں شامل ہوا ہوں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں میں شریک رہا ہوں۔ وہ ہنستی بھی میری تمہاری طرح ہی تھی۔ پھر بھی کچھ تو تھا جو کبھی اس بات پر وثوق سے یقین کرنے کو نہیں کہتا تھا کہ تم اس کے دماغ میں کون سے نقطے پر ہو، وہ تمہیں کتنا چاہتی ہے۔ تم اس کی نگاہوں میں کیا درجہ رکھتے ہو۔ میں ساری عمر یہ تعین نہ کر سکا۔ کنول کے گرد جتنے بھی لوگ تھے، سب کبھی یہ نہ جان سکے کہ وہ اسے کتنے عزیز تھے اور کیوں عزیز تھے۔ وہ اندھیرے کے ایک دائرے کی طرح ہستی کے سرچشمے کے گرد ایک سایہ بن کر پھیلی رہی اور سالوں کے بعد میں اس اندھیرے میں سانس لیتی آزاد گھومنے والی رات کی مخملیں سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ اگر میں ایمانداری سے بھی کنول کے خیالات کو لکھنا چاہوں، دوسروں کے سامنے رکھنا چاہوں تو نہیں کر سکتا، کیونکہ میں اسے جان ہی نہ سکا۔ یہ نہیں کہ وہ ایک معمہ تھی بلکہ یہ کہ اتنی آسان نہ تھی کہ اگر اس کی ہستی کو کوئی تغیر کرنا چاہو تو یہ ناممکن ہے۔

شوبھا نے مجھے لکھا تھا کہ اس نے کنول کی شہرت کو نقصان پہنچایا ہے۔ آج سوچتا ہوں کنول کماری ٹھاکر شہرت یافتہ تھی؟ کنول کو دنیاوی اعزاز کی کون سی سند ملی ہے؟ وہ تو پس منظر میں رہ کر خاموشی سے خوشبو کی طرح ہر شے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے کاموں سے اس کی انفرادیت کسی خاص روشنی میں اجاگر نہیں ہوتی۔ یہ کام بھی میرے تمہارے اور دوسرے کئی لوگوں کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں۔ اس نے کبھی جلوسوں کی قیادت نہیں کی۔ میری قلم عاجز ہے۔ میں کیا بتاؤں کہ اس نے کیا کیا ہے؟ اور پھر بھی کسی نہ کسی طرح کرشنا، شوبھا، نیرا کی زندگیوں کے عقب سے اسی کا چہرہ جھانکتا ہے۔ کنول کماری ٹھاکر کا۔ میری اپنی زندگی اسی نقطے کے گرد گھومتی رہی ہے اور پھر بھی کنول میری زندگی میں کہیں موجود نہیں ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں۔ ہم سب محبت کے اس نقطے کے گرد پھرتے ہیں جو کہیں نہ کہیں ہماری روحوں سے زیادہ ہمارے جسم میں مس ہوتا ہے۔ پہلے ہم ہیرے کے ٹکڑے ہوتے ہیں، پھر اندرونی تپش ہمیں کاربن بنا ڈالتی ہے۔ کاربن کوئلہ ہوتا ہے۔ دیئے کی لو سے بھی دھواں نکلتا ہے۔ محبت روشنی ہے، اندھیرا ہے اور جس محبت کا ذکر کنول اکثر کرشنا سے کرتی تھی، وہ کیا تھی۔ اس دنیا کا نظام اور بالواسطہ اسی روشنی سے کہاں جا کر ٹکراتا تھا؟

فن کار کنول کماری کی یاد کے ساتھ دور آموں کے جھنڈ میں چھپی کوئل اپنی دلدوز آواز میں کوہو کوہو پکار رہی تھی۔ پگلی کس کو پکارتی ہے اور مجھے آج پھر موہنا یاد آ رہی ہے۔ دنیا میری بہن وہ ایسے میں کہاں ہوگی۔ میں نے مذہبی کتابوں میں پڑھا ہے کہ روح ایک جسم سے نکل کر دوسرے میں اپنے اعمال کے مطابق منتقل ہوتی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو نیلے آکاش کے دوسری طرف سرد ستاروں میں محبت کی دھڑکن بن کر چمکنے والے خدا سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ دنیا نے کیا گناہ کیا تھا کہ اسے کوئل میں بدل دیا ہے۔ اگر کوئل کی پکار میں اتنا درد نہ ہوتا تو وہ...... پر کوئل دنیا نہیں ہو سکتی۔ یا اگر دنیا نہیں ہے تو پھر وہ دنیا کہاں ہے؟ دنیا نے اپنی یادداشتوں میں جگہ جگہ اس خستہ حال کاپی میں اکثر لکھا ہے کہ اسے آکاش سے دوسری طرف رہنے والی کسی ہستی پر یقین نہیں ہے۔ پرم آتما تم کہاں ہو؟ میری بہن کو اس سوال نے اکثر بے چین رکھا۔ سردیوں کی تاریک شاموں میں چولہے چوکے میں رات بھیگنے تک لگی رہنے والی کرشن گوپال کی بیوی اور میری بہن اس سوال کا جواب کہاں سے ڈھونڈ سکتی تھی؟

کاپی میں لفظ مدھم ہو رہے ہیں۔ مٹ رہے ہیں، کئی جگہ سے کاغذ اُڑ گیا ہے۔ تہوں کی جگہ لکھے ہوئے لفظ نظر نہیں آتے یا یوں ہے کہ جب میں پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں تو آنسو میری آنکھوں کو دھندلا دیتے ہیں اور میں صاف دیکھ نہیں سکتا۔ میرا دل آہستہ آہستہ دھڑک رہا ہے۔ جیسے کسی نے اسے نچوڑ کر اس کا سارا خون نکال دیا ہو اور کوئل کی کوک میں مجھے اس عورت کی چیخیں بھی سنائی دیتی ہیں جو دنیا کے مرنے سے پہلی رات اسپتال کے ایک کمرے میں اکیلی مر گئی اور جس کا پرسان حال سوائے نرسوں کے ڈاکٹروں کی سرد مہری کے اور کوئی نہ تھا۔ کائنات کے اس وسیع قطعے پر اس کا کوئی کیوں نہ تھا۔ عورت کو ماں بہن بیوی بیٹی کی حیثیت سے دیکھنے والے سارے مرد کہاں تھے؟ وہ اکیلی چیخی اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتی ہوئی مر گئی۔

دوسری صبح سارے اسپتال پر ایک اداسی چھائی ہوئی تھی۔ نرسوں کے چہرے موت وحیات کی روزانہ کشمکش دیکھنے کے باوجود بڑے ستے ہوئے اور پریشان تھے۔ نوکر دبے قدموں چلتے تھے۔ شاید زندگی کے بعد اس عورت نے اپنی ہیبت سے سب کو اپنا احترام کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے لوگ گھبراتے تھے کہ وہ پہلی عورت جو کائنات کے اس نظام سے بغاوت کر کے شرط لگا کر مر گئی ہے جیسے وہ آدم کی پہلی بیٹی ہو، جس نے 'دنیا کی خوبصورتی کو موت کی بدصورتی سے ایک دھچکا لگایا ہو اور موت کوڑھ کے ایک داغ کی طرح نظر

آ رہی تھی، ایک نمایاں اور پریشان کرنے والا داغ۔

خلافِ معمول اس دن دنیا کے چہرے پر خوشی کی لہریں سی آ کر ٹھہر جاتیں، میں ڈرتے ڈرتے اس کی طرف بھی دیکھتا تھا کہیں وہ بدحواس تو نہیں ہوگئی مگر اس کے چہرے پر وہی خوشی تھی جو میں نے اس کے بستر میں بیٹھ کر چائے پیتے اور ہنستے ہوئے دیکھی تھی۔ وہ خوشی جو صرف بچپن اور جوانی کے درمیان سالوں میں نصیب ہوتی ہے۔ بےفکری اور آزادی کے لمحوں میں دنیا بھولے ہوئے گیت گنگنانے کی کوشش کر رہی تھی جیسے وہ ایک چڑیا کی طرح ہلکا محسوس کر رہی ہو۔

میں نے کہا تھا: ''دینو تم کوئی بھجن گانا چاہتی ہو؟''

ہنس کر کہنے لگی: ''بھجن تو بھگوان کی یاد میں ہوتے ہیں، پرارتھنا کرنے کے لیے گائے جاتے ہیں اور مجھے تو کوئی ایسا کام نہیں جس کے لیے میں پرارتھنا کروں، کیوں بھیا دعا تو کچھ مانگنے کے لیے ہی کی جاتی ہے نا اور مجھ کو تو کچھ بھی نہیں لینا۔''

''دینو اس طرح بھگوان سے پھر نہیں جاتے، آس رکھو۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' میں نے اسے کہا تھا۔

''ٹھیک!'' اس نے ہنس کر کہا تھا جیسے اسی ایک لفظ میں تو زندگی کے سب راز پوشیدہ ہیں۔ ''جانتے ہو ٹھیک کون ہوا ہے؟'' میں نے خوش ہو کر پوچھا تھا۔

وہ دوسرے کمرے والی جو رات چیخ چیخ کر بھگوان کو پکارتی ہوئی خاموش ہوگئی۔

اور اس لمحے جیسے کسی نے میرے منہ پر پتھر مار دیا ہو، میں خاموش ہوگیا۔ کھلی کھڑکی سے باہر میں اڑتے پرندوں کو دیکھنے لگا۔

جب ڈیوٹی پر نرس اسے دیکھ کر جانے لگی تو دنیا نے پوچھا: ''کیوں بہن آپ مجھے ایک بات بتائیے گا۔''

''کیا؟'' نرس نے اس مصنوعی اور قلابازیوں والی مسکراہٹ کو چہرے پر لا کر کہا تھا۔

''پاس والے کمرے میں جو عورت رات مری وہ کون تھی؟''

نرس نے آہستہ سے کہا تھا: ''وہ عورت جو رات مر گئی لاوارث تھی۔ کوئی آدمی اسے یہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ اپنے کو اس کا باپ بتاتا تھا۔ چار دن سے وہ موت اور زندگی کے درمیان لٹک رہی تھی۔ رات اس کے ایک بچی پیدا ہوئی اور وہ اسی حالت میں مر گئی۔''

لاوارث۔ باپ۔ موت۔ زندگی۔ بچی۔ یہ لفظ مجھے سالوں پریشان کرتے رہے ہیں

اب بھی جب میں سونے کے لیے لیٹتا ہوں اور بتی بجھا دیتا ہوں۔ ایک باپ والی لاوارث عورت کی زندگی میرے سامنے آتی ہے جو ایک بچی کو پیدا کرتے ہوئے مرگئی اور میں آج تخلیق کو ایک مقدس کام سمجھ کر عورت کو دھرتی کی طرح پوتر پاکیزہ اور بلند سمجھتا رہتا...... میں آج بھی تخلیق کو ایک بلندی سمجھتا ہوں مگر عورت کی بلندی اس کے متعلق مجھے اعتراض ہے...... عورت بلند ہے ہی کہاں؟ عورت نے اپنے آپ کو راہ گزاروں کی خاک بنا دیا ہے۔ راہ گزاروں کی خاک' کاش کوئی میرے لیے یہ معمہ حل کر دے کہ جب ہم عورت کو ماں' بہن' بیٹی بنا کر دیکھتے ہیں وہ پھر بھی لاوارث کیوں رہتی ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں رہتی اور پھر اسپتال کے سرد خاموش کمروں میں کراہتی ہوئی تخلیق کی بلندی کو چھونے کی کوشش میں مرجاتی ہے۔

لمحاتی قید سے آزاد ہو کر دکھ اس بڑے چکر میں گھومتے کبھی کبھار پھر دل سے آٹکراتے ہیں۔ تب ماضی کی یاد اتنا بے قرار کرتی ہے کہ دکھ کا وجود سب وقتوں سے زیادہ زندہ اور قریب لگتا ہے۔ میں دنیا کے دکھ کو اس کی موت کے ماتم کو تقریباً مندمل زخم کی طرح سمجھ بیٹھا تھا۔ اسپتال کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے جب پہلے پہل وہ کمرہ دکھائی پڑتا جس میں دنیا نے اپنی زندگی کے آخری سانس پورے کیے تو میں منہ موڑ لیتا۔ پگلا انسان دکھوں اور یادوں سے منہ موڑ کر سوچتا ہے وہ ہمیں چھوڑ جاتے ہیں پھر ایک سال کے بعد مجھے دھچکا لگا۔

اخباروں میں زہر خورانی کی ایک واردات کا چرچا ہونے لگا۔ میں اکثر ایسے سنسنی خیز واقعات کو چھوڑ دیتا ہوں۔ میں سیاسی آدمی بھی نہیں ہوں مگر یہ باتیں مجھے بڑی مضحکہ خیز لگتی ہیں۔ پھر یہ بھی سوچتا ہوں کہ انسان کا اپنے بھائی بندوں کے کمزور وجودوں کو ختم کرنے کا خیال تو بڑا پرانا ہے۔ آدم کے بیٹوں نے ایک دوسرے کے وجود سے آزادی حاصل کرنے کا یہ طریقہ بہت پہلے سیکھ لیا تھا۔ پھر زہر تو اتنا مہلک نہیں ہوتا۔ آہستہ آہستہ مارنے والے دکھ کے دیر سے اثر کرنے والے زہر سے تو بچا لیتا ہے۔ میں نے ایسے چہرے بھی دیکھے ہیں جو مسکراہٹ سے لے کر چلنے کے انداز تک میں زہر ہوتے ہیں اور پھر دوسروں کا زہر کھلانا کیا ضروری ہے۔ انسان کا حسن اس کی دولت اس کی شہرت سب کبھی کبھی زہر میں بدل جاتے ہیں۔ ایک زہر تو آدمی کی زبان میں ہوتا ہے اور اس کا اثر بہت تیزی سے ہوتا ہے۔ اس زہر کا تو تریاق بھی کوئی نہیں اور میرے خیال میں سب سے اچھا زہر وہی ہے جس کا تریاق کوئی نہ ہو۔

کنول کے ہاں پہنچا تو کرشنا بولی: ''بھیا وہ تم نے کل کا واقعہ پڑھا' میرا تو دل ہل گیا ہے۔''

میں نے کہا: ''کون سا ایسا واقعہ ہے جس نے تمہارے دل کو ہلا دیا' کیا اپنی زندگی ایسے کم واقعات سے دوچار ہوتی رہی ہے۔''

کہنے لگی: ''ہاں ایسی ہی بات ہے۔ اتنا انوکھا سا واقعہ ہے۔ بے چاری لڑکی۔''

میں نے کہا: ''بے چاری لڑکی تو اس طرح کہہ رہی ہو جیسے وہ اکیلی ہی بے چاری لڑکی ہے۔ دنیا میں اور بے چاریوں کا وجود تمہارے لیے ختم ہو گیا ہو۔''

''آپ تو مذاق کرتے ہیں پڑھیں گے تو جانیں گے اور ہاں آپ اخبار کیا پڑھتے ہیں اگر ایسی باتیں چھوڑ دیتے ہیں۔''

میں نے کہا: ''موت کے واقعات مجھے ایسے ہی بچوں کا کھیل لگتے ہیں۔ کسی بات میں کوئی جدت ہو تو پڑھنا بھلا لگتا ہے۔ کلہاڑی یا زبان' زہر یا پانی موت تو قطعی ہوتی ہے۔''

کرشنا اخبار اٹھا لائی۔ پچھلے دن کا اخبار تھا۔ آج سے ایک سال پہلے کوئی لاوارث عورت ایک اسپتال میں مرگئی تھی۔ اب یکایک اس کے وارث پیدا ہو گئے تھے۔ اس کا باپ اس کے مالک' آخر کار عورت کو کس نے لاوارث سے سوسائٹی کی رُکن بنانا قبول کر لیا تھا۔ اسپتال میں کسی صاحب اقتدار شخص نے اس لڑکی کو جو لاوارث تھی زہر دلوایا تھا' مجھے ایک سال پہلے کی رات یاد آگئی۔ مجھے اپنی بہن دنیا بھی یاد آگئی۔ دماغ تیزی سے پچھلے دنوں کی طرف اڑنے لگا۔ اور میں اپنے سے پوچھنے لگا کیا تم اس لڑکی کو بھول گئے ہو۔ اس کی دلدوز چیخیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ میں نے اخبار کو دوبارہ پڑھا۔ تین بار چار بار میں اسے پڑھتا ہی گیا۔ پرانے نقش ابھرے اور ایک سال تو کوئی بڑا عرصہ نہیں ہے۔

کرشنا میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بولی: ''کیوں اس کو ایسے پڑھ رہے ہو جیسے یاد کرنے کی کوشش میں ہو۔''

میں نے کہا: ''میں اس لڑکی کو جانتا ہوں۔'' کرشنا کے چہرے پر کبھی حیرت بڑی مضحکہ خیز تھی۔

کنول بھی اندر سے آگئی۔ کہنے لگی: ''کس لڑکی کا ذکر کر رہے ہو؟''

کرشنا نے بتایا۔

کنول بولی: ''بہت سی زندگیاں یونہی موت سے ایک قدم اور زندگی سے ایک قدم لگی

ہوئی کم ہمتی سے لاوارث بن کر زہر کے سہارے سو جاتی ہیں۔"

پھر ہر روز میں کتنی بے چینی سے اخبار میں اس کے متعلق اور تازہ معلومات ڈھونڈنے کی کوشش کرتا' دنوں' یہ موضوع ہر اخبار بین کے لیے تمنا بنا رہا' شہر کے مقتدر آدمی اس میں ماخوذ تھے۔ لاوارث بننے سے پہلے وہ لڑکی کسی کی بیٹی تھی۔ شہر میں دور کسی گاؤں میں رہنے کے باعث باپ نے لڑکی کو اپنے ایک بارسوخ دوست کے ہاں چھوڑ دیا تاکہ تعلیم میں ہرج نہ ہو۔ دوست نے بیٹی کی جوانی اور حسن سے متاثر ہو کر اپنا راستہ بھلا دیا۔ بھولی بھالی لڑکی دام میں گرفتار ہوگئی۔ باپ جب لڑکی کو چھٹیوں میں گھر لے گیا تو اسے معلوم ہوا کہ لڑکی نے اپنی عصمت کی حفاظت نہیں کی۔ راستہ بھٹکی ہوئی ایک روح' بارسوخ دوست سے تعلقات بگڑ چکے تھے۔ باپ لڑکی کو اسپتال میں چھوڑ گیا۔ لاوارث لاوارث ہے اور جب اس کی چیخیں آسمان کے کناروں کو چھونے لگیں تو اس ڈر سے کہ شاید صدائے بازگشت پھر زمین کے کناروں سے ٹکرائے گئے باپ کے دوست نے زہر سے اس دکھ کا خاتمہ کروا دیا جو تخلیق کے سلسلے میں وہ لڑکی برداشت کر رہی تھی۔ کتنی آسانی سے یہ سب کام ہوگیا۔

لڑکی کو معلوم تھا کہ اسے اسپتال میں چھوڑ کر جانے والا دوبارہ واپس اسے دکھائی نہیں دے گا۔ اندھیری راتوں میں جس نے اسے دھوکا دیا' وہ بھی نہیں لوٹے گا۔ پلنگ پر لیٹتے ہوئے کوئی اس کے دل میں کہہ رہا ہوگا' اب تم اس سے نہیں اٹھو گی۔ ان صورتوں نے جو آج تک اسے پیار سے دیکھتی رہی ہیں' اس سے منہ موڑ لیا ہے۔ خدا کی اتنی لمبی چوڑی زمین پر اتنے انسانوں کے درمیان تنہائی کا دکھ اس کے لیے کیا کم زہر تھا کہ دوسرے زہر سے اسے خاموش کیا گیا۔ ان آنکھوں میں وہ زہر دوسروں کو پتھر بنانے کے لیے کافی نہ تھا؟ دل کی گہرائیوں میں اس نے ایک ایسے لمحے کو چھپا رکھا ہوگا' پر اس لمحے پر سے تنہائی اور کرب کی لہریں گزر گئی ہوں گی۔ وہ اسپتال کے لمبے برآمدوں سے نرسوں کے ہمراہ درد اور دکھ کو چہرے پر لیے اندر جاتی ہوئی پیچھے مڑ کر اس صورت کو دیکھتی رہی ہوگی جو آج تک اس لمحے سے پہلے اس کا باپ تھا۔ اسے بچپن یاد آ رہا ہوگا جب اس صورت نے جھک کر اسے بیٹی کہا ہوگا اور پھر کسی ستون سے اندر مڑتے ہوئے وہ صورت ہمیشہ کے لیے اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی ہوگی۔ پتھر باپ اور بیٹی کے درمیان حائل ہوگئے۔ غلطی تو ہے' پر اخلاق کی قدریں' دنیا کی شرم' عزت کے تقاضے' وہ اپنے دل کے اندھیرے میں کوئی روشنی نہیں پاتی ہوگی۔ میرے دماغ میں اس کی دلدوز چیخیں پھر گونجنے لگیں۔ دکھ کی انتہا میں اسے خدا یاد آ رہا ہوگا۔ خدا جو راتوں کو آرام سے اپنے نرم و گرم آسمان سے پرلی طرف بارگاہ خداوندی کے پردوں سے پرے آنکھیں بند کیے بیٹھا کسی نئی اور اچھی مخلوق کے تصور کو مختلف صورتوں میں دیکھ رہا ہوگا' کوئی ایسی مخلوق جو سدھائی ہوئی بھیڑوں کی طرح آنکھیں جھکائے ہوئے سوئی ہوئی راہ پر خاموشی سے چلتی جائے۔

اور جب اپنے خاندان کو پکارتی اپنے گناہوں کی معافی چاہتی موت کے اندھیرے تک بھی امیدوں کا سہارا لیے وہ لڑکی روشنی کا انتظار کرتی چیختی ہوئی مرگئی تو اس کی روح' تیزی سے آسمانوں کی پنہائیاں تہہ کرتی بارگاہ خداوندی کی طرف بڑھی ہوگی اور پردوں کو ہٹا کر اس نے وہاں جھانکا ہوگا تو وہاں کوئی بھی نہ ہوگا' لمبی لمبی گھاس اور اوندھے تخت اس کی نظروں سے ٹکرائے ہوں گے۔

اور یہ سوال کوئی کس سے پوچھے کہ خدا کا وہ ہاتھ جو ہمیشہ روشنی بن کر ہر انسان کے ساتھ چلتا ہے' اس لمحے کہاں تھا یا پھر اس کی قسمت میں یہ بھٹکنا یہ ذلالت یہ موت لکھی تھی' اگر قسمت یونہی تھی تو پھر مجبور و معذور انسان کا قصور کیا ہے؟

کہتے ہیں' لکھنے والی انگلی لکھتی ہے اور جب وہ لکھ چکتی ہے تو انسان کی ساری زندگی کے آنسو اور آہیں مل کر بھی اس لکھے کے ایک حروف کو نہیں مٹا سکتیں۔ پھر لکھنے والے سے کون پوچھے کہ تم کیا لکھ رہے ہو۔ وہ انگلی تو شروع سے آخر تک اندھیرے میں رہتی ہے۔ انسان کی فطرت ہے وہ کسی راز پر کسی اپنے سے بلند ارفع و اعلیٰ ہستی پر یقین کرنے کے لیے مجبور ہے۔ اپنے سے پہلے کے اندھیرے اور آگے کے اندھیرے میں کوئی ہو یا نہ ہو اسے اندھیرے پر یقین ہے' سرکش ایک اَن دیکھی قوت کو پکار کر دل کو تقویت دے لیتا ہے۔

لڑکی کو اسپتال میں چھوڑ کر جانے والا واپس نہ آیا اور آنے سے چار دن بعد درد و کرب کی آشا میں پکارتے پکارتے تھک کر وہ یکایک چپ ہوگئی۔ اسے پہلی بار یہ احساس ہوا ہوگا کہ وہ بے فائدہ ایسی قوتوں کو پکارتی رہی ہے جن کا وجود نہیں ہے۔ اپنی پچھلی زندگی کی خالی آرزوؤں اور امیدوں کا خیال اسے پریشان کرنے کو کافی ہوگا۔ اور پھر ناامیدی کے زہر نے اس کے گرم دل اور پریشان روح کو شبنمی موت سے ہمکنار کر دیا۔ دنیا والے کہتے ہیں اسے زہر دے دیا گیا۔ خیر' دنیا کے طریقے ہیں نا۔

سر بلند مقتدر ہستیوں کو ایک لاوارث لڑکی نے پھر پریشان کر دیا۔ عدالت کی

کارروائیاں شروع ہو چکی تھیں۔ لڑکی کی لاش کو دوبارہ نکالا گیا اور معائنے کے لیے بڑے بڑے ڈاکٹر جمع ہوئے۔ جس لڑکی کو زندگی میں کسی نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا' اس کی ہڈیوں کے گرد سر جوڑ کر بوڑھے اور تجربہ کار ڈاکٹر جمع ہوئے۔ لڑکی کی روح' اگر روح کا کوئی وجود ہے تو ہنستی ہوگی کہ ایک بار تو اس نے ہلچل مچا ہی دی ہے۔ زندگی میں وہ کسی کے دل میں ذرا سا ڈر اور خوف پیدا نہ کر سکی۔ موت کے بعد وہ ایک روح کی طرح زندگی کے امن و امان کے لیے آگ ثابت ہوئی۔ بہت دنوں یہ معاملہ چلتا رہا۔ لاوارث کو کسی نے قبول تو کر لیا۔ کسی نے بیٹی کہہ کر اس کی ہڈیوں سے روپے کمانا چاہے' کسی نے داشتہ سمجھ کر اس سے بچنے کی خاطر اپنی دولت جھونکی۔ دنیا کے نظام کو ایک بار تو اس نے ہلا دیا۔ اس کی ہستی اس کے وجود کا احساس تو ہوا' صدائے بازگشت زمین کے کناروں سے ٹکرا رہی تھی۔

کنول ان دنوں بہت اداس رہتی تھی اور کرشنا کی آنکھوں میں ہر وقت آنسو تیرتے رہتے۔ میں نے اس سے کئی بار پوچھا: ''کرشنا بہن تم کو کس بات کا غم ہے۔ کیا اس سے پہلے کبھی ایسی بات نہیں ہوئی۔ آسمان نے تو اس سے بھی بڑے تماشے دیکھے ہیں۔'' اتنے ہیبت ناک تماشے کہ اس کی آنکھیں دکھ سے بند ہو گئی اور کرشنا اور زیادہ پریشان ہو جاتی۔ اپنی سفید لٹوں کو چہرے پر سے ہٹاتے ہوئے کہتی: ''سوچتی ہوں تقریباً یہی انجام میرا بھی ہو سکتا تھا۔''

کنول کہتی: ''چھوڑو اب ان ممکنات کو جو تمہارے دامن سے چھو سکے' ناحق سوچتی اور کڑھتی رہتی ہو۔''

کرشنا پھر کہتی: ''مگر ایسی اور بھی تو مظلوم ہستیاں ہیں۔ ایسے بڑے بڑے ظلم اور گناہ جو کسی کی نگاہوں کے سامنے نہیں آ سکتے۔''

کنول جواب دیتی: ''مگر سنو تو سہی اس کائنات میں ظالم کا قصور بھی اتنا ہی ہے جتنا مظلوم کا۔ سوال تو یہ ہے اپنے آپ کو گاڑی کے پہیوں سے کچلنے کے لیے کیوں چھوڑ دیا جائے۔ کیا کش مکش کر کے اس سے نجات حاصل کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے؟''

کرشنا کہتی: ''گاڑی سے کنارہ کشی ناممکن ہے۔ ہر انسان تمہاری فطرت لے کر پیدا نہیں ہوا۔ دنیا میں بہت سی نیرنگیاں ہیں جو صرف گاڑی کے اندر ہیں اور باہر جن کا کوئی وجود نہیں۔''

''تو میں ایسی گاڑی کے وجود سے ہی انکار کر دیتی ہوں۔'' کنول جوش سے کہتی۔

زور سے ہوں کر کے کرشنا کہتی: ''تمہارے انکار سے کیا بنتا ہے۔ تم ایک ہوا پنی ساری انفرادیت کے باوجود تم صرف ایک ہو۔ تمہارے نظریے اس لمبی چوڑی دنیا کو ہلا نہیں سکتے۔ سنگ بنیاد کو بدلا نہیں جا سکتا۔''

''میں بدل کر رہوں گی۔'' کنول اسی طرح جواب دیتی۔

''کنولا رانی تم ہو کس سوچ میں۔ ایمانداری سے بات کرو۔ کیا تمہارے بازو میں طاقت ہے۔ سچ کہو کیا تم اس صدیوں کے نظام کو بدل سکتی ہو۔ تم عورت کی فطرت کے اس بہت بڑے خلا کو بھولتی ہو' جو صرف محبت سے پُر ہوتا ہے۔ تم عورت کے اس وجود سے جو زمین کی طرح صرف اپنے سینے میں ہل کا تیز چاقو چھونے کے لیے کہیں زندہ رہتا ہے' کیسے انکار کر سکتی ہو۔ عورت کے اس وجود سے جو محبت کے پھولوں سے ایک زندہ اور پھر جلد ویران ہو جانے والی بہار میں پھیلنا چاہتا ہے' کیسے آنکھیں بند کر سکتی ہو' تم عورت کے اس وجود سے جو سایہ دار درخت بن کر ماں کی طرح زندگی کے سینے پر ٹھنڈک بنا چاہتا ہے' کیسے بھلا سکتی ہو؟''

''میں کچھ بھی بھولنا نہیں چاہتی۔ میں کسی چیز سے انکار نہیں کرنا چاہتی۔ میں اکیلے درخت کی طرح صحراؤں کے سینے پر پھیلنے کے حق میں نہیں ہوں مگر میں تو ایک الگ ہستی ہوں۔ عورت کی یہ ذلالت مجھ سے سہی نہیں جاتی۔ کرشنا۔'' اس کی آواز میں دکھ ہوتا۔ ''تم اس عورت کے غرور کو کس چیز سے شکست دو گی جو کل کلبلاتے کیڑوں سے تنگ آ کر مر گئی اور پھر بھی اس کی آنکھوں میں اولاد کی بے اعتنائی کے باوجود ایک غرور تھا۔ کیا تم اس غرور کو درخت کی وارفتگی سمجھتی ہو؟'' کنول اداس ہو گئی۔

''کون عورت؟'' میں نے ان کی لمبی بحث سے تنگ آ کر پوچھا۔

''نیرا سے پوچھو بھیا۔'' کرشنا نے کہا۔ ''مجھ میں بتانے کی ہمت نہیں۔''

قریب بیٹھی ہوئی تیزی سے سلائیاں چلاتی ہوئی نیرا نے سر اٹھا کر کہا: ''قریب کے گھر میں کوئی سپرنٹنڈنٹ رہتے ہیں' ان کی بوڑھی ماں کل مر گئی بھیا۔ اس کے جسم میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ اتنی دور سے بو آیا کرتی تھی۔ کمرے کے باہر کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ رات کو اکثر روتی اور کراہتی رہتی۔ میں ہی ایک دو بار جا کر حال پوچھ آئی ہوں۔ تین جوان بیٹے' تینوں بڑے بڑے افسر' کسی نے علاج نہیں کروایا۔ بہوئیں اپنی اولاد میں مگن رہتیں۔ کوئی نوکر بھی بڑھیا کے پاس نہ جاتا تھا۔ کل وہ بے چاری مر گئی۔ نیرا پھر تیزی سے اپنی سلائیاں چلانے لگی۔

میں انجانے ہی اپنے دل میں سردی کی ایک رُو سے کانپ گیا۔ساری عمر انسانی کیڑوں نے عورت کے سینے سے زندگی کی قوت اور حُسن چاٹا اور مرتے سمے ننھے ننھے کلبلاتے کیڑوں نے اس جسم میں سڑاند پیدا کردی جس میں کچھ باقی نہ رہا تھا' جب طاقت ور خون باقی نہیں رہتا تو جسم میں بو پیدا ہو جاتی ہے۔ کیا اس عورت کے دل میں مرتے سمے یہ غرور تھا کہ اس کے بیٹے خوش رو بلند اور باوقار ہیں۔ اس کی اولاد خودرو بیلوں کی طرح بڑھ اور پھیل رہی ہے۔کیا اس کے ناسور میں سرسراتے کیڑوں نے اسے کبھی یہ احساس نہیں دلایا کہ اس کے وجود سے باہر قہقہے لگاتے ہنستے اور دوڑتے ہوئے بچے بھی کیڑے ہیں جو اس کے وجود کا سارا حُسن اس کی راتوں کی نیندیں اس کے چہرے کی ساری تازگی چاٹ کر بڑھے اور پروان چڑھے ہیں۔

میں خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔

کنول نے کہا: ''کرشنا سے پوچھو تو وہ اس کو غرور کہے گی عورت نہیں کہے گی۔ ایمانداری سے تم ہی کہو کیا تم ایسا انجام پسند کرو گی؟''

''کیسی باتیں کرتی ہو کنولا رانی تمہاری باتوں میں زہر اب پھیل اور بڑھ رہا ہے۔تم اس انجام کو برا کہہ سکتی ہو مگر اس بات سے کیوں انکار کرتی ہو کہ عورت نے جو کچھ کیا وہ اس کی عین فطرت ہے۔''

''ٹھیک! بچوں نے جو کچھ کیا وہ ان کی عین فطرت ہے۔ سب عین فطرت ہے۔اس نظام میں کوئی غلطی نہیں تو پھر کڑھتی کیوں ہو؟''

''کنولا تم بھلائے ہوئے زخموں کو پھر سے کرید دیتی ہو۔ میں ایک ماں ہوں۔ میرے دل سے پوچھو۔ میرا دل کتنا تڑپتا ہے۔ کاش مجھے میرا نند مل جائے۔ میں ساری دنیا کی دولتیں اس پر سے نچھاور کردوں۔ میں نے راتوں کو کیسے کیسے آنسو بہائے ہیں' کس طرح تڑپتی ہوں کہ سپنوں میں بھی اپنے بچے کی صورت ایک نظر دیکھ لوں۔ مجھے نیند نہیں آئی اور پھر بھی میں رات کا کتنی بے چینی سے انتظار کرتی ہوں اور خواب بھی میرا ساتھ نہیں دیتے۔ جو خیال تمہارے دماغ میں ہیں وہ کتابوں نے تمہیں دیئے ہیں' جس راہ پر تم چل رہی ہو' وہ اندھیری ہے۔ جھوٹی ہیں تمہاری نظام زندگی کو بدلنے کی ساری آرزوئیں' میری اس ایک تمنا کے برابر نہیں ہیں جو نند کے لیے میرے دل کی دھڑکن بنی رہتی ہے۔''

کنول نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے اپنے سامنے پڑے میز پوش کے رنگ برنگ پھولوں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

کرشنا نے پھر کہا: ''کنولا رانی عورت کا دھیرج اس کی ہستی کا سارا غرور تحریکیں چلانے اور آنے والی پود کو سدھارنے میں نہیں ہے۔اپنے وجود کے اس نقطے کو پانے میں ہے جو روشنی بن کر دنیا میں پھیلتا ہے۔''

نیرا نے اپنی سلائیوں سے دوسری بار سر اٹھا کر کنول کی طرف دیکھا جو اسی طرح سر جھکائے میز پوش کے کاڑھے ہوئے پھولوں پر انگلی پھیر رہی تھی۔ یہ تینوں عورتیں مختلف سمتوں سے آ کر ایک جگہ جمع تھیں۔ نندلال کی ماں کرشنا' کالج کی پرنسپل کنول کماری ٹھاکر اور زمانے کی رو کے ساتھ بہتی ہوئی سیلاب کی تباہی اور تھپیڑوں کا شکار نیرا۔

کنول نے بتایا تھا کہ نیرا گاؤں کی الھڑ لڑکی تھی۔ گھاس چھیلنے' مزدوری کرنے والے باپ کے مرنے کے بعد ماں کا ہاتھ بٹاتے اور پٹتے پٹتے اسے کشور مل گیا۔ گاؤں کے ساہوکار کا بیٹا۔ بڑا ہنس مکھ اور سندر تھا۔ خوبصورت باتوں کے جال میں پھنس کر گاؤں کی پچھلی کہانیوں کو بھول کر نیرا نے کشور کی باتوں پر اعتبار کر لیا۔ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کو کون پوچھتا ہے۔ شہر کی گھن گرج میں جب کشور نے بھی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تو وہ روتی روتی اپنے آپ سے بیزار اپنے خوابوں کی کیچڑ میں رینگتی کسی نہ کسی طرح کنول سے آ ملی۔

نہ جانے نیرا کے جی میں کیا تھا۔ کرشنا اور کنول کی باتوں سے اس کے دل میں کون سے طوفان دوبارہ سر اٹھا رہے ہوں گے۔ وہی الھڑ پن اب پختگی بن گیا تھا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے سلائیوں پر چلتے' اس کی آنکھوں کی پلکیں چہرے کو یوں تکتیں جیسے وہ سو رہی ہو۔ دو پہروں کی ٹھہر آ گیں نغمگی میں وہ نیندوں کی آرام دہ ٹھنڈک میں باغ کی خوشبوؤں کو سونگھتی' تیزی سے سلائیاں چلاتی' کرشنا اور کنول کی ناقابل فہم بحث کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر اپنے لیے کوئی نظریہ کوئی راہ بناتی رہی ہو گی۔

پھر نیلے آسمان کی جھکی ہوئی تازگی کو چھوتا ایک کوا تیزی سے گزر گیا۔ فرن میں سے ہوا گزرنے لگی۔ بوگن بیلا کے ڈھیروں پھول ایک دوسرے کے تعاقب میں تیزی سے ہمارے پاؤں کے نیچے سے گزر گئے۔ سامنے آم کے جھنڈ میں کوئل کی کوک مجھے پھر سنائی دینے لگی۔

پھولوں پر شہد کی مکھیاں سوئی سوئی اڑ رہی تھیں۔ سفید بادل نرم رو کشتیوں کی طرح اپنے بادبانوں کو کھولے ہوئے انجانے سمندروں پر اڑ رہے تھے۔ اس خواب آور وقت میں کنول نے

آہستہ سے کہا' کرشنا میں معافی چاہتی ہوں میں نے تمہیں دکھ دیا۔

جانے دو کرشنا نے مڑ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''دکھ دینے کی بات تو تب ہے اگر دکھ نیا ہو...... اور پھر جیسے کوئی جواب میں بولے' اور ہو سکتا ہے تمہارا خیال بھی ٹھیک ہی ہو۔ تمناؤں کی بے تابی دل کو کتنا کمزور کر دیتی ہے' کیا ہی اچھا ہوا گر آرزوئیں دل کے سکون کو پریشان نہ کریں تو' کیوں نیرا؟'' اس نے مڑ کر نیرا کو مخاطب کیا۔

''کیا ہے بڑی بی بی؟'' نیرا نے ہڑبڑا کر یوں کہا جیسے وہ خواب سے جاگی ہو۔ ہم سب ہنسنے لگے۔

کرشنا بوس کتنی متضاد باتیں سوچتی رہی۔ کرشنا کی فطرت اور اس کے خیالات نے مل کر اسے وہ بنایا جو وہ تھی۔ کرشنا بوس اگر مختلف سمتوں سے آئے ہوئے راستوں اور ایچ پیچ پگڈنڈیوں کا سنگم نہ ہوتی تو وہ کبھی اس بڑی آزمائش سے نہ نکلتی جس سے وہ آہن بننے کی کوشش میں رات کی مخملیں تاریکی اور سیاہی کی خوبصورتی بن کر نکلی۔ کرشنا کی طرح ہم سب سوالوں کے گورکھ دھندے میں پھنسے رہتے ہیں۔ ہم محبت کے علاوہ دوسری راہوں سے اپنی ہستی کے اندرونی نقطے تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ہم اپنی انفرادیت قائم رکھ سکیں۔ ایسی راہیں جن سے دکھ کے علاوہ ہم اپنے آپ کو پاسکیں۔ ہم محبت سے بلند ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور آخر میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تاریک راہوں اور مصیبتوں سے ہم جس نقطے تک جانے کی کوشش کرتے رہے' وہ راہ تو سیدھی اور آسان تھی۔ محبت کی پھیلی ہوئی راہوں سے ہماری منزل نزدیک تھی۔ آخر میں جب ہم اپنی غلطی کا احساس کرتے ہیں تو وقت ہمیں اتنی مہلت نہیں دیتا کہ اس راہ سے واپس جاسکیں اور آج سوچتا ہوں کہ کیا ہم سب بھٹکے ہوئے راہی ہیں؟

خدا کائنات کی ایک ایک شے میں ہے۔ سورج کی کرن میں' سبزے کے روپ میں۔ ہوا کی نرمی میں اور وہ ان سب چیزوں میں بھی تو جلوہ گر ہے جنہیں ہم پست اور ناقابلِ اعتبار سمجھتے ہیں۔

کیا محبت بھی ایک دکھ ہے؟
اور کیا محبت ایک سکون ہے؟
کیا محبت ایک راستہ ہے؟

ایسا راستہ جس سے ہم اپنے وجود کے دوسرے اندھیروں کی طرف سفر کر سکیں۔ ہم اس غیر فانی وجود کی ایک جھلک دیکھ سکیں جو لمحے کے لیے اپنے سانس سے ہمارے خیالوں کو خوشبودار بنادے۔ کیا ایک دن ہم سب اس خوشی کو پا سکیں گے جو کہیں ہمارے آس پاس اور ہماری ہستی کے اس دائرے میں رہتی ہے جو روشنی کے پردوں کے عقب میں ہے اور بڑھتی ہوئی تنہائی کے اس سیلاب میں جہاں تمام چیزیں بنانے والے کے پہلو میں کھڑی ہوتی ہیں۔

رات کے وقت محلات میں ایک ملکہ ہے اور میں بھی اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی ایک روح کی طرح ان محلوں میں گھومتا اپنے سوالوں کے جواب ڈھونڈ رہا ہوں اور خوشی کے تیروں سے اندھیرے کی بنیادیں کئی بار ہل گئی ہیں' مگر اندھیرا بدستور گہرا ہے۔ اے وقت کے طوفانی محلات کی باوقار ملکہ' میرے سوالوں کے جواب کون دے گا' کوئی نہیں' کوئی نہیں۔ تاریک ایوانوں کے وسیع ایوانوں میں سے گزر کر روشنی کا تعاقب کر سکو گے' مگر رات کی تاریکیوں سے پیار کرنا سیکھو اور میں پھر سوچتا ہوں' یہ بھی ہم سے محبت کی خواہاں ہے' یہ رات کی تاریکی۔

رات اندھیری ہے ندیا گہری ہے اور میرا سفر جاری ہے۔ اپنے وجود سے باہر تاریکی کے ایوان میں' کیا تاریکی جانی پہچانی اور اپنی نہیں لگتی۔ اے اُن دیکھے خدا! میں تمہیں کہاں پکاروں۔ تمہیں کرشنا بوس نے پکارا تھا اور تم نے اس کی ایک نہ سنی۔ بھگوان مجھے یہ تو بتاؤ جب کوئی تمہیں پکارتا ہے اور تم نہیں سنتے تو کیا تم سوئے ہوئے ہوتے ہو؟ سچ کہنا جب دکھ چاروں طرف سے مل کر دباتے ہیں اور انسان تمہارا نام لیتا ہے تو تم کہاں ہوتے ہو۔ تمہیں کہاں ڈھونڈا جا سکتا ہے؟

رویندر کمار پڑھا لکھا صاحبِ اقبال نوجوان تھا۔ کرشنا بوس نے لڑ کر عدالت میں اپنا حق منوایا تھا۔ نندلال اس کا ننھا سا بچہ ابھی چھوٹا تھا۔ کرشنا پر ماں بننے کے ساتھ ساتھ جو مصیبت پڑی' اگر کنول آڑے نہ آتی تو شاید وہ دکھ جان لے کر چھوڑتا' مگر رویندر کمار اسے اپنے گھر لے گیا۔ پانچ سال جو ظلم اس نے برداشت کیے ہیں' وہ بیان سے باہر ہیں۔ اسے بھوکا رکھا جاتا۔ اسے پیاسا رکھا جاتا۔ وہ ایک قیدی کی طرح اپنے کمرے سے نکل نہ سکتی تھی۔ وہ ہل نہ سکتی تھی۔ اسے کسی نوکر سے بولنے کی اجازت نہ تھی۔ رویندر رات کے سمے میں نشے میں دھت گھر آتا' اسے مارتا پیٹتا اور پھر اپنے محل کے وسیع کمروں میں گم ہو جاتا۔ بچے کو اس سے جدا رکھا جاتا۔ ان پانچ سالوں میں اس نے عذاب سہے ہیں' مصیبتیں برداشت کی ہیں' ان پانچ سالوں نے اس کے وجود میں گرمی اور اس کی رگوں میں خون اور اس کے جسم میں جان نہیں چھوڑی۔ محبت کے سکون

سے حاصلِ زندگی یہ ملا۔

کرشنا نے مجھے بتایا کہ اس نے اکثر رویندر سے پوچھا ''بتاؤ تم مجھے زہر دے کر میری زندگی ختم کیوں نہیں کر دیتے۔ تم مجھے سسکتے ہوئے کیوں دیکھنا چاہتے ہو؟ میں انسان ہوں' میں بھی تمہاری طرح ایک ارفع و اعلیٰ کائنات کے خدا کی بنائی ہوئی روح ہوں۔'' رویندر کی خوفناک ہنسی اس کا جواب تھی۔ کرشنا نے اکثر سوچا' کیا یہی وہ شخص تھا جس سے مجھے محبت تھی۔ کیا یہی وہ انسان تھا جس کے قدموں کی خاک میں مجھے ماضی کی زندگیاں اور مستقبل کی روشنیاں نظر آتی تھیں۔ جنم جنم سے وہ جس کا انتظار کر رہی تھی کیا یہ وہی تھا۔ اپنے خوابوں میں اس نے یہی پرچھائیں دیکھی تھیں۔

ظلم تجاوز کرتے گئے۔ کرشنا کے دل میں سوئی ہوئی عورت اور اس کی حمیت جاگی۔ جب محبت کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں تو نفرت اور حقارت جنم لیتی ہیں۔ اس کے سسرال والوں کا یہ کہنا تھا کہ ویش کی بیٹی نہیں ویشیا ہے۔ حق بات تو یہ ہے کہ عورت اگر عورت بننا چاہے تو کوئی اسے اس راہ پر جانے نہیں دیتا۔ اس نے یک بارگی بغاوت کی۔ پانچ سال کے سونے کے بعد ان سالوں کی مار پیٹ کے بعد اس نے اپنے آپ کو داؤ پر لگا دیا۔ اس نے رویندر کو قتل کر دیا۔

سسرال والے اس سے خوفناک انتقام لینا چاہتے تھے۔ وہ خود بھی اسے ختم کر سکتے تھے مگر دنیا کی نگاہوں میں اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے انہوں نے دوبارہ اپنی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کرشنا بوس کو چودہ سال قید کی سزا ملی۔ دس سال جیل کی سختیاں کاٹ کر جب وہ نکلی تو محبت کی اسی طرح متلاشی تھی۔ وہ سوچتی نندلال اب بڑا ہو گیا ہو گا۔ کسی لڑکے کو دیکھتی تو کہتی میرا نندلال اتنا ہی بڑا ہو گا۔ میرا نند بڑا سُندر ہے' میرا نند اب پڑھنے جاتا ہو گا۔

قید خانے میں اندھیرے کی اس رات میں اسے صرف یہی امید تھی' شاید وہ نندلال سے پھر کبھی مل سکے۔ پڑھی لکھی عقل مند عورت نظریوں کے ستونوں پر محبت کی عمارت کو کھڑا نہ کر سکی۔ وہ خالصتاً ایک ماں کی طرح سوچتی تھی۔ کنول نے اسے لاتعداد بار سمجھایا۔

کرشنا اتنی لمبی چوڑی دنیا میں کسی خاص بچے سے پیار کرنا ضروری نہیں۔ ملک کے یہ تمام بچے تمہارے ہیں۔ ان کو اپنا پیار بانٹ دو اور کرشنا اپنے اسی مخصوص انداز میں اسی نرم آواز میں کہتی' ''کنولا رانی تمہارے بنا کہے میں کوشش تو کرتی ہوں مگر یوں ہے کہ کہیں نہ کہیں راہ گم ہو جاتی ہے۔ میں بچوں کو دیکھتے ہوئے اپنے نندلال کو بھول نہیں پاتی۔ کیوں کنولا اب تو نند بڑا ہو گیا ہو گا نا؟''

کرشنا کا یہ سوال کنول کو خاموش کروا دیتا۔ بحث آگے نہ چل سکتی اور اسی لیے اس اندھیرے میں کھڑا میں اپنے آپ سے یہ سوال کر رہا ہوں۔

کیا محبت ایک دکھ ہے؟

کیا محبت ایک سکون ہے؟

کیا محبت ایک راستہ ہے؟

مگر اس مخملیں تاریکی میں جو خوشبو میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے' مجھے بتاتی ہے کہ طوفان آنے والا ہے۔ اگست کے بادلوں کے روپہلے کناروں سے بجلی چھونے والی ہے۔ ایک ایک کر کے ستاروں کے چراغ گُل ہو جائیں گے اور پھر کسی کا پائل سونے والے سادھو کے سینے سے چھو جائے گا۔ راستوں کے کنارے اُگے ہوئے درخت شگوفوں کے بوجھ سے ہانپ رہے ہیں۔

محبت تو روپہلی کرنوں کی طرح ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ جب نندلال کرشنا سے ملتا ہے اور میں سوچنے لگتا ہوں۔ عورت صرف ماں ہے' ہماری تحریکوں' ہمارے مضامین کے ساتھ ساتھ کرشنا بوس کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ آخر کنول نے اور میں نے ارادہ کر لیا کہ نندلال کو کسی نہ کسی طرح کرشنا سے ملوائیں گے۔ وہ شوقِ بے اختیار' وہ وارفتگی میں نے کسی کے چہرے پر نہیں دیکھی' ہم نے کرشنا سے کہہ دیا تھا' کوشش جاری ہے۔ شاید کسی دن تمہارے نندلال کو تم تک لانے میں ہم کامیاب ہو جائیں۔ میں بہار کے ایک دور دراز گاؤں میں جا کر کسی بہانے نند کو دیکھ بھی آیا تھا۔ کرشنا کہتی میں اسے یہ نہیں بتانا چاہتی کہ میں اس کی ماں ہوں۔ میں کسی اور عورت کی طرح اسے دیکھوں گی۔ کنول کہتی یہ تو تم سے نہ ہو سکے گا۔ مجھے معلوم ہے تم ایسا نہ کر سکو گی' تم جس گھڑی اسے دیکھو گی بے اختیار ہو جاؤ گی اور کرشنا ایک پاگل اور دیوانی عورت کی طرح کنول سے کہتی۔

''کنول نند تو کتنا ہی لمبا ہو گیا ہو گا' مجھ سے بھی لمبا۔ مجھے تو اس سے بڑی لاج آئے گی۔''

کرشنا نے اپنے بیٹے نند کے گھر سے مجھے لکھا ہے۔

''بھیا تم دھنیہ ہو جس نے دِلوں کو ملا دیا۔ کئی بار اِن تاریک دنوں میں نااُمیدی کے طوفان نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ تیز ہواؤں نے میری آس کا دیا گل کر دیا تھا۔ شک و شبہات نے مل کر میرے آسمانوں سے سارے ستاروں کو مٹا دیا تھا۔ بار بار میری امیدوں کے

اجالے کو بے یقینی کی لہریں بہا کر لے گئیں۔ میری آہیں اور میرے نالے میری دعاؤں کے اثر کو مٹا گئے لیکن میں نے انہی دنوں اپنا سب سے بڑا سبق سیکھا۔ محبت کا درد دل کو زندہ رکھتا ہے۔ اس میں موت کا سکون نہیں ہے۔

ہم سب وقت کی ہواؤں سے راہوں پر بکھر گئے ہیں مگر کرشنا کے شکریے کو قبول کرنے کا حق میرا نہیں شوبھا کا ہے۔ شوبھا بینر جی کا کیونکہ نندلال کو ہم تک لانے اور کرشنا کے دھڑکتے دل کو سکون بخشنے اور راحت دینے کا کام اسی کا ہے۔

شوبھا کے خطوط ایک تانا بانا ہیں جس میں حسن کے رنگ اور نفرت کے روپ جھانکتے ہیں۔ مشرق اور مغرب ایک روپہلی کپڑے کی طرح اس کے خطوں سے دکھائی دیتے ہیں۔ رگھوناتھ کی بانسری نے اس کے دل کے تاروں کو بدل دیا۔ ورنہ من موہن کے ساتھ چاندنی میں تاج محل دیکھنے کے لیے کسی دور کے شہر سے آنے والی شوبھا کبھی نہ بدلتی۔ زندگی کے موڑ کتنے تیز ہیں۔ ایک بار شوبھا نے لکھا تھا۔

''اندھیرے میں بھی ایک پکار ہے۔ محبت کا پھول کھلتا ہے تو اس پر تاریکی مسکراتی ہے اور ستاروں بھری راتوں میں پریوں کے پائل بجتے ہیں تو دل کے گیت میں گنگناہٹ بھی کسی انوکھے دیس کی ہوتی ہے۔ گیت کے بول میری سمجھ میں نہیں آتے۔ پھر میں کتنی ابھاگی ہوں کہ جس گیت کے بول میرے جانے پہچانے اور اپنے تھے۔ میں اسے بھی نہیں گا سکتی۔ میرا سفر اجالے سے اندھیرے تک سفر ہے مگر یوں کہ اندھیرے تک بھی کبھی پہنچ نہیں سکتی۔ میں راہ پر بھٹک رہی ہوں۔ میں بھٹکتی ہوں اور تمہارا بھگوان کبھی میرا ہاتھ نہیں پکڑتا۔ جانتے ہو وہ میرا کیوں نہیں؟ وہ میرا اس لیے نہیں کہ وہ میرا کبھی نہیں ہوا' اس کے آکاش کے سارے ستارے دوسروں کی راہوں پر بکھر گئے اور میرے نصیب کچھ بھی نہ ہوا۔

کوئی روشنی سے پیار کرتا ہے۔ کوئی موت کی تاریکی سے' میں تو پیار بھی نہیں کر سکتی۔ محبت میرے نصیب میں نہیں ہے۔ میں نے دولت کی چمک کا جھوٹ بہت پہلے دیکھ لیا تھا۔ میں نے تعلیم کا سطحی اثر بہت سالوں پہلے جان لیا تھا۔ اگر تمہیں میری بات پر یقین نہ ہو تو تم کنول کماری سے پوچھ لو۔ میں جھوٹ نہیں کہتی۔ میں جھوٹ اس لیے نہیں کہتی کہ مجھے کسی کا ڈر ہے۔ میں جھوٹ کو اس لیے چھوڑ رہی ہوں کہ اس میں جو جاذبیت کبھی میں نے دیکھی تھی' اب وہ نہیں رہی۔ اصل میں شروع سے آخر تک ہم خود ہی آنکھیں بند کیے سفر کرتے رہے' ورنہ چیزوں کی ماہیت تو ہم پر

اسی لمحے کھل جاتی ہے' جب ہم انہیں چھونے کی کوشش کرتے ہیں۔

وہ سہاگ بھرے گیت جو میرے آنگن میں گونجتے تھے' کاش کوئی مجھے صرف وہی واپس دے سکے۔

رات تاریک ہے اور پرانی زندگی کے سانسوں کی آواز مجھے اپنے وجود کے کسی نقطے سے کسی راستے سے آ رہی ہے۔

محبت کا دکھ جاگ اٹھا ہے' کیونکہ میں ان پرانے دنوں سے باہر کھڑی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں اس تاریکی میں اپنے دل کے دوار کیسے کھولوں' لمحے ٹھہرے ہوئے ہیں' ستارے دیکھ رہے ہیں اور ہوا خاموش ہے۔ سناٹے کا کرب میرے وجود کو سکیڑ رہا ہے۔ محبت جاگے گی تو میرے خالی پیالے میں گیت سکوں کی طرح کھنکیں گے۔

پھر کوئی مجھے یہ تو بتائے' سکّے تو ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے اور محبت کو جلاوطن کیوں کر دیا گیا ہے۔ کیا دولت مند بھکاری ہیں؟

میں بھی بھکاری ہوں اور پہاڑ پر سیر کی خاطر آئے ہوئے سب بھکاری ایک دوسرے کو کچھ نہیں دے سکتے' کیونکہ رات کا دامن بھی کسی مدقوق کے وجود کی طرح خالی ہے اور پھر بھی میں اپنے پرانے دنوں کے باہر چکر لگانا' سنتی ہوں۔ کیا بیتے دن واپس آ سکتے ہیں؟

بیتے دن واپس آ سکتے تو پیپل کی چھایا میں سنا ہوا گیت بھی واپس آ جاتا۔ وہ موہ بھری مُرلی پھر کبھی بجتی' مگر میں تمہیں کیسے بتا سکتی ہوں کہ تہذیب کے جادو کی چمک بھی اب میرے دامن میں نہیں رہی۔ سارے طلسم ٹوٹ گئے ہیں' کون مجھے میرے رگھو سے ملائے گا۔ میرے آنسو بھی خشک ہو چلے ہیں اور میں محبت کے دکھ کو تو جاگتا سنتی ہوں مگر کیا وہ پیار کبھی میرے گھر میں نہیں آئے گا اور میرا اپنا گھر تھا بھی کونسا؟ میں تو جلاوطن ہوں۔ اپنے آپ سے اپنے وجود سے باہر دھکیلی ہوئی ایک آوارہ روح۔''

شوبھا

اس نے پھر ایک خط میں لکھا تھا۔

''ساس کا گھر چھوڑنے سے پہلے میں نے آنگن میں کھڑے ہو کر سوچا تھا۔ میرے ہاتھ میں سہاگ کی چوڑیاں نہیں ہیں۔ میری مانگ میں سیندور نہیں ہے۔ میرے پاؤں میں پائل

نہیں ہے۔ شہنائیوں کی گونج اور مہندی کا رچاؤ کسی اور جنم کی بات ہے۔ میری زندگی میں ایک رات زندہ ہے اور وہ رات واپس نہیں آ سکتی۔ میں چاہوں تو اپنی ساری ہستی کو اپنے سارے وجود کو سمیٹ کر اس رات میں سما سکتی ہوں مگر اس کے باہر میرے لیے کچھ نہیں ہے۔ جھولے ملہار برساتوں کا جادو اور سردیوں کی تنہائیوں کا خوشبودار اندھیرا میرے نصیب سے مٹ چکا ہے اُودے کی بہو کے آنے پر ماں جی نے کیسے آرتی اتاری تھی اور میں دُور کھڑی دیکھتی رہی تھی۔ میرا سایہ منحوس ہے۔ ٹھیک بھی تو ہے۔ پرشوتم کے مرنے پر ساس نے اپنے گھر کی عزت سمجھ کر مجھے سارے گھر کی مالکن بنا دیا تھا پر میں اس کے جھوٹ کو سمجھتی تھی۔ رانی کے آنے پر کون مجھے پوچھے گا اور پھر اس رانی کے آنے پر میں نے گھر چھوڑ دیا۔ اس رات مندر کے پیچھے چاند بڑی تیزی سے چمک رہا تھا اور ستارے کہیں دور نیلاہٹ میں سوئے ہوئے تھے۔ میں نے تمہارے بھگوان کے چرنوں کو چھو کر کہا تھا' بھگوان مجھے بتا دو میں کیا کروں۔ اس رات میں نے سنگھار کیا تھا۔ سرخ ساڑھی باندھ کر قمقم کی بندیا لگا کر اپنی وہی ستاروں جڑی چولی پہنی تھی۔ پر وقت کے بوجھ تلے دبی صورت پر ساڑھی کا رنگ کانپ گیا۔ چولی کے ستارے ماند پڑ گئے اور بندیا رونے لگی۔ قمقم پھیکا پڑ گیا۔ کسی نے میرے دل میں کہا۔ یہ ساڑھی مانگے کی ہے' یہ چولی پرائی ہے۔ یہ روپ کسی اور کا ہے اور اس رات آئینے میں' میں اپنے آپ کو کتنی بیگانی لگی تھی۔ مگر میرا سانس کہتا ہے دکھ کی گھڑیاں ابھی باقی ہیں' دکھ کی گھڑیاں کبھی بیت ہی نہ سکیں اور آج بھی صرف ایک دور دراز کا لمس ہے جو پیپل کے پتوں میں سیٹیاں بجاتی ہوا کے سہارے یادوں اور گیتوں کے ہاتھوں میں چھپا رہتا ہے۔

اس رات بھی جب آنگن میں اُگے ہوئے پیپل پر رات کی سیاہی ملاح کے گیت کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے بھگوان کے چرنوں کی دھول اپنے ماتھے پر چڑھا کر اسے پکارا تھا۔ مگر تمہارا بھگوان ایک ہی طرف دیکھتا' زندگی اور موت کی جانے کون سی گتھی سلجھانے میں لگا رہا۔ اس نے میرے دل میں اٹھنے والے طوفان سے آشنا ہو کر مجھے سہارا دینے کی کوشش نہ کی' اس نے ہاتھ بڑھا کر میری جلتی پیشانی کو چھو کر مجھے تسلی نہ دی۔ تم ہی بتاؤ میں اس قابل نہ تھی کہ تمہارا بھگوان میری طرف اپنا ہاتھ بڑھاتا؟

بھگوان نے مجھے اپنے چرنوں سے ہٹا دیا اور میں نے بھی اس سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ میں نے بھی اتنے سب سالوں میں اسے کبھی یاد نہیں کیا۔ پھر کیا وہ میرے آس پاس کہیں آباد رہا ہے؟

آج سوئے ہوئے خیالوں کے جنگل میں آگ لگ گئی ہے۔ میرا سارا جیون جل اٹھا ہے لایعنی گزرے ہوئے سال دماغ کے ہماچل سے نیچے گر رہے ہیں۔ پتھروں کے ٹکراؤ سے آگ پیدا ہو رہی ہے۔ آج میرا سارا غرور ایک بالو کے محل کی طرح ڈھے گیا ہے۔ کونوں کھدروں میں پڑی ہوئی بوسیدہ یادیں' مجھے اپنے وجود کا احساس دلا رہی ہیں۔ بھکاری کے کشکول میں سے اس کا غرور بھی کسی نے چھین لیا ہے۔ تم لوگ جن گروہوں' مہنتوں' سادھوؤں کے سہارے بھگوان کے چرن چھونے کی آشا کرتے ہو' میں تو وہ بھی نہیں کر سکتی۔ میں نے مہاتماؤں کی زندگی کا سطحی پن ان کا جھوٹ دیکھ لیا ہے۔ مجھے بتاؤ اب میرے دامن میں کیا باقی رہا۔ کبھی کبھی یہ جھوٹے سہارے بھی کام آ جاتے ہیں؟ مستقبل میں تمہارے لیے کچھ تو ہے میرے لیے وہ بھی نہیں۔

میں ایک بگولہ ہوں جس کو کہیں قرار نہیں۔ میں ایک شعاع ہوں جو کسی شے کو بھی چھو نہ سکی جو ممکنات کے اندھیرے میں بھٹک رہی ہے۔

آج کل یہاں ایک رانی اور آئی ہوئی ہے۔ موٹروں کاروں' ہوٹلوں اور زندگی کے اس ریلے کو تم جانتے ہی ہو۔ اس رانی کی باتیں پھر سناؤں گی۔ میری کہانی اس سے بھی عجیب ہے مگر اس رانی کی کہانی تو اور بھی نرالی ہے۔ مت سمجھنا کہ میری دیورانی اودے کی بہو رانی۔

یہاں تک تو ایک مسلسل طوفان رہتا ہے۔ یہاں مرد ہیں اور عورتیں ہیں مگر نہیں میں غلط کہہ رہی ہوں۔ یہاں تو مسکراہٹیں ہیں۔ بناوٹیں ہیں۔ دھوکے ہیں اور یہ سب ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ ایک مسلسل آتش فشاں ہے' چاروں طرف آگ برساتا ہوا' چمک سے میری آنکھیں چندھیا چلی ہیں مگر میں نے اپنے لیے یہ راستہ خود منتخب کیا ہے۔ کچھ تو میرے دامن میں باقی رہے گا اور وہ اپنی تباہی کو سرد مہری سے دیکھنے کا جھوٹا غرور ہی کیوں نہ ہو۔''

شوبھا

سفیدی فتح کا نشان ہے۔ سفیدی میں طاقت ہے۔ روشنی میں ہر مخالف قوت سے ٹکر لینے کا زور ہے اور یہی سفیدی جب کنول کا روپ دھارتی ہے تو اندھیرے پانیوں کے سینے پر کانپتی ہوئی نامعلوم منزلوں پر برسنے کے لیے زمین کی شفقت بن جاتی ہے۔

شوبھا کے اس خط کے بعد میں نے کنول کماری ٹھاکر سے پوچھا تھا: ''عورت کا کون سا روپ سب سے بہتر ہے؟''

اس نے کہا تھا: ''عورت چٹان ہے اس کو پتھر کا روپ ہی بھلا لگتا ہے۔''

کرشنا نے ہنس کر کہا تھا: ''کنولا رانی عورت پتھر نہیں ہے۔ ماں ہے۔ عورت پھول ہے۔ تمہارا اپنا کوئی نہیں، اس لیے تمہیں اپنے عورت ہونے سے کوئی خوشی نہیں، تم پتھر بننا چاہتی ہو اور تم اس محبت کا پرچار کیسے کرتی ہو۔ محبت پتھر کو نہیں چھو سکتی۔''

کنول نے اٹھ کر بڑا سا گلاب توڑ کر کرشنا کی گود میں پھینک دیا تھا اور کہا تھا: ''بس''

کرشنا نے کہا تھا: ''شاخ پر لٹکے لٹکے مرجھا جانے سے تو بہتر ہے کہ تمہارے ہاتھوں سے میرے دامن میں آ گرا۔''

کنول نے پھر پھول کو اٹھا کر اس کی مخملیں پتیوں کی سرخی پر انگلی پھیر کر کرشنا سے کہا: ''اب تھوڑی دیر میں یہ مرجھا جائے گا۔''

وجود کے اس دائرے میں پھول اکیلا نہیں رہا۔ اس نے میرے دامن کی سختی اور تمہاری انگلیوں کی نرمی کا لمس اڑا لیا ہے۔ یہ مر کر بھی زندہ ہے۔

اور کنول نے پھول پھر کرشنا کو دیتے ہوئے کہا تھا: ''تم سے بحث کرنا بے کار ہے۔''

کرشنا نے ہنس کر کہا: ''جب تم عاجز آ جاتی ہو، جب تمہیں اپنے نظریوں کا کھوکھلا پن ڈرانے لگتا ہے۔ تم محبت سے پہلو بچا کر اپنی تسلی کرتی ہو۔''

''میرا سوال ابھی باقی ہے۔ تم محبت کا پرچار کیوں کرتی ہو۔ تم زندگی کے دامن سے خوشیاں دیکھنے کی متمنی ہو۔ پر خوشیاں عارضی ہیں پھولوں سے بھی عارضی اور محبت تو درد ہے جو دل کو زندہ رکھتا ہے۔ تم درد چاہتی ہو؟ پتھر کے سینے میں زندگی کہاں سے لاؤ گی؟''

''پتھر، مورتی کا روپ بھی دھار سکتا ہے۔'' کنول نے کہا۔

''مورتی کی پوجا کی جاتی ہے۔ کنولا! پتھر زندگی سے تو پھر بھی دور ہی رہا۔ کیا تم وہ مقام حاصل کرنا چاہتی ہو جو بے حس مورتی کو مندر کے گمبھیر اندھیرے میں ملتا ہے۔''

''نہیں کرشنا، میں دیکھنے، سننے اور سمجھنے والی مورتی بننا چاہوں گی۔''

''آخر مورتی کیوں، عورت کیوں نہیں، پھول کیوں نہیں، کنول کیوں نہیں، کنول کماری ٹھاکر!''

''عورت پر آج تک بہت ظلم ہوئے ہیں۔ تم، نیرا اور تمہاری جیسی عورتیں یہ ظلم سہتے سہتے تنگ نہیں آ گئیں۔ ہم پتھر بن کر ہی اس کا مقابلہ کر سکیں گے، عورت بن کر نہیں۔''

''بات تو وہی ہو گئی۔'' کرشنا ہنس کر کہتی۔ ''اپنے وجود سے باہر اپنے نقطے سے دور ہو کر اپنی ہستی کو بھلا کر تم اس دکھ کا علاج کرنا چاہتی ہو اور یہی بنیادی غلطی ہے۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟'' کنول بڑے دکھ سے پوچھتی۔ تمہارے تجربے کافی نہیں ہیں۔ تم ہی بتاؤ کیا کیا جائے۔'' اس کی صورت پر لکھی مایوسی مجھے بھی پریشان کر دیتی ہے۔

اور سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے؟ وجود کے اندھیروں سے اجالوں کی طرف سفر کرنے کے لیے کیا کیا جائے۔ مہاتماؤں، رشیوں، منیوں، واعظوں کو اسی سوال نے ہمیشہ پریشان رکھا ہے۔ کیا کیا جائے۔ وقت کی ہواؤں کے دوش بدوش اڑتے ہوئے مدقوق، معذور پتوں کی طرح زمانے کے ساحلوں تک پھیلے ہوئے لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کیا کیا جائے؟ وہ ایک نکتہ جو ان سارے سوالوں کے سامنے اور ان کے عین زد میں ہے، وہ نکتہ جو ان تمام سوالوں کا جواب ہو سکتا ہے۔ شوبھا نے ایک بار اپنے کسی خط میں لکھا تھا۔

''یہ ندیا گہری ہے ناؤ پرانی ہے۔ پار اترنے کا کون ٹھکانہ اور پار کون اترتا ہے۔ بھیا؟ بہتے بہتے نامعلوم جزیروں کے پتھریلے کناروں سے ٹکراتے، بہتے جاتے ہیں اور کنارہ کہیں دکھائی نہیں پڑتا۔ اپنے سے باہر اندھیروں میں، اپنے سے باہر روشنیوں میں، ہمارا سارا سفر اسی کاغذ کی ناؤ میں ہوتا ہے۔ ہم اس ناؤ پر اپنا نام لکھ دیتے ہیں۔ ایک بچے کی طرح جو سوچتا ہے شاید کسی نامعلوم دیس میں بہتی ہوئی اس کی کشتی کو کوئی پہچان لے گا۔ اس کا نام زیر لب پکارے گا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور ہماری ساری کشمکش پار اترنے کے لیے ساری کوششیں۔ جانے، بچے کی اس ناؤ پر وہ نام کب کا مٹ بھی چکا اور وہ ندیا تو اتنی گہری ہے۔

اس رات بھی ندیا گہری تھی۔ جوگی مہاراج کو دیکھ کر ماں جی کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ کہنے لگا تھا، مہاتما پار اتریئے گا کیا؟

میں گھاٹ سے دور اندھیرے میں کھڑی کانپ رہی تھی۔ اندھیرے سے روشنی کی طرف یہ سفر بڑا نرالا تھا، بڑا انوکھا تھا۔ میری روح اپنی ساری طاقتوں اور بے باکیوں کے باوجود کانپ رہی تھی۔ ستارے کانپتی ہوئی لہروں پر جھک کر اپنا عکس دیکھ رہے تھے۔ آسمان پانی کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہوائیں کنارے کے سرکنڈے میں سیٹیاں بجاتی سفید بوروں سے اپنا دامن بچاتی بھاگی جا رہی تھیں۔ سرسراہٹ میں غمگین گیت سنائی دیتے تھے۔ جیسے تمام پرانی روحیں عبادت کر رہی ہوں۔ میرے پاؤں کے نیچے دریا کے کنارے ریت کی نمی بڑی بھیگی ہوئی اور سکون

وہ تھی۔ مگر میرے دل کے اندھیرے میں کہیں سکون نہ تھا۔ مجھے بھگوان کی آنکھوں کی سختی یاد آ رہی تھی۔ میں کوشش کے باوجود اس کپکپاہٹ پر قابو نہیں پا سکتی تھی۔ ہمیں جلد پار اترنا تھا پر ماں جی بابا کو تو کوئی جلدی نہ تھی۔ اس نے اپنے چھوٹے سے حقے پر تمباکو کی ایک اور تہہ بڑے سے انگوٹھے سے دبا کر لگائی اور ناؤ کے ایک کونے سے کپڑے کی گندی سی تھیلی سے تھوڑا سا رسی کا ٹکڑا نکال کر آگ بنانے لگا۔ جوگی مہاراج دل میں گھبرا رہے ہوں گے مگر انہوں نے بھی کنارے پر بیٹھ کر اپنا لمبا سا گیروا جھولا زمین پر رکھ دیا اور کہنے لگا۔

''تم اس بُودار دھوئیں سے دل کو کیسے تسلی دیتے ہو ماں جی بابا۔''

مانجھی بابا کہنے لگا: ''مہاتما دھوئیں سے کیا ہوتا ہے۔ ہم تو آگ کے پجاری ہیں۔''

''تم آگ بھی اچھی نہیں بناتے۔ رسی کی آگ تو جلدی بجھ جاتی ہے بابا۔ تم گھڑی گھڑی مصیبت کرنے کی بجائے ایک ہی بار پیئو اور اچھی آگ بناؤ تو کیسا رہے گا۔'' انہوں نے پھر کہا۔

''مہاراج۔'' مانجھی بابا نے زمین پر ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اپنا کیا ہے۔ جو مل گیا ٹھیک ہے، اچھی آگ تو تب بنے جب کسی ٹھکانے سے بیٹھنا ہو۔ دریا کے کنارے گھاٹ کے پاس یونہی مسافروں کا انتظار کرتے کرتے عمر بیت چلی ہے۔''

''تمہارا گھر کدھر ہے؟'' مہاراج نے پھر پوچھا۔

مانجھی بابا نے ہنس کر زور کا ایک کش لیتے ہوئے کہا تھا۔ ''اپنا گھر کس کا اپنا گھر ہوتا ہے مہاراج۔ رات دو رات کے بسیرے کے لیے کون اتنا کشٹ کرتا پھرے۔ اپنا گھر تو یہ دریا کا کنارہ ہے، یہ ناؤ ہے۔''

اس رات آسمان پر ستاروں کو دیکھ رہے تھے اور ہم تینوں ان دونوں سے تھوڑی دور پرے دریا کے کنارے بیٹھے تھے۔

''مانجھی بابا!'' جوگی نے اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا تھا۔ ''کتنی دیر میں اور چلنا ہوگا۔''

اور بابا نے کہا تھا: ''کیا پتہ ہے، مہاراج کب جانا ہوگا۔ دریا کی لہریں یونہی بہتی رہتی ہیں۔ جب کشتی ڈالو چلے گی، پر کنارے کون لگے، یہ کون کہہ سکتا ہے۔'' پھر مجھے ذرا دور دیکھ کر بولا: ''کیوں بیٹا تم کب آئی ہو۔ کیا تم بھی پار اترو گی بٹیا؟''

''ہاں بابا۔'' ''پھر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ پار کون اترے گا۔'' میں نے اسی طرح کہا۔

''تمہارے ساتھ کون ہے بٹیا۔ ایسی گھور رات میں اکیلی کہاں جاؤ گی؟''

اور میں چپ رہی تھی۔

اس نے دوسری بار رسی کی آگ بنائی۔ ننھے کانپتے ذرا ذرا سے شعلوں میں۔ اس کی صورت پر وقار تھی۔ آنکھوں میں تھکن نہیں، اداسی تھی۔ کھلی پیشانی پر محنت شاقہ کی روشنی سی تھی۔ کانوں میں بڑے بڑے بالے ہلکورے سے لیتے تھے اور سفید بالوں پر بندھا ہوا میلا سا کپڑا، سیاہ لگتا تھا۔

پھر بولا: ''آؤ اب چلیں۔'' جوگی مہاراج نے اپنا تھیلا اٹھا لیا۔ میں بیٹھ گئی۔ انجانے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ سینے میں پنکھے لگے تھے۔ کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ کوئی شے میرے دل کے اندر ٹوٹ رہی تھی۔ کوئی طاقت مجھے پکار پکار کر کہہ رہی تھی تم اندھیرے سے کسی روشنی کی طرف نہیں جا رہی ہو۔ دوسرے کنارے پر بھی اندھیرا ہے۔ تم نے جس کا سہارا لیا ہے، وہ بھی بھٹکا ہوا ہے۔ اب بھی وقت ہے واپس جاؤ اور میں نے ناؤ کو اتنی زور سے پکڑ لیا تھا۔ میں نے کان بند کر لیے تھے اور پھر بھی کوئی مجھے پکارتا رہا تھا۔ پکارتا ہی رہا تھا۔

رات طوفانی نہیں رات روشن تھی۔ رات تاریک نہ تھی۔ پھر مانجھی بابا نے بھگوان کا نام لے کر چپو پکڑے اور ناؤ کو دریا میں دھکیل دیا۔ اس لمحے مجھے لگ رہا تھا۔ میں اپنے سے دور آگ کے سمندروں پر سفر کرنے کے لیے نکلی ہوں۔ لہریں آہستہ آہستہ ناؤ سے آ کر ٹکرائیں اور ہنستے ہوئے ستاروں کے ٹکڑے ہمارے نیچے سے نکلے چلے جاتے۔ دریا آکاش کی لامتناہی گہرائیوں کی طرح بے اتھاہ بے کنارہ لگتا تھا۔ مانجھی بابا نے کہا تھا بیٹیا! دوسرے کنارے پر اتر کر کہاں جائے گی، نہ جانے اس نے میری سہمی ہوئی صورت دیکھ کر شک سا محسوس کیا۔

اور میں نے کہا تھا: ''بابا۔ دوسرے کنارے پر کوئی جگہ تو ہوگی جہاں زمین مجھے سہارا دے گی۔''

''کبھی کبھار زمین بھی سہارا نہیں دیتی بٹیا۔ دھرتی تو بڑی کٹھور ہے۔ دریا مہربان ہے۔ پر اس پر ٹھہرنے کا کوئی مقام تو نہیں ہوتا۔ ہمیشہ ناؤ آگے ہی آگے چلتی رہتی ہے۔ تم خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔ تب بھی لہریں تمہیں آگے ہی آگے بہا لے جائیں گی۔''

پھر اپنے دیس کا گیت گانے لگا۔ دریا میں ایک جادو ہے۔ آواز میں ایک جادو ہے۔

دل کی گہرائیوں سے نکلے بول بھی ایک جادو ہے پر نہ جانے مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ میرا دل کیوں گھبرا رہا تھا۔ اس جادو کا اثر مجھ پر کیوں نہیں ہو رہا تھا۔ کشتی ایک بطخ کی طرح تیزی سے مگر طمانیت سے لہروں پر پھسل رہی تھی۔

جوگی نے بات کرنے کے لیے پوچھا: ''کیوں، مانجھی بابا تمہاری ناؤ کتنی پرانی ہے؟''

''جتنا پرانا میرا گیت مہاراج!'' پھر خود ہی کہنے لگا: ''دریا پرانا ہے۔ ناؤ پرانی ہے۔ گیت پرانا ہے۔ میرے گرد ہر شے بہت ہی پرانی ہے۔ میں خود بھی بہت پرانا ہوں۔ جانے کتنے جسموں سے سفر کرتا آیا ہوں اور کب تک یونہی ان تاریک پانیوں پر اپنی کشتی کو کھیتا رہوں۔ کون کہہ سکتا ہے۔ پھر بھی پار اتر سکوں گا یا نہیں اور پھر بھی ہر بار میں اپنے نئے پن سے حیران ہو جاتا ہوں۔ کیوں مہاراج یہ چکر کب تک چلے گا؟''

''کون سا چکر؟'' جوگی نے پوچھا تھا۔

''یہی جنم کا چکر یہی روز روز جینے اور مرنے کا چکر۔ کیا بھگوان کسی دن اپنا ہاتھ پھیلا کر اس چلنے بہنے اور بہتے رہنے کے جادو کو توڑ نہ دے گا۔''

''ہم بہنے کے لیے کیوں، میری سمجھ میں نہیں آتا مہاراج کبھی کبھار میں سوچتا ہوں ناؤ کو کنارے سے لگا کر خاموش بیٹھ جاؤں۔''

''پھر بیٹھ کر کیا کرو گے؟'' جوگی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں یہی تو مشکل ہے۔ بیٹھ ہی نہیں سکتا میں۔ مسافر کو سوچتا ہوں جانے اسے پار اترنے کی کتنی جلدی ہوگی۔ میں تو کبھی انتظار نہیں کرتا۔ جب دریا کا پاٹ چوڑا ہو جاتا ہے تب میری یہ سوچ اور بھی پریشان کر دیتی ہے۔''

رات خاموش تھی۔ رات اداس تھی۔ مانجھی اداس تھا اور ناؤ چپ چاپ تھی۔ زمانوں سے بھی بوڑھے ستارے چمک چمک کر تھکن کے مارے آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ ہوا سرکنڈوں میں کراہ رہی تھی، کنارے کے پتھروں پر پاؤں رکھتی تیز تیز چل رہی تھی اور وقت کے ایوانوں میں بند گھنٹے خاموشی سے عبادت میں محو تھے۔

مہاراج! مانجھی اندھیرے میں سے پھر بولا: ''آتما کو شانتی نہیں ملتی تو ایک سے دوسرا جنم کیوں بدلتی ہے۔ اچھے برے سب کو مرتیو کے سمے دکھ کیوں سہنا پڑتا ہے۔ جب دوسرا جنم اتنا ضروری ہے تو پھر آتما ایک جسم کو چھوڑتے ہوئے اتنا گھبراتی کیوں ہے؟''

جوگی کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔ وہ عمداً چپ رہا۔

مانجھی تھوڑی دیر کے بعد پھر بولا: ''سمجھ میں نہیں آتا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ مادھو اتنا اچھا آدمی تھا۔ پھر بھی مرتے ہوئے اسے اتنا دکھ کیوں ہوا؟'' جوگی نے جواب نہ دیا۔

لہریں سرگوشیاں کرتی ہوئی ہمارے گرد ناچ رہی تھیں۔ اور آسمانوں کے ایچ پیچ راہوں پر ستارے اپنا سفر کر رہے تھے۔ سیپ اور گھونگھے سے بھرے ہوئے دریا کے دونوں کنارے دُور دُور تھے۔

مانجھی بابا نے پھر کہا: ''مادھو اتنا اچھا آدمی تھا۔ اس نے کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کیا۔ جب کشتی کنارے لگتی تو کوئی مسافر اسے محنت سے کم پیسے دیتے تب بھی وہ کبھی جھگڑا نہ کرتا۔ میں نے اسے کبھی کسی سے اونچی بات کرتے نہیں سنا۔ روز رات دریا کے کنارے گھاٹ پر بیٹھ کر باتیں کرتے، اس کا اپنا سوائے دریا کے کچھ نہ تھا اور میرا میرا بھی تو سوائے ناؤ کے کوئی نہیں ہے؟''

''اسے کیا ہوا تھا؟'' جوگی نے یونہی پوچھ لیا۔

مانجھی نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ ''اور اب میں اکیلا، مادھو کل ہی تو زندہ تھا۔ اپنا گیت گا رہا تھا...... جو اس نے خود ہی بنایا تھا۔ پھر میری طرف مڑ کر کہنے لگا۔ کیوں بٹیا تم نے کبھی سیپ کے اندر بند لہروں کا گیت سنا ہے۔''

''نہیں بابا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''اچھا۔'' مانجھی نے تیزی سے چپو چلاتے ہوئے کہا: ''تم نے سیپ کان سے لگا کر کبھی سمندر کی لہروں کا، دریا کی لہروں کا گیت سننے کی کوشش نہیں کی۔ بس مادھو کا گیت ویسا ہی تھا گزرے لمحوں کے پاؤں کی ساری آہٹیں، بے باک، تیز اور جلد اس میں تھیں، کہیں دریا پر جھکے ہوئے ہوا کے سینے میں بند طوفان میں اس کا گیت اب بھی بکھرا ہوا ہوگا۔''

دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ اب اندھیرے کے ذخیرے لگتے تھے۔ کنارہ نزدیک آ رہا تھا۔ اس لمحے مجھے لگ رہا تھا، جیسے یہ جوگی میرا کوئی نہیں ہے۔ میں ایک قدم بھی اس کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ میں کبھی اس کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ مانجھی کا گیت کھلی ہوا کے بازوؤں پر لیٹا آسمان پر تیر رہا تھا۔ میں ایک بے لفظوں کی دعا مانگ رہی تھی۔ میں بھگوان سے نہیں، اس اندھیرے سے ایک پرارتھنا کر رہی تھی۔ میں زندگی کے کانٹوں پر گری اپنے زخمی وجود کے لیے کچھ مانگ رہی تھی۔ میں بھکارن تھی۔ انجانے کا بوجھ مجھے بے بس کر رہا تھا۔ لہریں ناگن کے پیچوں کی

طرح مجھے اپنے گرد لپٹتی لگتی تھیں۔

مگر خالی آرزوؤں سے کیا بنتا ہے۔ دوسرا کنارہ آ گیا۔ میں اور جوگی اتر کر ریت پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑتے نم دار بھیگی ریت پر اپنے پاؤں رکھتے مانجھی کو ناؤ کے کنارے بیٹھا چھوڑ کر اندھیروں میں گم ہو گئے۔

اور اب مجھے معلوم ہے دھرتی کٹھور ہے اور مرتیو کے سے اچھے بھلے سارے انسانوں کو جانکاہی کے عذاب میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ میں تو نزع کے اس عالم میں رہی ہوں جو مادھو پر ایک لمحے کے لیے آیا تھا۔ آسمانوں اور زمین کے درمیان خلا میں ایک دل دھڑکتا ہے جو سوال پوچھتا ہے یہی سوال کہ کیا کیا جائے۔ اس عذاب سے رہائی پانے کے لیے کیا کیا جائے۔ ناؤ آگے ہی آگے بہتی جا رہی ہے۔

پرندیا گہری ناؤ پرانی ہے اور ہم خود کتنے پرانے ہیں۔ پار اترنے کا کون ٹھکانہ۔ کون پار اترتا ہے بھیا؟

میں بھی پار نہ اتری۔ میرے لیے کوئی کنارہ کبھی نہ آیا۔ میں آگ کے سمندروں پر سفر کر رہی ہوں۔ مجھے دکھ درد' حد تک معلوم ہے کہ میری آتما جن چکروں میں گھوم رہی ہے ان کا انجام کوئی نہیں۔

جوگی مہاراج خود کچھ نہ جانتے تھے' مجھے کہاں لے جاتے۔

میں دُوار دوار بھٹکتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک عیسائی مشنری نے ترس کھا کر مجھے عیسیٰ مسیح کا پیغام سنایا۔ اس پیغام میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔ ہاں ایک تسلی تھی کہ خدا نے ہمارے سارے گناہ اپنے سر لے لیے ہیں۔ میں اس سارے کھوکھلے پن کو سمجھتی ہوں۔ بھلا بتاؤ تو سہی خدا جو ہر گھڑی محاسبہ کرتا ہے' ہمارے گناہ فانی انسانوں کے گناہ اپنے سر کیوں لیتا۔ کیا اس میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ قسمت بدل دے مگر مجھے معلوم ہے کہ قسمت کی راہیں نہیں بدلتیں۔ لکھنے والے کی انگلی جو لکھ چکی وہ کوئی نہیں مٹائے گا اور یہاں تو ایسے گناہوں کا بدلہ بھی مل جاتا ہے جو کسی نے کبھی نہیں کیے۔ میں دل میں سدا اس جھوٹی تسلی پر ہنستی رہی ہوں' پر مجھے آگ کے سمندروں پر گھومنے کے لیے کسی ناؤ میں تو بیٹھنا تھا۔ زخموں کو کوئی مندمل نہیں کر سکتا۔ مسیحا کا سانس بڑا بھی نہیں' میرے زخم آج بھی اسی طرح ہیں مگر عیسیٰ کے بیٹوں نے مغرب کے دروازے میرے سامنے کھول دیئے۔ میں کتابوں کی سیاہی کو چاٹ کر معزز بن گئی۔ معزز! مجھے ہنسی آتی ہے۔ کاش میں اپنے پرانے آنگن میں جا کر ان

سہاگ بھرے گیتوں کو سن سکوں۔

کوئی وہ اعزاز مجھے بخش دے۔ کوئی میرے پاؤں سے یہ زنجیریں کھول دے میں اس بانسری کو پھر سن سکوں۔ اے کاش۔ اے کاش!''

شوبھا کا یہ خط پڑھ کر میں نے سوچا تھا اس فیشن کی پُتلی کے دل میں کتنا درد ہے۔ کیا یہی درد کنول کے دل میں ہے۔ کیا یہ درد کرشنا کے دل میں ہے؟ کیا نیرا اور ان کی سی ہزاروں بے نوا عورتیں ایسی باتیں سوچتی ہیں۔ دوزخ اور جنت جس کے مالک کے طول و عرض میں زندگی کی وسعتوں کے تبلیغی جلسوں میں روز سنتے ہیں؟ کیا وہ آئندہ کے وعدوں کے اونچے ایوان کیا' ان میں یہ طاقت ہے کہ اس جلن سے شوبھا کے دل کو بچا سکیں؟ اس دن میں نے کنول کماری سے جا کر کہا تھا' بہت دنوں سے میں جس خطرے کا دل میں احساس رکھتا تھا' وہ خطرہ واضح اور ہمارے امن و امان کے لیے ایک عقلمند دشمن بنا گھات میں ہے۔'' ''کیسا خطرہ؟'' کنول نے بہت گھبرا کر پوچھ ہی لیا۔

''یہی کہ عیسائی مشن کے لوگ ہماری مایوس اور معصوم لڑکیوں کو ان کی تکلیف میں تھوڑی سی مدد دے کر انہیں اپنا مذہب قبول کروا لیتے ہیں۔''

''تو گویا آپ انسانیت کے بجائے مذہب کی حدوں کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ سمجھتے ہیں ہمدردی بجائے خود ایک مذہب نہیں ہے کیا اور جو مذہب مایوس اور بے کس انسانوں کے لیے کوئی احساس نہیں رکھتا' وہ مذہب کہلانے کا مستحق ہے؟

میں خاموش ہو گیا۔

وہ پھر بولی: ''میں کسی خاص جذبے کے تحت کسی ایک شاہراہ کی حامی نہیں ہوں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ بھگوان کرشن نے جب ظلم کی بیخ کنی کرنے کے لیے کنس کو مارا تھا تو ان کا پیغام یہی تھا جو عیسیٰ نے سولی پر چڑھ کر اپنے حواریوں کو سنایا جو عرب کے صحراؤں میں پیدا ہونے والے پرماتما کا پیغام لانے والے ایک رسولؐ نے اپنے پیروں کو کہا تھا کہ تم سچ کی پیروی کرو اور جھوٹ کی مخالفت' چاہے اس کے لیے تمہیں کوئی بھی تکلیف کیوں نہ اٹھانی پڑے۔''

میں نے پھر کہا: ''جب زندگی کے بیچ ہمیں بھگوان کے چرنوں میں مل سکتے ہیں تو ہم مارے مارے کیوں پھریں؟''

''کون کہتا ہے مارے مارے پھرنے کو۔ پر سوال تو یہ ہے بھگوان نے جو کہا ہے اس کا بھی تو کوئی لحاظ رکھا جائے۔ خالی نام لینے سے کیا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک عورت اس لیے ذات برادری سے باہر کردی جاتی ہے کہ اس نے کبھی اپنی راہ سے بھٹک کر ایک گناہ کیا ہے۔ مجھے کوئی یہ بتادے کہ کون نہیں کرتا۔ بڑے بڑے مہاتماؤں کے پاؤں لرز گئے ہیں۔ پر ہمارے ہاں عزت کے پیمانے بڑے بلند اور بہت چھوٹے ہیں اور پھر اس میں عورت کے لیے تو کوئی جگہ نہیں۔ مجھے اپنی ششما بھابی یاد نہیں ہیں کیا؟ وہ چپ ہوگئی۔

''کون ششما؟'' میں نے پوچھنے اور بات کرنے کے لیے کہا۔

کنول کی آنکھوں میں جیسے پرانی یادیں لہرانے لگیں۔ وہ بہت دیر کچھ نہ بولی اور میں سامنے کدم کے پیڑ میں اٹکے بادلوں کے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا' جو دھوئیں کی طرح بل کھاتے بڑی آہستہ روی سے اوپر ہی اوپر آسمانوں کی گہرائیوں میں گھومنے کے لیے چل رہے تھے۔ پیپل کی چوٹی پر ایک ننھی سی کونپل سورج کی کرنوں میں چمک رہی تھی اور ہوا کے ساتھ اپنے دھیمے سُروں میں گنگنا رہی تھی۔

نیرا نے آ کر کہا تھا: ''بی بی آپ سے کوئی بوڑھی سی انگریز عورت ملنے آئی ہے۔''

''انہیں یہیں بھیج دو۔'' کنول نے اس بے خیالی میں کہا۔

اور تھوڑی دیر بعد ایک انگریز عورت جس کے بال اس کے رنگ کی سفیدی میں ملے تھے نیرا کے ہمراہ وہیں آ گئی۔

میں نے اٹھ کر اپنی جگہ خالی کردی۔ کنول نے اپنی مخصوص ہنسی سے اس کا استقبال کیا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگی: ''ان سے ملئے۔ یہ آکسفورڈ میں میری ایک ہم سبق کی ممی ہیں۔''

میں نے دوسری بار جھک کر انہیں آداب کیا۔

عورت کی نیلی آنکھوں میں بہت نرمی اور چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی۔ جیسے کوئی کرن اردگرد چھپی ہوئی اپنی روشنی ڈال رہی ہو۔ آواز میں رس تھا اور بات کرنے کا انداز بڑا سہانا تھا۔

میری طرف دیکھ کر ہنس کر بولیں: ''آپ کبھی یورپ گئے ہیں؟''

میں نے کہا: ''بہت کم عرصے کے لیے چند مہینوں کے لیے صرف۔''

کہنے لگیں: ''آپ کو پسند آیا یورپ۔''

میں نے کہا: ''بہت۔ خاص طور پر انگلینڈ۔ اپنی دھند اور سردی کے باوجود مجھے وہ علاقہ بہت پسند آیا۔''

کہنے لگیں: ''آکسفورڈ گئے تھے؟''

میں نے کہا: ''افسوس مجھے وہاں جانے کا وقت نہیں ملا۔''

پھر کنول سے کہنے لگیں: ''روتھ کا خط کل ہی آیا تھا۔ اس نے مجھے لکھا ہے کہ وہ دو تین ماہ میں آنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ تمہارے پاس بھی آئے گی۔ ہم لوگ مشنری گروپ ادھر سے گزر رہے تھے۔ میں نے سوچا تم سے بھی ملتی جاؤں اور روتھ کا پیغام بھی دیتی جاؤں۔''

کنول نے ان کا شکریہ ادا کیا اور بتانے لگی کہ روتھ کا خط اسے بھی ملا ہے مگر اس نے آنے کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی۔ بہت اچھا ہوا کہ وہ آنے کا ارادہ کر رہی ہے۔

روتھ کی ممی نے اپنا تھیلا کھول کر ایک بڑی سی تصویر کنول کو دیتے ہوئے کہا: ''بیٹی میں نے سوچا تھا تمہیں ایسی چیزیں پسند ہیں۔''

کنول نے تصویر ان کے ہاتھ سے لے لی۔ اور بولی: ''ممی آپ کے پہلے تحفے اتنے ہی زیادہ ہیں۔ آپ جب بھی لکھتی ہیں میری پسند کا خیال رکھتی ہیں۔ میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔''

روتھ کی نیلی آنکھوں والی سفید سی ماں نے کہا تھا: ''کنولا بیٹی تمہیں اتنی چھوٹی سی چیز دے کر مجھے ایسی ہی خوشی ہوتی ہے جیسی روتھ کو دے کر۔''

کنول ہمہ شکریہ تھی۔

انگریز عورت نے پھر کہا: ''بہت اچھا موسم ہے بادل بھی ہیں اور دھوپ بھی' ہم اپنا دورہ تیزی سے کرسکیں گے۔ اگر واپسی پر ادھر سے گزر ہوا تو میں آنے کی کوشش کروں گی۔''

پھر کنول کے روکے جانے کے باوجود اٹھ کر جانے لگیں۔ بولیں: ''باہر موٹر میں سب لوگ میرے منتظر ہیں اور وہ چلی گئیں۔

بڑی سی تصویر۔ ایک ڈچ پینٹنگ تھی' سمندر تھا اور اٹھتی ہوئی نیلی دھند۔ چھوٹے چھوٹے جہاز لنگر اٹھانے کے لیے تیار تھے۔ پانی میں سورج کا عکس لہروں کے ساتھ لرز رہا تھا۔ بادلوں کی طرح بل کھاتا دھواں تھا۔ کنارے پر مزدور تھے۔ دور پس منظر میں ایک گرجے کی عمارت تھی۔ فضا پر ایک سکون اور امن کا عالم تھا۔ پن چکیاں تھیں اور پھولوں کے اودے' ملگجے رنگوں سے

خلا میں قوس وقزح کا احساس ہوتا تھا۔ یورپ کی قوموں کی زندگی میں سمندر ہے اور جہاز ہیں۔ سمندر جس پر راہیں گم ہو جاتی ہیں اور جہاز جنہیں ان گہرے پانیوں پر آگے ہی آگے ان گم کردہ راہوں کی تلاش میں جانا ہوتا ہے۔ وہ دنیا کے کناروں پر سکون اور ان کی تلاش میں گھومتے ہیں۔ انہوں نے بل بوتے اور محنت کے سہارے قدرت کی زبردست طاقتوں کو مطیع کر لیا۔ پھر گرجا ہے۔ آسمان کے سینے میں برچھی کی طرح چبھے ہوئے مینار' مذہب ان کی زندگی کا پس منظر ہے۔ بڑے سے بڑا سائنس دان اور عقل کے تابع فرماں شخص جب گرجے میں جاتا ہے تو اپنے دل کی گہرائیوں سے اس سکون کا طالب ہوتا ہے اور ہم اپنے بھگوان کو ایک مورتی کی طرح مندر میں بٹھائے رکھتے ہیں۔ وہ زندگی کی زندہ قدروں کا نہیں مردہ راہوں کا خدا ہوتا ہے۔ یورپ کی قوموں کا اپنے خدا سے رشتہ ایک عقلی اور دلائلی رشتہ ہے اور ہمارا اپنے پرماتما سے ایک جذباتی اور سطحی رشتہ ہے۔ پرجانے زندگی میں جذبات دیرپا ہوتے ہیں یا عقل اور دلیلیں۔

وہی جان سکتا ہے جو زندہ ہے اور زندہ رہے گا کہ ہم مشرق میں اس سے زیادہ نزدیک ہیں یا اس سے دور۔ زندگی کی نبضیں ہمارے ہاں دھڑکتی ہیں یا یورپ والوں کے ہاں۔ ہمارے مندر میں گمبھیرتا ہے' اندھیرا ہے' خوشبوئیں ہیں' ہمارے ساتھ ساتھ مسجدوں کے بلند مینار ہیں' فضا میں گونجتی ہوئی اذانیں ہیں۔ جب صبح ستاروں تلے پھیلنے لگتی ہے اور رات اپنا گھونگھٹ اٹھائے پیچھے مردہ کر دیتی ہے اس وقت کیرتن' بھجن اور اذانیں اوپر اُفق کے کناروں کو چھونے والی صبح کو ٹکراتے ہیں اور خدا' پرم آتما تم کہاں ہو۔ ہمارے ہاں صحرا ہیں' ہم تمہیں وہاں ڈھونڈ سکتے ہیں۔ یورپ میں سمندر ہے جس پر راہیں گم ہو جاتی ہیں اور راہیں ہمارے ہاں بھی گم ہیں۔ اے نیلی روشنیوں کے خدا' تم کہاں ہو؟ اے پرم آتما تم کدھر ہو؟

کنول کہنے لگی یہ یورپ کی زندہ قوموں کا طریق ہے۔ میری ششما بھابی اگر ودھوا ہو جاتی ہے تو اسے دھتکار دیا جاتا ہے۔ روتھ کی ممی اگر بیوہ ہو جاتی ہے تو مسیح کا پیغام لے کر دنیا کے کناروں پر گھومنے لگتی ہے۔ بتاؤ عورت کا احترام کون کرتا ہے؟ دھتکارنے والا' اسے روشنیوں سے آشنا کرنے والا؟

میں نے تلخ ہوتے ہوئے کہا: ''یہ کس نے بتایا ہے کہ دوسروں کی خوبیوں کو سراہتے رہو۔ ان کی خامیوں کو نظرانداز کر دو اور اپنے آپ سے نفرت کرو۔''

کنول ہنس کر بولی: ''آپ تلخ بہت جلد ہو جاتے ہیں اچھی باتوں کے ذکر سے دل کو

سکون نہیں ہوتا کہ کہیں تو دنیا کے کسی حصے میں تو انصاف کا وجود ہے؟''

میں نے کہا: ''انصاف اپنے ہاں بھی ہے' پر عورت نے خود کو اتنا مجبور بنالیا ہے۔''

''بنالیا ہے؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ! مجھے معلوم ہے یہاں کا ایک پڑھا لکھا آدمی عقلی دلائل کو چھوڑ کر محض جذباتی ہو جاتا ہے۔ عورت کی کل طاقتوں کو مردوں نے نچوڑ کر اسے ایک کھوکھلا وجود ایک جسم بنا دیا ہے۔ جس میں روح نہ ہو۔''

''قصور کس کا ہے؟'' میں نے پوچھا: ''عورت نے اپنے آپ کو مرد کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے اس لیے؟''

''بتایئے دنیا نے کیا کیا تھا کہ اپنے بیٹے کی شکل کو ترستی ہوئی اسپتال میں مرگئی۔ بتایئے کرشنا نے کیا کیا تھا' بتایئے نیرا نے کیا کیا تھا۔''

''بتایئے ششما بھابی نے کیا کیا تھا؟'' کنول رُوہانسی ہوگئی۔

''آپ ششما بھابی کا ذکر کیوں کر رہی ہیں؟ مجھے بھی بتایئے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''ششما میری بھابی تھیں۔ ایک بڑی سُہانی رت میں بھیا انہیں بیاہ کر لائے تھے۔ ماں کو بڑی بہو کا چاؤ تھا۔ برساتوں میں بھابی کے لیے جھولا باغ میں ڈلواتیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتیں۔ گھر میں ایک مسلسل خوشی رہتی۔ مجھے یاد ہے جب شنو پیدا ہوا تو میں بہت چھوٹی تھی۔ پر مہینوں گھر میں ڈھولک پٹتی رہی تھی مگر بھگوان کو یہ خوشی بہت دنوں منظور نہ تھی۔ ایک برسات میں بھیا بیمار پڑے اور پھر مرگئے۔ یہ باتیں اتنی دور زمانوں کی اور تلخ معلوم ہوتی ہیں۔ میں تو انہیں دہراتے بھی ڈرتی ہوں۔ بھابی کی چوڑیاں ماں نے اپنے ہاتھوں توڑ ڈالیں۔ مانگ کا سیندور دھو دیا۔ ایک ماتم کا سا سماں سارے گھر پر چھایا رہتا۔ شنو بھابی کا آنچل پکڑ کر ہنستا تو وہ اس ڈر سے کہ کہیں ماں دیکھ نہ لیں اسے پیار سے بھی نہ دیکھتیں۔ مایوسی اور کمزوری نے بھابی کو بے حد کمزور کر دیا۔ شنو بھی گھلنے لگا اور پھر شنو بھی مرگیا۔ بھابی پر اس کے بعد سارا دن گالیوں کی بوچھاڑ پڑتی۔ اسے ایک کونے میں پڑا رہنے کو کہا جاتا۔ کوئی اس سے ہنس کر نہ بولتا۔ وہ منحوس تھی اور اس کے سائے سے پرہیز کیا جانے لگا۔ مجھے یاد ہے ماں مجھے بھابی سے بولنے نہیں دیتی تھیں۔ وہ بڑی بڑی آنکھیں جن میں بے کسی تھی' وہ سوکھے بال جو کھوپڑی سے چپک گئے تھے' کھال لٹک گئی تھی اور یہ دھتکاری ہوئی ششما بھابی جب تلیا میں ڈوب مریں تو لوگوں نے اس پر انگلیاں اٹھائیں۔ طرح طرح کی باتیں کیں۔ ماں جب تک زندہ رہیں' ششما بھابی کو کوستی رہیں۔ مجھے کوئی بتائے

ان کا قصور کتنا تھا؟ کون خود سے چاہتا ہے کہ اپنے گھر میں آگ لگائے؟ بھیا کو بخار نے مارا تھا' بھابی نے تو نہیں۔ شنو کو بیماری نے مارا تھا بھابی تو نہیں چاہتی تھی کہ اس کا چمپا کے پھول کی طرح کا بچہ اس سے جدا ہو جائے۔ کون اپنے سے برباد ہوتا ہے۔ پر دنیا کتنی ظالم ہے۔ ماں کا بھی قصور نہیں' ہمارے ہاں کے رواج ہی ایسے ہیں جب بھی یاد کرتی ہوں میرا دل پھٹنے لگتا ہے۔'' کنول تھک کر کرسی کی پشت سے سر لگا کر چپ ہو گئی۔

اور مجھے دنیا یاد آ گئی۔ میرا دل بھر آیا تو وہ دھوا ہو گئی تھی مگر دنیا کا کیا قصور تھا۔ اسے تو کبھی دو دن کی خوشی دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ شوبھا نے جو لکھا تھا کہ ہمیں تو ایسے قصوروں کی سزا بھی مل جاتی ہے جو کسی نے کیے نہ ہوں۔ ٹھیک تھا۔ اور بھگوان سے کون پوچھنے جائے کہ تم جس روشنی کا وعدہ کرتے ہو' اسے تم بے کس معصوم روحوں سے کیوں چھپائے رکھتے ہو۔ تم جس شانتی اور سکون کا پیغام سناتے ہو وہ تم نے کس لیے رکھا ہے۔ زمانوں کے چکروں میں نروان کی سختیاں برداشت کرتی ہوئی آتمائیں کس سے مدد طلب کریں۔ تم کہاں ہو کہ بات ہی نہیں سنتے۔ خواب کے سے آ کر خوشی کے سپنے دیتے ہو تو جاگنے کا عذاب بھی روشنی میں ڈال دیتے ہو۔ ان نکتوں کو کون حل کرے۔ ان سوالوں کے جواب کون دے۔ کوئی نہیں جانتا' کوئی نہیں سنتا' اے پرم آتما کیا کیا جائے اے بھگوان کیا کیا جائے۔ اے خداؤں کے خدا روشنی کدھر ہے؟ میں ہمہ تن سوال ہوں۔ مجھے بتا روشنی کا نقطہ کدھر ہے؟

اور آج کی رات جب تاریکی ذرا اور نیچے جھک کر کھڑکی پر کے سفید کنول کو چھو رہی ہے۔ میں سوچتا ہوں ہمارے گرد سوالوں اور استفساروں کا ایک عظیم چکر ہے۔ ہم اپنی ناؤ کو بچاتے چلے جاتے ہیں اور پھر بھی آگ ان کے گرد لپٹی رہتی ہے۔ ساحلوں پر کے سیاہ جنگلوں کے ہولناک حاشیے' کون اس تاریکی کو چھونے کی جرأت کرے گا؟ میری کشتی اس مانجھی کی طرح ڈول رہی ہے جس نے بپھرے طوفان کی پروا کیے بغیر گرجتے بادلوں کے باوجود اپنی ناؤ کو دوسرے کنارے کی تلاش میں پانی کے بہاؤ پر چھوڑ دیا ہے۔ جن سوالوں نے کنول کماری کو پریشان رکھا' وہ ہم کو پریشان کرتے ہیں۔ کبھی کبھار عورت ہمارے لیے بھی ایک معمہ بن جاتی ہے۔ عورت ششما ہو یا کرشنا' ہم کبھی جان نہیں پاتے کہ وہ کیا ہے؟ ہمارے لیے وہ ایک رنگوں کا ہیولیٰ ہے جو ہوا کے بازوؤں پر سورج کی روشنیوں میں چمکتا ہے اور جب ہم اس کے قریب ہوتے ہیں ہماری نگاہوں کی حرارت سے رنگ بکھر جاتے ہیں۔ ہم عورت کو رنگ و نور ہی بنانا چاہتے ہیں۔ ہم اسے ایک

ایسی شے چاہتے ہیں جو ہماری خوبصورتی کی حس کو تسکین دے' اس کے علاوہ اور کچھ نہیں؟

اور اسی لیے جب کنول کے رنگوں نے راجندر کو الجھا دیا جب اس کی ساڑھی کی سفیدی نے اس کے چہرے کے نور سے راجندر کو رنگوں کے ہیولے سے الگ کسی شے کا احساس دلایا جو رنگوں کی نمود اور ان کی چمک ہے جوان کی زندگی اور ان کی تڑپ ہے تو وہ گھبرا گیا تھا۔ سچا لگاؤ محبوب ہے اور دھڑکن وقتی ہے۔ راجندر میرا دوست ہے۔ اس میں دھیرج بھی ہے' ان نگاہوں میں پاکیزگی بھی ہے۔ وہ جب اپنی بلندی سے جھک کر بات کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کوئی شاہ بلوط ہوا کے جھونکوں سے تھوڑا سا جنبش کر رہا ہو۔ میں نے اس سے وجیہہ آدمی کبھی نہیں دیکھا مگر اپنی وجاہت کا کوئی کیا کرے۔ آئینے میں عکس تو لرزاں سایوں کا ہوتا ہے اور سطح پر کانپتے کنول پانی کے اندھیرے آئینے میں چمک اٹھتے ہیں۔ ان دنوں ایک مایوسی اور اداسی اس کے چہرے کا جزو بن گئی تھی۔ میں نے کئی بار پوچھا بھی مگر اس نے مجھے کبھی بھی کچھ نہیں بتایا۔ ان روشن آنکھوں کی چمک بجھ سی گئی تھی۔ وہ خوش آیند قہقہے خاموش ہو گئے۔ وہ جب مجھ سے ملنے آتا خاموش بیٹھا کھڑکیوں پر بنے ہوئے بڑے بڑے کنول کے پھولوں کو دیکھا کرتا۔

میں نے اس سے پوچھا: ''راجندر آج کل تمہاری خوش طبعی تمہاری زندگی' تمہارے قہقہے کہاں کھو گئے ہیں؟''

اور راجندر سیٹی بجاتا کوئی پرانی دھن یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس سیٹی میں وہ زندگی نہیں ہوتی تھی۔ وہ سیٹی ایک چیخ ہوا کرتی تھی۔ جیسے کوئی سسکیاں روکنے کی کوشش کرتا ہوا گیت گانے لگے۔

بہت دنوں میں نے اسے نہیں دیکھا۔ مہینوں گزر گئے۔ راجندر کا تعارف کنول سے میں نے کروایا تھا اور پھر اپنی ذہانت اور مقناطیسی قوت سے وہ اس کے زیادہ نزدیک ہوتا گیا تھا۔ یہ نہیں کہ کنول پر کسی کشش کا اثر ہوتا تھا۔ پھول اور پتھر قریب تھے اور پتھر کی چمک میں پھول کا عکس کانپنے لگا تھا۔ وہ عورتوں کی آزادی کا زیادہ حامی نہیں تھا مگر جب میں اور کنول باتیں کرتے تو وہ خاموش بیٹھا کدم کی ٹہنیوں کو دیکھتا رہتا۔

کنول نے مجھ سے نہیں پوچھا راجندر کہاں ہے' بے چارہ مجبور معذور کہاں ہے' وہ اچانک غائب ہو گیا تھا۔

پھر ایک دن بینا نے مجھ سے کہا: ''آج آپ شام کو ضرور جائیے آپ کی دوست بلاتی ہیں۔''

میں بینا کو دیکھ کر ہنس پڑا۔ اس نے کنول کماری کو بہت دنوں سے صرف میری دوست کہنا شروع کر دیا تھا۔

بولی: ''ہنستے کیوں ہیں؟ آج وہ بہت خفا معلوم ہوتی تھیں۔ جائیے گا تو معلوم ہو جائے گا۔''

میں نے کہا: ''ان کے خفا ہونے سے میرا کیا تعلق ہے اور تمہیں کیسے معلوم تھا کہ وہ خفا ہیں؟''

بینا بڑے انہماک سے اپنے کاموں میں لگ گئی۔ بولی: ''میں کچھ نہیں جانتی۔''

میں نے کہا: ''پھر میں شام کو خود ہی معلوم کر لوں گا۔'' اور میں اپنے سامنے پڑے مسودے کو دیکھنے لگا۔ ''مشرق اور مغرب کی عورت۔''

مگر میرے دماغ میں انجانے ہی راجندر، کنول، مشرق اور مغرب تانے بانے کی طرح الجھ گئے تھے۔ کنول کو تو کبھی غصہ نہ آیا۔ وہ کیسے خفا ہو سکتی ہے۔ جانے بینا یونہی کہہ رہی ہو۔

اور اسی شام جب میں اور بینا اپنا اپنا کام بڑے انہماک سے کر رہے تھے، شوبھا کا خط آیا۔

دنیا کے ٹوٹے تاروں میں کتنے نغمے خوابیدہ تھے۔ کتنے گیت ابھی تخیل کے اندھیروں میں بادلوں کی بجلی کی طرح پوشیدہ تھے۔ آج میری دنیا ٹوٹ گئی ہے۔ ایک جھنکار سے اپنے ہاتھوں سے گر کر میری دنیا خود ہی ٹوٹ گئی اور ذرا ذرا سے کمزور تاروں میں آہنگ کتنا مجروح ہو گیا ہوگا۔

بھیا! جانے کیوں آج کل ہر ٹوٹی شے کو دیکھ کر مجھے اپنا ٹوٹا ہوا غرور یاد آ جاتا ہے۔ ہر برباد شے کو دیکھ کر مجھے اپنی بربادی یاد آ جاتی ہے۔ بظاہر میں اچھی طرح سے ہوں۔ اگلے ماہ یورپ کے سفر پر اپنے پتی کے ساتھ جانے والی ہوں۔ کتنے ہی یتیم خانوں اور نادار گھروں کی کمیٹیوں کا کام کر رہی ہوں اور دنیا کو بدلنے، اسے سنوارنے کا سارا سہانا سپنا میرے قریب ہی کہیں ڈولتا رہتا ہے اور مجھے کبھی کبھار اتنے زور کی ہنسی آتی ہے جو اپنے کو تباہ ہوتے دیکھ کر بچا نہ سکا، وہ دوسروں کو کیا بچا سکے گا۔ میں نے اپنے خول سے باہر جھانک کر ان دنوں بھی یہی سوچا تھا۔ یہ میں نہیں ہوں جو جوگی مہاراج کے ساتھ جا رہی ہوں۔ یہ میں نہیں ہوں جو تباہ ہو رہی ہوں۔ یہ میں نہیں ہوں جو ایک تباہ حال عورت سے زیادہ برباد ہوں۔ یہ میں نہیں ہوں جو ایک انجانے، ان دیکھے خدا پر ایمان لا رہی

ہوں اور آج تک میں نے سوچا تھا یہ میں نہیں ہوں جو ہوا کے بازوؤں پر سوار دنیا کی خوشبوؤں کے ساتھ آکاش کی بلندیوں کو چھونے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کیا آکاش اتنا ہی نیچا ہے کہ میرے سانس کی نرملتا جھرنے کی کلکل کی طرح اس کی طرف بہنے لگے گی؟ کتنی اُلجھی ہوئی تمنا ہے؟

جب اس بڑے سے گمبھیر گرجے کی خاموش عمارت میں مریم کنواری کی تصویر کے سامنے جھک کر میں نے کہا تھا، میں خداوند خدا کو جو شفقت کرنے والا اور مہربان ہے اپنا آپ کو سونپتی ہوں اور پادری نے مقدس پانی میرے سر پر چھڑک کر مجھے بپتسمہ دیتے ہوئے کہا تھا، آج تم زندگی سے آشنا ہوئی ہو۔ خداوند ہمارا خدا بہت مہربان ہے۔ وہ دوسروں کے اور ساری دنیا کے گناہ اپنے سر لے کر ہمیشہ کے لیے ہمیں عذاب سے نجات دلا گیا تو میرا دل کتنے زور سے دھڑکا تھا۔ میں نے سوچا تھا، اب میں اپنے میکے گھر واپس جا سکوں گی کیونکہ خدا نے ہمارے سارے گناہ اپنے سر لے لئے ہیں۔ پر سچ کہنا بھیا، کبھی انسان گناہوں سے بھی رہا ہو سکتا ہے اور میرے خول میں کسی نے چیخ کر کہا تھا۔ تم تم تو مر کر بھی اپنے گناہ کی آگ میں جلو گی۔ تم کبھی بھی مکتی حاصل نہیں کر سکتیں۔

قربان گاہ پر جلنے والے دیئے کی زرد روشنی گرجے کی بلند دیواروں پر کانپ رہی تھی۔ میڈونا کی تصویر پر ہنسی ایک مضمحل تھکن بن کر مسلط تھی۔ ایک ایسی حسرت جو دیکھنے والے کے دل میں دامن تھام کر چلتی اور فریاد کرتی ہے۔

پھر پادری نے مقدس انجیل کو چوما اور ایک انگلی کی زبور کو نم کر کے ورق پلٹتے ہوئے بڑی مدھم آواز میں منمنا کر کہا تھا: ''زبور 42 دوسری کتاب۔''

میرے ذہن میں آج بھی ایک سرسراہٹ سی ہوتی ہے۔ کوئی صفحے پلٹتا تھا اور پھر جیسے ہوا کے زور سے پلٹتے ہیں اور ہوا کے زور سے کمزور زرد پتوں کی طرح ایک کے بعد ایک صفحے کسی غیر مرئی ہوا کے زور سے پلٹتے جاتے ہیں۔ دماغ میں ایک آندھی سی چلتی ہے۔ تیز اور زبردست جو ساری عافیت کو اڑا کر لے جاتی ہے۔ میں طوفان میں کھڑی ایک عورت کی طرح اپنی ساڑھی کو اپنے گرد لپیٹتی ہوں اور اڑتے ہوئے بادلوں کو اپنے چہرے سے ہٹاتی ہوں۔ گرد و غبار سے بند ہوئی آنکھوں کو کھولنے اور اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کرتی ہوں مگر مجھے کچھ بھائی نہیں دیتا۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میرے گرد کتنا گہرا اندھیرا ہے، میں کسے پکاروں؟

جس بھگوان کے چرنوں کو میں نے چھوڑ دیا تھا، جس کے سہارے کو میں نے ٹھکرا دیا تھا، جس گھر کو برباد کر کے میں نے یاد رکھا تھا، آج وہ مجھے یاد آتا ہے۔ دنیا کے ٹوٹے تار، کوئی بادل

خشک اور برباد کھیتی پر نہیں برسے گا' حالانکہ

زبور 42 دوسری کتاب کو پڑھتے ہوئے پادری نے کہا تھا۔

جیسے ہرنی پانی کے نالوں کو ترستی ہے' اسی طرح اے خدا میری روح تیرے لیے ترستی ہے۔

میری روح خدا کی' زندہ خدا کی پیاسی ہے۔

تیرے آبشاروں کی آواز سے گراؤ گراؤ کوئی پکارتا ہے۔ تیری سب موجیں اور لہریں مجھ پر سے گزر گئیں۔

تو بھی خداوند کو اپنی شفقت دکھائے گا۔

اے میری جان تو کیوں گری جاتی ہے۔ تو اندر ہی اندر کیوں بے چین ہے۔

خدا سے امید رکھ کیوں کہ وہ میرے چہرے کی رونق میرا خدا ہے۔

میں پھر اس کی ستائش کروں گا جیسے ہرنی پانی کے نالوں کو ترستی ہے۔ ویسے ہی اے خدا میری روح تیرے لیے ترستی ہے۔ تم سوچو گے میں اتنی اچھی طرح سب کچھ کیسے یاد رکھ سکی۔ بس اسی طرح جیسے مجھے وہ لمحہ یاد ہے جب مغنیوں نے سازوں کو چھیڑا تھا۔ رباب کے تار جھنجھنائے تھے مگر یہ تو پرانی باتیں ہیں۔ شام کو گرجے میں آنکھیں بند کر کے خداوند کی بادشاہت کے دوام کی آرزو کرتے ہوئے ایک عمر بیت چلی ہے اور میرے خول کے اندر سے کوئی پکار کر کہتا ہے' چیخ کر کہتا ہے' رو کر کہتا ہے تم کون سا گن جانتی ہو؟ کوئی نہیں میرے گرد روتی ہوائیں نوحہ کرتی ہیں۔ ستارے صرف چمکتے ہیں راہ نہیں دکھاتے۔ ستارے صرف ٹمٹماتے ہیں' روشن نہیں ہیں۔ مانجھی بابا تم کہاں ہو؟ سنسان راہ گزاروں اور اندھیروں' پانی کی لہروں' دریا کی موجوں کے ساتھ مانجھی بابا تم کہاں ہو؟ کیوں مدتوں بعد میں نے مانجھی بابا کو پھر دیکھا تھا۔

دیکھتے ہو مجھے کتنی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ کبھی اپنے خول میں گھستی ہوں تو گرے پڑے خیال ٹوٹی پھوٹی چیزوں کے ڈھیر کی طرح قدموں میں الجھ جاتے ہیں۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی بھی تو نہیں دیتا اور یوں مجھے مانجھی بابا یاد آ جاتا ہے۔ بابا کی یاد کتنی اچھی تھی کیونکہ جوگی مہاراج کے دس سال بعد مانجھی بابا نے مجھے ایک گھاٹ پر پکنک کرنے والوں کی ایک پارٹی کے ساتھ دوبارہ دیکھا تھا۔

میں اس رات والی سہمے سہمے قدم رکھنے' ڈرنے اور دھرتی کی کٹھورتا سے گھبرانے والی

شو بھا تو نہ تھی۔ میں جو ناؤ کو مضبوطی سے پکڑ کر ان آوازوں کو اپنے سے دور دھکیل رہی تھی جو مجھے پکارتی ہی رہی تھیں۔ میں تو بدلی ہوئی نرالی زور سے قہقہے لگانے اور زندگی کے پیالے کی تلچھٹ تک کو جانے والی پرشوتم کی ودھوا تو نہ تھی۔ میں تو خداوند کے پیغام سے سوکھی کھیتی کی طرح دوبارہ سیراب تھی۔

مگر مانجھی بابا نے مجھے پہچان لیا۔

"کیوں بٹیا کیسی ہو؟" دس سال کے بعد بھی مانجھی بابا کی آنکھوں میں چمک حیرت انگیز طور پر زندہ اور جاندار تھی۔

میں گھبرا گئی۔ ہم پانچ لوگ اس کی کشتی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھ سمیت پانچ لوگ تھے' سب نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور شاید میرے نئے ساتھیوں' نئے دوستوں کو دیکھ کر مانجھی بابا نے پھر مجھ سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔

ناؤ دریا کی موجوں پر ایک کھلونے کی طرح تیرتی رہی۔ چپو ٹھنڈے' نیلے' سبزی مائل پانی کو چیرتے رہے۔ بابا کے کانوں میں بڑے بڑے بالے ہلکورے لیتے رہے اور میں اپنے دل کے اندھیرے میں پھر ایک گہری اور تیز چیخ سن رہی تھی۔ میں بھول چکی تھی کہ جس کنارے کو میں چھوڑ چکی ہوں جو میرے لیے ڈوب چکا ہے' وہ پھر یادوں پر کبھی اُبھرتا ہے اور بات تو یہ ہے کہ وہ کنارہ میرے لیے کبھی ڈوبا ہی نہیں تھا۔ میں نے کنارے کو بھلا دیا تو کیا ہوا۔ کنارہ زندہ تھا' آباد تھا' میرے دل میں کوئی تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ مجھے اپنی ساس یاد آ رہی تھیں' اپنا میکہ' گھر یاد آ رہا تھا اور اس دلدل پر میں چلتے ڈرتی تھی۔ میں اپنے خول کے اندر ہنس رہی تھی۔ میں اپنے خول سے باہر نہیں اندر پکڑ کر لائی جا رہی تھی۔ ایک مجرم کی طرح یادوں کی اینٹوں میں کوئی مجھے چن رہا تھا۔ میں انارکلی کی طرح اس خوبصورت بے بس دوشیزہ کی طرح اپنے آپ سے شکست کھا کر اپنے وجود میں خود ہی مر رہی تھی مگر میں کسی کو پکار بھی تو نہ سکتی تھی۔ میرے دل کی راہوں سے تو کئی گزر گئے تھے اور کوئی میرا اپنا نہ تھا۔ آج تو کوئی میرا اپنا نہ تھا۔

اپنے سمیت پانچ ساتھیوں کے ساتھ میں ہنستی رہی' قہقہے لگاتی رہی۔ دریا کا پانی اُچھال کر ان پر ڈالتی رہی۔ ہم ایک دوسرے سے بھونڈے مذاق کرتے رہے۔ یونہی ہنستے اور قہقہے لگاتے رہے۔ پھر پرانے اور نئے گیت گاتے رہے۔ اور میں کن انکھیوں سے مانجھی بابا کو دیکھ رہی تھی۔ میرا دل بوجھ سے بھری ناؤ کی طرح ڈوب رہا تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر چل رہا تھا۔ سانس میرے

سینے میں نہیں سماتا تھا' مگر میں ہنس رہی تھی۔ بے تحاشا' بے محابہ' بے باکانہ' میرا وجود رو رہا تھا' کراہ رہا تھا اور میں ہنس رہی تھی' کنارے کے گھنے جنگلوں کی طرف جیسے زمانوں کی دوری سے روحیں اپنے پرانے مسکنوں کو دیکھنے آئیں' میں حیرت سے دیکھ رہی تھی اور میرے دماغ میں۔

''تم ماتم کرو جس طرح دلہن اپنی جوانی کے شوہر کے لیے ٹاٹ اوڑھ کر ماتم کرتی ہے۔''

بار بار چکر لگا رہا تھا' کنارے کی دلدلی زمین پر زور سے پاؤں رکھتے اور آگے کی طرف بوجھ ڈالتے۔ ڈانیل نے مجھے کشتی میں سے کھینچ کر اوپر اٹھا لیا اور خشک زمین پر رکھ دیا۔ ان دنوں ڈانیل میرا عزیز ترین دوست تھا۔ میری پیاری سہیلی نورا کا پیارا بھائی۔ میں اس سے شادی کرنے والی تھی۔ یہ پکنک بھی نورا نے ہمارے اعزاز میں دی تھی۔ ہونے والی مبارک ساعت کے نیک شگون کے لیے مگر میں نے ڈانیل کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا۔ اتنی زور سے جھٹک دیا کہ مانجھی بابا نے بھی دیکھ لیا۔ اس نے بڑی حیرت سے دیکھا۔ نورا نے بھی حیرت سے دیکھا اور میرے باقی ساتھیوں نے بھی مگر اس لمحے میرے لیے صرف دریا کا کنارہ تھا' یادیں تھیں اور مانجھی بابا تھا۔ مجھے مندر کا کلس یونہی پانی کی لہروں کے ساتھ ہلکورے لیتا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے بھگوان کی آنکھیں ہر لہر کے کٹاؤ سے جھانکتی نظر آ رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں افسوس تھا' رنج تھا اور غم کی بکھیر تا تھی۔ میں نے اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے دبا لیا اور وہیں کنارے پر بیٹھ گئی۔ میرے قریب ڈانیل تھا' نورا تھی' کاش وہ مجھے تنہا چھوڑ دیتے۔

مانجھی بابا نے اپنے دیس کا وہی پرانا گیت گانا شروع کیا' جب اس اندھیری رات میں وہ مجھے اور جوگی مہاراج کو گھاٹ کے پار لایا تھا۔ اس گیت میں نہ جانے کیا تھا' میں چیخ پڑی۔ میرا خول پھٹ گیا تھا اور ایسے میں مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ جو بربادی ہوئی وہ میری تھی' جو بیتی مجھ پر کسی اور پہ نہیں۔ میں نے اتنے سالوں سے یہ تکلیفیں برداشت کی ہیں کسی اور نے نہیں۔

ڈانیل اور نورا گھبرا گئے۔ مانجھی بابا نے گیت اسی طرح رکھا اور پھر کسی نے مانجھی بابا سے کہا' ''تم گیت کو ختم کرو۔''

کشتی دوبارہ چلی۔ بابا کا گیت فضا میں سڑے ہوئے پتوں سے بھری باس کے ساتھ کنارے کے جنگلوں کی ویران راہوں اور پیچ در پیچ پگڈنڈیوں کے ساتھ چکر لگا تا رہا ہوگا۔ اُف میری بے چین برباد روح!

جب ہم اس جگہ پر واپس آئے جہاں سے چلے تھے تو سب کے اُتر جانے پر مانجھی بابا نے چپکے سے مجھ سے کہا۔

''بٹیا یہ جینا نہیں مرنا ہے۔''

اس سے زیادہ ایک لفظ نہیں اس سے کم ایک لفظ نہیں۔ مانجھی بابا نے مجھے گزرے زمانوں کے ویرانوں میں دوبارہ لا کھڑا کیا تھا' جہاں میں اکیلی تھی۔

دیکھا تم نے مگر یہ خول ایک زخم کی طرح پھٹتا ہے۔ میں روتی ہوں اور پھر ہنستی ہوں۔ زندگی کی لاپرواہ راہوں کی خاک اور آرام کا تیل مل کر اس پر مرہم بن جاتے ہیں۔ کوئی مجھے یہ تو بتائے مانجھی بابا مجھے دوبارہ کیوں ملتے تھے؟

اس رات اپنے آپ سے بچنے اور اپنے اکیلے پن سے دور بھاگنے کے لیے میں نے نورا کے بھائی ڈانیل سے شادی کر لی۔

گرجے میں جھنڈیاں لٹک رہی تھیں۔ روشنیاں ہو رہی تھیں۔ میں ایک سفید کفن پہنے قربان گاہ کے سامنے کھڑی تھی' سوچ رہی تھی۔ یہ میرا نیا خول ہے جس میں میں واپس جا رہی ہوں۔ یہ میری نئی زندگی ہے جس میں پناہ لے رہی ہوں۔ اب مجھے مانجھی بابا کا گیت اور کنارے کے جنگل کبھی نہیں ستا سکتے اور مریم کنواری کی تصویر اپنی مضمحل اور اداس ہنسی کے ساتھ میری طرف دیکھتی رہی تھی۔ میں نے کہا تھا' مریم کنواری کو کبھی یہ سفید کفن پہننے کی ضرورت نہیں پڑی نا' اسی لیے ہنستی ہے۔ مریم کنواری میں نے دل میں کہا تھا۔ مجھے تو بتاؤ یہ ہنسی رونے کو چھپانے کے لیے ہے یا ہنسی ہے؟ اور مریم کنواری کی صورت اور مضمحل ہو گئی تھی۔

خداوند کریم' مریم کنواری کا بیٹا۔ مریم کا خدا۔ تقدیس کے بندھن الجھی ہوئی راہیں اور یوں میں قربان گاہ کی روشنیوں میں پرشوتم کی ودھوا سے ڈانیل کی دلہن بن گئی۔

گرجے کے باہر درختوں پر ایک مایوسی چھائی تھی۔ ننگی شاخوں پر ایک پتا بھی نہیں تھا اور دروازے کے سامنے جو درخت مل کر محراب بناتے تھے' ان پر دونوں طرف اُلو بیٹھے تھے۔ ہمارے ہاں الو کو ایک برا شگون سمجھا جاتا ہے مگر ان مغربی قوموں کے ہاں اس سے کوئی بچنا نہیں چاہتا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ پاؤں پھسل گیا اور ڈانیل اگر مجھے نہ سنبھالتا تو میں گر جاتی۔ مجھے اپنے پر ایسے ویرانوں کی روح ہونے کا گمان ہو رہا تھا' جس نے مدتوں اپنے سے باہر سفر کیا اور تھک کر اب پناہ لے رہی ہو۔ اس رات بھی کسی نے بانسری پر ایک بیتاب کرنے والی دھن چھیڑی تھی۔ میرا سارا وجود بے چین ہو گیا تھا۔ مجھے شہنائیوں کی آواز آ رہی تھی۔

میں بھی تمہیں کیسی باتیں سنا رہی ہوں۔ اتنی ذرا سی بات نے مجھے اداس کر دیا کہ آج میری دنیا کے تار ٹوٹ گئے ہیں۔ سوچو تو سہی اس سے کیا ہوتا ہے۔ دنیا تو ایک ساز ہے اور ساز اپنی ساری مشکل بناوٹ کے باوجود ایک ساز ہے۔ نیا خریدا جا سکتا ہے ٹوٹے ہوئے ساز کو پھینکا جا سکتا ہے۔ پھر یہی تو بات ہے کہ ٹوٹے ہوئے تاروں میں سے کبھی کبھی کوئی گیت ایک جھنکار کے ساتھ زندہ ہو جاتا ہے۔ جاگ اٹھتا ہے اور پھر مجھے وہی بات یاد آ جاتی ہے۔

''بٹیا یہ جینا نہیں مرنا ہے۔''

ہماری ناؤ کھینے والے دوسروں کو پار اتارنے والے جینے اور مرنے کا وقت جانتے ہیں اور رشیوں، منیوں، مہاتماؤں سے بہتر ان کو معلوم ہے کہ جب عورت ودھوا ہو کر قہقہوں کی گود میں پناہ لیتی ہے تو وہ لاش ہوتی ہے۔ پر کوئی مجھے بتاؤ ہمارے ہاں زندگی میں اتنا رونا کیوں ہے؟ ہمارے سازوں کی دھنیں ایک چیخ ہیں۔ اندھیرے کی پکار ہیں، ہم سارا وقت اَن دیکھی طاقتوں اور شکتیوں کو پکارتے رہتے ہیں۔ ساری دنیا ایک انجانی آتما پر یقین تو رکھتی ہے مگر ہمارے ہاں تو یہی پکار ساری زندگی پر چھائی رہتی ہے۔ کیا ہماری بہاروں میں کوئی خوبصورتی ایسی نہیں جو برباد ہونے والی نہ ہو۔ کیا پھول کی رنگت اڑ جانے کے بعد کچھ باقی نہیں رہتا؟

اور پھر وہی سوال: ''یہ جینا نہیں مرنا ہے۔''

کوئی مجھے سمجھائے میں اب جی رہی ہوں؟

پادری نے ایک بار مجھ سے کہا تھا، دعا کرنے سے گناہ معاف ہو سکتے ہیں اور میں نے کہا تھا، مقدس باپ وہ گناہ نہیں ہوتا جو معاف کیا جا سکے وہ تو لغزش ہوتی ہے۔ انسان لڑکھڑا کر سنبھل سکتا ہے پر گری پڑی شے کو کون پھر سے جھاڑ کر اپنے خوبصورت آتشدان پر رکھے گا۔

اور وہ پہلا دن تھا جب پادری نے میری طرف بہت حیرت سے دیکھا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ مریم کنواری کی ستاروں بھری چنری اور اس کے چھوٹے سے بچے نے دنیا کے گناہ نہیں دھوئے۔ کسی کو کوئی بھی پار نہیں اتار سکتا۔ سب بے بس مجبور اور اپنی سوچی ہوئی راہوں سے نجات کے طالب ہوتے ہیں۔

خداوند ہمارا خدا شفقت کرنے والا ہوگا، پر وہ ہے کہاں؟

اور کوئی مجھے اس سوال کا جواب نہیں دیتا۔

اندھیرے میں جب تمام چیزیں اپنے بتانے والے کے پہلو میں کھڑی ہوتی ہیں مجھ

میں کبھی اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ میں اس پہلو کا تصور بھی کر سکوں۔

اور ایک نئی عجیب اور اچھی سی چیز بتاؤں۔ کل میں کنول ٹھاکر کے بھیا سے ملی۔

وہ میرے پتی کے دوستوں میں سے کسی ایک کے ہاں مہمان ہیں۔ کل ان لوگوں سے ملنے جاتے ہوئے، ہم ان سے بھی ملے تھے۔ دیکھا کیسا عجیب انکشاف ہے مگر ان کے متعلق میں کبھی دوسرے خط میں لکھوں گی۔ ذرا سوچو تو سہی کنول کماری ٹھاکر کے بھیا۔

تمہاری اس آسمانوں کی بلندیوں پر بیٹھی ہوئی دیوی کے بھیا۔

تم کو یقین آ گیا کہ وہ آسمان پر نہیں یہیں دھرتی کی ایک باسی ہے خیر اسے بھی جانے دو۔ میری دنیا کے ٹوٹے تار۔

شوبھا

شوبھا کا خط پڑھ کر مجھے بھی اپنا دل بیٹھتا ہوا معلوم دیا۔ میں کتنی دیر خط کو پڑھنے کے بعد بھی اسے ہاتھ میں لیے یونہی خلا میں تکتا رہا۔ قریب ہی کسی اسکول میں چھٹی کا گھنٹہ زور سے بج رہا تھا۔ آوازوں اور شور سے فضا میں ایک بے چینی سی تھی۔ میرے کمرے کی کھلی کھڑکی میں سے لڑکیوں کے سرخ دوپٹے لہراتے ہوئے نظر آتے تھے۔ پھر تانگوں کی آوازیں، موٹریں اسٹارٹ ہونے کی صدائیں، سائیکلوں اور پیدل چلنے والوں کا ہجوم سا سڑک پر سے گزرنے لگا۔

زندگی سے معمور اور مسرتوں سے مغلوب یہ چہرے، یہ لڑکیاں تھیں کونپلیں، خوبصورت تتلیاں، معصوم پریاں، یہ ہر فکر سے آزاد ہیں۔ ان کو کسی غم سے دوچار ہونے کا موقع نہ ملا۔ چپکے چپکے قدم بڑھاتے ہولناک سرعت سے بڑھتے ہوئے سال ان کو محتاط کر دیں گے۔ کندھوں پر لہراتے دوپٹے سر پر ڈھپ جائیں گے۔ چال میں متانت پیدا ہو جائے گی۔ باتیں کرتے ہوئے راستوں پر زور سے قہقہے لگانے والی یہ لڑکیاں پھر چونکی ہرنیوں کی طرح ہر قدم پر اپنے پیچھے مڑ کر دیکھیں گی۔ ان میں سے کئی روپ متیاں اپنے باز بہادر کا انتظار کرتی ہوئی کافور پھانک لیں گی۔

کافور ٹھنڈا ہے، سفید ہے اور تیزی سے کام کرتا ہے۔ ٹھنڈک روح کو یخ کر دیتی ہے اور جانے ہم میں سے کتنے ہیں جن کو کافور پھانکنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ سینے میں دہکتی آگ ٹھنڈی ہو سکے پر سوال تو یہ ہے سینے میں آگ دہکے ہی کیوں؟ مذہب ہماری حفاظت اور ہر قدم پر ہمیں برے بھلے کی تمیز بتانے کے لیے موجود ہے۔ پھر بھی لوگ راہ بھٹک جاتے ہیں۔ راستہ بھول جاتے ہیں اور

یہ آگ ان کے دامنوں کو جلا دیتی ہے۔ عورت انارکلی بننا کیوں پسند کرتی ہے وہ اپنے لیے ایک معمہ کیوں ہے؟

عورت اپنے لیے بھی تو ایک معمہ بنتی ہے۔ انارکلی بن کر وہ محبت کے دکھ سے بے تاب ہو کر سلیم کی محبت میں بے چین ہوتی ہے اور دنیا اکبر کی شہنشاہیت بن کر اسے زندہ اینٹوں میں چنوا دیتی ہے۔ وہ روپ متی ہوتی ہے تو دل میں سوچتی ہے پیارے شہزادے باز بہادر وہ دن کب آئے گا اور جب وہ دن آتا ہے اور جب باز بہادر جلوہ گر ہو پاتا ہے تو اسے اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے کافور پھانکنا پڑتا ہے کیا پیار کی دو چار گھڑی کی زندگی ایک عمرِ رواں کے مقابلے میں کافی ہوتی ہے؟ اور کرشن کنہیا کی بانسری سننے کے لیے رادھا کی بے تابیاں ان سب سے بڑھ جاتی ہیں۔

عورت ایک باوقار ملکہ ہے۔ دنیا کی ساری نعمتیں اس کے قدموں میں کھلونوں کی طرح بکھری ہوں۔ مگر وہ نثار میاں سے کہتی ہے میرے سینے میں نا مختتم تمنائیں ہیں۔ میرے تاج وتخت کے مقابلے میں انطونی کا دامن ایک سلطنت سے بڑھ کر ہے اور آخر سانپ کا زہر اسے سکون دیتا ہے۔ کیا سانپ کا زہر، کافور کی ٹھنڈک، اینٹوں کی سختی ایک ہی شے ہیں؟ کیا محبت ان سب کے راستے ابدیت کی راہوں پر چلنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ کیا ان راہوں سے گزر کر وہ جنت کا درخت بن سکتی ہے۔ جس کے سائے میں تمنائیں بے قرار نہیں کرتیں۔ شوبھا کو دنیا کی ہر مسرت میسر ہے، اس کے دامنوں سے ایسی خوشیاں لپٹی ہیں جن کے خواب لوگ دیکھتے رہتے ہیں اور اس کے باوجود اپنے خول میں کتنی اکیلی ہے۔

اور پھر کنول کماری ٹھاکر ہے۔ کیا کنول کسی اور مٹی سے بنائی گئی ہے۔ کیا عورت کی خامیاں کنول میں نہیں ہیں۔ کیا اس کے خمیر میں وہ سب خامیاں نہیں ہیں جو کیمیا گر نے عرشِ اعظم سے چرا لیں۔ تاروں کی چمک، چاند کا داغِ جگر، رات کی ظلمت، بجلی کی تڑپ، حور کی پاکیزگی، ربوبیت کی شانِ بے نیازی، ابنِ مریم کا نفس، فرشتوں کی عاجزی اور شبنم کی نیازمندی، کیا محبت کا مرکبِ اعظم اس کے وجود سے کبھی چھو نہیں پایا؟ اپنے تجربات کے باوجود میں کنول کو ایک معمہ سمجھتا تھا۔

کیا محبت کے بغیر عورت مکمل ہے؟ کیا اس کی شان بلند الگ اور تنہا رہنے میں ہے؟ کیا دھرتی کا دھرم یہی ہے کہ اس پر کوئی چلے نہیں۔ کیا کنول دھرتی ہے؟

ان سوالوں کے جواب میرے پاس ہیں کہاں؟ میرا دماغ عاجز ہے اور سفید کپڑے

پہنے سرخ دوپٹے اوڑھے بچیاں اور لڑکیاں سڑک کی لمبائی پر سے گزرتی جا رہی ہیں۔ ان کے پاس کتابیں ہیں۔ یہ دماغ جغرافیہ اور تاریخ کی کتابوں اور ناقابلِ حل مسائل کو سمجھے بغیر یاد رکھتی ہوں گے۔ اور اگر کسی نے سوچا بھی تو جواب کون دے گا۔ ان کی استانیاں تو خود عاجز ہیں؟ اپنے اپنے حالات کے چکروں میں گرفتار کئی بھٹکی ہوئی روحیں اسکول کی یکسر خشک فضا میں سکون تلاش کرتی ہیں۔ پھر جلتی ہوئی دوزخ کی مٹی سے بنائی گئی روحوں کو سکون کہیں نہیں ملتا۔ کیونکہ انارکلی، روپ متی، رادھا، کلوپیٹرا کسی کو بھی سکون مل نہ سکا۔

تو پھر کیا محبت کی ابدیت اس دکھ میں ہے؟

میں اپنے آپ سے سوال کر رہا ہوں اور میری بیٹی بینا پوچھ رہی ہے کیوں بابا آج پھر خوابوں میں کھو گئے؟ اپنی دوست سے ملنے نہیں جائیے گا؟

''میری دوست کون میری دوست؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''واہ اتنی جلد بھول بھی گئے۔ کیوں بابا یہ کس کا خط ہے۔ اتنا لمبا چوڑا؟''

''شوبھا کا۔'' میں جواب دیتا ہوں۔ وہ جانتی ہے شوبھا کون ہے اور اس لیے آگے کچھ بھی نہیں پوچھتی۔

میں نے پوچھا: ''کیوں ہنستی ہو چوہیا؟'' میں اسے پیار سے اکثر چوہیا کہتا ہوں۔

''ایک دوست کا خط پا کر دوسری کو بھول بیٹھے نا۔'' وہ طنز سے کہتی ہے۔

میں جلدی سے اٹھا اور بینا کی بات کا جواب دیئے بغیر اپنی چھتری اٹھا کر باہر نکل آیا۔ مگر میرا دماغ بینا کی کہی ہوئی بات کو سوچ رہا تھا۔ عورت بیٹی ہو یا بہن، بیوی ہو یا دوست مرد کی ذہنیت کو دو لفظوں میں کہہ جاتی ہے۔ ''ایک دوست کا خط پا کر دوسری کو بھول گئے نا؟''

نہیں۔ میں نے دل سے کہا۔ میں مر کر بھی کنول کو نہیں بھول سکتا۔ مگر میں شوبھا کو بھی یاد رکھتا ہوں۔ میں اس کے اس دکھ کو محسوس کرتا ہوں جو وہ برداشت کر رہی ہے۔ وہ آج کل آگ کے سامنے کھڑی ہے اور اس کے اندر جو بھی جھوٹ ہے جو غلط ہے جو فریب ہے جو کھوٹ ہے، سب پگھل رہا ہے۔ آگ اگنی ہے، پوتر ہے، اس پر ہاتھ رکھ کر کوئی جھوٹ نہیں کہہ سکتا۔ شوبھا آج کل جانکنی کے اس عذاب کو برداشت کر رہی ہے۔ جو اس نے لکھا تھا مادھو کو ایک رات برداشت کرنا پڑا۔ یہاں سکھ دکھوں کے مقابلے میں کم ہیں۔ بہت کم۔ یہ عذاب اسے پیس رہا ہے۔ آگ کے سمندروں پر آگے ہی آگے جس کشتی میں بیٹھ کر وہ سفر کر رہی ہے وہ آگ کی ہے۔

یا پھر کیا؟ ساری دنیا ہی آگ کا بہت بڑا کنڈ ہے اور اس لیے کہ دیاؤں کے حضور ہمارے دل کی قربانی قبول کر لی جائے۔ ہمیں کنڈ پر چلتے ہی قدم قدم پر ہماری آزمائش ہوتی ہے۔

سڑک پر سے موٹریں تیزی سے گزرتی جا رہی تھیں اور ان کی خاک اڑ کر میرے بالوں میں پڑ جاتی ہے۔ میرے چہرے پر دھول جم جاتی ہے۔ میں رومال سے چہرہ صاف کرتا ہوں۔ دُور آہستہ آہستہ رینگتا ہوا ایک چھکڑا آ رہا ہے۔ اس پر کوئی خاندان خانہ بدوشوں کی طرح کا بیٹھا ہے۔ ایک کے اوپر ایک چارپائیاں لدی ہیں۔ صندوق ہیں۔ چارپائی کے پائے سے لٹکی ہوئی ایک لالٹین جھول رہی ہے۔ ادھ ننگے بچے چوٹی پر بیٹھے گنے چوستے ہوئے ہنس رہے ہیں۔ ایک نوخیز لڑکی ہے بالکل الہڑ جیسے میری بینا جیسے بادام کی سفیدی گر۔ کتنی بڑی بڑی آنکھیں ہیں اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ سحر عورت کی آنکھوں سے شروع ہوتا ہے۔ یہ جادو ان چراغوں میں جاگتا ہے۔ کسان بیلوں کے ساتھ چل رہا ہے۔ بیل جھومتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور ہانکنے والا لڑکا جانے کیوں کھلکھلا کر ہنس رہا ہے۔ آگے آگے چلنے والا کسان گا رہا ہے۔ اس کی آواز میں لے ہے' سوز ہے' ساز ہے اور بھولی ہوئی محبتوں کی داستان ہے۔ پرانے وقتوں کے قصے سورج کے سونے ڈھل رہے ہیں۔ پاس کی کسی کوٹھی سے ریڈیو کی آواز آ رہی ہے۔ بتھادن کی ساتویں سفنی کوئی اناؤنس کر رہا ہے...... دور پار کا ایک نغمہ کسان کی آواز کے ساتھ ساتھ آسمانوں کے کناروں کو چھونے لگتا ہے۔ میرا سفر ختم ہونے میں نہیں آتا۔ آسمان اوندھے پیالے کی طرح ہمارے اوپر ڈھکا ہوا ہے اور اس کے ایک کونے میں شرابی بادل گلگوں شراب کی تلچھٹ کی طرح جمع ہو رہے ہیں۔ یہ کسان اور یہ خاندان رات کے ہوتے ہی یہیں کہیں اپنے چھکڑے کے نیچے آگ روشن کر کے کھانا پکا لیں گے۔ گرم گرم سوندھی کلی کی خوشبو پھیلے گی اور پھر ستاروں کی بساط تلے غم و فکر سے آزاد سب پاؤں پھیلا کر سو جائیں گے۔ زندگی کی تصویر کتنی سادہ ہے اور کتنی آسان ہے مگر بتھادن کا نغمہ میرا پیچھا کر رہا ہے اور کسانوں کے اپنے فکر ہوں گے جہاں عورت ہوتی ہے' حُسن ہوتا ہے چاہے زندگی کے اُلجھے ہوئے مسائل نہ بھی ہوں وہاں پر بھی غم ہوتا ہے۔ غم ہماری زندگی کا ایک جزو ہے۔ ہم لوگوں کو اگر غم نہ بھی ہو تو اسے خود پیدا کر لیتے ہیں۔ اگر خوشیاں آسمان سے برسیں تو ہم ان سے منہ موڑ لیتے ہیں۔

کیا ہم بنی اسرائیل کی بھٹکی ہوئی قوم ہیں یا کیا یہ انسانی فطرت ہے کہ غم کی تلخی کے بغیر ہر شے پھیکی اور بے کیف ہو جاتی ہے۔

پھاٹک میں گھسا ہوں تو سب سے پہلے ایک لمبی کار نظر آئی' سیاہ نیش تھی۔ سیاہ نیش شہر میں صرف ایک شخص کے پاس ہو سکتی تھی رادھے کرشن کے پاس تو رادھے کرشن' کنول کماری سے ملنے کیوں آیا؟ وہ شہر کا متمول اور بدنام ترین آدمی تھا۔ اس لیے نہیں کہ لوگ اس سے ملنے سے گریز کرتے اور اس کے سائے سے بھاگتے تھے۔ اس کے برعکس جیسا کہ قاعدہ ہے' لوگ رادھے کرشن کو جلسوں کی صدارتیں پیش کرتے' اس سے چندہ لیتے اس کی رائے سنتے اور اس کے حضور ادب سے بات کرتے تھے۔ شہر کی کوئی تقریب بغیر اس کے ناممکن رہ جاتی تھی۔ وہ شہر کا بے تاج بادشاہ تھا مگر اس کے باوجود وہ بدنام ترین آدمی تھا۔ میں گھبرا گیا۔ میرے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے۔ مرد کی فطرت ہے نا عورت کے خلاف فوراً کہانیاں ترتیب دیتا ہے۔ مرد کا دل بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقابلے میں کسی کو لانا پسند نہیں کرتا۔ اپنی راہوں پر اکیلا چلنا اسے بھلا لگتا ہے۔ آج تک اپنے آپ کو کنول کماری کے واحد اور عزیز ترین دوستوں میں سے سمجھتا رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے وہ اپنے محلے کے لوگوں اور ملنے والوں سے بہت اچھی طرح پیش آتی ہے مگر کوئی ایسا نقطہ تو ہے جس پر مرد اکیلا ہی رہنا پسند کرتا ہے؟

میں چند لمحوں ٹھٹکا اور پھر پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔

کنول دوسرے کونے کی کرسی پر بیٹھی اپنے سامنے رکھی تپائی پر ہاتھ پھیرتی ہوئی رادھے کرشن کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے حیرت کا اظہار نہیں کیا' البتہ رادھے کرشن نے اٹھ کر پہلی بار میرا خیر مقدم کیا۔ شہر کا معزز اور مغرور آدمی ہونے کی حیثیت سے اس کا کنول کماری کے ڈرائنگ روم میں اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملانا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اس کمرے میں بیٹھ کر اپنے آپ کو ایک الگ اور بدلا ہوا انسان محسوس کر رہا ہے اور اسے اس بات کا احساس شدت سے ہے کہ کنول کماری کے پاس اس کا آنا لوگوں کی نگاہوں میں کیا ہوگا۔ کبھی کبھار جھوٹی عزت اور دولت کا سایہ شرافت سے شکست کھا جاتا ہے۔ پھر ہم دونوں باتیں کرنے لگے۔

رادھے کرشن متمول ہونے کے باوجود حیرت انگیز طور پر وجیہہ اور خوبصورت ہے۔ ہمارے ہاں دولت جسم کی خوبصورتی پر سبقت لے جاتی ہے اور چند دنوں میں فربہی عذاب بن جاتی ہے مگر رادھے کرشن ہندوستانی خوبصورتی کا نمونہ ہے۔ اس کا رنگ گندم گوں ہے۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک' ہے بلند قامت ہے۔ سیاہ گھنگریالے بال سر پر ایک تاج لگتے ہیں۔ اپالو کی طرح اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے کبھی مغربی لباس نہیں پہنا۔ وہ اصل ہندوستانی کھتری ہے۔

پرتاب کا حسن اور اس کی سنجیدگی اس میں جمع ہے۔ اگر وہ راجپوتانے میں پیدا ہوتا تو سوربیر ہوتا' مگر اب وہ اپنے زمانے سے بہت بعد پیدا ہوا ہے۔ اس لیے اپنی سیاہ نیش میں اڑتا پھرتا ہے اور عورتوں کے دلوں پر بجلیاں گراتا ہے۔ وہ شہر کا ہیرو ہے' اس کی دولت اس کا اعتماد اور اس کا حسن سب مل کر اس کی شخصیت کو بہت جاذبِ نظر بنائے رکھتے ہیں۔ میں نے اکثر عورتوں کو کھڑکیوں میں لٹکے رادھے کرشن کو گزرتے دیکھنے کے لیے منتظر پایا ہے۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ ادھر سے گزر رہا تھا۔ اس نے سوچا کنول کماری سے بھی ملتا چلوں۔ دونوں کی ملاقات ایک دعوت میں ہوئی تھی۔ آکسفورڈ کے ڈاکٹر مناسٹر آئے ہوئے تھے اور آکسفورڈ کے پرانے لوگوں نے ان سے ملنے کے لیے ایک بڑی دعوت کا انتظام کیا تھا۔ سارے پرانے وقتوں کے ساتھی مل رہے تھے۔ پھر کسی نے کنول کا نام بھی لیا اور اسے بھی ایک پرانی آکسونین ہونے کی حیثیت سے مدعو کر لیا گیا۔ دعوت میں ذرا پہلے جاؤ تو برداشت کی ساری قوتوں اور باتیں کرنے کی ساری حسوں' مزاح کی ساری طاقتوں کی آزمائش ہو جاتی ہے۔ کنول اکیلی عورت تھی۔ شہر کے متمول' معزز' مغرور اور پرانے آدمی عورتوں کے خلاف نعرے لگانے پر ان کو دنیا سے ناپید کرنے کے حق میں تھے۔ آدمی دیوتاؤں کی طرح دور دور اپنے اونچے تختوں پر بیٹھے بلندی سے جھک کر ڈر سے گھبرا کر کنول کو دیکھ رہے تھے جو بڑی طمانیت سے ایک طرف بیٹھی تھی۔ اس کے قریب ادھر ادھر کوئی ایسا نہ تھا جو ہمت سے اس کی طرف نہ آتا اس سے بات کرتا۔ اگر عورت مرد سے گھبرانے لگے۔ اس سے چھپنے لگے تو مرد اپنے آپ کو بادشاہ بنا لیتا ہے۔ اس کی بے بسی اور کمزوری کو محسوس کر کے اور بھی مطمئن ہوتا ہے۔ اگر عورت کمزور نہ ہو تو دیوتا بھی گھبرا جاتے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر مطمئن کنول کو دیکھ کر یورپ کے ساحلوں پر گھومنے والے یہ تمام بڑے بڑے آدمی ذرا غیر مطمئن سے ہو گئے۔

اور تب رادھے کرشن نے آ کر اپنا تعارف خود ہی کرا دیا تھا۔ وہ آکسفورڈ میں گیارہ سال رہا تھا۔ اس نے ڈگری نہیں لی تھی اور دولت کی ڈگری کے ساتھ ساتھ کتابوں کی ڈگریوں کی کون پرواہ کرتا ہے۔ مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بھی آکسونین تھا اور اسی لیے آج کی دعوت میں شرکت کرنے آیا تھا۔

کنول ہنس پڑی تھی۔ اس کے سفید دانت چمک اٹھے تھے۔ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ مگر وہ اس سے مرعوب نہیں ہوئی تھی۔ رادھے کرشن اسے ایک ایسا بچہ لگا تھا جو ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار سے بگڑ گیا ہو۔ جو اپنے گرد کی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر ان سے پیار کر کے اپنی حسِ برتری کو تسکین دینا چاہتا ہو۔ ایسا بچہ جو اپنی ماں سے کہے "ماں اب تو میں اپنے بابا سے بھی بڑا ہو گیا ہوں اور جب اس کا استاد اس سے کہے آؤ تم خراب کام نہ کرو تو وہ اس کہے واہ میں تو بابا سے بھی بڑا ہوں۔ وہ ہنس کر سب کا مذاق اڑانا چاہے۔ رادھے کرشن کا دماغ دفعتہً پڑھنے سے انکار کر گیا تھا۔ صرف اس کا جسم اور دل بڑے ہو گئے تھے۔ یہ مجھ پر اس رات اس شام اس ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر پہلی بار انکشاف ہوا کہ کنول کے لیے تو اپنے سے مطمئن تمام آدمی تمام مرد بڑے بچوں کی طرح تھے جو اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے جو اسے کوئی نقصان نہیں دے سکتے جو اگر اس کے دامن سے لٹکنا چاہیں تو وہ انہیں جھٹک بھی سکتی ہے۔

رادھے کرشن نے یہ محسوس نہ کیا ہوگا مگر میں نے یہ سب باتیں محسوس کی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کنول یا تو ایک دیوی ہے اور یا پھر ایک بہت بڑی بہن اس کے علاوہ ایک محبت کرنے والی عورت کی حیثیت سے وہ کہیں نہیں ہے۔

وہ سیاہ نیش کا مالک معزز اور وجیہہ انسان باتیں کر رہا تھا اور کنول بڑے انہماک سے اس کی باتوں کو سنتی اور اس کا جواب دے رہی تھی۔

کرشن نے کہا: "تو پھر آپ وعدہ کیجیے آپ کبھی میرے غریب خانے پر بھی تشریف لائیں گی۔"

تو کنول نے حیرت سے کہا تھا: "کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ کیا آپ کے ہاں آئے بنا دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا؟"

رادھے کرشن نے اس سے پھر کچھ نہیں کہا۔ اس نے اس سوال کا جواب بھی نہیں دیا۔ اسے ایک دھکا لگا ہوگا۔ اس کے ہاں تو لوگ سجدہ ریزیاں کرنے چلے آتے ہیں اور یہ عورت اس سے پوچھ رہی تھی اس کی دعوت کو ٹھکرا رہی تھی۔

میرے ساتھ کنول بھی باہر برآمدے میں آ گئی اور سیاہ نیش میں بیٹھے ہوئے جب رادھے کرشن نے اس سے کہا۔

"آج تو میں نے آپ کو بہت تکلیف دی۔"

کنول نے سنجیدگی سے جواب دیا: "تو آئندہ کے لیے محتاط رہیے نا کبھی ایسی تکلیف نہ دیجیے گا۔"

وہ یہ سننا چاہتا تھا۔ ''نہیں کوئی تکلیف نہیں۔ مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔
آپ پھر بھی کبھی آیئے گا۔ آپ اس طرح سے میری عزت افزائی کیجئے گا۔'' وہ بہت مایوس ہوا
ہوگا۔ ہم سب کسی نہ کسی وقت کنول کی طرف سے یہ مایوسی اٹھا چکے تھے۔ ہمارے نصیب میں یہ
مایوسی تھی مگر اس کے باوجود ہم کنول کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ جب بھی کوئی انسان دوسرے سے ایسی
بات کہتا ہے اس کا مطلب یہ سننا ہوتا ہے کہ نہیں وہ تو خوشی لاتا ہے وہ ایک دوست ہے وغیرہ
وغیرہ۔ کنول نے ایک بے رحم کی طرح رادھے کرشن کا دل توڑ دیا تھا۔ اگر اس کا کوئی دل تھا تو؟
پھر وہ سیاہ نیش تیزی سے پھاٹک میں سے نکل گئی۔ میں نے اس کے بعد کنول کے
ہاں کبھی اس لمبی کار کو کھڑے نہیں دیکھا جس کا واحد مالک صرف رادھے کرشن ہوسکتا ہے۔ جو بے
حد متمول معزز اور بہت بدنام آدمی ہے جو اپنی وجاہت سے آشنا ہے اور خطرناک حد تک اس سے
فائدہ اٹھاتا ہے۔

جب ہم بیٹھنے کے کمرے میں واپس آئے ہیں تو کنول چپ تھی۔ اس کے چہرے پر
متضاد جذبے کشمکش کررہے تھے۔ شاید وہ بے حد خفا تھی۔

وہ خفا تھی اور میں آتش دان پر رکھی ایک تصویر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے
استفسار کا منتظر تھا۔ یہ تصویر نئی تھی۔ میں نے اس سے پہلے تصویر کو بیٹھنے کے کمرے میں نہیں دیکھا
تھا۔ ایک ندی تھی دونوں طرف اونچے اونچے پرانے گھر تھے اور ایک کشتی تھی۔ بظاہر اس میں کوئی
جدت نہیں تھی، نیا پن نہیں دیکھا تھا۔ ایک سادہ سی معمولی سی آسان سی تفسیرِ حیات تھی۔ پرانے
کمروں پر عشقِ پیچاں کی بیلیں جھاڑ جھنکار کی طرح چھتوں کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ بند کھڑکیوں میں
سے کوئی جھانک نہیں رہا تھا اور ڈوبتے سورج کی کرنوں سے ایک زردی پھیلی تھی جو دل کو ایک دم
مضمحل کردیتی ہے۔ کشتی کنارے کے ساتھ ساکن تھی اور حد نظر تک کناروں کے ساتھ بنے ہوئے
مکانوں میں زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ پانی بے تاب لہروں میں اچھل نہیں رہا تھا۔ خاموشی سے
چاپ چاپ آخری کرنوں کی زردی سے رنگین ہو رہا تھا۔ ان مکانوں کو جیسے جینے کی عادت ہوگئی
ہو۔ بس جیئے جارہے ہیں۔ زمانہ شکست کھا گیا ہے، پر انہوں نے شکست نہیں کھائی یا پھر ایک
شکست مجسم تھے۔ ان کے اندر خوشیاں دفن ہوگئیں مگر ان کو اتنی طاقت نہیں کہ ان مزاروں پر بیٹھ کر
رولیں یا پھر یہ مجسم آنسو تھے۔ کچھ تو تھا جو اس تصویر کو دیکھ کر میرا دل بھی اداس ہوگیا۔ اسی کمرے
میں چند لمحے پہلے رادھا کرشن تھا اور اب میں کنول کماری ٹھاکر کے پاس بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اگر اس
تصویر میں زردی نہ ہوتی اور مکانوں کی کھڑکیوں سے پانی پر جھانکنے کے لیے کوئی چہرہ دکھائی دیتا تو
اچھا تھا۔ میں نے اٹھ کر تصویر کو غور سے دیکھا۔ کنارے کے قریب بڑے بڑے سرکنڈے پانی پر
جھکے تھے اور ایک غمناک ہوا کے چلنے کا شدید احساس ان کے جھکاؤ کو دیکھ کر ہو رہا تھا۔ راتوں کو ان
سرکنڈوں میں جگنو چمکتے ہوں گے۔ جب ہوا چلتی ہوگی تو یہ پانی اونچی لہروں میں بدل جاتا ہوگا مگر
کون بتائے، کون کہے فن کار کے موقلم نے ایک لمحے کو ایک زمانے کو قید کردیا ہے۔ ان مکانوں پر
کئی زمانے گزر جائیں گے مگر یہ گھر ایسے ہی سُونے ویران اور زردی کی وجہ سے اداس رہیں
گے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ ان کے باسی کہاں گئے اور کب واپس آئیں گے۔ آہ فن بھی تو ایک
قید خانہ ہے!

نیرا چائے لے کر آ گئی مگر کنول اسی طرح چپ بیٹھی اپنے سامنے والی تپائی پر انگلیاں
پھیرتی رہی۔ نیرا کے آنے سے جیسے اسے ہوش آ گیا ہو۔ پیالی بنا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے
بھی وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کی پیشانی کی شکنوں سے معلوم ہوتا تھا وہ کسی گہرے راز کو سلجھانے کی
کوشش کررہی ہے۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اسے اتنا پریشان اور مضمحل نہیں دیکھا تھا۔ وہ سنجیدہ
تھی خاموشی اس کی طبیعت کا ایک جزو تھی۔ شور اس کے سامنے تھم جاتے تھے مگر اس کی یہ خاموشی
بامعنی تھی۔ مجھے بینا کی بات رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔

میں نے بات خود شروع کرنے کا ارادہ کیا مگر میں یونہی ڈر رہا تھا۔
پہلی پیالی ختم کر کے میں نے کہا: ''آپ نے آج مجھے یاد فرمایا تھا۔''
ایک مضمحل سی ہنسی ہنس کر بولی۔ ''جی ہاں، میں نے ہی یاد فرمایا تھا۔ اچھا کیا آپ
آ گئے۔'' وہ پھر چپ ہوگئی۔

میں حیران تھا۔ آخر کیا بات ہوسکتی ہے، جس نے اسے ایک دم اداس کردیا ہے۔
چائے ختم ہوگئی...... باہر ستارے نکل آئے ہوں گے۔ شام کا اکیلا ستارہ چمک رہا
ہوگا۔ رادھے کرشن کی سیاہ نیش سڑکوں کی گرد کو اپنے پیچھے بادلوں کی طرح اڑاتی بھاگی جارہی
ہوگی۔ وہ یہاں سے سیدھا اپنے کلب جائے گا۔ وہاں برج کھیلے گا۔ پھر یہ عورتوں کی باتیں کریں
گے۔ ان کے جسم کی دلآویز خطوط کی باتیں، ان کے حسن کی تاثیر کا ذکر مگر رادھے کرشن آج ان
سے مطمئن انداز سے نہیں مسکرائے گا۔ اسے معلوم ہے اس کے غرور نے آج ایک پرانی آکسونین

سے شکست کھائی ہے۔ اس نے ایک عورت سے شکست کھائی ہے۔

ایک دفعہ میرے کسی دوست نے اپنی شادی کے سلسلے میں لڑکیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا: ''یار لڑکیاں تو بہت مل جاتی ہیں۔''

تو قریب سے ایک اور نے ہنس کر کہا تھا: ''ٹھیک ہے لڑکیاں تو بہت ہیں مگر لڑکی کوئی نہیں ملتی۔'' اور آج مجھے اس کی بات پر ایمان تھا کہ رادھے کرشن کی روح میں بیٹھے مرد نے عورت سے شکست کھائی ہے اور اس شکست نے اس کے گرد اتنا اندھیرا کر دیا ہوگا کہ اس نے اس اندھیرے میں اپنے طریق سے روشنی کرنے کا خیال کبھی نہ کیا ہوگا۔

رادھے کرشن کا اپنے گرد روشنی کرنے کا طریقہ بھی عجب ہے۔ عورتیں اس کے لیے کھلونے ہیں۔ وہ اچھے کھلونوں کی طرف ایک مقناطیسی قوت سے کھنچتا ہے پھر ان سے چندے خوش ہوتا ہے اور پھر ان کو توڑ دیتا ہے۔ ٹوٹے ہوئے کھلونے دوسروں کی راہوں میں بکھر جاتے ہیں اور عورت ایک ٹھیکری کی طرح ایک دروازے سے دوسرے کی طرف ایک ٹھوکر سے دوسری ٹھوکر کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔

تھوڑے دنوں پہلے اس نے ایک غریب بیوہ کی خوبصورت لڑکی کو بیاہ لیا تھا۔ شادی ایک چھوٹے سے مندر میں ہوئی تھی۔ لڑکی کا حسن پھیکا پڑا تو کرشن نے اسے اپنے کسی دوست کے حوالے کر دیا۔ وہ لڑکی روتی چلاتی عدالت میں پہنچی مگر سننے والا کون تھا اور آخر غریب بیوہ کے بعد اس کا تھا ہی کون۔ چندا کی دکان کی آرائش کرنے کے لیے روپا کام آئی۔ آج کل اس کا نام خوب چمک گیا ہے۔ جس عورت کی ایک بے کس کی طرح کسی نے مدد نہ کی' اب اس کے دروازے پر سینکڑوں بھکاری بن جاتے ہیں۔ عورت مر گئی اور اس کی جگہ جو ہستی پیدا ہوئی وہ اس لاش سے مختلف ہے۔ وہ عورت ہرگز نہیں' اس کی ہنسی اس کی چنچلتا اور یہی رادھے کرشن آج کنول کے ہاں سے شکست کھا کر گیا۔

کنول نے اپنے خیالوں سے تھک کر اوپر دیکھا' اس کی آنکھوں میں بڑی اداسی تھی۔ کہنے لگی: ''راجندر کدھر ہے؟''

میں اس غیر متوقع سوال پر چونک پڑا۔ راجندر تقریباً دو ماہ سے غائب تھا۔ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں کیا بتاتا۔

وہ پھر بولی: ''آپ نہیں جانتے راجندر کہاں ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''مگر آپ اس کے متعلق کیوں پوچھتی ہیں؟''

''اس نے میری بے عزتی کی ہے۔ راجندر نے آپ کے دوست نے' آپ میری بات سمجھ گئے کیا؟''

میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے مگر یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ راجندر آپ کا اپمان کرے وہ یہ جرأت نہیں کر سکتا۔''

''ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ یہ جرأت کرنے کی ضرورت کیوں پڑی آخر میں نے تو اسے کبھی اپنی کسی حرکت سے یہ سمجھنے کی ڈھیل نہیں دی تھی کہ......'' اس نے بات کو ادھورا چھوڑ دیا اور چپ ہو گئی۔

راجندر کا کنول سے میں نے تعارف کرا دیا تھا مگر میں کسی اور بات کا ذمہ دار نہیں تھا اور میرا دماغ الجھ گیا۔ جانے راجندر نے کیا کر دیا ہے۔ میں اور کرشنا' نیرا اور اتنے لوگ اس کے اتنا نزدیک ہونے کے باوجود کبھی اس خول میں نہیں در آئے جس کو ایک قلعے کی طرح کنول نے اپنے گرد بنا رکھا ہے۔ ہم سب کو اس کے صحیح خیالات کا پتہ نہیں لگا۔ کبھی کوشش کے باوجود پتہ نہیں چل سکا۔

جانے راجندر نے کیا کیا ہے۔ اس گھڑی راجندر مجھے بری طرح یاد آ رہا تھا۔

کنول پھر بولی کیا ہی اچھا ہوتا جو آپ اسے یہاں نہ لاتے۔ اور میرے دل میں شکوک نے پھر سر اٹھایا۔ کیا کنول کماری ٹھاکر اصل میں راجندر سے مرعوب ہو گئی تھی۔ کیا اس کے دل کے ٹھہرے پانی میں بھی کوئی عکس چوری چوری' چپکے چپکے اور جھکے ہوئے درختوں میں سے آنے والی روشنی کی کرنوں کے مقابل کانپ گیا تھا۔ کنول تو صرف اپنے دل میں اپنے وجود کا عکس دیکھا کرتی تھی' اسے تو کسی سے کوئی علاقہ نہیں رہا' کبھی بھی نہیں۔

نیرا برتن اٹھانے آئی تو ہم دونوں خاموش تھے۔ کنول بولی: ''جاؤ نیرا میری فائل اٹھا لاؤ۔''

اور فائل میں سے ایک نیلے رنگ کا تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر اس نے میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: ''اسے پڑھ لیجیے۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے کاغذ کھولا۔ جانے یہ کیا تھا بغیر القاب کے بغیر تاریخ کے بغیر جگہ کے تعین کے' راجندر سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ میرا دل کانپ گیا۔ یہ کیا ہو سکتا ہے اور

کنول نے اتنے سالوں میں پہلی بار اپنی فائل سے نکال کر یہ نیلا تہہ بہ تہہ کاغذ میرے ہاتھوں میں کیوں تھمادیا ہے؟

قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے نیلے کاغذ کو تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ کرشنا اندر آ گئی تھی۔

بولی: ''آپ ہیں میں ابھی باہر سے لوٹی ہوں۔ کہیے کیسے رہے آپ۔ ان دنوں آتے ہی نہیں ہیں؟''

میں نے کہا: ''یونہی کام میں مصروف رہتا ہوں اور پھر اگر بلایا نہ جائے تو کیسے آجایا کروں۔''

کرشنا ہنس کر بیٹھتی ہوئی بولی: ''میں ہر روز آپ کو بلوالیا کروں۔ اگر مجھے اس بات کا یقین ہو کہ آپ بلانے پر آجایا کریں گے۔''

کنول اس سارے عرصے میں خاموش سی بیٹھی سامنے والی تصویر کو دیکھتی رہی تھی۔ کرشنا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کنولا رانی تم کو اس میں کون سی ایسی نئی چیز نظر آئی، جس کے لیے آنکھیں ادھر لگائے ہوئے ہو۔''

کنول کی آواز جیسے زمانوں کے فاصلے سے آئی، بڑی مضمحل ہو کر جواب دیا۔ ''زندگی میں نیا پن کہاں سے آئے گا۔ میں کسی نئے پن کو دیکھنے کی متمنی نہیں ہوں۔''

''کیوں؟'' کرشنا نے تیزی سے مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری آنکھیں نئے پن کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتیں ورنہ نیا پن تو ہر قدم پر زندگی میں ہے۔ ہر لمحہ نیا ہے کنولا رانی۔'' اب وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ ''اس سبزے کے روپ کو دیکھو جو تمہارے باہر پھیلا ہے۔ اس جھکے ہوئے آسمان کو دیکھو ہر شے نئی ہے۔ اگر دنیا میں اتنا نیا پن نہ ہوتا تو میں بھی جیل کی سختیاں برداشت کر کے جینے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہ رکھتی۔''

وہ میری طرف مڑ کر کہنے لگی۔ ''سنائیے شوبھا کا کوئی خط آیا؟''

میں نے کنول کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں آیا ہے آج ہی شام کو۔''

''کیا لکھا ہے اس نے؟'' کرشنا نے ہمہ تن شوق ہو کر پوچھا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''جس آگ کے سامنے کھڑی بیانات دے رہی ہے اس میں کسی خوشی کی گنجائش نہیں ہے۔''

کرشنا نے پھر پوچھا: ''اس نے نند کی کوئی بات لکھی ہے۔'' نند کا نام لیتے ہوئے اس کے چہرے پر اتنی نرمی اُمنڈ آئی تھی اور میں سوچ رہا تھا اس عورت نے زندگی سے مقابلہ فولاد بن کر کیا ہے مگر اس کے چہرے پر کوئی سختی نہیں اور نند کا نام لینے پر اس کی آنکھوں میں خواب گھس آتے ہیں۔ یہ کیسا میٹھا مدھر نام ہے۔ نند اس عورت کا بیٹا ہے۔ ان دکھوں اور مصیبتوں کا ایک نشان جو اس نے اس کی پیدائش سے لے کر آج تک برداشت کی ہیں۔ یہ اپنے نظریوں سے اپنے گرد پھیلی دنیا سے پیار کرتی ہے مگر اس کا پیار کتنا سطحی ہے۔ محبت تو پانی کی نرملتا اور کرنوں کی نرمی ہے۔ محبت میں سختی کہاں۔ اس میں دکھ کہاں اور پھر کنول تو اپنے تخت سے نیچے نہیں جھک سکتی۔ یہ اپنے قدموں میں پڑی گندگی کو چھو نہیں سکتی۔ کرشنا نند کا نام لیتے ہوئے ایک پھول کی طرح کانپ جاتی ہے۔ دونوں عورتیں ہیں دونوں کے چہرے پر حسن ہے مگر کرشنا کا روپ نند کے روپ میں مل گیا ہے اور کنول اکیلی ہے۔ اس نے محبت کی ہو گی پر اس کا پیار اپنے خیالوں سے ہے۔ عورت جب تک زمین بن کر دکھ نہیں سہتی، اس کی مکتی نہیں ہو سکتی۔ میں نے غور سے کرشنا کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگی: ''بھیا نہ جانے کون سا دن ہو گا جو میں اپنے نند کو دیکھ سکوں گی کیا ہوا اگر میں شوبھا سے جا کر خود مل لوں۔''

کنول بولی: ''کرشنا تم میں دھیرج کبھی نہ آیا۔ تم اتنی جذباتی ہو۔ شوبھا سے جا کر ملنے سے تو بنا بنایا کام بگڑ جائے گا اور تم کتنے دنوں سے شوبھا کے پاس جانے کا سوچ رہی ہو۔ بیٹے کی محبت نے تم کو اور کسی کام کے قابل نہیں رہنے دیا۔''

اور کرشنا جیسے آتش فشاں کی طرح پھٹنے کو تیار ہو کر کہنے لگی: ''ٹھیک کہتی ہو۔ میرا بیٹا ہے دیوانگی کی حد تک ایک ماں کی طرح اسے چاہتی اور پیار کرتی ہوں۔ میرا کام یہی ہے کہ میں اسے چاہوں۔ میری نجات اس سے ملنے اور اسے چاہنے میں ہے۔ تم اپنے نظریوں کی کھوکھلی عمارت پر کب تک کھڑی رکھو گی۔ تم اکیلی کب تک رہو گی۔ تمہارا حال بھی مس جوزف کا سا ہو جائے گا۔''

کنول ہنس کر بولی۔ ''بہت غصہ آ گیا ہے تمہیں میری بات سن کر کیا حال ہو گیا ہے جوزف کا میں بھی تو سنوں۔''

کرشنا بھی ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔ ''تمہاری یہ کھوکھلی باتیں مجھے بہت دُکھ دیتی ہیں۔ جہاں تک تمہارا اپنا سوال ہے میں کب منع کرتی ہوں اگر تم نے دنیا کو سنوارنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے تو

اچھا ہے' کام کرتی جاؤ۔ پر میری بات تو سنو جب تم میرے جذبوں کی توہین کرنے لگتی ہو تو میں ضرور خفا ہوتی ہوں۔ تم اتنی لمبی چوڑی دنیا کو کیا سنوار سکو گی۔''

کنول کہنے لگی: ''ان باتوں کو چھوڑ۔ اب مس جوزف کی بات تو سناؤ کیا آج ان کے ہاں سے آ رہی ہو۔''

''ہاں۔'' کرشنا نے زور سے کہا۔ ''انہی کے ہاں سے آ رہی ہوں۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ مس رام یہاں ہیں۔ میں ان سے ملنے مقامی ہائی اسکول کے بورڈ میں گئی دیکھا تو مس جوزف ہیں۔''

''یک نہ شد دو شد۔ تو آج تم نے دو دو تماشے دیکھے' تبھی اتنا بگڑ رہی ہو۔''

''نہیں کنولا رانی بگڑنے کی کیا بات ہے۔'' کرشنا ہنس کر کہنے لگی سوچتی ہوں اپنے نظریوں کے باوجود تمہارا بھی حال وہی ہوگا۔''

''کسی زمانے میں مس جوزف ہندوستان کی بڑی ورکر کام کرنے والی' بڑا عزم رکھنے والی عورت تھی اور اب ان کا یہ حال ہو گیا ہے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے تمہارا مستقبل کتنا بھیانک ہے۔''

''تم فکر نہ کرو میں اپنے لیے کافی ہوں بات تو سناؤ۔''

بولی: ''جب ہم مس رام سے ملنے کے لیے گئے تو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ پھر باتیں کرتے کرتے چپ ہو گئیں۔ اٹھ کر کمرے میں چکر لگانے لگیں۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا' انہیں شاید پچھلے زمانے یاد آ رہے ہوں گے۔

واقعی یہی بات ہے۔ کرشنا بولی۔ پھر مس رام مجھ سے پوچھنے لگیں کیوں کرشنا شادی کر لی ہے۔ میں نے کہا' جی ہاں کر ہی ڈالی ہے۔ مس رام کے چہرے پر ایک کرب اور دکھ سا آ گیا۔ بولیں اچھا کیا اور اس کے بعد پھر خاموش ہو گئیں۔ دیر تک ایک کاغذ پر یونہی لکیریں بناتی رہیں۔ پھر ہم نے دیکھا کہ ان کے ناک پر ایک مکھی بیٹھ گئی۔ فوراً اٹھیں اور چق سے باہر جا کر ناک کو جھاڑ دیا۔ میری تو ہنسی نہیں رک رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگیں جو کچھ کھانا چاہو اس سے کہہ دو' ہم حیران رہ گئے۔ اتنے میں مس جوزف حواس باختہ بھاگتی ہوئی کمرے میں آ گئیں۔ کہنے لگیں شاما کمرے میں سانپ ہے۔ مس رام نے دونوں پاؤں اوپر کر لیے۔ باہر سے مس جوزف نے ہم کو دیکھا مگر ہم اسی طرح واپس چلی گئیں۔ مس رام سخت گھبرا کر جوتا کھولنے لگیں۔ ارے بھئی دیکھنا کہیں سانپ نے میرے پاؤں میں کاٹ تو نہیں لیا۔ میرا مارے ہنسی کے برا حال ہو رہا تھا اور مس رام دونوں پاؤں اوپر کیے بیٹھی تھیں۔ ہم نے ان سے اجازت لی۔ اور مس جوزف سے ملنے چلے آئے۔ وہ بھی ملیں۔

کرشنا یہ قصہ کہہ رہی تھی اور میرا ہنسی کے مارے دم نکل رہا تھا۔ کنول کا منہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ کبھی قہقہہ لگا کر زور سے ہنسنے کی عادی نہیں ہے۔ میں نے کبھی اسے منہ کھول کر ہنستے نہیں دیکھا۔ وہ ہر موقعہ پر اپنے آپ کو لیے دیئے رہتی ہے۔

''مس جوزف نے جب سنا ہے کہ میں نے شادی کر لی ہے۔ میرا ایک بیٹا ہے تو یقین کرو مارے صدمے اور رنج کے ان کا منہ سرخ ہو گیا۔ کہنے لگیں تم کو سوائے شادی کے کیا کچھ نہ سوجھا۔ تم لوگ ہندوستان کے ہونا' ذہن اور زندگی کے بلند نظریئے کبھی تمہاری نگاہوں کے سامنے سے نہیں گزرے۔ اپنے اونچے کالر کی قمیص اور لمبی سکرٹ کے ساتھ سفید بالوں والی مس جوزف سے نظریوں کی باتیں سن کر' مجھے تم یاد آ گئیں۔

میں نے کہا' مس جوزف آپ کے نظریے کیا ہوئے ہم لوگ تو کمزور ذہن کے انسان تھے' ''نوجوان آپ کو خدا نے کام کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔''

مس جوزف کا خول پھٹ گیا۔ وہ اپنے حصار سے باہر آ گئیں اور میں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں تنہائی کا کرب تھا۔ صدیوں کا بڑھاپا تھا اور اکیلے پن کا خوف تھا۔ جیسے وہ کسی گھنے جنگل میں دشمنوں میں گھر گئی ہوں اور انہیں راہ دکھائی نہ دیتی ہو۔ بچنے کی کوئی امید نہ ہو۔ ان کے دامن میں ایک رات کا آسرا بھی نہ ہو۔ انہوں نے ایک سرد آہ کھینچ کر کرسی سے سر لگا لیا۔ بولیں کرشنا نظریوں کی اپنی جاذبیت ہے مگر یہ جاذبیت ایک زمانے تک رہتی ہے۔ جب رگوں میں گرم خون ہوتا ہے کام کرنے کے جذبے برسرِ اقتدار ہوتے ہیں زندگی کی ہر راہ اُلجھی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور اپنے بازوؤں میں اتنی طاقت جان پڑتی ہے کہ اس کو سنوارا جا سکے۔ تم لوگوں کی کمزوریاں تمہارے کام آ گئیں اور ہم نے جو قلعہ اپنے گرد بنایا وہ ریت کا تھا۔ اب قلعہ ڈھے گیا ہے اور بے آسرا ہم اکیلے ہیں۔

مجھے ان کی یہ بات سن کر بہت دکھ ہوا تھا' کنولا رانی کرشنا نے کنول کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔'' کنول نے بڑی متانت سے کہا۔ جیسے یہ معمولی بات ہو۔

کرشنا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مس جوزف آپ لوگوں کے ہاں تو

روح کا بڑھاپا اتنا دکھ نہیں دے سکتا جتنا ہمارے ہاں۔ آپ لوگ تو باہر مردوں سے مل سکتی ہیں۔ آزادی ہے اور زندگی میں وہ اکیلا پن نہیں ہوتا۔ جتنا ہمارے ہاں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مغرب میں تو لوگ ساری عمر جوان رہتے ہیں' آپ یہ کیسی متضاد باتیں کہہ رہی ہیں۔

''اور جانتی ہو کنول؟ کرشنا نے پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا' مس جوزف نے کیا کہا تھا؟''

''نہیں۔'' کنول نے بڑی تلخی سے کہا۔ ''مجھے کیا معلوم؟''

''مس جوزف نے کہا تھا کرشنا مردوں کی دوستی بھی جوانی کے دنوں تک ہوتی ہے۔ مرد ہوس پرست ہے' اسے کسی نہ کسی طرح کی تسکین چاہیے جب میں جوان تھی تو کتنے ہی لوگ شاموں کو باہر لے جانے مجھ سے ملنے کے لیے آیا کرتے تھے اور اب تو کوئی نہیں آتا۔ پرانے دوستوں کی شادیاں ہو گئیں۔ کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا اپنی بیوی کو لے کر مجھ سے ملنے چلا آتا ہے' یا اپنی بیٹی کو اس اسکول میں داخل کروانے آ جاتا ہے۔ میں ان دنوں ایک پاگل کی طرح سوچتی رہی تھی کہ یہ لوگ میری عزت کرتے ہیں اور مجھے ایک بلند کردار عورت سمجھ کر چاہتے ہیں' ان کو میری باتوں میں عقل سلیم کی جھلک دکھائی دیتی ہے مگر مرد عورت سے زیادہ ذہین اور باعمل ہوتا ہے۔ لوگوں نے میرا رویہ دیکھ کر ان دنوں مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ میں ہنس دیا کرتی تھی۔ میں سمجھتی تھی یہ سب بکواس ہے۔ عورت کے پاس جب تک کوئی مقصد ہے' وہ زندہ رہنے کے لیے اکیلی ہی کافی ہے۔ اسے کسی مرد کی ضرورت نہیں ہے۔

''انہوں نے ٹھیک سوچا تھا۔'' کنول نے آہستہ سے کہا۔

''بالکل تمہاری طرح کنولا رانی مگر جانتی ہو مس جوزف اب کیا کہتی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا' میں جنسیات کے چکر میں نہیں پڑتی۔ مگر خدا کے ایک عظیم قانون اور ربطِ حیات کو جھٹلانے کی سزا مجھے اب ملی ہے۔ میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہوں مگر مجھ میں کوئی چیز ہے جو بکھر بکھر جاتی ہے۔ جو شیرازے کے پریشان ہونے کی وجہ سے گھڑی گھڑی کھل جاتی ہے' اوراق اڑتے ہیں مجھے اپنے جسم کے ایک بند میں ایک شکست کا احساس ہوتا ہے۔ میں دعا کرنے اور خدا کا سہارا لینے کی کوشش کرتی ہوں مگر خدا کا سہارا بھی اب تو کھوکھلا سا لگتا ہے۔ میں اب بھی کلاس میں جاتی ہوں اور لڑکیوں کو بلندیٔ عقل سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں مگر میری زبان میں وہ جادو نہیں رہا اور پھر میری باتوں میں اثر آئے تو کہاں سے۔ جانتی ہو پھر نتیجہ کیا ہوتا ہے لڑکیاں پیٹھ

پیچھے مجھ پر ہنستی ہیں۔ میرا مذاق اڑاتی ہیں اور میں سمجھتی ہوں وہ ٹھیک ہی کرتی ہیں۔ میں نے خدا کے ایک بڑے قانون کا مذاق اڑایا۔ خدا نے اور اس کے قانون نے میری ہنسی اڑائی ہے۔''

میں اب خاموشی سے کنول کو دیکھ رہا تھا۔ جو باتوں سے زیادہ اپنے میں محو تھی۔ کرشنا تھوڑی دیر خاموش رہی اور پھر بولی۔

''مس جوزف اتنی اُداس تھیں جیسے انہیں آج کسی کے مرنے کی اطلاع آئی ہو۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگیں تمہارا پتی کیا کرتا ہے۔ میں ساری داستان دہرانا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے کہا' اس کا انتقال ہو گیا ہے۔''

ان کے چہرے پر تھوڑی سی خوشی کی لہر آ گئی۔ مگر بولیں ''مجھے بہت افسوس ہے تمہارے بیوہ ہو جانے کا' پر تمہارا بچہ تو ہے تم اس کے سہارے زندہ رہ سکتی ہو اور وہ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ مجھے نند لال کا بڑا سہارا ہے۔ کاش شوبھا اپنے خط میں اس کے متعلق کچھ لکھ دیتی۔''

مس جوزف نے کہا تھا: ''کرشنا پہلے ہم تمہارے ہاں کے نظامِ حیات کو' جاہلوں کا بیوقوفوں کا طریق زندگی سمجھ کر اس سے پرہیز کیا کرتے تھے۔ میں نے جوانی کے دنوں میں ہمیشہ تمہارے ہاں کے رواجوں کی ہنسی اڑائی ہے مگر تم لوگوں کی زندگی میں جو عظمت ہے جو خوبصورتی ہے اور جو رفعت ہے' اس کو اب میرا دل محسوس کرتا ہے۔

میں نے کہا: ''بہت خوشی ہوئی ہے۔ یہ سب باتیں سن کر مس جوزف' پر ہمارے ہاں زندگی بہت پرانی ہے اور انہیں راستوں پر ابھی تک چل رہی ہے۔''

انہوں نے کہا: ''کرشنا پرانی راہیں یقینی ہیں اور نئی راہوں کے متعلق تو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ بہت الجھی ہوئی اور ناقابل اعتماد ہیں۔ تمہارے اور ہمارے نظریوں کا فرق نئے پرانے کا فرق۔ انفرادیت' شخصیت اور اجتماعی زندگی کا فرق ہے۔ شخصی اور جمہوری نظام کا فرق ہے۔ ہمارے ہاں اگر کوئی عورت بیوہ ہو جاتی ہے تو اسے اپنے گھر کے ورثے کے سہارے اکیلے گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ تمہارے ہاں بیوہ عورت کی زندگی ہے گھر اور سسرال کی خوشیوں کے درمیان بڑی آن بان سے گزر جاتی ہے۔ تمہاری بیوہ اپنے بچوں' اپنے بھائی کے بچوں اور اپنے دیور کے بچوں کے لیے بڑی بوا بن جاتی ہے اور یوں زندگی میں اس کے لیے اپنے پن کا خلا مٹ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں خدا کا سہارا بھی ایک محبوب سہارا نہیں ہوتا اور تمہارے ہاں بھگوان ہی تمہارا پتی اور

تمہارا محبوب بن جاتا ہے۔ تمہارے لیے کرشن ایک ایسا معشوق ہے جو کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ جو ہر ایک عورت کے لیے قریب ہوسکتا ہے اور ہمارا خدا تو کانٹوں کا تاج پہنے گھومتا ہے وہ بھی مجسمہ دکھ ہے اور ہم بھی اس کے نقشِ قدم پر چل کر صرف دکھ بن سکتے ہیں اور کچھ نہیں۔"

اور میں نے آہستہ سے کہا تھا: "مس جوزف کرشن بھگوان تو ہر ایک کو سہارا دے سکتے ہیں۔ آپ بھی ان کی شرن لے لیجیے۔"

مس جوزف نے سر ہلا کر کہا۔ "نہیں اب میں ایک چور کی طرح بغلی دروازے سے سکون ڈھونڈنے تمہارے بھگوان کے مندر میں نہیں آؤں گی۔ میں نے جوانی میں جو غلطی کی تھی، بڑھاپے میں اس کا عذاب بھگتنے سے کم از کم یہ سکون تو ملے گا کہ میں نے ہمت سے حالات کا مقابلہ کیا مگر نہیں کرشنا یہ تو حالات کا مقابلہ نہیں یہ تو شکست ہے۔ صریحاً ریخت اور شکست مگر اب تو وقت بیت گیا ہے، وقت گزر گیا ہے۔ میں اب موت کا انتظار کروں گی۔"

اور میں نے کہا: "مس جوزف موت بھی اتنی آسان نہیں ہے، وہ کبھی کبھار تو دکھیا لوگوں کو بھول جایا کرتی ہے۔"

ہاں مس جوزف نے چپکے سے کہا تھا: "موت بھی کبھی کبھار بھول جاتی ہے، پر مرنے کے بعد ہمارے لیے کیا ہوگا۔ یہ سوال انہوں نے مجھ سے زیادہ اپنے سے کیا تھا!"

"اور میں نے بھی اس کا جواب نہیں دیا، کنولا رانی! مجھے بھی کیا معلوم ہے موت کے بعد ہمارے لیے کیا ہوگا اور اس لیے میں تم سے کہتی ہوں مس جوزف نے جو پریشان خواب دیکھا ہے، تم بھی اس کی لپیٹ میں نہ آ جاؤ۔"

"کیا کروں پھر؟" کنول نے تلخی سے پوچھا۔ "کون سی راہ ہے میرے لیے جو راہ تم نے اختیار کی وہ میرے لیے ممکن ہے ہی نہیں۔ وہ میرے لیے ناقابلِ عمل ہے اور کچھ کہو اور کوئی بات کرو۔ کیا مس جوزف کے علاوہ تمہیں کوئی نہ ملا۔"

"پھر میں واپس آ گئی۔" کرشنا نے کہا: "مگر پھر کسی دن ان سے ملنے جاؤں گی۔"

"تو گویا تم سوچتی ہو انہیں تمہارا سہارا مل گیا ہے۔ کنول نے پوچھا، اچھا خیال ہے تمہارا!"

کنولا رانی کیسی باتیں کرتی ہو۔ میرا سہارا وہ کیسے لینے لگیں، اپنی باتیں وہ جیسے مجھ سے کرسکیں، ویسے شاید کسی اور سے نہ کرسکیں۔ دل کی بات کہہ لینے سے بوجھ ہلکا ہوجایا کرتا ہے۔"

"یہ تمہاری خام خیالی ہے مس جوزف ہر شخص سے ہر ملنے والے سے ایسی باتیں کرتی ہیں۔ چند دن پہلے ہی مجھے کوئی بتا رہا تھا کہ مس جوزف نے ہم سے یہ باتیں کیں ایک ہی سی باتیں ہیں وہ کرسی پر بیٹھی اسکول کے بعد اپنی پرانی زندگی کے قصے لوگوں کو سناتی اور اس طرح اپنی احساسِ کمتری کو تسکین دیتی رہتی ہیں۔"

"اچھا!" کرشنا نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔" کنول نے کہا۔ "انہیں کوئی کام جو نہیں اسکول کے نظام میں ان کی دلچسپی اب ختم ہو چکی ہے۔ لڑکیوں میں وہ روح پھونک نہیں سکتیں، بس اپنے پرانے خوابوں میں کوئی ایسی لایعنی باتیں سوچا کرتی ہیں۔"

"لایعنی کیوں کہتی ہو؟" کرشنا نے آہستہ سے کہا۔ "تم بھی ایسی ہی باتیں سوچا کرو گی جب تمہاری دلچسپی تمہارے کام میں ختم ہو جائے گی۔"

اور یہی اکیلا پن تمہاری زندگی پر چھائے گا تو لمبی سہ پہروں کو بیٹھی خیالوں کے تانے بانے میں مشرق اور مغرب کو پرویا کرو گی۔"

کنول خاموشی سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔

کرشنا نے میری طرف دیکھ کر کہا: "کنول کے نظریوں سے میں متفق ہوں اس کے کردار کی بلندی کو سمجھتی ہوں۔ مجھے اپنی زندگی کے برباد ہو جانے کا بھی احساس ہے۔ مجھے کنول کے کام اور قوم کے لیے اس کے درد کا بھی علم ہے مگر بھیا......"

میری جیب میں راجندر کا خط موجود تھا۔ کنول نے مجھے یہ خط کیوں دیا تھا۔ کرشنا کی موجودگی میں میں یہ خط پڑھ بھی نہ سکتا تھا اور یہاں کرشنا بھی بیٹھی تھی۔ مجھے حیرت انگیز طور پر مس رام اور مس جوزف اپنے سامنے زندہ دکھائی دے رہی تھیں۔

نیرا نے آ کر بتیاں جلا دیں۔ پردوں پر بنی ہوئی سانپوں کی تصویروں میں جان سی پڑ گئی۔ بڑے بڑے سانپ، جب ہوا چلتی تو ہلتے ہوئے معلوم دیتے تھے۔ روشنی میں ان کی آنکھیں چمکتی ہوئی معلوم دیتیں۔ جیسے ابھی منہ کھول کر وہ کسی نہ کسی کو نگل لیں گے اور مجھے ناگ میلہ یاد آ گیا۔

جب ناگ میلہ ہوتا ہے تو پرماتما جانے ناگ سیاہ پھنوں والے کہاں سے آ جاتے ہیں۔ لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں۔ ان کے سامنے ماتھا ٹیکتے ہیں۔ انہیں دودھ پلاتے ہیں۔ کبھی

میلے کے دنوں کسی سانپ نے کسی آدمی کو نہیں کاٹا۔ بچے ان کو گلے میں لٹکا لیتے ہیں مگر وہ کسی کو بھی کچھ نہیں کہہ پاتے اور پھر میلہ ختم ہو جاتا ہے۔ سانپ خود بخود کہیں چلے جاتے ہیں۔ ایسے ہی ناگ تو ناگپور میں ہوتے ہیں۔ سیر کو جاتے ہوئے راہ میں لیٹے ہوئے گز گز بھر کے لیے کسی کو نہیں کاٹتے اور ان کے متعلق تو روایت ہے کہ بن باس کو جاتے ہوئے سیتا جی کے بال راہ میں گر گئے۔ چودہ برس کی لمبی جلاوطنی کے عرصے میں ان خوبصورت بالوں کا کیا حال ہو گیا ہوگا۔ رام چندر کی وجاہت میں سورج کا سونا کیسا گھل گیا ہوگا۔ لچھمن جی اپنی بھابی کے عقب میں چلتے ہوئے کبھی کبھار میرے خیالوں پر ایک کارواں ابھرتا ہے۔ تین آدمیوں تین انسانوں کا کارواں جس میں ایک عورت ہے سیتا' دھرتی جو دکھ سہنے کے لیے اپنے پتی کے پیچھے بنوں میں ماری ماری پھرنے کے لیے سارے دکھ اور راج محل کے عیش تیاگ کر اپنے دیوتا کے پیچھے آ گئی ہے۔ زمین کے سینے پر جنگلوں کے کنارے پر یہی کارواں آگے ہی آگے چلتا ہے۔ ہماری زندگی رامائن ہے جس میں بن باس ہیں' دکھ ہیں' لڑائیاں ہیں' سمندر ہیں اور راون ہیں' ہماری مذہبی کتابیں تو تمثیل ہیں جو حیات کی تفسیریں ہیں۔ ان کتابوں میں خشک وعظ ہی نہیں بتائے جاتے۔ کہانیوں کے ذریعے ہماری حس' خود پسندی اور خوبصورتی کی تسکین بھی ہوتی ہے۔ ہماری کتابوں میں مس رام اور مس جوزف کے لیے کہیں جگہ نہیں ہے۔ ہمارے ہاں کنول کماری ٹھاکر کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔ نہ جانے کون سے نرالے دیس کی باسی ہے۔ یہ کنول کماری ٹھاکر جس کو اپنے آپ پر اپنی طاقتوں پر اور اپنے نظریوں پر اتنا یقین ہے۔ اور یہ نظریے یہ راستے یا الجھی ہوئی راہیں!

کرشنا اسی طرح اپنے خیالوں میں لپٹی بیٹھی تھی اور پردے شام کی نرم رو ہوا کے ساتھ ہل رہے تھے۔ کنول کا کہیں پتہ تک نہ تھا۔

رادھے کرشن اب کہاں ہوگا۔ میرے دل نے مجھ سے پوچھا۔ رادھے کرشن اتنا بدنام کیوں ہے؟ آخر عورت سب کی کمزوری ہے۔ پھر وہ اکیلا ہی کیوں اتنا بدنام ہے۔ میں نے اپنے سے پوچھا کیا تم کسی زمانے میں کنول کی شمع حسن کے پروانے نہ تھے۔ کیا اب تم کنول کے دیوانے نہیں ہو۔ تم جھوٹ کہتے ہو کہ تم نے اس کے نظریوں کی وجہ سے اس کی رفاقت کی ہے۔ تم غلط سمجھتے ہو کہ تم اس سے دوستی اپنی دریا دلی کی وجہ سے کرتے ہو۔ کیا دل کے اندھیرے میں تم رادھے کرشن نہیں ہو اور میں اپنے ان پریشان خیالوں سے گھبرا گیا۔ میں نے اپنا سر زور سے جھٹک دیا۔

کرشنا نے پوچھا: ''کیوں بھیا' سر کیوں جھٹک رہے ہو؟'' وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے کہا: ''یونہی سر دکھنے لگا ہے۔''

کہنے لگی: ''کیا میری باتیں سن سن کر آپ گھبرا گئے ہیں؟''

میں نے کہا: ''نہیں اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ آپ کی باتیں بہت لطف انگیز تھیں۔ پُر از معلومات تھیں۔''

''آپ سائنس کی تلمیحات میری باتوں کے لیے کیوں استعمال کر رہے ہیں بھیا۔ ویسے میں بھی سوچ رہی ہوں مس جوزف کی اداسی اور پریشانی کے لیے بظاہر تو یہ کوئی خاص وجہ نہ ہوئی۔ کیا اکیلے پن کا دکھ اتنا ہی گہرا ہے کہ دل اور دماغ کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دے۔ آج پہلی بار میں نے دوسرے کمرے میں ستار کے تاروں کی جنبش سنی۔ کرشنا کہنے لگی۔ کنولا رانی' آج اپنے بھگوان کے چرن چھونے جا رہی ہے۔ اصل میں میری باتوں نے اسے ڈرا دیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو کتنا ہی مضبوط بنانے کی کوشش کرے عورت ہے نا اور عورت کے لیے یہ دکھ کافی ہے کہ وہ زندگی کے آخر میں ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنے سے باتیں کرے۔''

میں پوچھنا چاہتا تھا۔ ''کنول شادی کیوں نہیں کر لیتی' مگر میں نے یہ سوال اپنے لیے مناسب نہ سمجھا۔''

ستار کے تار جھنجھناتے رہے کوئی لے اس میں نہ ملی' خاموشی سے صرف تار ہی لرزتے رہے۔ جیسے کنول کماری ٹھاکر کی زندگی میں صرف یہی ساز باقی رہ گیا ہو۔

باہر ہوائیں کدم کی ڈالیوں اور پھولوں کے پودوں کو ہلا رہی ہوں گی۔ ستارے آسمان پر اکیلے شام کے ستار کے ساتھ لرزنے لگے ہوں گے۔ اور میری نظریں پھر اس تصویر پر جا پڑیں۔ ماحول کی زردی بجلی کی روشنی میں اور بھی نمایاں تھی۔ ابد تک بغیر کسی تمنا کے جیئے جانے والے گھروں پر اداسی تھی۔ میں نے سوچا شاید اُلّو ان گھروں میں رہتے ہوں گے اور پھر نور جہاں کا مزار میری نظروں میں پھر گیا۔ تاج محل میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ میں نے کرشنا سے کہا' کبھی آپ نے چاندنی رات میں تاج محل دیکھا ہے؟

کرشنا نے ہنس کر میری طرف دیکھا اور بولی: ''میں خوبصورت تو نہیں ہوں' پر کیا میں تاج محل نہیں ہوں' محبت کا مزار آرزوؤں کا مدفن' میں خاموش ہو گیا۔ دوسرے کمرے میں ستار کے تار لرزتے رہے۔

کرشنا بولی ''اندھیری راتوں میں تاج میں دفن روحیں جاگتی ہوں گی اور گنبد کے نیچے کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے پوچھتی ہوں گی' کیا ہم زندہ ہیں؟ کیا ہم نے ایک دوسرے کو چاہا تھا' کیا جمنا کے کنارے اس یخ اور سفید عمارت میں ہماری محبت قید ہے۔ شاہ جہاں ایک عام آدمی کی طرح ایک مزدور کی طرح وہاں کھڑا ممتاز محل کے بازوؤں کی طرف حسرت سے دیکھتا ہوگا۔ وہ مرمریں بازو' اور پھر کہتا ہوگا۔ نہیں ہم زندہ نہیں ہیں۔ یہ تاج محل ہے اور یہ سنگ مرمر زندہ ہے۔ ہم تو محبت کے اندر زندہ ہی دفن تھے۔ اندھیرا خالی ہیروں کی جگہوں میں بھر جاتا ہوگا اور ممتاز محل شاہ جہاں کے ساتھ جمنا کے پانیوں میں اپنے کھوئے ہوئے حسن کو ڈھونڈنے کے لیے جھکتی ہوگی۔''

کرشنا کے سفید بالوں کی ایک لٹ اس کے چہرے پر آ پڑی اور وہ کرسی کی پشت سے سر لگا کر بیٹھ گئی۔ میں ایک ایسے بے وقوف کی طرح محسوس کر رہا ہوں جو لایعنی ہی کسی گھر میں گھس آیا ہو۔ سب طرف خاموشی تھی اور سانپوں کی زبانیں لپک رہی تھیں۔ اب ستار بھی خاموش تھا۔

میں جانے کے لیے اٹھا۔ کرشنا نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے کہا: ''بھیا اگر شوبھا کا کوئی خط آئے اور اس میں نند کا ذکر ہو تو فوراً اطلاع دیجیے گا۔ میرا دل جانے کیوں آج بجھتا جا رہا ہے۔''

پھر میں پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

برآمدے میں باہر سڑک کی روشنیاں دھندلی اور مدھم لگ رہی تھیں۔ آسمان بہت روشن تھا۔ ستارے خوب چمک رہے تھے اور میرے دل میں تاج کے خواب تھے۔ تاج محل کے محبت کے اس مدفن کے' مجھے شوبھا اور من موہن یاد آ رہے تھے۔ چاندنی اور رگھو یاد آ رہے تھے۔ ستار کے گیت اور وہ بجھی بجھی تان' نہ جانے کیوں میں یادوں کا ایک مزار لگ رہا تھا۔

باہر ستاروں کی چمک کے مقابلے میں آسمان سیاہ تھا۔ سڑک کے دونوں طرف کوٹھیوں میں ریڈیو گونج رہے تھے۔ آج سے چند سال پہلے ملک میں اس قدر ریڈیو نہ تھے۔ بہت لوگ موسیقی کی طرف متوجہ تھے۔ اب گانے کے لیے کون ریاض کرتا۔ اچھا فن تو رخصت ہو رہا ہے۔ پہلے لوگ فنکاروں کی قدر کرتے تھے' بڑے بڑے استادوں کو دور دور سے مدعو کیا جاتا تھا اور پھر کبھی کبھار سرود کی جو محفلیں برپا ہوتیں ان کو ایک نادر تحفہ سمجھا جاتا تھا۔ اب ریڈیو کی سوئی گھماؤ اور بہتر سے بہتر فن کار کے ریکارڈ سن لو۔ آج کل کالوں کے ذریعے بھی [illegible]

محنت کرنے کی ضرورت نہیں۔ زندگی ایک دم کیسی آسان ہو گئی ہے۔ ہم مغرب کے احسان سے کس طرح باہر آ سکتے ہیں۔ مغرب نے ہم کو اپنی چیزوں سے نفرت کرنا سکھایا۔ اپنی چیز تھی ہی کون سی۔ پرانی روایتیں' پرانے رواج' پرانی قدریں اور گھسی پٹی فرسودہ راہوں پر کون سفر کرتا رہے۔ نئے افق سے واقف ہو کر پرانے اندھیاروں کی طرف کون جاتا ہے' پھر بھی ہمارے ملک میں کئی بے وقوف ابھی باقی ہیں۔ ریڈیو اب زندگی کا سب سے بڑا مشغلہ بن گیا ہے مگر پھر بھی فن کے نام لیوا ابھی زندہ ہیں۔ سازوں میں کہیں کہیں سسکتی ہوئی جان باقی ہے۔ رواجوں میں کہیں کہیں زندگی ہے اور پھر اگر ہم بڑے شہروں سے دیہاتوں کی طرف سفر کر جائیں تو ہم اپنے آپ سے کچھ اور قریب ہو جاتے ہیں۔ اب گاؤں کی گلیوں میں اکتارہ لیے فقیر اور جوگی گاتے ہوئے مل جاتے ہیں۔ آسمان پر ہوائی جہاز پرواز کر رہا ہے اور میلوں تک سوئی ہوئی دھرتی پر صرف رہٹ کی روں روں سنائی دیتی ہے۔ ہر طرف سبزہ ہے اور مدہوش زمین اپنے حسن کے بوجھ سے خود ہی دوہری ہو جاتی ہے۔ گاؤں کی گوریاں اب بھی پیپل کے کلسے لیے پنگھٹ پر اکٹھی ہوتی ہیں۔ اپنی نارنجی اور عنابی ساڑھیوں کو متناسب جسموں کے گرد لپیٹتی اب بھی کھیتوں کی طرف جانے والی پگڈنڈیوں پر نظر آ جاتی ہیں۔ اپنے خوابوں میں مگن' واٹر ورکس کے ہمسائے میں رہنے والے اب بھی اپنے ماضی کے قریب ہونے لگتے ہیں۔ مجھے شہروں میں گہما گہمی سے نفرت ہے۔ مجھے زندگی کے اس سستے پن سے نفرت ہے۔ مجھے ان آسانیوں سے نفرت ہے۔ کاش کوئی ہمیں ہمارا پرانا دیس واپس دے دے۔ ہمیں قافلوں اور کاروانوں کی رینگتی ہوئی پیاری سی زندگی واپس کر دے۔ ہمارے سازوں کی زبانیں ہمیں واپس کر دے۔ ہمیں ہمارا اصل پھر سے مل جائے اے کاش!

مگر کون سنتا ہے اور سڑکوں پر رینگتے ہوئے چھکڑوں کے دوش بدوش تیز اڑتی ہوئی موٹریں بھی سڑک پر سے گزر جاتی ہیں اور پھر ایک موٹر کی چندھیا دینے والی روشنی میں جب میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں تو تھوڑی دور جا کر وہ موٹر رک جاتا ہے اور کوئی اتر کر میری طرف آتے ہوئے کہتا ہے۔ ''مجھے پہچان رہے ہیں آپ؟''

میں نے آنکھیں ذرا اور کھول کر دیکھا: ''من موہن ہیں' سنائیے کیا حال ہے؟''

اور من موہن اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں اسی طرح رہنے دیتا ہے وہ اپنی موٹر کی چمکیلی اور چکیلی سطح پر ہاتھ رکھے رکھے کہتا ہے: ''میں آج اکیلا ہوں اور تاج محل بھی دیکھنے نہیں آیا۔''

اب کیا رکھا ہے؟''

کہنے لگا: ''اتفاق یا قسمت کی بات ہے۔ آپ اسی سڑک پر مل جاتے ہیں مہینوں بعد میں نے آپ کو اسی سڑک پر دوبارہ دیکھا ہے۔''

میں نے جواب دیا: ''اسی کو کہتے ہیں حسن اتفاق یا پھر یوں ہے کہ میں ہمیشہ اسی سڑک پر چلتا رہتا ہوں۔ تمام دنیا آخر اسی سڑک سے سفر کرتی ہے۔''

اور من موہن نے کہا: ''ٹھیک ہے ساری دنیا ایک سڑک سے سفر کرتی ہے پھر بھی آگے جانے والے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کرتے۔ ذروں کی طرح گھومتے ہوئے سفر کرتے ہوئے دو ذرے اچانک مل جاتے ہیں اور پھر الگ الگ سمتوں میں اڑنے لگتے ہیں۔''

اسے مہینوں کے بعد دیکھ کر بھی مجھے سوجھ نہیں رہا تھا کہ ہم کیا بات کریں۔ وہ اتنی اچانک مجھ سے ملا اور ویسے ہی مجھ سے جدا ہو گیا تھا اور آج اسی سڑک پر میں نے اسے سبز ڈاج میں پھر دیکھا تھا۔ وہ شرابی آنکھیں ڈھلکے ہوئے پپوٹے اور سرخ ہونٹ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے مگر مجھے یقین تھا اس کی بھاری آواز شراب کی زیادتی کی وجہ تھی اور پھر آج ہمارے درمیان شوبھا نہ تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ مجھ سے شوبھا کی کوئی بات نہیں کرے گا، کم از کم اس شکست کے بعد وہ اس کا نام لینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

ہوا ہمارے گرد تیزی سے چلنے لگی تھی۔ سڑک پر بگولے ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے۔ ہوا میں سڑے ہوئے پتوں، درختوں، سبزیوں، جلی ہوئی لکڑیوں، نالیوں اور رات کی رانی کی خوشبو تھی۔ پھر ایک تیز سا بگولا گلاب کی خوشبو لایا۔ شاید قریب کے کسی لان پر پھول کھل رہے ہوں گے۔ چپکے چپکے سازش کرنے والوں کی طرح سر ہلا رہے ہوں گے اور خوشبو ان میں اندھیرے کے ساتھ مل کر بہہ رہی ہوگی۔ یہ بے چین اور برباد بگولے۔

من موہن میرے قریب کھڑا تھا۔ اس کے کپڑوں میں کسی بدیسی سینٹ کی مہک تھی جو میرے گرد اڑتی خاک میں آنکھوں میں گھستے ذروں اور میرے قریب ناچتے بگولوں میں بھی کسی اور ہی دیس کی لگتی تھی۔ اپنی چیز اپنی ہی ہے۔

پھر ریڈیو کی آواز تیز اور صاف سنائی دی۔ اختری بائی پاٹ دار آواز میں گا رہی تھی۔

ان آنکھوں کا عالم گلابی گلابی، مرے دل کا عالم شرابی شرابی۔

شرابی اور گلابی کی تکرار نے شعر کو بہت بلند کر دیا تھا۔

مغرب میں شراب پانی کی طرح پی جاتی ہے۔ اس کو ثواب اور عذاب کی قید سے سردی کے بہانے نے بلند کر دیا ہے اور ہمارے ہاں صرف سرور کی خاطر اپنے کو بھلانے کی خاطر شراب پیتے ہیں۔ بہکنے کے لیے، غم غلط کرنے کے لیے، دولت کو بہانے کے لیے، دولت کے بندھنوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے۔

آخر من موہن کو کیا دکھ تھا؟

اور میں نے اپنا ہاتھ ڈاج کی چمکیلی سطح پر پڑے ہوئے اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ خلوص اور طمانیت کی لہریں اس کے ہاتھ سے نکل کر میرے جسم میں حلول کرنے لگیں۔ اس اندھیرے میں کھڑا وہ شخص جو میرے لیے اجنبی تھا، مجھے بہت قریب اور اپنا لگ رہا تھا جیسے اس کا اور میرا ساتھ جنم جنم سے رہا ہو۔ جیسے وہ اور میں ایک دوسرے کے بہت قریب اور اپنے ہوں۔ جیسے ہم دونوں بھائی بھائی ہوں۔ میرا دل ایک دم غم اور رنج سے بھر گیا۔ یوں کہ انجانے میں ہی مجھے من موہن کا دکھ معلوم ہو گیا ہو۔ اختر کی آواز ہمیں اپنے گرد پھیلی ہوئی اور لپٹی ہوئی معلوم دیتی تھی۔ ہوا اور تیزی سے چل رہی تھی۔ کوٹھیوں کی سبز باڑوں اور برآمدوں میں جلنے والی بتیوں کی کانپتی ہوئی روشنی پڑ رہی تھی۔ پھر کسی شخص کی تیز آواز سنائی دی جو اپنے بھونکتے ہوئے کتے کو چپ کرانے کے لیے چمکار کر کہہ رہا تھا: ''سیزر سیزر۔'' مگر کتا بھونکتا چلا جا رہا تھا اور سیزر سیزر کی آواز گیت کے ساتھ مل کر ایک عجیب گنگا جمنی دھارا بن رہی تھی۔

تمنا...... سیزر ہوتی جا رہی تھی۔ جوابی سیزر اور پھر ساز کی آوازوں ستار کی ٹنٹناہٹ اور سیزر۔

من موہن میرے ہاتھ کو پکڑ کر خاموش کھڑا تھا۔

پھر سیزر کی آواز بھی تھم گئی۔ شاید کتا چپ ہو گیا ہوگا۔ کہیں سے دروازہ بند کرنے کی آواز آئی اور کسی نالی میں پانی زور و شور سے بہنے لگا۔ نوکروں کے کوارٹر کہیں قریب ہوں گے کیونکہ کسی نے چلا کر کہا: ''روشن دیئے میں تیل ختم ہو گیا ہے۔'' اور دور سے چلا کر کسی نے جواب دیا: ''تو پھر اندھیرے میں رہو مجھے اب اور بھی کام کرنے ہیں۔ تیل نہیں مل سکتا۔'' ایسے میں عورت بڑبڑاتی رہی ہوگی اور پھر چپ ہو گئی ہوگی۔ آخر کیا فرق پڑتا ہے تیل کے نہ ہونے سے، اندھیرا روشنی سب برابر ہیں۔

میں نے پوچھا: ''آج پھر کیسے آنا ہو گیا تاج کے شہر میں؟''

کہنے لگا: ''یونہی کام کوئی خاص نہیں تھا' میں ادھر سے گزرتا تھا' اس شہر میں سے گزر کر جا
رہا تھا آج آپ مل گئے ہیں اب میں صبح ہی جاؤں گا۔'' اور پھر تھوڑی دیر بعد رک کر کہنے لگا۔ ''مگر
میں آپ کے ساتھ گھر نہیں چل رہا۔ ہم دونوں کسی ہوٹل میں چلیں گے' باتیں کریں گے میرا جی کسی
سے باتیں کرنے کو چاہتا ہے۔''

سبز ڈاج کا دروازہ کھول کر میں بھی من موہن کے ساتھ اس سیٹ پر بیٹھ گیا جہاں پہلے
دن شوبھا بیٹھ گئی تھی۔ اور پہلی بار شوبھا نے اپنا سر نکال کر مجھ سے کہا تھا' ہیلو! اس سیٹ پر بیٹھ کر شوبھا
یاد آ گئی۔ دماغ بھی کیا ہے یادوں پر یادیں چلی آتی ہیں۔ جیسے ایک دیئے سے دوسرا دیا جلتا ہے
اور پھر حدِ نظر تک روشنیاں ہو جاتی ہیں۔

شوبھا کا خط شام کو مجھے ملا تھا اس نے لکھا تھا میری دنیا کے تار ٹوٹ گئے ہیں۔ دیکھو تو
سہی شوبھا کیسی پگلی ہے کوئی اس سے پوچھے جب تار ایک بار ٹوٹ گئے' جب ایک بار تار ٹوٹ گیا'
اب تار باقی تاروں سے الگ ہو گیا' دنیا پھر بھی نہیں بجے گی؟ مجھے اپنی بہن دنیا یاد آ گئی۔ اس کے
بھی تار ہی ٹوٹ گئے تھے۔ سانس کا تار ہی ٹوٹا تھا اور ایک تار کے ٹوٹنے پر دنیا ہم سے جدا ہو گئی۔
پھر مجھے اپنا بچپن اور دادی ماں اور ماں اور محلے والے لوگ یاد آ گئے۔ مجھے کہر آلود شامیں اور
برساتوں میں بالکنی کے کنگروں سے آنسوؤں کی طرح گرتے بارش کے قطرے یاد آ گئے۔ مجھے
ایک دم کتنی چیزیں یاد آ گئیں۔ میں نے کبھی سوچا تھا کاش یہ شامیں لامتناہی ہو جائیں اور وہ
شامیں...... لامتناہی ہو گئی تھیں۔ میں کام کر رہا تھا۔ ایک اخبار کا مالک تھا۔ بہت سی کتابوں کا
مصنف تھا مگر زندگی پر یکسانیت سی تھی۔ کنول کماری سے ملنا خوشی کی بات سہی مگر کنول ایک عورت
تھی اور عورت کیا معلوم کب اپنے دامن سمیٹ کر چڑیا کی طرح ایک ڈال سے دوسری ڈال پر کود
جائے۔ اپنے پر پھیلا کر فضا کی بے کراں وسعتوں میں گم ہو جائے اور پھر نظر ہی نہ آئے مگر اس
طرح تو ہم اپنے متعلق بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ سب سے زیادہ بے یقینی تو یہی اپنے آپ سے ہے۔

اور میرے پہلو میں بیٹھا من موہن کہہ رہا تھا: ''یورپ میں اچھا ہے۔ سین کے کنارے
ہوٹل ہیں۔ نہر کے کنارے ہوٹل ہیں۔ پانی میں روشنیوں کا عکس لرزتا اور کانپتا ہے' دریاؤں کے
عین کناروں پر گھر ہیں' کھڑکی کھول کر دیکھ سکتے ہیں اور یہاں جمنا اکیلی اور خاموش بہتی ہے' چپ
چاپ ہے۔''

اور میں نے کہا: ''ٹیمز اور سین دریا ہیں جمنا بھی گنگا کی طرح ماں ہے اور مائیں اپنی

محبت میں دھیمی اپنے پیار میں سچی اور اپنے لگاؤں میں خاموش ہوتی ہیں۔''

من موہن کہنے لگا: ''میں یہ نہیں کہتا کہ یہاں ایسا کیوں نہیں ہے۔ پھر میرا جی جمنا کو
دیکھنے کو چاہتا ہے۔''

ہم پل پر سے گزر رہے تھے۔ میں نے کہا: ''موٹر یہیں ایک طرف کھڑی کر لو' آؤ دریا کو
پہلے دیکھ لیں۔ مجھے کہیں جانے کی جلدی نہیں' تمہیں بھوک تو نہیں لگ رہی؟''

اس نے خاموشی سے موٹر کھڑی کر دی اور ستاروں بھری رات میں ہم دونوں پل کے
قریب سے اتر کر جمنا کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ دور دور تک کوئی صدا نہ تھی۔ کبھی کبھار کوئی پرندہ
ٹیں ٹیں کرتا کنارے کے درختوں پر سے اڑ کر دوسری شاخوں میں گم ہو جاتا۔ تھوڑی دیر یہ حرکت
فضا میں جاگتی رہتی۔ اس کے بعد خاموشی ہو جاتی۔ پل کے دروں کے ساتھ پانی کی لہریں ایک
گمبھرتا سے ٹکراتیں اور پھر آگے چلی جاتیں۔ لہریں کناروں سے آ کر ٹکراتیں اور ساحل کو چوم کر
واپس ہو جاتیں۔ جیسے ساحل کوئی بھگوان ہو' جس کے چرن چھو کر دیوداسیاں رقص کے چکر میں
گھومنے لگیں اور پھر کوئی دیوداسی ٹھٹک کر وجے ناچتے ناچتے تھک کر' تھم کر اپنے پائل کو ٹھیک کرتے
ہوئے سوچے کہ وہ کیا ہے' وہ کیوں ہے' وہ کون ہے؟ اور پھر طبلے پر تھاپ پڑے ستار کے تار جھنجھنا
اٹھیں اور وہ اسی طرح رقص کے چکروں میں کھو جائے' گھوم جائے۔

پگ گھنگھرو باندھ میرا جی ناچی رے' ناچی رے......

آسمان کے ستارے لہروں میں بہہ رہے تھے۔ نیلے پانی میں طوفان کی طرح گھلے
ہوئے بہہ رہے تھے۔ پانی پر سیاہی ڈول رہی تھی اور گھنے جنگلوں کا سناٹا ہمارے گرد تیر رہا تھا میں
سوچ رہا تھا جو شخص جمنا کو دیکھتا ہے' وہ شرابی نہیں ہو سکتا اور پھر کائنات کی خوبصورت ترین مخلوق
سے ہم سب ہی پیار کرتے ہیں۔

میں من موہن کے پہلو میں خاموش کھڑا دریا کی آوازوں کو اپنے دل میں گونجتے سن
رہا تھا اور مجھے کنول ٹھاکر کے ڈرائنگ روم میں رکھی ہوئی وہ تصویر یاد آ رہی تھی جس پر زردی
چھائی تھی۔

''من موہن کوئی بات تو کرو۔'' میں نے اپنے خیالوں سے گھبرا کر اور تھک کر کہا۔

''بات!'' من موہن نے آہستہ سے کہا۔ ''بات ہو تو کروں۔''

''کیوں کیا باتیں ختم ہو گئیں؟''

''ہاں۔'' اس نے سانس کے نیچے ہی مجھے جواب دیا' پھر ہم دونوں کنارے کی ٹھنڈی اور گیلی ریت پر اپنے پاؤں رکھتے پل کے پاس کھڑی موٹر میں آ بیٹھے۔

اس نے موٹر کو تیز چلاتے ہوئے کہا: ''جمنا کتنی اچھی ہے یہ اپنا پن سین اور ٹیمز میں کہاں۔''

میں نے کہا: ''تم یورپ سے کب لوٹے ہو؟''

کہنے لگا: ''دو چار دن پہلے ہی لوٹا ہوں۔ اپنے ملک میں بھی بیگانوں کی طرح رہتے ہیں۔ وہاں بھی دل نہیں بہلتا' جانے اس کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔''

''کس کو؟'' میں نے سمجھتے ہوئے بھی پوچھا۔ ''ملک کون؟''

''نہیں بھیا دل کو' دل کو۔'' من موہن نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''اسے کچھ ہوتا جا رہا ہے۔''

''اچھا۔'' میں نے سمجھنے کے انداز میں کہا۔ ''پھر اس کا کوئی علاج کرو۔''

وہ خاموش رہا اور ہم تیزی سے ستاروں بھرے آسمان تلے اڑتے ہوئے فرشتوں کے پروں پر پرواز کرنے والوں کی طرح جنت کی وادی سے بھی خوبصورت ایک ہوٹل کے سامنے رکے۔

من موہن میرے ساتھ باہر نکل کر کہنے لگا ''یہاں کتنی زندگی ہے پر اپنے کس کام کی؟''

میں نے کہا: ''آج کل جان پڑتا ہے کسی نئے صدمے سے دوچار ہوئے ہو۔''

اس نے گھوم کر چلتے چلتے ہی میری طرف دیکھا اور بولا: ''محبت کا دکھ ہی دنیا میں سب سے بڑا اور جان لیوا نہیں ہے اور بھی دکھ ہیں اس کے سوا۔'' میں اس طرح اس کے ساتھ چلتا رہا۔

بڑے سے ہال میں کرسیاں تھیں۔ میز تھی' چمک تھی اور خاموشی تھی۔ دیواروں کے اندر بتیاں یوں جل رہی تھیں کہ صرف ان کی روشنی منعکس ہو کر بیٹھنے والوں کے سروں پر پڑتی تھی۔ ہم سے دور ایک میز پر کوئی انگریز خاموش بیٹھا اپنی انگلیوں سے میز پر گیت بجاتا ہوا اپنے گلاس کی شراب ختم کر رہا تھا۔ جانے کیوں وہ اتنا اکیلا تھا' بالکل اکیلا۔ ویٹر سوئے ہوئے جان پڑتے تھے۔ ہال کے دروازے کے قریب ریشمی پردوں پر بنی رقص کرنے والے جوڑوں کی تصویریں ہی زندہ اور جاگتی ہوئی لگتی تھیں۔ اس بڑے سے ہوٹل میں آج بے پناہ خاموشی تھی۔ باہر لان میں روشنی بہت کم تھی۔ درختوں پر اداسی تھی۔ کسی میں سازوں کے ریکارڈ بج رہے تھے اپنے نہیں غیر ملکی سازوں کے ریکارڈ۔

میں نے بینا کو فون کیا کہ میں آج رات گھر نہیں آ سکتا۔ اگر آیا تو بہت دیر سے آؤں گا۔ وہ فکر مندی سی ہو گئی۔ بولی: ''کیوں بابا کہاں پھنس گئے ہیں آج اور میں کمرے میں اکیلی ہوں' میں نے کھانا بھی نہیں کھایا اور اتنا انتظار بھی فضول ہی گیا۔''

میں نے کہا: ''اچھی بیٹی ہو کیا' اپنے بابا کو چھما نہ کرو گی؟''

کہنے لگی: ''وہ تو میں آپ کو پہلے ہی کر چکی ہوں پھر ماں کو کیا کہوں۔ اگر وہ پوچھیں تو۔''

میں نے کہا: ''جو تم سے کہا ہے وہ تم ان سے بھی کہہ دینا اور تمہاری ماں میرے لیے اتنی پریشان نہیں ہوا کرتی۔''

اس نے ہنس کر فون رکھ دیا اور میں نے اپنے خیال میں سوچا' اب وہ نوکر کو ہلا کر کہے گی جاؤ ماں سے کہہ دو آج بابا گھر نہیں آ رہے۔ پھر نروپما بڑبڑائے گی اور بینا سے کہے گی بینا چلو ادھر آج اپنے کمرے میں آ جاؤ۔ وہ ہمیشہ سے میرے کمرے میں بینا کے سونے پر اعتراض کرتی ہے اور جب اسے معلوم ہو جائے گا کہ میں گھر نہیں آنے کا' تو وہ ضرور اسے گھسیٹ کر اپنے پاس سلانے لے جائے گی۔ مجھے معلوم ہے میں باقی بچوں سے الگ سلوک کر کے ان کے دل میں احساسِ کمتری پیدا کر رہا ہوں مگر اپنا اپنا دل ہے نا مجھے بینا ہی سب سے عزیز ہے۔ میں اپنے کام سے نظر اٹھا کر بھی یونہی ستار بجاتی پڑھتی اور اپنی لمبی چوٹی کو ہلا کر کتاب کا مطالعہ کرتی بینا کو دیکھتا رہتا ہوں۔ وہ ساری دنیا سے زیادہ میرے دل سے قریب ہے۔

واپس آ کر میں نے من موہن سے کہا: ''کیا پیو گے؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھ لیا۔

''آج کی رات کے احترام کے لیے کچھ نہیں۔''

میں نے سادہ کھانے کا آرڈر دے دیا۔ ہال میں لوگ جمع ہو رہے تھے۔ کمروں سے نکل کر آ رہے تھے۔ شام کے لباس میں غیر ملکی اکڑ اکڑ کر چل رہے تھے۔ احساسِ برتری کے بوجھ تلے دبے ہندوستانی انگریزوں کی نقل میں اپنے آپ سے مطمئن یورپی لہجے میں بات کر رہے تھے۔ ہم خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ من موہن نے اس عرصے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ دیواروں کے پیچھے سے کئی اور روشنیاں جل اٹھیں۔ پھر پردوں کے پیچھے سے سازوں کی آوازیں تھرتھراتی ہوئی آئیں اور دفعتہً دوسری طرف کے بڑے سے پردے کو اٹھا دیا گیا۔ اسٹیج پر کیبلے

ڈانس ہونے لگا۔ قلابازیاں کھاتی ہوئی عورت اتنی تیزی سے گھوم رہی تھی۔ ساز چیخ رہے تھے۔ پیانوں کی آہیں' بین کا رونا' وائلن کی آہ وزاری' گٹار کے آنسو سب مل کر رو رہے تھے۔ اور وہ عورت نیم عریاں لباس میں مسلسل قلابازیاں کھا رہی تھی۔ اپنے فراک کو جو بہت ہی اونچا تھا اٹھا کر گھوم جاتی اپنی ننگی ٹانگوں کو تھرکاتی' اپنے جسم کے خطوط کی نمائش کرتی اور جھوٹی مسکراہٹ اس کے چہرے پر دائروں کی طرح پھیل جاتی۔

من موہن ادھر نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ شاید اپنی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔

پھر گیت تیزی سے بدلنے لگا اور آرکسٹرا کوئی اور ہی دھن بجانے لگا۔ عورت یک دم غائب ہوگئی تھی۔ فضا قلابازی کھا کر رہ گئی۔ فلور پر تیزی سے جوڑے گھومنے لگے۔ عورتوں کی کمر ننگی تھی۔ ننگے فراق فرش پر پھیلے تھے۔ اونچی ایڑی کے جوتے جو ایڑی سے زیادہ صرف پنجوں کی وجہ سے ہوتے ہیں چمکیلے فرش پر پھیل رہے تھے۔ مرد آسانی اور متانت سے ناچ رہے تھے۔ عورتوں کی موہوم کمر میں ہاتھ ڈالے قریب قریب اور قریب روشنی میں جسم پگھل رہے تھے۔ گھل رہے تھے۔ سانس کی حرارت سے بخارات بن رہے تھے اور پھر بھی حیرت انگیز طور پر زندہ تھے اور تیز اور تیز...... روشنیاں تیز ہو رہی تھیں۔ پھر مدھم ہو رہی تھیں۔ گتیں تیزی سے بدل رہی تھیں۔ دریائی لہروں کی روانی سے جوڑے بہے چلے جا رہے تھے' گھوم رہے تھے۔ مرد اور عورتیں جسم اور دل بن کر ایک دوسرے میں فنا ہو رہے تھے اور پھر بھی زندہ تھے۔

اور انگریز اسی طرح اکیلا بیٹھا اپنی شیری کے گھونٹ نگلتا۔ انگلیوں سے میز پر گت بجا رہا تھا۔

شراب کا مزہ اس کے غٹ غٹ چڑھا جانے میں نہیں ٹھہر ٹھہر کر رک رک کر ایک گھونٹ کو آگ کی طرح نگلنے میں ہے۔ آگ دھیرے دھیرے ہی سلگتی ہے۔ ایک دم نہیں بھڑکتی ہے۔ فوراً نہیں جلتی۔ ایک زمانے کے بعد ہی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔

ساز رک گئے۔ آرکسٹرا تھم گیا اور رقص ختم ہو گیا۔ لوگ تھک کر میزوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ لیمن سکواش پی رہے تھے۔ شیری پی رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ عورتیں مسکراہٹیں بنیں قہقہے لگا رہی تھیں۔ اپنے بالوں کو جھٹک کر درست کر رہی تھیں۔ اپنی انگلیوں میں چمکتی انگوٹھیوں کو درست کر رہی تھیں اور چمکیلے شیشے نگینے اور ہیرے روشنیوں میں اور زیادہ چمک رہے تھے اور بجے

تھے اور سانس تھے شراب تھی اور قہقہے تھے۔ فضا میں سینٹ بگولوں کے ساتھ کی خوشبوئیں سبزی کی باس اور رات کی رانی کی مہک یاد آ رہی تھی۔

پھر وقت ختم ہو گیا۔ رات بھیگ گئی۔ غیر ملکی موسیقی کے ریکارڈ بھی ختم ہو گئے۔ فضا میں سکون تھا۔ لوگ اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ آخر میں صرف من موہن اور ہم سے دور وہ انگریز بیٹھے رہ گئے۔ روشنیاں کم ہو گئیں۔ ویٹر سو سے گئے اور پردے پر بتی رقص کرتے جوڑوں کی تصویریں حیرت انگیز طور پر پھر زندہ ہو گئیں۔

اس غیر ملکی کا گلاس اب بالکل ختم ہو چکا تھا' اس نے ویٹر کو بلا کر ایک اور گلاس کا آرڈر دیا۔ اور پھر اپنی کرسی کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں بند کر کے اپنے میں گم ہو گیا۔

من موہن نے تب مجھ سے پوچھا تھا: ''اکیلے پن کا کوئی علاج بتاؤ۔''

''اکیلے پن کا علاج تم مجھ سے پوچھتے ہو کیا تم اکیلے ہو؟''

''ہاں بھیا' میں اکیلا ہوں میری روح میں گھور اندھیارا ہے ہر طرف اندر باہر روشنی کہیں نہیں۔ پہلے تو میں نے اس کی پرواہ نہیں کی مگر اب یہ تاریکی میرا گلا گھونٹنے لگتی ہے۔ میرا سانس بند ہونے لگتا ہے۔ مجھے روشنی کا کوئی راستہ دکھاؤ۔''

میں نے پوچھنے کے لیے پوچھا: ''یہ راستہ تم نے کب سے گم کیا ہے؟''

''اصل میں میں کبھی کسی بھی راہ پر نہیں چلا۔ میں شروع سے اندھیرے میں رہا ہوں۔ بچپن میں تاریکی کی راہوں سے میں نے دولت پائی ہے اور اس اندھیرے کے راستے میں اپنا سفر کر رہا ہوں۔''

دراصل معلوم تو مجھے بھی نہیں تھا کہ اندھیرا کہاں ختم ہوتا ہے اور روشنی کی حدیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ ہم میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں ہو پاتا کہ کس حد سے آگے گزر کر ہم اندھیرے سے اجالے میں آ جاتے ہیں' کوئی بھی تو نہیں جانتا۔

میں نے کہا: ''کسی جوگی سے کسی مہاتما سے پوچھو' میں ایک عام انسان ہوں تمہاری طرح ظلمت میں گھرا ہوا ہوں' راہ سے ناواقف ہوں' زندگی کوئی گاؤں کی پگڈنڈی تو نہیں جو تم کو کہیں نہ کہیں لے جائے گی۔ کسی بستی کا نشان مل جائے گا۔ یہ تو شہر کی بیچ در بیچ سڑک ہے جس پر کھو کر راستہ پانا مشکل ہو جاتا ہے۔''

من موہن بولا: ''جوگی اور مہاتماؤں کے دوار سے تو کسی کو بھیک بھی نہیں ملتی۔ وہ خود بھکاری ہیں۔ کسی کو کیا دیں گے۔ ان کے کشکول میں دھرم کی دولت نہیں اور میں دھرم کی دولت نہیں چاہتا میں تو صرف راستہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اندھوں کی طرح چلتے چلتے ایک عمر بیت چلی ہے۔''

میں نے کہا: ''تمہیں کب سے یہ گیان ہوا کہ راہ چلنا چاہیے اور پھر راہوں پر چلنا بھی تو بہت مشکل ہے ذرا سا قدم ڈگمگا جائے تو راہ گم۔''

من موہن نے کہا: ''پا کر کھونے میں بھی ایک لذت ہے اور نہ پانے میں تو کوئی لذت نہیں۔ اس میں تو کوئی تسکین نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''پہیلیوں میں باتیں کیا کر رہے ہو، ٹھیک ٹھیک بتاؤ تمہیں کاہے کی ضرورت ہے۔''

اور اس نے میری طرف دیکھ کر کہا: ''اگر درد معلوم ہو تو علاج بھی ہو یہی تو معلوم نہیں ہوتا کہ پیڑ کس جگہ ہے بھیا۔''

وجود کے کسی حصے میں کبھی کبھار دکھن بڑھ جاتی ہے اور پھر بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کہاں ہے؟ دل کراہنے لگتا ہے اور پھر بھی وہ بالکل تندرست ہوتا ہے من موہن جیسے اس شرابی اور زندگی سے صرف قہقہوں کا حصہ لینے والے کو اپنے اندھیروں میں پھرنے کی ضرورت کیوں آ پڑی، مگر میں خاموش بیٹھا تھا۔

وہ پھر بولا: ''بھٹکتے دھوکہ دیتے دھوکہ کھاتے ایک عمر گزر جاتی ہے اور پھر بھی معلوم نہیں ہو پاتا کہ ہم جن راستوں سے گزر کر آئے ہیں وہ اتنے غیر یقینی کیوں تھے اور اس سے پہلے ہم نے ان کے غیر یقینی ہونے سے خبر کیوں نہ حاصل کی۔''

میں خاموش تھا۔

وہ تھوڑی دیر بعد کہنے لگا: ''بھگوان کے مندر میں جاتے میں ڈرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے وہاں صرف مورتی ہے اور مورتی کے پیچھے اندھیرا ہے۔ پجاری جی شراب پیتے ہیں...... دیوداسیاں ناچنے کے ساتھ ساتھ ان کا من بھی لبھاتی ہیں اور بھگوان مندر میں اب براجمان نہیں ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے تپ کرنے سے برہما کے درشن نہیں ہو سکتے۔ تپ کا راستہ بھی باقی راہوں کی طرح بہت غیر یقینی ہے۔ پھر میں تو کسی منزل تک جانے کا متمنی نہیں ہوں۔ میں تو صرف راستہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

میرے پاس ان باتوں کا کیا جواب تھا۔ وہ انگریز دوسرے گلاس کو چھیڑے بغیر کرسی کی پشت سے سر لگائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ شاید وہ بھی ہماری طرح سوالوں کے گورکھ دھندوں میں پھنسا تھا۔ شاید وہ بھی اندھیرے میں راہ گم کیے بیٹھا تھا۔ شاید' کون کہہ سکتا ہے کہ دوسرے پر کیا بیت رہی ہے۔ جب اپنے وجود کے دوسرے حصوں پر بیتنے والے دکھ بھی معلوم نہیں ہو پاتے۔

میں نے کہنے کے لیے کہا تھا: ''تو یوں کرو کسی مہاتما کے چرن چھو لو ان کی اشیرباد سے بگڑے کام سنور جائیں گے۔''

''بگڑے کام!'' من موہن نے ہنس کر کہا: ''بگڑے کام کون سنوارنا چاہتا ہے میں تو ایک راہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اور تب مجھے معلوم ہوا کہ ہم دونوں ایک ہی طرح کے تھے' اندھا اندھے کو کیا راہ دکھا سکتا ہے' اس کا دکھ سن سکتا ہے' پھر سننے سے کیا ہوتا ہے۔ میں بھی چپ ہو گیا۔ میرے خیال پیچھے کی طرف پرواز کر گئے۔ اپنے ماضی کی طرف دادی ماں کی طرف' دادی ماں کی بھگتی کی طرف' مندر کی سیڑھیوں کی طرف' پھولوں کے ڈھیروں اور پجاری جی کی طرف' رام دلارے کی طرف' میں ادھر ادھر دیکھ کر کہیں سے روشنی لینا چاہتا تھا۔ آج اتفاق سے من موہن مجھے ملا تھا اور اس کی سانس میرے سینے میں چکر لگا رہی تھی۔ ٹھنڈی سانس جب انسان بظاہر مطمئن ہوتا ہے اور پھر بھی طمانیت اس کے لیے ایک بے یقینی ہوتی ہے۔

ہم دونوں کے سینے میں ایک ہی سوال تھا کہ کیا کیا جائے؟ بھگوان کیا کیا جائے؟ تم تک جانے کے لیے ہم اپنے کو تیار نہیں پاتے۔ پرا سے مکتی دینے والی راہ کونسی ہے کیا کیا جائے؟ ہر ایک اپنے طور پر کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی سوال پوچھتا ہے اور پھر بھی کہیں جواب نہیں ملتا۔ کوئی راہ نہیں سوجھتی۔

میں نے کہا: ''بہتر ہے زندگی کی خوشیوں اور مسرتوں میں قہقہوں اور روشنیوں میں اس سوال کے جواب کو تلاش کرو۔ اپنے آپ کو انتہائی مصروف رکھو تا کہ تم کو کوئی سوال ہی نہ ستائے۔ یہی علاج ہو سکتا ہے اور پھر میں نے جھک کر کہا' میں بھی تو تمہاری طرح بھٹکا ہوا ہوں' من موہن نے زور سے قہقہہ لگایا' اتنے زور کا کہ آدھے سوئے ہوئے ویٹر جاگ گئے اور اس انگریز نے اپنی کرسی کی پشت سے سر اٹھا کر بہت غور سے ہماری طرف دیکھا۔ کہیں من موہن پاگل تو نہیں ہو گیا۔ وہ زور زور سے ہنستا رہا اور میں نیم پاگلوں کی طرح بیٹھا اس کے قہقہوں سے پیدا ہونے

والے ارتعاش کو دیکھتا رہا۔ ویٹر حیران تھے' اس شخص نے تو شراب بھی نہیں پی۔ بہک جانے والوں کو ہوٹل سے نکال دیا جاتا ہے۔ کم از کم ان سے مؤدبانہ درخواست کی جاتی ہے کہ آپ یا تو اچھی طرح اخلاق کے طریق پر چلیئے ورنہ جائیے۔ اس شخص نے تو شام سے اب تک ایک بوند بھی حلق سے نیچے نہیں انڈیلی۔ یہ کیوں بے تحاشا قہقہے لگا رہا ہے۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''موہن بھیا کیا ہو گیا۔ ارے بھائی ہنس کاہے رہے ہو؟''

''تم نے ہی تو کہا ہے کہ قہقہوں میں سوالوں کے جواب ڈھونڈو۔'' اس نے رک کر کہا۔

''دکھوں پر ہنس کر۔'' میں نے آہستہ سے کہا: ''کہ دنیا چونک جائے۔''

''اچھا!'' من موہن نے کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

ہم سے دور بیٹھا انگریز آدمی اٹھا اور قریب آ کر بولا: ''گو میں آپ سے متعارف نہیں ہوں مگر خود کو پیش کرتا ہوں۔ میرا نام ڈون وارٹن ہے۔ آپ دونوں کی طرح میں بھی اکیلا ہوں اور اداس ہوں۔''

میں نے اور من موہن نے اپنا تعارف کروایا اور ہم تینوں گزرتی تاریکی کے پروں کی نرمی محسوس کرتے وہاں بیٹھے رہے۔ رات ایک مانجھی کی بیٹی کی طرح اپنی پھٹی ساڑھی کو کمر میں اڑسے چپو لیے ہانک لگاتی پھر رہی تھی۔ ''کون اندھیرے پانیوں پر سے میری ناؤ میں بیٹھ کر پار ہونا چاہتا ہے۔'' ہم تینوں پار جانا چاہتے تھے مگر اس حسین رات سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہ تھی اور ہم تینوں بھکاریوں کی طرح وہاں بیٹھے اپنے اپنے دکھوں کی آگ پر اپنے وجود کو گرم کرتے بیتی کہانیاں کہتے رہے۔

ڈون وارٹن بولا: ''میں بھی بائرن کا ڈون ژوان ہوں۔ دنیا کو دیکھے ہوئے اور دنیا سے بیزار' محبت سے غنی' نفرت سے غنی' اپنے میں ایک انجمن اور پھر بھی اکیلا۔''

اس سے زیادہ مختصر لفظوں میں کسی نے کبھی اپنی تشریح نہ کی ہو گی۔ میں خوش ہو گیا اور من موہن پھر زور سے قہقہے لگا کر ہنسنے لگا۔ ڈون نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''تم سے زیادہ پاگل تو میں ہوں' مگر ابلیس کی طرح قہقہے لگا کر اپنے کو مجروح نہیں کر رہا۔ میں سوچتا ہوں تم بھی کافی زخمی ہو۔ دھیرج سے کام لو۔ ہنسنے سے جو تھوڑی بہت زندگی دل کے دیئے میں بجھتی ہوئی بتی کی طرح ہوتی ہے۔ بھڑک کر ختم ہو جاتی ہے۔ بھڑک کو نہیں دوست' دھیرج سے کام لو۔''

''ابلیس کون؟'' من موہن نے اس سے زیادہ مجھ سے مخاطب ہوئے پوچھا۔

''سنو۔'' ڈون وارٹن نے سمجھانے کے انداز میں کہا: ''وہ واحد وجود ہے جس نے بڑے خدا سے بغاوت کی جس نے اس کی مرضی کو ماننے سے انکار کر دیا اور جس نے اپنے دل کے پیچھے سارے عیش جنت کی ساری خوشیاں باغِ عدم کی ساری راحتیں ٹھکرا دیں اور جو حیرت انگیز طور پر ساری دنیا سے ہمارے خدا سے بھی زیادہ زندہ ہے۔''

''اچھا!'' من موہن نے کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ''پھر؟''

''پھر کیا۔ وہ میں ہوں آج رات جب سیاہی گہری ہے اور تمہاری کشتی کو پار لگانے والا کوئی نہیں میں بھی یہاں بیٹھ کر تمہیں اپنے دکھ کی کہانی سناؤں گا۔''

''اچھا!'' موہن نے پھر اسی بے کسی کے انداز میں کہا۔

ڈون وارٹن نے مسکراتے ہوئے کہا: ''تم میری بات پر یقین نہیں کرتے ہو۔ دوست میرا دل دکھی ہو گیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو ابلیس مجھ سے زیادہ عظیم ہے اور میں اپنے مالک کے پہلو میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔'' وہ اداس ہو گیا۔

''میں کب کہتا ہوں۔'' من موہن نے اسی طرح سے کہا: ''مگر تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ تم کہتے ہو' تم ہماری طرح اداس ہو' اکیلے ہو اور پھر تم اپنے آپ کو ابلیس کہتے ہو۔ میں نے کبھی اس کا نام پہلے نہیں سنا۔''

میں نے ڈون سے کہا: ''دیکھو بھائی یہ شخص دوست ہے۔ دوست روایتی نہیں' کتابی نہیں یہ زندگی میں کسی پچھلے زمانے سے نہیں آیا۔ اس کا ماضی کوئی نہیں۔ تم اپنے فلسفے کو ذرا واضح لفظوں میں سمجھاؤ۔ ہمارے ہاں ابلیس وغیرہ بے کار کی باتیں ہیں۔ ہمارا پرماتما تمہارے خدا سے مختلف بڑا اور عظیم ہے۔ ہمارے ہاں کسی ابلیس کی کسی باغی کی گنجائش نہیں۔''

ڈون وارٹن چپ ہو گیا اور انگلیوں سے میز پر گیت بجا کر کوئی پرانا نغمہ الاپنے لگا۔ وہ بہت آہستہ سروں میں گا رہا تھا مگر مجھے معلوم تھا اس نغمے میں درد تھا جیسے بلبل کے نغمے میں ہوتا ہے۔ جیسا ستار کے تاروں میں ہوتا ہے۔ جیسا دنیا میں رہتا ہے' دکھ کی زبان ساری دنیا پر ایک ہی ہے بالکل ایک۔

ڈون وارٹن مجھ سے مخاطب ہو کر بولا: ''تم غلط کہتے ہو' یہ زندگی ہے اور تم کسی پچھلے زمانے سے نہیں آیا۔ سب انسان کسی اور زمانے سے آئے ہیں' سب پرانے ہیں اور سب ابلیس

ہیں، ذرا سوچو تو سہی میرے بھائی اور میں یہاں تمہارے بدھ مت کا پیغام سننے آیا ہوں۔ ہمارے یورپ میں مہاتما بدھ کو دنیا کا سب سے بڑا آدمی مانا جاتا ہے۔ اس کی لائی ہوئی روشنی میں ابدیت ہے، شانتی ہے اور سچائی ہے اور پھر تمہارے مذہب میں تو انسان بہت پرانا ہے۔ نروان کے چکروں کو پار کرتا ایک جنم سے دوسرے جنم کی طرف پھلانگتا اکیلا گھومتا اپنی ناؤ کو خود ہی کھیتا اپنے گیت خود ہی گنگناتا، اندھیروں اجالوں میں ایک تمہارے یورپ میں تمہاری زندگی کی تصویر میں ایک ندی ہے۔ ایک ناؤ ہے اور اس میں ایک اکیلا انسان ہے..... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں، کیا ہمارے ہاں تمہارے مذہب کو جھوٹی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔"

"شانتی، شکتی ہے، مکتی ہے اور نجات ہے۔" میں نے اس سے زیادہ اپنے سے بات کرتے ہوئے کہا، مگر راہ پھر بھی ناپید ہے۔

"سنو!" ڈون وارٹن نے کہا: "راہ کے چکر میں مت پڑو اس سے اور بھی الجھ جاؤ گے جو پگڈنڈی تمہارے دل کو پسند آئے، اس پر گھوم جایا کرو اور اگر کہیں بھی نہ جا سکو تو بہرحال دل کو یہ سکون تو ہوگا کہ چل رہے ہو، کیا یہ تسلی کافی نہیں؟"

"بالکل یورپ کی ذہنیت ہے نا۔ خالصتاً تم لوگ صرف یہ سہارا چاہتے ہو کہ تم بڑھ رہے ہو، چاہے گھوم کر پگڈنڈیاں پھر اسی مقام پر آ جایا کریں، جہاں سے تم نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ تم لوگوں کو یہ غم سارا وقت کھاتا رہتا ہے کہ تم بڑھ نہیں رہے، چل نہیں رہے، اپنے چکر میں گھوم نہیں رہے۔ ٹھیک ہے تم لوگوں کو کہیں جانا تو نہیں بس چلنا ہے مدام چلنا، بے خور و خواب چلنا..... ہمارے ہاں یہ زندگی نہیں ہے۔"

من موہن نے کہا: "تم مجھے بھی یورپ زدہ کہو گے۔ میں بھی تو راستہ چاہتا ہوں۔ سفر کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہمارے ہاں راہیں بہت ہیں اور سب منزل پر لے جاتی ہیں، مگر کٹھن وادیاں ہیں، اکیلے پن کا خوف ہے اور پھر یہ نظریہ ناپید ہے کہ تم یقین سے بڑھ رہے ہو، آگے جا رہے ہو۔"

ڈون وارٹن نے اپنے گلاس میں سے ایک چسکی لے کر کہا: "سنو راہوں کا ذکر چھوڑو، آؤ سیاہ آنکھوں کی باتیں کریں۔ تمہارے ہاں عورت بہت گرم خوبصورت اور شرمیلی ہوتی ہے۔"

اور میں نے دیکھا ایک آن میں من موہن نے ڈون وارٹن کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ لگا دیا۔ اس کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر دور جا گرا۔ چھن سے آواز آئی، سرخ شراب خون کی

طرح بہنے لگی اور ٹوٹے شیشے کے ٹکڑے ہیروں کی طرح سرخی میں دمکنے لگے۔ روشنی میں مدھم اور دیواروں سے سروں کے اوپر ہی اوپر خدا کے ہاتھ کی طرح بنی اسرائیل کے چلنے والی روشنی کے ستون کی طرح کرنوں کی دھار زور سے بہنے لگی۔ ڈون وارٹن اپنے جبڑے کو پکڑے سر جھکائے بہت مجوب اور سر جھکائے بیٹھا تھا۔

میں نے من موہن کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور اپنے سامنے دیکھ رہا تھا جہاں پردوں پر بنی رقص کرتے جوڑوں کی تصویروں میں زندگی سی عود آئی تھی۔

ڈون وارٹن نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں شرمندگی تھی۔ معاف کر دیئے جانے کی التجا تھی اور ایک زخمی جانور کی طرح بے بسی تھی۔ میرا دل اس لمحے اتنا نرم ہو رہا تھا، اگر وہ ایک لفظ بھی کہتا تو میں رو دیتا۔ آنسو میری آنکھوں کے پردوں پر جلن کی طرح انگارے بن کر دمک رہے تھے۔

من موہن نے ڈون وارٹن کا خالی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے اسے معاف کر دیا تھا۔

ڈون وارٹن نے تقریباً روتے ہوئے کہا: "دوست میں بہت شرمندہ ہوں۔ ہمارے ہاں عورت ایک عیش ہے۔ ایک کھلونا ہے۔ ایک تیتری ہے۔ میں نے اس سے پہلے بہت سے ہندوستانیوں سے بات کی ہے۔ وہ عورت کے معاملے میں اتنے نازک طبع نہیں ہوتے، کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

"کس عورت کا ذکر کر رہے ہو؟" من موہن نے تیزی سے پوچھا۔ "اس گوشت کے لوتھڑے کا ذکر جو تمہارے حریم ناز کی سجاوٹ تمہاری عیش گاہوں کی رونق اور تمہاری زندگی میں ایک کالر ایک بٹن ایک سانس سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ ہمارے ہاں کی عورتوں کی بات کرنے کے لیے تم اپنی زبان کو پاک کرو، اپنے دل کو پاک کرو، تمہارے سات سمندر مل کر بھی تمہیں اس قابل نہیں بنا سکتے کہ ہماری عورت کا ذکر تمہارے منہ سے ہو سکے۔"

"اچھا!" وارٹن اپنے جبڑے کو سہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"اب بتاؤ۔" من موہن نے کہا "تم کس عورت کا ذکر کرنا چاہتے تھے، کسی گرم، شرمیلی اور خوبصورت ہستی کا ذکر کر رہے تھے۔ میں بھی تو سنوں۔" اور ڈون وارٹن نے کہا: "میں اپنے اسپین کی سی سیاہ آنکھوں والی دوشیزاؤں کو یہاں بھی دیکھتا ہوں۔ ان کے جسم کے خطوط بھی دلآویز

ہوتے ہیں۔ وہ بھی مسکراتی ہیں، قہقہے لگاتی ہیں، تھوڑے دن پہلے میں تاج محل دیکھنے گیا تھا۔ میں نے وہاں عورتیں دیکھی تھیں۔ مجھے معلوم نہیں تم ہندوستانی عورت کس ہستی کو کہتے ہو۔ مجھے سمجھاؤ دوست۔'' اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔

میں نے دیکھا من موہن بہت زرد ہو گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ شوق کی ایک لے سی اس کی آواز میں سے تھم گئی۔ اس نے ڈون کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے رادھے کرشن شدت سے یاد آ رہا تھا اور کرشنا، دادی ماں۔

جانے کون کون میرے دماغ کے پردوں پر سے بے آواز قدموں سے گزر رہے تھے۔ ڈون وارٹن نے ویٹر کو آواز دے کر کافی لانے کے لیے کہا۔

من موہن کے دماغ میں شوبھا ہو گی، تاج محل ہو گا، چاندنی رات ہو گی اور جانے یادوں کے کارواں کیسے چلے آ رہے ہوں گے۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔

انگریز آدمی نے اپنا سوال پھر نہیں دہرایا، اسے معلوم تھا تکلیف دہ حد تک معلوم کہ اس سوال کا جواب من موہن دے نہ سکے گا۔ میں بھی نہیں، کوئی ہندوستانی نہیں دے سکے گا۔ بڑھتی ہوئی آزادی کے غلغلے بڑھتی ہوئی غریبی کے شور اور بڑھنے والی دنیا کے چکروں میں ہندوستان کی عورت بھی قدم بڑھا رہی ہے۔ وہ بھی بے باکی سے قہقہے لگا سکتی ہے۔ وہ بھی مرد سے آنکھ ملا کر بات کر سکتی ہے۔ اس نے گھونگھٹ کو پیچھے ہٹایا ہے۔ پریوں کا سر بھی ننگا ہو گیا ہے۔ بالوں کی لمبی چوٹی ناگن کی طرح بل کھاتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اب دوار میں کھڑی سوچ سوچ کر قدم آگے نہیں بڑھاتی۔ وہ بہت یقین سے قدم اٹھاتی، تیز تیز چلتی شاہراہوں پر جا رہی ہے۔

آہ ہماری عزت کے تقاضے، ہمارے خواب ہمارا ماضی ہماری روایتیں ہمارا پرانا پن اور پھر ہمارا نیا پن۔

میرا دماغ ایک پن چکی کی طرح گھوم رہا تھا اور کافی کے تیز تلخ گرم گھونٹ گلے سے اتارتے ہوئے میں کنول کماری ٹھاکر کو سر جھکائے بہت ہی دکھی اپنے سامنے بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا میری جیب میں راجندر کا خط تھا۔ راجندر نے کنول کی بے عزتی کی تھی۔ کم از کم کنول نے تو یہی کہا تھا کہ راجندر نے اس کا اپمان کیا تھا۔

کیا عورت سے اظہارِ محبت اس کا اپمان ہو جاتا ہے؟

گھوم پھر کر ہم اسی روشنی کے نقطے سے دور اندھیرے میں آ جاتے ہیں۔ کون سی راہ صحیح ہے۔ یورپ میں اگر عورت سے اظہارِ محبت نہ کرو، اگر اس کی طرف توجہ نہ دو، اگر اس کے حسن کی تعریف نہ کرو تو وہ تم سے نفرت کرنے لگے گی۔ اس کو اپنی بے عزتی تصور کرے گی۔ تمہارے اغماض کو کبھی نظر انداز نہ کرے گی اور ہمارے ہاں سب اس کے خلاف ہیں۔ تو کیا عورت کا خمیر دو مختلف مرکبوں سے اٹھایا گیا ہے؟ کیا عورت اسی حوا کی بیٹی اسی پاربتی کے بطن سے پیدا نہیں ہوئی، کیا آب و ہوا کا اثر رواجوں اور طریقوں کا اختلاف اتنا مختلف ہو سکتا ہے۔ عورت کی اصل کیا ہے؟ وہ کیوں ہے وہ کون ہے؟ کہاروں کے کندھوں پر لد کر جن دنوں عورت پھرتی تھی کیا ان دنوں ہماری زندگی زیادہ پرسکون اور زیادہ پرامن تھی یا اب؟ یہ سب سوال میرے دل کو اُلجھا رہے تھے۔

کافی میرے حلق میں بہت تلخ تھی۔ میرا منہ جل رہا تھا۔ یہ کڑوا سیال ہمارا اپنا نہیں تھا۔ پھر بھی ہم اس کو ایک تحفہ تصور کرتے تھے اور بہت شوق سے بہت غرور سے کافی پیتے تھے۔

خوشبودار تمباکو کا نیلا دھواں میرے نتھنوں میں گُھسا تو مجھے معلوم ہوا کہ ڈون وارٹن چرٹ پی رہا ہے۔ قربان گاہوں کا سا نیلا دھواں، بھگوان کے سر پر ڈالنے والی مندروں کی گمبھیرتا میں رہنے والی موہوم سی خوشبو ترچناپلی کے اس چرٹ سے نکل رہی تھی اور میں نے جان لیا کہ سب چیزوں کا اصل وجود ایک ہے۔ ایک اکائی، ایک وحدت، ایک ہی منزل، ایک ہی راہ۔

رات اتنی تیزی سے اپنی کشتی کھے رہی تھی۔ ڈون وارٹن بولا: ''چلو یہاں بیٹھ کر ہم زندگی کے مسائل حل نہیں کر سکتے۔ زندگی کے مسائل اتنے آسان نہیں ہیں جتنا تم سمجھتے ہو۔ ساری دنیا بھٹک رہی ہے۔ اس لیے آؤ باہر چلیں، سڑکوں پر گھومیں اور پھر من موہن کی طرف جھک کر بولا: ''شاید کوئی راہ مل جائے تو آگے ہی آگے لے جا سکے۔''

ہم تینوں اس اندھیری اور ستاروں بھری رات میں ہوٹل کی روشنیوں، پردے پر رقصاں جوڑوں اور روشنی کے سایوں کو چھوڑ کر باہر نکل آئے۔

من موہن کی سبز ڈاج کا رنگ رات کی سیاہی میں گہرا سبز لگ رہا تھا۔ اتنا گہرا کہ وہ سیاہی مائل نیلا ہو گیا تھا جیسے کرشن کنہیا کا رنگ مجھے، اپنی بہن دنیا یاد آ گئی۔ اس نے مرتے سمے کہا تھا، بھگوان کی آنکھوں کی سیاہی اندھیرے میں ہر شے سے چھو جاتی ہے۔ کیا ایسے لمحے، میں بھگوان کے سامنے تھا، مگر اس کی طرف جانے والے راستے کہاں تھے۔ کیا وہ وجود کے اندھیرے میں ایک شریر بچے کی طرح کہیں چھپا تھا جو اپنی ماں کو ستانے کے لیے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر

اس کی بے صبری دیکھتا تھا اور پھر جب وہ کھڑکی میں بیٹھی اپنے بھیگے بالوں کو سکھاتی رامائن پڑھتی تو ایک پھول کی طرح جھک کر جہاں وہ پڑھ رہی ہوتی ہے اسے اندھیرا کر دیتا ہے ماں اوپر دیکھتی تو اسے اپنا پیارا سندر اور موہن نظر آ جاتا ہے۔ ماں کی بے تاب آغوش کھل جاتی اور دونوں کا ملاپ ہو جاتا ہے تو بھگوان ہے کہاں؟

ہم تینوں لمبی ویران تنہا اور خاموش سڑک پر چلنے لگے۔

ڈون وارٹن نے کہا: ''مجھے تمہارے ہاں کی موسیقی بہت پسند ہے۔ ہمارے ہاں تو بھیایوں کے نغمے کے علاوہ سب چیخ و پکار ہے۔ دل کو مسلسل مصروف رکھنے کا ایک ذریعہ کود پھاند ہے اور کچھ نہیں۔ بس یہی تسلی کہ یہ میوزک ہے۔ ہم بازوؤں، گرم سانسوں اور روشنیوں میں بہے چلے جا رہے ہیں۔

من موہن نے آہستہ سے اس سے پوچھا: ''یار آج تم ہمارے ملک کی اتنی تعریف کیوں کیے جا رہے ہو؟ اپنے گھر کی کوئی بات کرو۔ جب تم یہاں ہوتے ہو تو ہندوستان کے گیت گاتے ہو پھر اپنے دیس کو لوٹ جاؤ گے تو ہندوستانیوں کے رواجوں ان کی عادتوں اور ان کے نظریے کے خلاف ایک زوردار کتاب لکھ دو گے، تم لوگ مخلص کیوں نہیں ہوتے۔''

اور ڈون وارٹن نے اُسے آہستگی سے جواب دیا۔ ''ہمارا دل کبھی ہماری کتابوں میں نہیں ہوتا۔ تمہاری عظمت ہمارا قلم نہیں لکھ سکتا۔ تمہاری عظمت ہمارا دل بھلا نہیں سکتا۔ ہمارے ہاں نئی راہوں سے بیک بار سفر کرنا پڑتا ہے۔ ہم ایک پراپیگنڈا ہیں۔ اگر یوں نہ ہو تو ہم جئیں کیونکر۔''

''اچھا!'' موہن نے زیر لب کہا۔ کتے کہیں زور زور سے بھونک رہے تھے۔ چوکیدار جاگتے رہنا ہوشیار رہنا کی صدائیں لگا رہے تھے۔ اور جمنا کی آغوش میں سویا ہوا شہر پرسکون بھی لگ رہا تھا۔ ہوا شام سے جو چل رہی تھی، تو ابھی تک تھمی نہ تھی۔ گو اس کی تیزی گم ہو گئی تھی۔ کبھی کبھار کوئی بگولہ تیزی سے بھاگتا ہمارے آگے سے نکل جاتا۔

موہن نے کہا: ''تو کیا تم ہماری موسیقی سنو گے؟''

''ہاں۔'' ڈون وارٹن نے کہا۔ ''مگر ایسے میں کہاں ہوگی موسیقی۔ رات دوسرے دن میں قدم رکھ چکی ہے۔ ہر طرف سناٹا ہے۔'' اس کی آواز میں بے یقینی نمایاں تھی۔

خاموشی سے چلتے ہوئے ہم دونوں من موہن کے ساتھ قدم بڑھا رہے تھے۔ یہ شخص یہ انگریز اسپین کے تاکستانوں اور سیاہ آنکھوں والی دوشیزاؤں کے دیس سے آیا تھا، شام تک یہ اکیلا بیٹھا شراب پیتا رہا اور اب یہ ہمارے ساتھ قدم بڑھا رہا تھا۔ ہم تینوں دنیا کے آخری انسان لگ رہے تھے۔ خالص محض صرف انسان...... ہندوستانی یورپی نہیں خدا کی زمین پر صرف انسان۔

ایک ایسی سڑک پر مڑ کر جہاں مکان بھی اکا دکا تھے، جہاں روشنی کے کھمبے بھی نہیں تھے من موہن نے کہا: ''موسیقی کبھی کبھار زندہ ہوتی ہے، کائنات کی موسیقی۔ راگ اور ابدیت۔''

ایک چھوٹے سے پھاٹک میں جو کھلا تھا گھس کر من موہن نے ہم سے کہا: ''تم لوگ سڑک پر ہی ٹھہرو۔'' اس گھر کے باہر باڑ ویران تھی، سوکھی ہوئی۔ درخت جو پھاٹک کے قریب تھا، لنڈ منڈ ننگا تھا۔ جیسے آس پاس ہر شے ننگی ہو اور شرمندہ ہو۔

ہم دونوں منتظر تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ ڈون وارٹن مجھے بتا رہا تھا کہ پیرس میں ایک رات پھرتے اور گھومتے اسے پولیس نے گرفتار کر لیا اور صبح تک حراست میں رکھا۔ یہ سوچ کر کہ میں ایک غیر ملکی جاسوس ہوں۔ میں ان دنوں اسپین سے سیر کرنے اور تفریح کی خاطر فرانس میں آیا تھا۔ اس رات مجھے اتنی کوفت ہوئی کہ میں پھر کبھی وہاں نہیں گیا اور سب سے زیادہ تو اس پولیس افسر کا رویہ تھا جو معلوم ہوتا تھا خدا کی طرف سے محض اسی کام کے لیے مامور تھا اور یہی کام اس کا شاہکار ہوگا۔ وہ اتنی سنجیدگی اور طمانیت سے ڈائری میں میرا نام پتہ درج کر رہا تھا، گویا ڈائری میں اس سے بڑھ کر اور کوئی قیمتی نام اس نے کبھی نہ لکھا ہوگا اور ڈون وارٹن اس کی نقل اتار کر مجھے بتانے لگا۔ ہم دونوں بے تحاشا زور زور سے ہنسنے لگے۔ پاس سے ایک کتا ہنسی کی آواز سن کر زور زور سے بھونکنے لگا۔ ستارے اور بھی تیزی سے چمکنے لگے۔

من موہن نے سڑک پر آ کر ہم سے کہا: ''چلو چل کے اندر بیٹھتے ہیں۔ میں ایک کمرہ کھلوا آیا ہوں۔ بائی جی ابھی سوئی تھیں۔ تھوڑی دیر میں اٹھ جائیں گی'' اور میں ڈون وارٹن کے پیچھے من موہن کے ساتھ اس ویران اداس اور ننگے گھر میں چلا گیا۔

کمرہ اتنا چھوٹا اور مکمل تھا جیسے کوئی تصویر ہو۔ دیواروں پر پرانے فرانسیسی شاہکار لگے تھے۔ ڈون وارٹن ایک دم تصویر کی طرف گیا اور پھر ہماری طرف مڑ کر کہنے لگا'' جانتے ہو دوستو یہ دونوں لاجواب شہکار ایسے ہیں جن کی تلاش میں میں دیس دیس گھوما ہوں۔ تمہاری بائی جی کے ہاتھ یہ کہاں سے لگے!'' اس نے من موہن سے پوچھا۔

اور من موہن نے کہا: ''یہ فن کار کا گھر ہے۔ یہاں چیزیں آسمان سے اترتی ہیں۔''

ڈون وارٹن ہمہ تن شوق اور محویت بنا تیز روشنی میں تصویروں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے

انہیں نگل جائے گا۔'' پھر حیرت سے ہماری طرف مڑ کر کہنے لگا: ''ان تصویروں کی قیمت لاکھوں روپے ہے۔ تمہاری بائی جی بہت امیر ہیں۔'' اس نے ایک بار پھر بے یقینی سے اپنے اردگرد دیکھا جیسے وہ گھر والی کی حیثیت اور تصویروں میں موازنہ نہ کر رہا ہو۔

کمرے کی ہر شے پرانی تھی مگر ایک پرانی اور نئی زندگی کے ساتھ قالین کی چمک ہیروں کی سی تھی اور سرخی سیاہی مائل گہری تھی اور اس میں ہم منتظر تھے۔

پھر ایک پردہ اٹھا اور کوئی عورت اندر آ گئی۔ یہ ایک صاعقہ تھا۔ ایک بجلی تھی، سویا سویا سا حسن، اتنی نوخیز اور الہڑ، رنگ میں ایک یاقوتی چمک جیسے فیروزے کی ہوتی ہے۔ شمع کی روشنی میں مدقوق کی سی نزاکت، آنکھیں بہت بڑی بڑی نہیں مگر نیچے سے اوپر نگاہ ہوتی تو جیسے مندر کا دروازہ کھل گیا ہو۔ مسکراہٹ میں شوخی نہیں شرارت نہیں، بے باکی نہیں اور نہ بناوٹ کی شرم نہ لبھانے کی کوشش۔

ڈون وارٹن نے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں اور من موہن کھڑے ہو گئے۔

بیٹھتے ہوئے بولیں: ''میں ابھی سوئی تھی آپ کو اتنی دیر منتظر رکھنے کی معافی چاہتی ہوں۔''

ڈون وارٹن ہمہ آنکھ تھا۔ اس کے جسم کا رواں رواں آنکھ بن کر بائی جی کو دیکھ رہا تھا اور پھر من موہن نے کہا: ''میں آج شام ہی آیا تھا۔ گزر رہا تھا کہ یہ دوست مل گئے۔ سوچا آپ کے درشن بھی ہوتے جائیں۔''

سر پر ڈھکے پلو کو درست کرتے ہوئے بائی جی نے کہا: ''بڑی کرپا کی آپ نے۔'' ناک میں ہیرے کی کیل ایک ننھے سورج کی طرح دمک رہی تھی۔ وہ ایک ایسا سحر تھا جس کو محسوس کر لو اور وہ تمہیں نگل جائے۔

بائی جی بولیں: ''آپ تو بہت دنوں کے بعد دکھائی دے پڑتے ہیں۔ کہیے کیا خدمت کروں آپ کی؟''

من موہن جو شوبھا کے ساتھ اتنی آزادی سے بات کرتا تھا، یہاں بے حد ادب سے سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ کوئی لفظ غلط نہ ہو، زیادہ نہ ہو اور فالتو نہ ہو۔ کہنے لگا: ''یہ ہمارے انگریز دوست ڈون وارٹن ہیں، انہیں اپنی موسیقی سے بہت لگاؤ ہے۔''

بائی جی مسکرا کر کہنے لگیں: ''اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔''

ڈون وارٹن ایک سحر زدہ پرندے کی طرح اپنی آنکھوں کو بائی جی کے چہرے پر نہیں اس

کے اردگرد گاڑے ہوئے تھا۔ وہ فرانسیسی شہکاروں کے پاس کھڑا تھا اور وہ دوسرے زندہ شاہکار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں جھپکے بغیر سانس لیے بغیر۔

''آپ تشریف رکھئے۔'' بائی جی نے ڈون وارٹن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اور خواب میں چلنے والوں کی طرح وہ جو انگریز تھا، جو دور دیس سے آیا تھا، جو حسن بہانہ جو کا عادی تھا جو ٹیمز کی لہروں میں موسیقی اور خوبصورتی کو بہتے دیکھتا تھا، وہ اسپین کی معشوقانِ سیاہ چشمان کا نظارہ کرتا تھا۔ ایک بندھے ہوئے آدمی کی طرف ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی گہرے سیاہی مائل سرخ ریشم کی تھی۔ ہر طرف سرخی تھی۔ جیسے شفق کی رنگینیاں اس کمرے میں اکٹھی ہو گئی ہوں اور وہ سانولی سلونی لڑکی جس کو میں ہرگز بائی جی سمجھنے کی جرأت نہیں کر سکتا، اس سرخی کے درمیان دبی دبی چمک سے ساری طرف جا رہی تھی۔ مجھ پر ایک بے ہوشی کا عالم طاری تھا۔ میں بات کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا۔ میں اپنے گرد صرف اس عورت کے موجود ہونے سے آگاہ تھا۔ مجھے اور کسی شے کی خبر نہیں۔

ہمارے ہاں ہندوستان میں گانے والیوں کا ایک خاص طبقہ ہے جن کے لیے بے باک ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ساز کے لیے گت۔

سلجھی ہوئی طبیعتیں، شرفا کی صحبتوں میں پہلے کسبیوں کے کوٹھے طبیعتوں کے لیے باغ کی ہوا کا کام کرتے تھے، پر اب تو کچھ باقی نہیں رہا۔ سب کچھ رخصت ہو رہا ہے۔

میں سوچ رہا تھا وہ شوخی اور بے باکی کہاں ہے۔ من موہن نے اس ہیرے کو اس ننگے ماحول اور اجاڑ گھر میں کہاں سے ڈھونڈ لیا ہے کیا وہ کوئی مندر کی دیوداسی ہے؟

مگر نہیں اس نے تو کہا تھا: ''بائی جی'' من موہن نے سرِ شام ڈون وارٹن کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا تھا، اس لیے کہ اس نے ہندوستان کی عورت کا اپمان کیا تھا اور جب رات ڈھل گئی تاروں کا نور ہر طرف پھیل گیا۔ آسمان کی ظلمت گہری ہو گئی، صدائیں خاموش ہو گئیں، ساز تھم گئے تو وہ ہم کو ہندوستان کی ایک عورت کے گھر لے گیا۔ کیا وہ ہندوستان کی عورت تھی، کیا وہ ہندوستان کی روح تھی۔ وہ یقیناً مشرق کی ان روایتوں سے دور تھی جہاں عورت کے لیے گھر سے باہر دہلیز پر قدم رکھنا بھی ایک قہر ہے۔ جہاں سیتا اگر رام چندر کی کھینچی ہوئی لکیر سے باہر ہو جاتی ہے تو راون کے ہاتھوں گرفتار ہوتی ہے۔ وہ مغرب کی اس عورت سے بھی اتنا ہی دور تھی۔ وہ روایتی بائیوں سے بھی بلند اور دور تھی آخر وہ کیا تھی؟

من موہن آہستہ آہستہ سنبھل کر ادب سے بول رہا تھا۔ میں بائی جی کی آواز کو کس شے سے تشبیہ دوں۔ میرے پاس طاقت نہیں' میرے پاس لفظ نہیں ہیں۔

پھر وہی پردہ اٹھا اور ایک خادم کمرے میں آ گیا۔ ایک بڑے سے طشت میں کھانے کی چیزیں تھیں جنہیں اتنے قرینے سے رکھا گیا تھا کہ کچھ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

من موہن نے کہا: ''آپ نے یہ کیا تکلیف کی۔''

اور بائی جی نے کہا: ''اتنی رات گئے میں اور کچھ نہیں کر سکتی اور پھر طشت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''شوق فرمائیے۔''

یہاں کوئی دلال نہیں تھا۔ کوئی نائیکہ نہ تھی۔ کوئی ایسا نشان نہ تھا جس سے ان حکایتوں کی تصدیق ہوتی جو بائیوں' کوٹھوں اور کھولیوں کے ساتھ وابستہ ہیں اور میں سوچ رہا تھا' جانے لوگ ایسے حسن کو اپنی زندگی سے الگ کس طرح کر دیتے ہیں یا پھر اس توبہ شکن صورت سے اپنے لیے خطرہ ہوتا ہے اس لیے یہ انہیں عام زندگی سے دور کر دیتے ہیں' کوئی تو بات ہے۔ یہ عورت جس کو کسی طرح عورت نہیں کہا جا سکتا۔

ایسی عورت کے لیے تو یہ تعریف ہے کہ وہ بھاری بھرکم ہو' رعب اور بڑی عمر کی ہو اور زمانے کے سرد و گرم دیکھے ہوئے ہو' چہرے پر ایک پختگی ہو اور اس صورت پر بھولپن تھا' کچی کلیوں کی سی خوشبو تھی' وہ بانکپن جو بائیوں کی صورتوں کے لیے ضروری ہے۔ وہاں کہیں نظر نہیں آتا۔ اپنے سر کو پلو سے ڈھانپے وہ ایک ایسی لڑکی کی طرح بیٹھی تھی جس کا خاوند گھر پر موجود نہ ہو اور جو اس کی عدم موجودگی میں اس کے دوستوں کی خاطر داری کرنے کے لیے مجبور ہو۔

طشتریوں میں خشک میوے تھے اور بڑے ہی مزے دار کرارے پان تھے۔ بائی جی نے ڈون وارٹن سے پوچھا: ''آپ نو وارد تو نہیں جان پڑتے۔''

''نہیں میں دو سال سے اس ملک میں گھوم رہا ہوں میں بدھ مت کا مطالعہ کرنے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔''

''بدھ مت کا مطالعہ پھر کر چکے۔'' اب انہوں نے بڑی آہستگی سے پوچھا۔

ڈون وارٹن کو جیسے ہوش آ رہا تھا۔ وہ بھی اسی طرح سنبھل سنبھل کر مگر جھجکے بنا آہستہ آہستہ جواب دے رہا تھا۔ ''مذہب کا مطالعہ صدیوں کا کام ہے اور پھر یہ مذہب تو اتنا پرانا ہے اس کے لیے بھی وقت چاہیے۔''

''الجھے ہوئے مسائل کو چھوڑیئے فرقوں کے مسائل تو کبھی حل نہ ہو سکیں گے اگر آپ کو بدھ کی صحیح تعلیمات کی ضرورت ہو تو صرف بدھ کی کتابوں اور اس کی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔''

''اس کے برعکس میں فرقوں کے مسائل سے اس اکائی کی طرف بڑھ رہا ہوں جو بدھ مت کے پیروکار کی زندگی ہے۔''

''اپنا اپنا طریق ہے۔'' بائی جی پھر کہنے لگیں: ''مگر ایک سے زیادہ کی طرف جانے سے کام آسان ہو جاتا ہے اور پھر پہلے دس بیس سالوں کے بعد ہر مذہب مختلف فرقوں نظریوں اور آراء کا شکار ہو جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈون وارٹن چپ ہو گیا تھا۔

بائی جی بولیں: ''ویسے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے آپ صرف سیر کرنے نہیں بلکہ کسی خاص مقصد کو لے کر ہمارے ہاں آئے ہیں۔ آپ تو ہمارے سب سے بڑے مہمان ہیں' اگر آپ کو ان مسائل پر علمی نسخوں کی ضرورت ہو تو پرانا کتب خانہ آپ کی امداد کر سکے گا۔''

میں اور ڈون وارٹن ان کی بجائے من موہن کو دیکھ رہے تھے۔ ہم دونوں ہی حیران تھے۔

اور ڈون وارٹن نے مودبانہ سر جھکا کر ان سے مدد لینے کا وعدہ کر لیا۔

پھر ہنس کر بولیں: ''آپ لوگ تو کچھ کھا ہی نہیں رہے۔'' اور میں سوچ رہا تھا یہ الہڑ پن یہ نوخیزی ملوکیت' معصومیت اور پھر کتب خانہ سمجھ ہی نہیں آتا کیا بات ہے۔ کیا کسی جادو کے زور سے من موہن ہمیں کسی اور دنیا میں لے آیا ہے جہاں سدا شباب رہتا ہے' جہاں کی ہر شے میں تازگی ندارت اور حسن ہے یا پھر کیا یہ رات کا جادو ہے جو ہمیں ہر شے بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔

سازندے آ گئے اور بائی جی نے قالین پر بیٹھ کر ستار پکڑا۔ پھر ڈون وارٹن کی طرف دیکھ کر کہنے لگیں: ''ہر ملک کی موسیقی میں ایک سحر ہے جیسے ہر ملک کے باشندے کے الگ نظریے ہیں' مگر میں سمجھتی ہوں پھر بھی موسیقی کا بنیادی کام روح کے اس اندھیرے کو ہلانا ہے جو ہر آدمی کے اندر ہے۔ ہمارے ہاں مہاتماؤں' رشیوں' منیوں نے گیت کا سہارا لیا ہے۔

ہمارے ہاں موسیقی ایک سہارا ہے۔ کُل مذہب نہیں وہ کل آتما کی طرح خود مذہب ہے۔ ہماری موسیقی مذہب کی پیدائش ہے اور اس لیے اسے سمجھنے کے لیے بھی دھرم کے گہرے

مطالعے کی ضرورت ہے۔ راگ میں بھی مذہب کی طرح رخنہ اندازیاں ہونے لگی ہیں مگر اصلاً وہ اب بھی اسی چیز کا نام ہے جو پرماتما کی روح ہے۔''

ہم تینوں ہمہ تن گوش تھے۔

پھر آہستہ آہستہ طبلوں پر تھاپ پڑی۔ ستار کے تاروں میں بائی جی نے سر ملایا۔ تان اڑنے لگی۔ رات کی گوری کا الاپ ہونے لگا۔ اتنا ستھرا اور صاف گلا میں نے پھر کبھی نہیں سنا۔ راگ ہر شے پر اثر رہا تھا۔ راگ ہر شے پر بہہ رہا تھا۔ میرا خیال ہے وہ وجد نہیں تھا اور میں اب بھی کہہ سکتا ہوں کہ اتنی دیر میں مدہوش رہا تھا بائی جی کا راگ کسی فانی عورت کے حلق سے نہیں نکل سکتا' یا پھر ہم ہی اس سحر کو محسوس کرنے کے لیے آئے تھے اور اس جادو میں کھو گئے تھے۔

بائی جی ایک سچے بھگت کی طرح آنکھیں بند کیے ستار کو پکڑے دوزانو بیٹھی تھیں اور مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ ہم سے بے خبر سازندوں سے بھی بے پروا اپنے آپ کو بھگوان کے چرنوں میں دیکھ رہی تھیں۔ وہ راگ میں گھل رہی تھیں۔ وہ راگ میں مل رہی تھیں۔ وہ تال گت اور لے میں کھو گئی تھیں تو کیا وہ ایسے میں روح کے اس اندھیکار سے روشنی کے اس نقطے کی طرف سفر کر رہی تھیں۔ اس وقت مجھے کنول ٹھاکر یاد نہیں آئی۔ مجھے کوئی یاد نہیں آیا۔ میں کسی شے کو یاد نہیں رکھ سکتا تھا۔ کیا ہم آگے ہی آگے اپنے اندھیروں میں سفر کر رہے تھے۔ کیا بہت سے راستے مل کر اکائی بن گئے تھے۔ ایک ہو گئے تھے۔

پھر سازوں کی لے تھم گئی اور بائی جی نے مسکرا کر آنکھیں کھول کر ہماری طرف دیکھا۔ اس مسکراہٹ میں کیا تھا کہ میں پھر اپنے آپ کو بھول گیا۔ میرا وجود میرا اپنا نہیں تھا۔ میں ایک نقطے کی طرح ایک مغنی کی طرح راگ کے سوز میں فنا ہو گیا تھا۔ میں ایک راگ بن گیا تھا' جس سے گیت اپنا راستہ بناتا ہے۔ میں کہیں نہیں تھا۔ وہاں ڈون وارٹن بھی نہیں تھا۔ وہاں من موہن بھی نہیں تھا اور وہ بائی جی ابد کی ایک روح دنیا کی ایک آتما کی طرح کتنی شانتی سے مسکرا رہی تھیں۔

طبلہ بجانے والے رخصت ہو گئے۔ بائی جی اسی طرح سر ڈھانپ کر بیٹھی اپنے سوئے ہوئے حسن اپنی نوخیزی اور مندر کے دوار کی سی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ منتظر تھیں کہ ہم کچھ بولیں۔

شاید اور کہنے کے لیے بھی کچھ نہیں رہا تھا۔ ہم جانے کے لیے اٹھے' بائی جی نے وہ دونوں فرانسیسی مصوری کے شاہکار اتارے اور ڈون وارٹن کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولیں: ''یہ میری طرف سے تحفہ ہے۔''

اس انگریز کو جیسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹا۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی جسے اس نے اپنے ہاتھ سے روک لیا۔ شاید اس نے کبھی خواب میں بھی یہ تصور نہیں کیا ہوگا کہ وہ دونوں قیمتی اور لاکھوں سے بھی زیادہ مہنگی تصویریں اسے یوں کسی ہاتھ سے تحفتاً مل سکیں گی۔

مگر بائی جی نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا: ''آپ ہمارے مہمان ہیں اور مہمان کے لیے میں اس وقت کیا کر سکتی ہوں۔ رات ہے اور یہ ناچیز سی تصویریں ہی ہیں۔ آپ ان کو بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ یہ آپ کو بہت پسند ہیں نا۔ لے لیجیے۔ میرا دل رکھنے کو ہی سہی انہیں قبول کر لیجیے۔''

ڈون وارٹن نے ایک سہمے ہوئے بچے کی طرح جو چیز لیتے ہوئے اپنی ماں سے ڈر رہا ہو کہ شاید وہ اسے ڈانٹ نہ دے۔ آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ بڑھایا۔ شاید وہ ہاتھ سو گیا تھا۔ ڈون وارٹن جاگ رہا تھا کیونکہ اس نے تصویریں پکڑ لیں اور پھر اسی آہستگی سے کبھی تصویروں کو کبھی اپنے آپ کو اور کبھی بائی جی کو دیکھنے لگا۔ وہ ایسے میں ایک بھکاری لگ رہا تھا جو بھیک لینے جائے اور اسے کوئی بادشاہت کا پیغام دے دے۔ اس کے سر پر کوئی تاج رکھ دے اور پھر جھک کر اس نے بائی جی کے قدم چھو لیے۔ بائی جی نے اس کو اٹھانے کے لیے جھکنے کی بجائے اپنے پاؤں پرے کر لیے۔ وہ دونوں پاؤں سانولی سلونی عورت کے ننگے پاؤں کنول میں رہنے والی دیوی کے پاؤں کی طرح تھے اور کہنے لگیں: ''کیا کرتے ہیں آپ! مہمان کو ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ اٹھیے۔''

ڈون وارٹن اپنے اس سجدے سے آہستہ آہستہ اٹھا اور پھر کھڑا ہو گیا۔

بائی جی کہنے لگیں: ''اب آپ جائیے' آپ لوگوں کو آرام بھی تو کرنا ہوگا۔''

اور ہم تینوں میں اور من موہن' وارٹن کے ساتھ باہر نکل آئے۔

آخری راتوں کا چاند صبح کے قریب ایک تصویر کی طرح چمک رہا تھا اور آسمان میں لٹکا ہوا تھا۔ تارے دور دور تھے۔ درخت خاموش تھے۔ سفید بادلوں کے چند ٹکڑے درختوں کی خنکی شاخوں میں اٹکے ہوئے ستاروں کے ساتھ جھول رہے تھے اور ان کے ننگے ماحول میں کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید کوئی چھکڑا اس سوئی ہوئی ویران سڑک پر سے گزر رہا تھا۔ بیلوں کے گلے میں لٹکی گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ جیسے خواب میں چل رہے

ہوں اور ہم تینوں محض صرف انسان بہتی ہوئی ہوا کے ساتھ وہاں کھڑے دنیا کے تین آخری انسان لگ رہے تھے۔

ڈون وارٹن نے اس سڑک پر اپنے گرد اُڑتی ہوئی ہوا کے ساتھ چیخ کر کہا: ''میں نے ایک بہت اچھا خواب دیکھا ہے۔ او بوائے میں نے ایک خواب دیکھا ہے'' اور وہ من موہن کے کندھے پر جھک کر کہنے لگا۔ ''میں نے ہیلن کو خواب میں دیکھا ہے۔'' میں نے آنکھیں بند کیں اور ٹرائے کی ہیلن مجھے نظر آئی۔ میں تم کو اپنا خواب کیا بتاؤں۔'' اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

من موہن نے ہنس کر کہا: ''تم اس خواب میں کب سے کھوئے ہوئے ہو۔ کب تک کھوئے رہو گے؟''

اور ڈون وارٹن نے کہا: ''میں آج زندہ ہو گیا ہوں۔ میں آج جاگ گیا ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے خداوند خدا نے جس بادشاہت کا وعدہ کیا ہے وہ بالآخر آ گئی ہے، ورنہ میں کبھی ایسی خوبصورتی نہ دیکھ سکتا۔ او بوائے کیا میں زندہ ہوں۔''

اور من موہن نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا: ''ہاں تم زندہ ہو اب صبح ہونے والی ہے۔''

چھکڑا نزدیک آ گیا تھا۔ بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ ان کے بھاری قدموں کے نیچے سڑک ہل رہی تھی۔ اور چوں چوں کی آواز نزدیک آ رہی تھی۔

چھکڑا ہمارے قریب سے گزرا تو اس میں سے کراہنے کی آواز سنائی دی جیسے کوئی سوئے ہوئے رو رہا ہو۔ جیسے کوئی خواب میں کراہ رہا ہو۔ ایک شخص جس کے کپڑے چیتھڑے تھے، ننگے سر بیٹھا بیلوں کو ہانک رہا تھا اور صبح کی سرد ہوا میں اس کے دانت بج رہے تھے۔ ہم تینوں وہاں کھڑے اس چھکڑے کو گزرتا دیکھتے رہے۔ ہمارے پاس سے کراہ ایک چیخ بن کر گزری۔

من موہن نے تیزی سے قدم بڑھا کر اس گاڑی بان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا: ''کیا بات ہے گاڑی میں کون ہے؟''

گاڑی بان نے بدستور بیلوں کو ہانکتے ہوئے کہا: ''ہماری بائی جی ہیں۔''

''کہاں سے لا رہے ہو انہیں؟''

''اپنے گاؤں سے۔''

''کیا بات ہے کیا یہ بہت بیمار ہیں؟'' من موہن نے پھر پوچھا۔

''ہاں بہت بیمار ہیں۔''

''کہاں لے جاؤ گے؟''

''وید جی کے پاس۔''

''یہاں سے دو میل دور ان کا گھر۔''

''پہلے کیوں نہیں لائے اپنی بائی جی کو۔''

''ہم نے سوچا تھا یہ ٹھیک ہو جائیں گی، پھر یہ اور بیمار ہو گئیں۔'' چھکڑا اب ٹھہر گیا تھا اور کراہنے کی آواز جو ہچکولوں کے ساتھ کم سنائی دیتی تھی، اب واضح ہو گئی تھی۔ کرب کے مارے بے قراری سے روح اور تڑپ رہی تھی۔

من موہن نے کہا: ''کیا میں پردہ ہٹا کر تمہاری بائی جی کو دیکھ لوں؟''

لڑکے نے بڑی بے یقینی سے ہم تینوں کی طرف دیکھا۔ چاند کی طرف دیکھا۔ شاید وہ یہ اندازہ کر رہا ہو گا کہ صبح قریب ہے اور یہ لوگ بائی جی کا اتنی بیمار اور کراہتی ہوئی بائی جی کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ پھر اس نے سر کے اشارے سے کہا: ''نہیں!''

کراہنے اور رونے کی آواز بدستور آ رہی تھی۔

من موہن بولا: ''اچھا بھائی تمہاری مرضی!'' پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ہوٹل یہاں سے دو میل تو ہو گا ہی اگر موٹر ہوتی تو بائی جی ذرا جلد وید جی کے پاس جا سکتیں۔'' اور پھر لڑکے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ''تم کس سڑک سے جا رہے ہو۔ وید جی کے ہاں؟''

''سیدھی سڑک سے۔'' لڑکے نے اشارے سے بتایا۔

''میں اپنی موٹر لے کر آتا ہوں تم کو راستے میں ملوں گا۔''

یہ کہہ کر من موہن تیزی سے بھاگنے کے انداز میں چلنے لگا۔ اس کے پیچھے میں اور ڈون وارٹن بھی بھاگنے لگے۔ درخت بھاگنے لگے، کائنات کی ہر شے اس دوڑ میں ہمارے ساتھ شامل ہو گئی۔

صبح کا ستارہ اُفق کے قریب کانپنے لگا تھا۔ ہوا کی خنکی خوشگواری میں بدل گئی تھی، جب ہم اور من موہن بائی جی کو اسپتال لے کر پہنچے ہیں تو وہ بدستور کراہ رہی تھی۔ انگریز ڈاکٹر نے باہر نکل کر آنکھیں ملتے ہوئے کہا: ''کیا کوئی بہت ہی سنجیدہ قسم کا دکھ ہے انہیں۔''

اور من موہن نے میری طرف دیکھا' ہم کیا بتا سکتے تھے۔

پھر وہ پھٹے کپڑوں والا لڑکا آگے بڑھا' جسے دیکھ کر ڈاکٹر کے چہرے پر حقارت سی آ گئی۔ کہنے لگا۔

''یہ دو مہینوں سے بیمار ہیں۔''

اور ڈاکٹر نے کہا: ''کیا بیماری ہے۔ پہلے کیوں نہیں لائے؟'' وہ پھر ہم سے مخاطب تھا۔

من موہن نے کہا: ''آپ انہیں دیکھ لیجئے۔ گاؤں کے لوگ کیا بتا سکتے ہیں۔ یہ لڑکا تو سب سے چھوٹا ہے۔''

ڈاکٹر ان منے دل سے بائی جی کو دیکھنے لگا۔

من موہن نے منہ دوسری طرف کر لیا' مگر اس عورت کو دیکھتا رہا جس کو لڑکا بائی جی کہہ رہا تھا۔ مرجھایا ہوا' مردہ مسلا ہوا پھول کبھی تم نے دیکھا ہوگا۔

ڈاکٹر دیر تک آلے لگا لگا کر انہیں دیکھتا رہا اور پھر کہنے لگا' جان ابھی باقی ہے' اگر زندہ رہیں تو بارہوں گی۔''

من موہن نے میری طرف دیکھا اور پھر کہنے لگا: ''آپ کوشش تو کیجئے' انہیں کسی طرح بچا لیجئے۔'' اس کے چہرے پر اتنا کرب تھا جیسے اس کے وجود کا کوئی حصہ مر رہا ہو اور وہ اسے زندہ کرنا چاہتا ہو۔

دو ایک نرسیں زندہ ممیوں کی طرح چپ چاپ سامنے کی طرف دیکھتی ہمارے قریب سے گزر گئیں اور مجھے کیٹس کی ایک طویل نظم یاد آ گئی۔ قطار اندر قطار مرے ہوئے لوگ قبروں کی صلیبوں کے نیچے دعا میں مصروف ہوں گے۔ ان سیاہ دوزخی سطروں میں بند' سورما حسین عورتیں' گونگے لفظوں میں دعا کرتے اور میں سوچتے ہوئے ڈر رہا تھا' کانپ رہا تھا کہ وہ کیسے اپنے پتھریلے بھاری لباس میں کانپ رہے ہوں گے۔''

مجھے مصر کی ممیاں یاد آ گئیں۔ مجھے فرعون یاد آ گیا۔ مجھے مصریوں کی دیوی آئسس یاد آ گئی۔ وہ خوبصورت اور جوان سورج کی بیٹی جس کا ہم عصر زمانے میں کبھی پیدا نہیں ہوا۔ فرعون ایک بادشاہ نہیں' ایک زمانہ نہیں' زندگی کا ایک نظریہ تھا اور اس کی حنوط شدہ لاش کے پھر سے پائے جانے سے مراد ہے کہ وہ نظریہ اب تک زندہ ہے۔ فرعون حیات کے ان کناروں سے اغماض کا نام ہے جو ہمارے تجربے کی حدوں سے باہر ہمیں نظر نہ آنے والے اور اندھیرے ہیں۔

پھر کیا باقی سب کچھ روشن جانا پہچانا اور معلوم ہے؟

ہستی میں یہ تگ و تاز' یہ کشمکش' یہ زندگی اور موت کے درمیان جنگ' یہ کیوں ہے؟ اگر سب کچھ سامنے واضح اور روشن ہے' فرعون ایک غلطی ہے' اندھیرے میں ایک اور اندھیرا ہے' مگر اس اندھیرے میں اہرام ہیں' صحرائیں' اونٹوں کی قطار اندر قطار کارواں ہیں۔ کھجور کے درخت ہیں' صحراؤں میں ایک روح ہے جو ہر سفر کرنے والے سے راہ روک کر پوچھتی ہے' بتاؤ وہ کون سا جانور ہے جو شروع میں چار پاؤں پر پھر دو پاؤں پر اور آخر میں تین پاؤں پر چلتا ہے؟

کوئی جواب نہیں دے سکتا اور وہ صحراؤں کی روح جو خوبصورت عورت ہے' اس کی آنکھوں کے سامنے اپنا خونی پنجہ رکھ دیتی ہے اور وہ وہیں سو جاتا ہے' کبھی نہ جاگنے کے لیے۔

یہ زندگی کا سوال ہے اور اس کا جواب کوئی نہیں جانتا' کیونکہ کوئی یہ نہیں جان سکتا کہ وہ جانور ہے وہ بھی اپنی طرح دوسروں کا خون پینے والا ایک درندہ ہے۔ وہ بھی دوسروں کی خوشیوں کو سمیٹ کر اپنا گھر سجانے والا ایک پرندہ ہے یا پھر وہ ایک بچہ ہے جو دوسرے بچوں کے پاس اچھی چیز دیکھ کر ضد کرتا' روتا اور زمین پر لوٹنے لگتا ہے۔

مصر کلوپیٹرا کا گھر ہے۔ مصر تیل کا گھر ہے۔ مگر نیل میں حسین کنواریاں دلہن بنا کر بہائی جاتی ہیں اور کلوپیٹرا نیل کے کناروں پر روشنیوں کے باوجود اندھوں کی طرح بھاگتی' گرتی' اٹھتی اور چیختی ہے کیونکہ اس کا انطونی قتل کر دیا گیا ہے۔ وہ کیسی روشنی ہے اور یہ کیسا اندھیرا ہے؟

وہ معبود کہاں ہیں جن کو مصریوں کے عہدوں میں خداؤں کا درجہ دے دیا گیا تھا؟

وہ بھگوان کہاں ہے جسے ہندوستانیوں نے اپنے مندروں میں شکتی اور طاقت کا روپ قرار دے دیا؟

کیا سب شکتیاں پتھر ہیں' کیا پتھر کے اندر کوئی روشنی نہیں۔ کیا آسمان سے پرے کوئی نہیں رہتا؟

یہ سوال میرے سینے میں چکر لگا رہے ہیں کیونکہ گاؤں سے ایک رینگتے ہوئے روتے ہوئے آہستہ چلتے چھکڑے میں آنے والی بائی جی مر رہی ہیں۔ ڈاکٹر کی کوشش کے باوجود مر رہی ہیں۔

اے مندر کے دیوتاؤ! اے اتم شکتیو! تم کہاں ہو؟

کیا انسان ایک جانور ہے جسے بے دردی سے دکھ کے تیروں کا نشانہ بنا لیا جائے۔ کیا

انسان صحراؤں کی روح کے خونی پنجے سے ہی مر جاتا ہے اور کبھی اپنے سفر کے اختتام تک اپنی منزل کے انجام تک نہیں پہنچ سکتا؟

سفید پتھریلے لباسوں میں نرسیں بھاگ رہی ہیں کیونکہ من موہن کے ہاتھ میں روپے ہیں، دولت ہے اور وہ ابھی تک سبز ڈاج پر ہاتھ رکھے کھڑا ہے۔

پھر ڈاکٹر آ کر کہتا ہے: ''چلئے آپ لوگوں کو مریضہ نے بلایا ہے۔''

اور ہم نرس کے پیچھے ڈاکٹر کے ہمراہ ایک بالکل اجنبی عورت سے پہلی بار جب وہ مر رہی تھی، مل رہے تھے۔

عورت نے اپنی احسان مند نگاہیں اٹھا کر میری اور پھر من موہن کی طرف دیکھا۔ اس کی آواز رک رک کر نکل رہی تھی۔ اس نے کہا: ''ذرا قریب آؤ، اب موت ہے اور میں بے ضرر ہوں، ذرا میرے قریب آؤ۔''

من موہن اس کے قریب ہو گیا۔ عورت نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ ماتھے کے قریب لے جا کر بولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ''بھگوان کی یہی مرضی تھی کہ ہم ایسے میں ملیں اور بچھڑ جائیں۔''

وہ پھر چُپ ہو گئی۔

''میرے پاس پہلے بھی کچھ نہیں تھا، اب بھی کچھ نہیں ہے۔ یہ جسم جواب مر رہا ہے۔ صرف یہی ایک شے میرے پاس رہی ہے۔ یہی میری دولت تھی۔''

''یہ دولت دنیا کی نگاہوں سے چھپانے کی تھی۔ پر میں نے اسے لٹا دیا اور اب میں مر رہی ہوں۔ اکیلی، اکیلی، ایسے میں بھگوان نے تمہیں بھیج دیا۔ مرنے والوں کی پرواہ کون کرتا ہے۔''

''اس لکڑی کے ڈبے میں میرے چند خط ہیں، یادداشتیں ہیں، یہ تمہارے سپرد ہیں۔''

من موہن کا چہرہ شدت رنج سے سرخ ہو رہا تھا، مگر اس نے سر کے اشارے سے ہاں کہہ دیا۔

اور پھر سورج کی پہلی کرن کے ساتھ میری بہن دنیا کی طرح اپنے مضمحل پھول سے چہرے پر روشنی کی شعاعوں کی نرمی محسوس کرتی آنکھیں بند کر کے چپ ہو گئی۔ صحراؤں کی روح نے اس کی آنکھوں کے سامنے اپنا خونی پنجہ ہلا دیا تھا۔ آئسس سورج دیوتا کی بیٹی نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

زمیں اسی برفانی بے حسی سے اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں۔ ان کے لیے ایک نیا دن طلوع ہو گیا تھا۔

لاش کو چھکڑے میں رکھ دیا گیا اور وہ لڑکا بیلوں کو ہانکتا اسی طویل سڑک پر اپنے گاؤں کی طرف چلا گیا۔ کیا یہ دنیا کے دکھ ختم ہو گئے تھے۔ کیا ابدیت کے اندھیرے میں سکون ہے؟ کیا موت کی آغوش میں ٹھنڈک ہے؟

زندگی ایک ناؤ ہے جس پر راتیں لہروں کی طرح گزر جاتی ہیں۔ ہماری زندگی میں دائرے ہیں۔ لہریں ہیں اور بہاؤ ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو موت ہو یا حیات مرنا ہو یا جینا راتیں گزر جاتی ہیں۔ جانے کب سے کتنے زمانوں سے چپ چاپ' خاموش' اُداس طوفانی راتیں یونہی گزرتی آئی ہیں۔ آسمان دھات کا نیلا خول بالکل ساکن ان گزرنے والی راتوں کو ہمارے سر پر گراتا ہے۔ وقت کبھی نہیں تھمتا۔

اور میں آج بھی سوچتا ہوں وہ رات جب میں اور ڈون وارٹن من موہن کے ساتھ بائی جی کے گھر گئے تھے' کتنی پیچھے رہ گئی ہے۔ بہنے والی ناؤ آگے ہی آگے جا رہی ہے اور لہریں بھی تو آگے ہی آگے بہہ رہی ہیں۔ کیا وہ رات پیچھے ہے یا ہم؟

کبھی کبھار تو ایسا لگتا ہے جیسے زمانہ نہیں ہم گزر رہے ہیں۔

اور آج بھی اس تاریکی میں مجھے لگ رہا ہے جیسے میں ایک گزرا ہوا زمانہ اور بیتا ہوا وقت ہوں۔ جب وہ لوگ اپنے پاس نہ رہیں جو اپنے تھے تو وقت تھم جایا کرتا ہے۔ ہم گزرتے ہیں' وقت کی حدوں سے پار زندگی کی حدوں سے پار اصل میں ہم گزرتے ہیں اور پھر بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اصل بات کیا ہے۔ کون پار اترتا ہے۔ زمانہ یا ہم؟

اب تو وہ ساری باتیں کتنی بے یقینی اور فرسودہ خیالوں کی طرح بڑی پرانی اور دُور دراز کی لگتی ہیں۔ پھر بینا سسرال جا چکی ہے اور میں اکیلا اپنے بھرے پُرے گھر میں چند راتوں کی دولت کو دامن میں لیے کھڑا ہوں۔ بھکاری جیسے سارے دن کے بعد کسی کونے میں کھڑا ہو کر ڈرتے ڈرتے اپنے کشکول کو جانچے اسی طرح میں سہما سہما اپنی زندگی کے پیالے کی طرف دیکھ رہا ہوں' جہاں صرف چند زمانے ہیں' چند گھڑیاں ہیں' چند دن ہیں۔

کسی نے کہا ''مالی میرے پاس ایک پھول تھا' بڑا شوخ' بڑا سندر اور بہت خوشبودار۔

پھول بیچو گے' میں دیوتا کے درشن کے لیے جا رہا ہوں۔ اس کے چرنوں میں تمہارا پھول چڑھاؤں گا'' اس نے قیمت کم دی تھی۔ آگے بڑھتا گیا۔

پھر ایک درباری آیا۔ اس نے کہا'' مالی پھول بیچو گے۔ میں بھگوان کے مندر جا رہا ہوں۔ درشن کر کے تمہارا پھول مورتی پر چڑھاؤں گا۔'' اس نے دگنی قیمت دی تھی۔ پر میں آگے بڑھتا گیا۔

پھر بادشاہ گزرا' اس نے بھی کہا'' مالی پھول دو گے۔ میں اپنے پرماتما کے گھر جا رہا ہوں۔ درشن پا کر تمہارا پھول اس کے سر اتاروں گا'' اس نے مجھے بہت زیادہ قیمت دی پر میں آگے بڑھتا گیا۔

اور میں نے اپنا پھول خود چھوٹے مندر میں اپنے بھگوان کے سامنے رکھ دیا اور پھر ماتھا ٹیک کر باہر آ گیا۔

میں اکیلا ہوں۔ میں خالی ہاتھ ہوں۔ پر میرا پھول بھگوان کے چرنوں کو چھو چکا ہے۔ یہ تسلی کافی نہیں کہ اس نے جو سب سے بڑا ہے۔ میرے پھول کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر اسے سویکار کیا ہو گا؟

میں نے اپنا پھول کسی کو نہیں دیا تھا' اس لیے میرے دامن میں دولت نہیں طمانیت ہے پر یہ تسلی بھی کب تک ساتھ دے گی؟

کیا محبت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا کر دل مطمئن ہو جایا کرتا ہے؟

کیا محبت کی قربان گاہ پر نیلی روشنیوں' خوشبوؤں اور گیتوں کے درمیان اپنے کو کسی عہد و پیمان کے حوالے کرنا ضروری ہے؟

رات کی خاموشی کا الاپ میرے کانوں میں ہے اور میں سوچ رہا ہوں جانے کیا سوچ رہا ہوں' موت و حیات کی گتھیاں کبھی سلجھ نہ سکیں اور دل قربان گاہوں کے دھوئیں میں مست ہو کر یونہی الاپتا رہا۔

آج مجھے راجندر بھی یاد آ رہا ہے اور پھر کنول کماری ٹھاکر بھی یاد آ رہی ہے۔ راجندر نے لکھا تھا۔

میں زندگی میں کسی بہار کا متمنی نہیں ہوں۔ میں آرزو سے بے چین نہیں ہوں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم میری زندگی میں کیا ہو۔ اس سے فرق تو کچھ نہیں پڑے گا کہ تم اس کاغذ

کے پرزے کو کیا کرو گی۔

تم تیز دھار کی ایک تلوار ہو، تمہیں مرد کی رفاقت، اس کی شفقت سے کیا واسطہ پر پھر بھی کبھی کبھار تلوار کند ہو جاتی ہے۔ اس پر صیقل کرنے کی ضرورت ہو جایا کرتی ہے۔ میں ایک پتھر ہوں۔ میں ایک نیام ہوں۔ میں ایک ڈھال ہوں۔ تمہاری آنکھوں کی چمک گہری ہے۔ تمہاری آنکھوں میں غرور ہے۔ مجھے ایک چمک کو نکھارنے نہ دو گی؟ مجھے اس غرور کو نرمی میں نہ بدلنے دو گی؟ تم باتیں کیا کرتی ہو اور میں سوچتا ہوں یہ نظریے تمہاری طرح اکیلے ہیں۔ کب تک ان کا ساتھ دے سکو گی۔ ان میں حرارت نہیں صرف وقتی راحت ہے۔ کتابوں میں خیالات ہیں اور خیالات میں روانی ہے۔ پر سوچو تو سہی ان میں خون نہیں ان میں جوانی نہیں، آخر پچھتانا پڑے گا۔ تم دنیا کو سنوارتی ہو، تمہارے عزم بلند ہیں۔ پر جب دنیا سنور نہ سکی تو تھک جاؤ گی اور بلندیاں کبھی پستیوں میں آملتی ہیں۔ مانتا ہوں تم بہادر ہو، تمہارے بازوؤں میں طاقت ہے۔ تم اپنی حفاظت خود کر سکتی ہو پر ایک زمانہ آجاتا ہے، جب بہادری بھی تھک جاتی ہے اور بازو اپنے گرد ڈھیلے ڈھیلے اکڑ جاتے ہیں۔ جب اپنے گھر کے سامنے بیٹھے بیٹھے حفاظت کرنے والا خود ہی اونگھ جاتا ہے۔ تم ستاروں کی طرح ہمیشہ حرکت سفر اور چلنے میں اپنی نجات سمجھتی ہو اور ستارے تو زمانوں سے چمک رہے ہیں۔ تم سورج کیوں نہیں بنتیں جو سُوریہ ہے، شکتی کا مظہر ہے اور پھر بھی ہر وقت چلتا نہیں رہتا، تھک جاتا ہے اور آرام کرتا ہے۔ زندگی کی راہ بہت لمبی اور منزل دور ہے۔ راستے کے ساتھیوں کے پاس اپنے لیے بھی زادِ راہ نہیں ہیں۔ تمہیں کب تک یاد رکھیں گے۔ مجھ سے سوگند اٹھوا لو وہ تمہارے سامنے ہی تمہیں بھول جائیں گے۔ تمہارا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ انسان بڑا خودغرض ہے۔ میں بھی انسان ہوں اور میں بھی خودغرض ہوں مگر میں تمہاری ساری طاقتوں سے اپنی تکمیل چاہتا ہوں۔ دیوتا بھی جب تک بھگت نہ ہوں اکیلا رہتا ہے۔ سوچو تو سہی یہ بات اتنی بری تو نہیں۔

تم آکاش کی طرح بلند ہو پر آکاش بھی دھرتی سے کہیں نہ کہیں ملتا ہے۔ تم اپنے سینے میں جس عورت کو چھپائے ہوئے اسے پردوں سے باہر لاؤ۔ آکاش ٹھنڈا ہے اور نیلا ہے۔ دھرتی پھولوں اور سمندروں، پہاڑوں اور ندیوں کے روپ بدلتی ہے۔ عورت کا دھرم اس کے پھلنے اور پھولنے میں ہے۔ دکھ اٹھانے اور اپنے سُونے پن کو دور کرنے میں ہے۔

مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے جب میں سوچتا ہوں تمہارا روپ شمشان کی آگ میں کسی دن

بھسم ہو جائے گا اور پھر راکھ بن کر گنگا کے پانی پر بہے گا۔ مانتا ہوں تم پھر اپنے رنگ بدلو گی پر اب سے ہی اس کا انتظام کیوں نہیں کرتیں۔

میں کون ہوں۔ میں اپنے آپ کو تم سے الگ دور اور نیچا سمجھتا ہوں پر اگر تم عورت ہو اور ندی کی روانی اس کے ڈھلوان کی طرف بہنے میں ہے تو تم میری طرف آؤ گی۔ میں اتنے یقین سے یہ لکھ رہا ہوں جیسے خود تمہیں کہہ رہا ہوں۔ عورت کا مان' اس کی شان بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے اور سورماؤں کی طرح میدان جنگ میں لڑنے سے نہیں ہے۔ اگر پرماتما نے عورت کو کچھ اور بنانے کا سوچا ہوتا تو کیا وہ اس میں سختی نہیں رکھ سکتا تھا۔ عورت خوشبو کی ایک لہر ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا ہے۔ تم اپنے میں کتنی بھی سختی پیدا کرنے کی کوشش کرو مگر اس سے انکار نہیں کر سکتیں۔

میں دو ماہ غائب رہا ہوں اور نہ جانے اس خط کے بعد تمہاری زندگی سے یکسر نکل جاؤں۔ اس خط کو پڑھ کر تمہیں غصہ تو بہت آئے گا اور ان سب باتوں کو سمجھنے کے باوجود سچ جاننے کے بعد تم اس سے انکار نہیں کرو گی۔ یہ عورت کی فطرت ہے۔ وہ ضد میں آ جائے تو اپنے آپ کو برباد کر لے گی پر کسی کی بات کبھی نہیں مانے گی۔

مگر کبھی ایسا بھی وقت آئے گا تم اپنے بلند بانگ مقاصد کے باوجود مجھے یاد کرو گی۔ تب میں بلند نہ ہونے کے باوجود تمہاری پہنچ سے دور ہوں گا۔ اس وقت تم میری کمی محسوس کرو گی۔ پر رونے اور فریاد کرنے سے بیتا وقت ہاتھ نہیں آئے گا اور اگر میری مانو تو غور کرو' تم خود بیت رہی ہو' تم اپنے دوار سے باہر جھانک کر شام کے اندھیروں میں کسی کا انتظار کیا کرو گی' پر تمہارے سُونے گھر میں کون آئے گا؟ پھر تم کواڑ بند کرو گی تو اندر بھی اندھیرا ہو گا۔

مگر تم اپنے جوش میں میری بات نہیں مانو گی۔ مجھے معلوم ہے میں نے زیادتی کی ہے۔ میں نے یعنی راجندر پرشاد نے کنول کماری ٹھاکر کا بڑا اپمان کیا ہے۔ پر جب تمہارے گرد اندھکار ہو گا تو یہی اپمان ایک دیئے کی طرح تمہاری سُونی راتوں میں ٹمٹمائے گا۔ عورت کا غرور اس کے چاہنے والے ہیں اور مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ تمہاری شان' عظمت' بلندی اور بزرگی کے باوجود میں نے تمہیں چاہنے کی جرأت کی ہے۔ میں تم سے ڈر کر پیچھے نہیں ہٹا۔ میں تمہارے اندھیرے میں چمکوں گا کبھی سہی۔

چند مہینوں بعد مجھے راجندر پرشاد ملا تھا۔ میں نے اس خط کا ذکر اس سے کبھی نہیں کیا۔

میں نے وہ تہہ بہ تہہ کاغذ کنول کماری تھا کر کو واپس دے دیا تھا۔ وہ اضمحلال جو محبت میں ناکامی پر چہرے کا ایک جزو بن جاتا ہے' راجندر کے چہرے پر کہیں نہیں تھا' اب وہ واپس آیا تو بدلا ہوا اور وہی قہقہے لگانے والا وجیہہ وشکیل مرد تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی' پر میں اس سرچشمے کا پتہ لگانا چاہتا تھا جس نے اسے پھر سے حیات ابدی عطا کر دی' اسے وہی بنا دیا جو وہ تھا' اس کے آنے پر دعوتیں ہوئیں' خوشیاں ہوئیں اور زندگی اپنی پرانی راہ پر بھاگنے لگی۔

ایک دن راجندر نے مجھ سے پوچھا تھا: ''تمہیں معلوم ہے غلط خواب دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟''

''نہیں' مجھے کیا معلوم۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں نے تو غلط خواب کبھی نہیں دیکھے۔ اصل تو یہ ہے کہ میں نے خواب ہی نہیں دیکھے۔''

راجندر نے حیرت سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''اور یہ جو تم دنیا کو سنوارنے' سدھارنے اور بدلنے کا پروگرام سا بنا رہے ہو' یہ کیا ہے؟''

''یہ کسی اور کے خواب ہیں جو میری راہوں سے گزر رہے ہیں بھائی۔'' میں نے اسے سمجھانے کی غرض سے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پر میری سمجھ میں نہیں آ سکتا' دوسرے کے خواب تمہاری راہوں سے کیسے گزرے۔''

''ارے بھائی۔'' میں نے تیزی سے قلم چلاتے اور اخباروں کو الٹتے پلٹتے کہا تھا۔ ''یہ ایسے خواب ہیں جن کی لپیٹ میں سارا زمانہ آ جاتا ہے۔ یہ سنہری خواب ہیں اور ان سے جو دوسرا کنارہ نظر آتا ہے بہت خوبصورت ہے۔''

''مجھے بھی اپنے خوابوں میں شریک کرلو۔'' اس نے پھر کہا۔

''تم بھی ہمارے خوابوں میں شریک ہو۔ کیا تم نے ابھی نہیں کہا کہ تم نے غلط خواب دیکھے ہیں۔ خوابوں کے متعلق یہ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سچ ثابت ہوں' پر خواب میں خواب ہیں۔'' میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اتنے مہینوں سے وہ اپنے اس سانحے کے متعلق خاموش تھا۔ وہ کنول سے ملنے بھی نہیں جاتا تھا۔ میں نے دو ایک بار اس سے کہا بھی کہ ''راجندر پرشاد' ایک اتنی عظیم عورت تمہارے پاس اِدھر اُدھر رہتی ہے۔ پہلے تو تم دن کا اکثر حصہ اُس کے ہاں گزارنا اپنی سعادت سمجھتے تھے' اب کیا بات ہے۔'' مگر اس نے ہمیشہ بہانہ کر دیا' بات

کوٹال گیا اور کبھی میرے ساتھ کنول سے ملنے نہیں گیا۔ میں حیران ہوں کبھی زندگی میں اس نے ایسی جرأت کی ہے۔ کبھی پھر' عورت ٹھوکر کھا جاتی ہے تو دوبارہ اسی آستان پر سجدہ کرتی ہے' مرد ٹھکرایا جاتا ہے تو زخمی ہرن کی طرح بھاگ کر کسی کونے میں روتا ہے اور جب تک زخم مندمل نہ ہو یا زخم جان لیوا نہ بن جائے وہ خود دکھائی نہیں دیتا۔

راجندر میری بات سن کر چپ رہا۔ پرانی اداسی کی لہر اس کی آنکھوں میں لوٹ آئی اور اسی طرح سیٹی بجاتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس دن باہر ایک ہنگامہ سا تھا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے۔ جلوس کی صورت میں پنڈال کی طرف جا رہے تھے۔ ایک دوسرے کے گلے مل رہے تھے' ایک عید کا سا سماں تھا۔

پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا: ''آؤ تمہیں چند اور سوئے ہوئے لوگ دکھاؤں۔''

میں تیزی سے گیا اور کھڑکی سے باہر جھانک کر اس ساری رونق کو دیکھ کر کہا اور میں نے اسے پوچھا: ''کہاں ہیں سوئے ہوئے لوگ مجھے تو نظر نہیں آتے؟''

اور وہ شاہ بلوط کا سا وجیہہ آدمی یعنی راجندر پرشاد مارے ہنسی کے جھوم کر کہنے لگا۔ ''کیا یہ پھول پہنے نعرے لگاتے اور پنڈال کی طرف گروہ در گروہ بڑھنے والے لوگ خواب نہیں دیکھ رہے۔ انسان سویا ہو تب ہی خواب دیکھتا ہے نا؟''

پھر میں اپنی کرسی پر آ بیٹھا تھا اور میں نے چند لمحے چپ رہنے پر کہا تھا: ''جاگتے کے خواب ہیں پر پھر بھی ہمیں ان پر زیادہ یقین ہوتا ہے۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے بھی کوئی غلط کام نہیں کیا۔ بس غلط خواب دیکھے ہیں۔'' سوتے کے خواب غلط ہوتے ہیں...... اور پھر اور بھی ٹھہر ٹھہر کر جیسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا: ''تمنائیں بھی تو خواب ہیں' ہماری آرزوئیں بھی جاگنے کے بھیانک خواب' پر مجھے یہ بتاؤ بھائی جب تمنائیں جھوٹ ثابت ہو جائیں پھر بھی اپنی جلن کے نشان دل میں کیوں چھوڑ جاتی ہیں آخر کیوں؟''

اور اس لمحے مجھے معلوم ہوا کہ ہنسی بھی ایک پرندہ ہے جس میں انسان اپنے غم چھپاتا ہے راجندر بدل نہیں گیا تھا' زخم کاری تھا اور مندمل ہونے کے بعد بھی اس میں کبھی کبھار پرانا دور لوٹ سکتا تھا' کیا میرے دل میں بھی پرانے جذبے کی دیوانگی اور ٹیس تھی مگر میں نے زندگی سے صلح کر لی تھی مگر میں کنول کماری ٹھاکر سے ملنے جاتا رہا ہوں۔ میں اس کے قریب ہوں اور پھر بھی میں یقین

سے نہیں کہہ سکتا کہ میں کہاں ہوں۔ میں نے بتایا کہ وہ میری زندگی میں ایک لمحے کے لیے بھی موجود نہیں ہے۔ کہیں بھی نہیں۔

اپنے سے صلح کیے بنا' زندگی سے کوئی معاہدہ کیے بغیر دن گزارنے بہت مشکل ہیں۔

پنڈال دفتر سے تھوڑی دوری پر تھا۔ بے تاب آواز میں شور آوازیں نہ جانے کیا کچھ سڑک پر سے گزرتا جا رہا تھا اور پھر رادھے کرشن کی سیاہ نیش وہاں آ کر رکی۔ وہ دفتر میں آ گیا اور مجھ سے کہنے لگا۔ ''آپ نہیں چل رہے ہیں جلسے میں؟''

میں مصروف تھا اور پھر نہ جانے جلسہ کیوں ہونے والا ہے۔ میں اکثر جلسوں سے کتراتا ہوں۔

مگر رادھے کرشن نے مجھے اور راجندر کو کھینچ کھانچ کر اپنی موٹر میں بٹھالیا۔ وہ کنول کے ہاں مجھ سے ملنے کے بعد اکثر دفتر میں آ جایا کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے اگلے دن ہی پوچھا تھا: ''آپ کنول کماری ٹھاکر کو کب سے جانتے ہیں؟''

اور میں نے کہا تھا: ''میں انہیں ان زمانوں سے جانتا ہوں جب یہ آپ سے نہیں ملی تھیں۔'' رادھے کرشن پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ڈگری یافتہ نہ سہی یونیورسٹیوں اور یورپ کے ملکوں میں گھوم کر اسے اخلاق و آداب سے خاصا علاقہ ہے۔ اس لیے اس نے مجھ سے پھر کنول کے متعلق سوال نہیں کیے۔ پر جب کبھی بیٹھتا تھا' اس کی بات ضرور کرتا تھا۔ وہ کنول کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔ شاید برے لوگ بھی نیکی اچھائی اور خوبصورتی کے مداح ہوتے ہیں اور ابلیس سے بڑھ کر دنیا کی خوبصورتی کا سراہنے والا کوئی نہیں۔ اسٹیج کے دونوں طرف بڑے لوگوں' عہدیداروں' افسروں اور کارخانہ داروں کے لیے کرسیاں تھیں۔ ورکر ادھر سے ادھر اسٹیج پر کسی ڈرامے میں کام کرنے والے کرداروں کی طرح گزر جاتے۔ مائیکروفون کو ٹھیک کیا جا رہا تھا۔ اسے ٹیسٹ کیا جاتا۔ ہیلو' ہیلو کی آواز آئی۔ پھر ٹھک ٹھک پھر ہیلو ہیلو۔ اوپر لگے شامیانے میں جھنڈیاں تھیں۔ میز پر سرخ گلابوں کے بڑے بڑے گلدستے تھے۔ لوگ دریوں پر بیٹھ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو ہاتھ کے اشاروں سے اپنے پاس بلا رہے تھے۔ عین بیچوں بیچ جو راستہ تھا' اس پر چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ دونوں طرف بانس گاڑ کر مناسب موقعوں پر ان پر بلب لگائے گئے تھے' جس سے مراد تھی جلسہ رات تک جاری رہے گا۔

لوگ اٹھ اٹھ کر رادھا کرشن سے مل رہے تھے۔ اس سے بات کرتے اور سلام کرنے کو

جھکے جاتے تھے۔ وہ اپنی ہنسی بکھیرتا ایک سے دوسرے کی طرف مڑتا بڑی آسانی سے اپنے گرد گھومتا رہا تھا۔ دائیں بائیں سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتا۔ اٹھ کر کسی سے ہاتھ ملاتا تھا۔ میرے جاننے والے مجھ سے ملنے والے لوگ راجندر کے دوست‘ اس کے ساتھی ہم مسلسل ملتے اور سلام کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ میں اکثر پبلک جگہوں سے کتراتا ہوں۔ لوگوں سے ملنے ملانے کا تو یونہی میرا کام ہے۔ پھر بھی مجھے کھلی جگہ میں جا کر بہت کوفت ہوتی ہے۔

پھر کسی ورکر نے کہا: ”جلسہ شروع ہونے والا ہے۔“ باادب باملاحظہ ہوشیار کا اعلان کر دیا گیا۔ اور کرسی صدارت پر ایک بوڑھے سے آدمی بٹھائے گئے جو قرائن سے غیر ملکی جان پڑتے تھے اور تب کرشن نے ہم سے کہا کہ جلسہ موجودہ طرزِ تعلیم کے خلاف ہے۔ لوگ چاہتے ہیں اسکولوں‘ کالجوں سے انگریزی کو ہٹا دیا جائے تاکہ انہیں کام کرنے‘ ترقی کرنے میں آسانی رہے۔ ملک کے طول و عرض میں جلسے ہو رہے ہیں۔ لوگ اس ہوا کے ساتھ چل رہے ہیں۔

اور میں نے رادھے کرشن سے پوچھا: ”آپ کدھر ہیں؟“

بڑی بے یقینی سے میری طرف دیکھ کر بولا: ”میں‘ میں کدھر ہو سکتا ہوں‘ جدھر عوام ہیں اسی طرف میں۔ مجھے اس جلسے میں آج تقریر کرنا ہے۔“

رادھے کرشن کا نام پکارا گیا۔ عوام کا محبوب بے حد بدنام بہت خوبصورت اور اپنے آپ سے مطمئن رادھے کرشن اسٹیج پر کھڑا ہوا تو لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ وہ اتنا اچھا بولتا ہے۔ اس کی زبان کی روانی اور خیالات کی دھار ایک ساتھ بہہ رہی تھیں۔ وہ موجودہ تعلیم کے خلاف بول رہا تھا۔ انگریزی زبان کے خلاف اور خود اس نے آکسفورڈ میں گیارہ سال گزارے تھے۔ اب بھی اس کا طرزِ زندگی مشرقی اور نظریے مغربی تھے۔ اس نے ہمیشہ کنول کماری ٹھاکر کی اصلاحات کی حمایت کی ہے۔ وہ عورتوں کی آزادی کا زبردست حامی اور ہر میدان میں عورت کی عزت کو بڑھانے‘ اس کے کندھوں پر آدھی آبادی کا بوجھ رکھنے کو تیار تھا۔ وہ ہمیشہ یورپ کے ملکوں وہاں کے باشندوں کی مثالیں دیا کرتا تھا۔ اس کا موضوعِ سخن ہمیشہ عورت رہا ہے۔ چاہے وہ مغرب کی ہو‘ مشرق کی عورت ہو‘ عورت کی تعلیم ہو یا عورت کی ترقی‘ چاہے وہ کنول کماری ٹھاکر ہو یا شوبھا بینر جی۔

اور اب بھی رادھے کرشن اپنے محبوب موضوع کی طرف آ رہا تھا۔ اس کی تقریب میں عورت لڑکی اور بہن کے لفظ بہاؤ کی طرح چلے آ رہے تھے۔ یہ لفظ چمپا کے پھولوں کی طرح اس کی

زبان کی ندی پر بہہ رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا اگر ہم انگریزی طرزِ تعلیم اور ذریعۂ تعلیم کو اپنائیں تو ہماری عورتیں ترقی نہ کر سکیں گی۔ ہماری بیٹیاں دوسرے ملکوں میں جا سکیں گی مگر ہماری زندگی ادھوری رہ جائے گی۔ ہم کہاں ہوں گے اور مجھے کنول یاد آ رہی تھی۔

تو کیا رادھے کرشن کنول کے خلاف بول رہا تھا مگر نہیں' وہ اس کے خلاف نہیں بول سکتا۔ وہ ایک نظریے کے خلاف بولتا جا رہا تھا اور چند دن پہلے ہی تو وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے کنول سے مکمل عورت کہیں نہیں دیکھی۔ کم از کم اس کی زندگی میں تو ایسی عورتیں بہت کم آئی ہیں۔ مغربی تعلیم نے اسے سنوار دیا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ اس نے کبھی کسی لڑکی کو یورپ کے ملکوں میں سالوں سال رہنے کے باوجود ایسا سنجیدہ نہیں دیکھا۔ وہاں کی آب و ہوا ہی اس قسم کی ہے۔ وہاں کی زندگی کی نہج ایسی ہے کہ مرد عورتیں ایک دوسرے کے لیے ہمارے ملک کی طرح اجنبی نہیں ہوتے اور پھر وہ نائٹ کلبوں اور ڈانس پارٹیوں کا ذکر کرنے لگا تھا۔

ملمع آخر زود یا بدیر اتر جاتا ہے۔ پیتل پیتل ہی ہے۔

اسے سب سے زیادہ شکایت ہمارے طرزِ زندگی کے خلاف تھی وہ اس زندگی کی گھٹن کے خلاف تھا۔ وہ پکار پکار کر کہتا تھا کہ ملک کو سنوارنے کے لیے سب سے پہلے عورت کو آزاد کرو' اسے گھروں سے نکالو' اس کے لیے دائرہ بناؤ پھر دیکھو ہمارا ملک کیسا جنت بن جاتا ہے اور مہاتما ایک بار میرے دفتر میں بیٹھے کہ ایک بوڑھے نے ان سے پوچھا: ''کیا کیجئے گا راہ بنا کر' کیا کیجئے گا عورتوں کو آزاد کر کے' گھروں میں کیا بٹھائیے گا؟''

اور رادھے کرشن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا: ''یورپ میں کیا گھر خالی ہیں۔''

اس بزرگ نے پوچھا تھا کیا عورتوں کو تم اب غلام سمجھتے ہو' کیا عورت بھی جانور ہے' بھیڑ بکری ہے' بندھی ہوئی لونڈی ہے کہ تم اس کی آزادی کا پرچار کرتے پھرتے ہو' پھر یورپ کو تو دیکھو وہاں کی خامیاں کیوں بھول جاتے ہو؟ اور اس دن رادھے کرشن نے ان کی بات اَن سنی کر دی تھی۔

مگر انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا تھا' تم لوگوں کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ تم لوگ اپنے کانوں میں پڑی لاشعور کی جاگتی صداؤں کے غلام ہو۔ ہمارے ہاں عورت اپنے حلقے میں آزاد ہے۔ وہ زندگی کا پس منظر ہے۔ وہ گھر کا سکون ہے۔ وہ جھرنے کی نَے ملتا ہے۔ درخت کی

ٹھنڈک ہے۔ وہ سب کچھ ہے جس کا ہم خیال کر سکتے ہیں۔ تم لوگ اسے گھر سے نکال کر خود ہی پریشان ہو جاؤ گے۔

اور رادھے کرشن نے کہا تھا' میں یہاں ایک ایسی عورت کو جانتا ہوں جو کئی سال یورپ میں رہی ہے۔ مگر آزادی کی ساری برائیاں اس کے پاس سے خس و خاشاک کی طرح نکل گئی ہیں۔ کیا آپ پسند کریں گے کہ اس سے ملیں۔

وہ بزرگ گھبرا گئے تھے۔ غیر عورتوں سے کبھی ملے نہ تھے۔ یورپ زدہ مغرب کی منزلوں کو دیکھ چکے تھے۔ پر پھر بھی کہنے لگے: ''اگر ایسی عورت یہاں موجود ہے تو وہ عورت نہیں دیوی ہے۔ میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا اگر اس سے مل سکوں گا تو۔''

میں نے سوچا تھا رادھے کرشن خود ہی گنگا دھر جی کو کنول کے ہاں لے جائے گا مگر اس نے کہا: ''اچھا اب میں چلتا ہوں اور آپ ان کو لے جایئے گا۔ گنگا دھر حیران رہ گئے تھے۔''

میں نے کہا تھا: ''بھائی تم ہی کیوں نہیں لے جاتے انہیں اس عورت کے پاس۔''

ہنس کر بولے: ''احترام کی جگہ ہے اور اگر ادب مانع نہ ہو تو میں ضرور چلتا۔''

راندۂ درگاہ نے بھی بلندیوں کے عرش کی رفعتوں کا احترام کرنا شروع کر دیا تھا۔ رادھے کرشنن کو اپنی ساری فلاسفی کے باوجود معلوم تھا کہ اسے کیسی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ اپنی شہرت کو جانتا تھا۔ گو ہم نے برسوں اس سے مل کر بھی کوئی ایسی بات نہ دیکھی تھی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ وہ کیا کرتا ہے۔ ہم اس کے راز داں اس کے دلی دوست نہ تھے۔

اس شام کو میں گنگا دھر کو لے کر چلا ہوں تو سوچ رہا تھا' جانے کنول میں کیا بات ہے' وہ دوسروں کی راہوں کی خاک سے بھی اپنا احترام کرواتی ہے۔ میں جیسا اس کو شروع سے جانتا تھا' اسی طرح سے اب بھی تھا۔ سالوں کے فرق نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اسی طمانیت سے اپنے بیٹھنے کے کمرے میں وہ پہلے ملنے والوں سے مسکرا کر ملتی' بہت محبت سے پیش آتی اور لوگوں کی باتوں میں دلچسپی لیتی تھی اور سالوں کے بعد بھی وہ اسی طرح تھی۔

راہ میں گنگا دھر نے اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔ بولے: ''دیکھو بھئی مجھے آج مندر جانا ہے' پھر کبھی سہی میں ان سے پھر مل لوں گا۔'' اور میں بھی راستے سے لوٹ آیا تھا۔

آج مجھے وہ غُلغلہ بھی یاد آ رہا ہے جو رادھے کرشن کی بیٹی کے بھاگ جانے پر شہر میں بلند ہوا تھا۔ لوگ بہت خوش تھے۔ ایک دوسرے سے کہتے پھر رہے تھے' جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ رام بدلہ لے ہی دیتا ہے اور پھر اس سے ہمدردی کرنے اس کا حال پوچھنے' اس کا زخم کریدنے بھی جاتے تھے۔

ان دنوں میں اس کے پاس نہیں گیا۔ جانے کیا بات تھی' میں اپنے میں ہمت نہیں پاتا تھا کہ میں اس سے مطمئن شخص کو جا کر بسورتے روتے اور زندگی سے ناخوش دیکھوں۔ یہ ترس کا جذبہ نہیں ترحم نہیں کمزوری نہیں' بس ایک خیال تھا کہ رادھے کرشن کو دکھی دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ دنیا کا قاعدہ ہے گرے ہوؤں کو روندتی گزر جاتی ہے اور اپنے پاؤں تلے مسلتی ہوئی۔

اس کے کئی دوست تھے۔ میں اسے اپنے دوستوں کے زمرے میں شمار نہیں کرتا تھا۔ میں اس سے گاہ بگاہ ملنے والا ایک عام آدمی تھا۔ اس نے اور میں نے کبھی عام باتیں نہیں کیں۔ وہ جب بھی میرے دفتر میں آتا' مجھے سرراہ کہیں مل جاتا تو مجھ سے کنول ٹھاکر کا حال پوچھا کرتا اور پھر اس کے کاموں اور اس کی' کی ہوئی ترمیمات کی باتیں کیا کرتا تھا۔ کنول نے کالج کو ایک مثالی کالج بنانے کا بیڑا اٹھا لیا۔ شوبھا نے جیسے لکھا تھا کیا تم اصلاح کرنے کے لیے نئی پود کو منتخب نہ کرو گے' وہ نئی پود کی اصلاح کر رہی تھی۔ وہ لڑکیوں کو سنوار رہی تھی۔ اس کی دلچسپیاں اپنی ذات سے زیادہ کالج سے وابستہ تھیں اور پھر میری بیٹی بینا کا دماغ جیسا سنور رہا تھا' اس کی باتوں میں جو پختگی آ رہی تھی' وہ سب اس بات کا زندہ ثبوت تھی کہ کنول نئی پود کو سنوارنے اور مانجھنے میں ایک مزدور کی طرح محنت سے خون پسینہ ایک کر رہی ہے۔ میں جب بھی ملنے جاتا اس کا موضوع ہمیشہ لڑکیوں کی اصلاح اور ان کی آئندہ بہبود ہوتی۔

مجھ میں اتنی ہمت کبھی نہیں آئی کہ پوچھوں کیوں کنول ٹھاکر' تم ان مٹی کے گھروندوں سے کب تک دل بہلاؤ گی۔ کالج ہی اس کے لیے زندہ حقیقت اور واحد تمنا تھی۔ کبھی کبھار تو مجھے معلوم ہوتا اسے اپنے پھولوں اپنے گھر اور خوبصورت تصویروں سے وہ والہانہ عشق نہیں رہا۔ اس کا بھگوان کرشن بھگوان نہیں کالج ہے۔ وہ در و دیوار کو اتنے پیار سے دیکھتی جیسے اس میں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ رہی ہو۔

اس نے زندگی میں ہر کام ایک عاشق کی سی بے صبری اور ایک فن کار کی سی توجہ سے کیا تھا' پر اس کے کام تھے ہی ایسے۔ کون سے زیادہ' ایک کالج تھا۔ جو اس کے بعد بھی قائم ہے۔

اور میں شاید یہ سوچنے میں حق بجانب ہوں کہ ہم گزر جاتے ہیں، زمانہ نہیں گزرتا۔

کنول ٹھاکر کے لیے ہمیشہ حال زندہ اور حقیقی رہا ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے متعلق کبھی نہیں سوچا، کیا اس کے لیے کوئی مستقبل نہیں تھا؟ کیا اس کے لیے کوئی ماضی نہیں تھا؟

پر رادھے کرشن کی بیٹی چلی گئی۔ اپنے گھر کا عیش چھوڑ کر اپنے باپ کا نام چھوڑ کر اور وہی رادھے کرشن مجھ سے جب بھی ملتا تھا کنول ٹھاکر کی بات کیا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کی تعریف میں فرشِ راہ ہو جاتا تھا اور اس کے چہرے کے جذبات اس کی آواز کا خلوص سن کر میں سوچا کرتا تھا کہ رسی کا بل اتر جاتا ہے کیا رسی کا بل جل کر اترتا ہے مگر نہیں شاید یہ میری غلطی تھی۔

میں اس بڑے سانحے کے بعد بھی اس کے پاس نہیں گیا۔ لوگ دفتر میں آتے اور مجھ سے پوچھتے کیوں بھئی تم بھی تو اس کے ملنے والوں میں سے ہو کیا تم اس سے ملنے نہیں جاؤ گے۔ پھر زوردار قہقہہ لگاتے مگر میں نے کبھی ہنس کر اس بہت بڑے واقعے کی توہین نہیں کی۔ ان دنوں مجھے ایک شام ایک جلسے کے سلسلے میں کنول کماری سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ایک غیر ملکی وفد آیا تھا اور شہر کے رؤسا کی ایسی بیویاں جن کو بات کرنے کی تمیز تھی یا جو پڑھی لکھی تھیں، وفد کی عورتوں سے ملنے کے لیے مدعو کرنے کا کام میرے سپرد تھا۔ کنول کو دیکھ کر پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ بہت غمگین اور بے حد اداس تھی اور میں ایک بے وقوف کی طرح سوچ رہا تھا۔ شاید اس نے رادھے کرشن کی بیٹی کے متعلق کچھ نہ سنا ہو۔ ضروری باتیں کر کے میں جانے لگا تو کنول بولی۔ ''ٹھہریئے!'' میں ٹھٹک گیا۔ وہیں رک گیا۔

کنول نے آج پہلی بار رک رک کر بہت آہستہ سے بات کرتے ہوئے کہا: ''میں رادھے کرشن کے پاس جانا چاہتی ہوں۔''

اگر کوئی یہ کہہ دیتا کہ رادھے کرشن بھگت ہو گیا ہے تو میں اتنا حیران نہ ہوتا جیسا میں کنول کی یہ بات سن کر ہوا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہم دونوں کافی دیر خاموش رہے۔

پھر کہنے لگی: ''آپ میرے ساتھ چلیے گا۔''

اور میں سوچ رہا تھا کیا ہو گیا ہے کنول کو، جو آج تک کالج کی حدود سے باہر کسی آدمی کے ساتھ کسی مرد کے ساتھ آزادانہ گھومتی ہوئی نہیں دیکھی گئی۔ اس کے دماغ کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ ذمہ دار ہے پر ایک بے بیاہی عورت کی طرح لوگ انگلیاں نہ اٹھائیں گے۔ میں ان استفسارات سے بچنا چاہتا تھا۔ کم از کم کنول کی عزت مجھے ساری چیزوں سے زیادہ پیاری تھی۔ میں کنول کا

احترام کرتا تھا۔
اس نے کبھی کوئی غلطی نہیں کی۔ زندگی میں کبھی ایک لفظ فالتو نہیں کہا، کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جس کے لیے اسے پچھتانا پڑے، مگر اب وہ اندھا دھند کیا کرنا چاہتی تھی۔ رادھے کرشن کے ساتھ ہمدردی کرنا ضروری ہے، پر جا کر کیوں، وہ لکھ بھی تو سکتی ہے۔ کیا اب اسے یہ احساس ہو گیا ہے کہ وہ بہت بڑی ہے کہ وہ اپنی حفاظت تو خود کر سکتی ہے۔ پر یہ اس کی غلطی تھی۔ میں اسے کیسے سمجھا سکتا ہوں۔ میں اس سے بھی کہنا نہیں چاہتا تھا کہ تم یعنی کنول کماری ٹھاکر ایک غلط کام کر رہی ہو۔ رادھے کرشن کی پستی کی طرف دیکھنا بھی بلندی کی توہین ہے۔

میں نے کہا: ''آپ کرشنا بہن کو ساتھ لے جائیے۔ میں ان دنوں فارغ نہیں ہوں۔''

اور اتنے سالوں میں پہلی بار میں نے دیکھا کہ ناامیدی کے سائے سے اس کے چہرے پر بڑھ آئے۔ وہ چپ ہو کر اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اور پھر اس نے اپنی ریشمی پلکیں اٹھا کر میری طرف بڑے غور سے دیکھا اور بولی: ''آپ وہاں جانے میں میری توہین سمجھتے ہیں؟''

''ہاں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''دھرم گری پڑی چیزوں کو اٹھانے اور دکھیوں کے ساتھ ان کے دکھ جھیلنے میں ہے۔ کیوں یہ بات نہیں ہے کیا؟'' کنول نے پوچھا۔

''مانتا ہوں دھرم کی راہ یہی ہے پر دنیا کی نگاہیں ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔''

''لوگ کیا کہیں گے؟'' کنول نے اپنے دونوں ہاتھ بڑی بے بسی سے جھٹک دیئے۔ ''لوگ لوگ، کب تک لوگ ہی ہماری زندگیوں پر حکومت کریں گے۔ ہم ان بندھنوں سے آزاد نہیں ہو سکتے۔''

اور میں نے کہا تھا: ''بندھن بھی ایک راہ ہیں ان پہ چلنا ہی ٹھیک رہے گا، دنیا کا احترام کرنا تو آپ بہت پہلے سیکھ چکی ہیں۔''

اس شام میں نے کنول کو بہت اداس اور مضمحل پایا تھا۔ وہ ہمیشہ کی تیزی سے سوچنے اور عملی کام کرنے والی کنول ٹھاکر گہری سوچ میں پڑی تھی۔ اسے سوجھ نہیں رہا تھا۔

میرے ہمیشہ کے شکی دل نے ایک مرے ہوئے سر بریدہ ناگ کی طرح پھر پھن اٹھایا۔ کیا کنول، رادھے کرشن کو چاہتی ہے؟

دوسرے لمحے ہی کنول کہہ رہی تھی: ''میں اسے لکھنا نہیں چاہتی۔ میں اس کی نیکیوں کا بدلہ بھی نہیں دے سکتی۔ وہ ہر مجلس میں میرا ذکر اتنے ادب اور احترام سے کرتا ہے۔ حقیقتاً میں اس قابل نہیں ہوں۔ میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ آپ کے ہمراہ اس کے پاس جاؤں گی مگر ہمارے سب طرف لوگ' لوگ' لوگ'' وہ چپ ہوگئی۔

کرشنا ان دنوں بہت خوش تھی۔ شوبھا نے لکھا تھا کہ وہ نندلال کو کسی نہ کسی بہانے سیر کی خاطر یا کسی اور غرض سے اپنے ہمراہ لا رہی ہے اور پھر کرشنا سارا وقت ایک ہی خواب دیکھتی۔ ایک بے قراری اور بے چینی اس کے بیٹھنے' بولنے اور ہر حرکت سے نمایاں ہوتی۔ باتیں کرتے ہوئے کھو جانا اور پھر اچانک کہنا کنولا رانی سچ مچ میں اپنے نند کو دیکھوں گی اور کنول اس کی طرف بڑے رحم سے بڑی ملائمت سے بہت نرمی سے دیکھتی جیسے وہ بھی اس خوشی کے سحر کو محسوس کرنے لگی ہو۔ نندلال اس کا بھی ایک حصہ ہو' وجود کا حصہ' اس اندھیرے کا حصہ۔

کرشنا تو محبت تھی جو زمین میں بارش کی طرح جذب ہو جاتی ہے جو روح کے اندھیرے میں اپنا راستہ بنا لیتی ہے اور پھر وہاں سے درختوں کی ہریالی میں' پھولوں کے روپ میں' زندگی کے درخت پر نظر آتی ہے۔ اس کی محبت اور آنکھوں کے خواب دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ گزرے زمانے کے دکھ کہیں پیچھے رہ گئے ہیں اور اب وہ پیار کے ریلے میں کھڑی زمین کی طرح اپنے اندھیروں اور خشکیوں کی پیاس بجھا رہی ہے۔

وہی کرشنا جو اپنے وجود کے اندر دل کو سکون دینے والا پیار چھپائے تھی' امن اور شانتی کی دولت کو سمیٹے تھی' اندر آ گئی۔ اس کا ہمیشہ یہی گلہ ہوتا تھا بھیا آپ تو کہیں نظر ہی نہیں آتے۔ آج بھی اس نے یہی سوال کیا۔

کنول کو پریشان دیکھ کر بولی: ''کیوں کنولا رانی کیا بات ہے اتنی اداس ہو...... وہی بات ہوگی۔ میں تمہیں سمجھا چکی ہوں۔ تمہارا جانا بے کار ہے۔ تم لڑکی کو واپس نہیں لا سکتیں۔ تمہاری ہمدردی وقتی ہوگی' کھوکھلی ہوگی' جو بیت گیا' وہ بیت گیا' مجھے بتاؤ تمہارے جانے سے کیا ہوسکتا ہے۔''

اور کنول نے ایک ہارنے والے جواری کی طرح جو اپنی آخری پُونجی بھی داؤ پر لگا دے کہا: ''رادھے کرشن کا فون آیا ہے' اس نے مجھے بلایا ہے۔'' ''یہ بات ہے کیا وہ تمہیں بھی برباد کرنا چاہتا ہے۔ عزت بڑی شے ہے کنولا۔ کرشنا نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''تو آپ کی جگہ میں چلا جاؤں گا۔ میں ابھی تک اس کے پاس نہیں گیا۔ میں جانا نہیں چاہتا تھا، مگر اب جاؤں گا۔''

کنول نے ان منے دل سے کرشنا کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ ''ٹھیک ہی تو ہے تمہارے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ بھیا چلے جائیں گے۔ آخر رادھے کرشنن کو کسی ہمدردی کی ہی ضرورت ہے نا تم نہ گئیں تو کیا فرق پڑے گا۔ بھیا آپ چلے جائیں نا۔'' کرشنا نے مجھے مخاطب کیا۔

اور شام میں رادھے کرشنن کے پاس کنول کا بھیجا ہوا گیا۔

رادھے کرشن کے قلعہ نما گھر میں داخل ہونے کے لیے ایک چھوٹے سے دروازے سے گزرنا پڑتا ہے۔ باہر سے یہ عمارت غیر معمولی بڑی نظر نہیں آتی۔ پھر ہم پُر پیچ راہوں سے گزرتے ایک قطعہ زمین پر داخل ہوئے جو خوبصورت باغوں، فواروں اور درختوں سے ارم کا نمونہ بنی تھی۔ تالابوں میں سفید پھول تھے۔ راستوں کے کناروں پر خوشبودار پھولوں کے پودے تھے۔ ہر شے پر چمک تھی۔ درخت پھلوں سے لدے تھے۔ اوپر آسمان اتنا نیلا اور شام کی سرخیوں سے دلہن کے جوڑے کی طرح خوبصورت لگ رہا تھا۔ پگڈنڈیاں صاف اور چھوٹے دروازے سے سیدھی جانے والی سڑک سے نکلتی تھیں۔ سڑک باغوں میں سے درختوں کی محرابوں کے نیچے سے آگے ہی آگے جا رہی تھی۔ میں ہر موڑ پر سوچ رہا تھا کہ اب کوئی جگہ نظر آئے گی اور میں رادھے کرشنن کے سامنے جاؤں گا مگر راستہ ختم ہونے میں ہی نہیں آیا تھا اور ایسے میں میں نے سوچا تھا شاید میں ایسی وادی میں داخل ہو گیا ہوں جو لامتناہی ہے اور جس کا پہلی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ آس پاس میں نے کسی انسان کی شکل نہیں دیکھی۔ میرے ہمراہ ایک باوردی تمیز دار نوکر تھا جو پیچھے چل رہا تھا۔

میرے دماغ میں طلسمی قلعوں اور پریوں کے خواب گھوم گئے۔ ایسی کہانیاں جو ہم نے بچپن میں اپنی دادی ماں اور اس کے بعد رام دلارے کے کندھوں پر سوار سیر کو جاتے اور آتے سے سنی تھیں۔ جن میں رام دلارے خود ہی ہیرو ہوتا تھا اور خود ہیرو کی تلوار کا شکار۔

درختوں کے گھنے جھنڈ کے درمیان ایک موڑ مڑتے ہی دفعتہً سرخ اور بلند عمارت نظر پڑی اور میرا باوردی ملازم کہیں غائب ہو گیا۔ نزدیک گیا ہوں تو ایک اور ملازم نے مودبانہ سلام کرکے پوچھا، آپ مالک سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے سر ہلا کر جواب دیا، وہ مجھے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں ہر شے سبز رنگ کی تھی، پردوں کا رنگ گہرا سبز تھا۔ بیٹھنے کو

صوفے ریڈیو کا غلاف' دیواروں پر سبز روغن ہر طرف ایک ہریالی ایک مرمریں سا غبار اڑتا ہوا شمع دانوں میں بڑی بڑی شمعیں جل رہی تھیں اور سبزی کو اور بھی اجاگر کرتی ہوئی یہ مدہم سی روشنی بہت بھلی لگتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد پردہ ہلا۔ ایک شخص نے جو رادھے کرشن نہیں تھا' آ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگا' آج کل مالک کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ کسی سے ملا نہیں کرتے۔ میں ان کا سیکرٹری ہوں۔ کیا آپ کو ان سے کوئی بے حد ضروری کام ہے۔

میں نے کہا: ''ان سے کہہ دیجئے کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اپنا نام سیکرٹری کو بتا دیا۔

چند لمحے جو مجھے گھنٹے لگے' کے بعد اسی شخص نے آ کر کہا' چلئے اور میں لمبے راستوں خوبصورت کمروں سے گزرتا ایک بڑے برآمدے میں کھڑا تھا۔ سیکرٹری نے کہا' مالک آپ کے منتظر ہیں' آپ اندر جا سکتے ہیں۔

کیا یہی رادھے کرشن تھا۔ میں پہچان نہ سکا۔ بال جو آبنوس کو شرماتے تھے' سفید ہو چکے تھے۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ جیسے ایک دم بڑھاپے نے چھاپہ مارا ہو۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ میرے قدم اٹھ نہ سکے۔ وہ کرسی پر سے اٹھ کر میری طرف آنے کی کوشش میں لڑکھڑا گیا۔ اس کے کندھے جھک گئے تھے۔ اس کا لباس میلا اور بے حد الجھا ہوا تھا۔ وہ خوش پوش سیاہ نیش کا مالک رادھے کرشنن کہاں تھا؟ صدارتیں کرنے اور قیادت کرنے والا وجیہہ و شکیل انسان کہاں تھا؟ کیا یہ بھی وہی تھا۔ حالات انسان کو کیسا بدل دیتے ہیں؟ میں رو نہ سکا میں ہنس نہ سکا' میں افسوس نہ کر سکا۔ میرا دل کسی بھی جذبے سے یکسر خالی تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا' رادھے کرشن کے چہرے پر بے شمار جھریاں تھیں۔ وہ پرانے غاروں سے نکلا ہوا ایک عبادت گزار لگتا تھا' جس نے اپنی ساری عمر تپ میں گزار دی ہو۔

وہ کرسی پر سر جھکائے اسی طرح بیٹھا رہا۔ اس نے مجھ سے بات کرنے اور بیٹھنے کے لیے کہنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

اور میرا خیال ہے ساری ضروریات اس کے لیے سطحی اور ختم ہو چکی تھیں۔ ایک شمع بالیں' رونے والوں کی طرح آتش دان کے اوپر جل رہی تھی۔ کمرے کی سرخی خون کی طرح چھت سے لے کر فرش تک پھیلی تھی۔ اس جگہ پردوں سے لے کر پائیدان تک سب کچھ سیاہی مائل سرخ تھا۔

صرف رادھے کرشنن کے بال سفید تھے۔ کافور کی طرح سفید۔ وہ اس جگہ کتنا بے گانہ اور عجیب سا لگ رہا تھا۔

میں اس سے کیا کہوں گا۔ میں اس غم اور زمانے کے بوجھ سے تھکے شخص سے کیا کہوں؟

اور یوں لگا جیسے صدیوں تک ہم دونوں اس سرخی میں دفن ہونے کے لیے بھیج دیئے گئے ہوں۔ یہ کمرہ ایک مزار تھا جس میں شمع جل جل کر بجھ رہی تھی اور اب چاروں طرف اندھیرا ہوگا۔ میں اپنے جسم میں صرف سردی کی تیز رو سی محسوس کر رہا تھا۔ میں یخ ہو رہا تھا۔ سارا ماحول اداس ہی نہیں موت کی یخ بستگی سے آلودہ لگتا تھا۔ جیسے ابھی ابھی کسی کو قتل کر دیا گیا ہو۔ ہوا کی گھٹن میں خون کی بو تھی یا یہ میرا واہمہ ہے۔ مجھے ڈر لگنے لگا۔ میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی مگر میں کانپ رہا تھا اور سرد ہوا کے جھونکے اس سرخ پردے کو مخملیں اور بھاری پردے کو ہلا رہے تھے اور میں اپنا منہ بند کر رہا تھا۔ میری چیخ نکلنے والی تھی۔ کیا رادھے کرشن زندہ تھا؟

جانے کب رادھے کرشنن نے سر اٹھایا۔ اس کی آواز مجھے بہت دور سے بمشکل اپنے کانوں میں آتی سنائی دی۔

"مجھے معلوم تھا وہ نہیں آئیں گی۔ فون کرنے کے بعد ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ وہ نہیں آئیں گی۔ لوگوں کا خوف' دنیا کا ڈر اور پھر اپنے عورت ہونے کا ڈر وہ میری طرح کے کسی شخص کے گھر کبھی نہیں آئیں گی۔"

وہ سکوت ٹوٹا۔ چاہے رادھے کرشنن ایک بھوت ہی کیوں نہ ہو مگر وہ بول تو رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھا اور بجھی شمع کو ٹھیک کرنے لگا۔ اس نے دوسری شمع' شمعدان میں لگائی۔ روشنی میں اس کے چہرے پر دکھ اور کرب تھا۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں ایک ایسی کیفیت تھی جس کا میں نام نہیں لے سکتا جس کا کوئی نام نہیں جو خودکشی کر کے مرنے والوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔

شمع جلنے لگی اور وہ پھر بھی وہیں کھڑا رہا۔ جیسے میرا وجود اس کے لیے ختم ہو گیا ہو۔ جیسے وقت اس کے لیے تھم گیا ہو۔ آتش دان پر سنگ مرمر کا سانپ کا پھن تھا اور اس پر پاربتی جی بیٹھی تھیں۔ مورتی کے جسم کے خطوط دلآویز تھے۔ ان میں سے زندگی کی کرنیں نکل رہی تھیں۔ شاید پاربتی جی بھی کسی قیمتی چمکیلے پتھر سے بنائی گئی تھیں۔ سانپ اور عورت دونوں کا ساتھ کتنا پرانا ہے۔ دونوں ساتھی ہیں۔ ساری مذہبی روایتی کہانیوں میں ایک ہی کہانی ہے۔ باغ جنت کی عورت

کی بہنے والی خوبصورتی کی اور سانپ کے پھن کی عورت کا حسن ہے اور کہانیاں ہیں' پر بنیادی کہانی ایک ہی ہے جیسے سارے مذہب ایک ہیں' جیسے سارا وجود ایک ہے' جیسے زندگی کا خطرہ اس کا منبع اور اس کی اصل ایک ہے۔

رادھے کرشنن نے مورتی کے پاؤں پر انگلی پھیری۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ پھر مڑ کر کہنے لگا: ''ہم ہمیشہ عورت سے شکست کھاتے ہیں عورت ماں ہو' دیوی ہو' بیٹی ہو ہم اس سے ہار جاتے ہیں۔'' اور پھر وہ پاربتی جی کے پاؤں پر اپنی انگلی پھیرنے لگا۔

میں سن رہا تھا۔ میں بولنے کی کوشش بھی کرتا تو بول نہ سکتا۔ میری بولنے کی قوتیں سلب ہو چکی تھیں۔

اس کی آواز کانپتی ہوئی کسی اور ہی کی لگتی تھی۔ ایسی رعب دار آواز میں بولنے والا رادھے کرشنن کوئی اور ہوگا یہ نہیں۔ وہ پھر اپنی کرسی پر جا کر بیٹھا اور بولا: ''دوست تم اتنے دنوں میں پہلے آدمی ہو جو باہر سے آ کر مجھ سے مل رہا ہے۔ میں ایک زمانے کے بعد باتیں کر رہا ہوں اور حیران ہوں کیا میں زندہ ہوں۔ میں ابھی تک زندہ ہوں۔''

اب کچھ کہنے کا وقت تھا: ''میں نے کہا' زندگی تو حادثات سے بھری پڑی ہے اور پھر مصیبتیں تو ایسے لوگوں کی راہوں سے گزرتی ہیں جو ان کے نااہل ہوں۔''

رادھے کرشنن نے کہا: ''آپ غلط سمجھتے ہیں میں ہی اس قابل تھا' بھگوان کبھی غلط کام نہیں کرتا۔''

میں پھر چپ ہو گیا۔ جانے اس کے دماغ میں کون سا خیال تھا جب دکھ ناقابل برداشت اور غم کا دکھ بوجھ' پہاڑ بن جائے تو کمزور انسان یہی سوچتا ہے کہ اسے کیے کی سزا مل رہی ہے۔

وہ پھر بولا: ''کنول کماری نے بہت اچھا کیا وہ نہیں آئیں۔ یہ جگہ کسی عورت کے قابل نہیں۔''

چاروں طرف سناٹا تھا۔ اتنی خاموشی کہ اگر میں اکیلا ہوتا تو اپنے دل کی دھڑکن بھی اپنے کانوں سن سکتا تھا۔

اور میں خاموش تھا۔ میں ہمدردی کرنے آیا تھا اور مجھے لفظ نہیں مل رہے تھے۔ لفظوں کی ضرورت ایسے میں نہیں ہوا کرتی۔

وہ پھر اٹھا اور کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ نرم قالین پر بے آواز قدموں سے چلنے لگا اور بہت آہستہ سے بولا: ''تم نے کبھی اپنے ہاتھوں خود ہی شکست کھانے کا تجربہ نہیں کیا ہوگا۔ تم نے کبھی اپنی آرزوؤں کو اپنے ہاتھوں ہواؤں میں نہیں اڑایا ہوگا۔ کوئی بھی ایسا نہیں کرتا۔ صرف یہ میں ہوں اکیلا نرالا اور عجیب آدمی۔''

میں نے پھر اپنی تمام قوتیں مجتمع کر کے کہا: ''گزری باتوں سے کچھ حاصل نہیں اپنے کو سنبھالو بھائی۔''

وہ تیزی سے مڑا اور کہنے لگا: ''تم نے مجھے بھائی کہا ہے تم اصل اور سچی دنیا کے ایک انسان بھائی کہتے ہو مجھے۔ میں تو ایک ہتیا کاری ہوں اور کچھ نہیں۔''

''وہ کیسے؟'' میں کرسی سے اٹھ کر اس کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ اگر میں چند لمحے اور بیٹھا رہتا تو میری ٹانگیں چلنے سے جواب دے جاتیں۔ ان میں خون منجمد ہو رہا تھا۔

''بیٹھ جاؤ دوست دھیرج اچھا ہوتا ہے۔'' اس نے مجھ سے کہا۔

''نہیں بھائی، رادھے کرشن۔'' میں نے اپنا سر بلند کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا وہ مجھ سے کتنا اونچا اور الگ سا لگ رہا تھا۔ ''میں رادھے کرشن ہوں۔ میں ہی رادھے کرشنن ہوں۔'' اس نے اپنے ہاتھوں کو جن کی نسیں ابھر آئی تھیں ملتے ہوئے کہا۔

''کیا رادھے کرشنن ہوں؟''

''ہاں۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ایک نشست کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔

مگر وہ خواب میں بولنے والوں کی طرح اپنا ہاتھ، ہاتھ میں دیئے اسی کمرے کے وسط میں کھڑا کہہ رہا تھا۔ ''ہاں میں ہی رادھے کرشن ہوں۔ میں ہی رادھے کرشنن ہوں۔ میرا کا بابا رادھے کرشنن۔''

میں نے کچھ کہنے کے لیے کہا: ''میرا مل جائے گی۔ آپ چل کر بیٹھیے تو سہی اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں۔ میرا مل ہی جائے گی۔''

اور پہلی بار ان آنکھوں میں ایک چمک آئی۔ ایک ہوش کی لہر جیسے اسے میری بات سے خوشی ہوئی ہو۔ ''اچھا!'' اس نے یونہی کھڑے کھڑے کہا۔ وہ خاموش ہو گیا، میں بھی۔ ہم دونوں کمرے کے وسط میں کھوئے ہوئے انسانوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔

''میری بیٹی مل جائے گی۔ میری میرا مل جائے گی۔'' اس نے زیر لب پھر دہرایا اور وہ

کہتا ہی گیا۔ ''میرا مل جائے گی۔ میرا واپس آ جائے گی۔''

رادھے کرشنن کا دماغ چل گیا تھا۔ یا وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر روشنی سی آئی۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور چیخ کر اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ وہ رادھے کرشنن جس کو کسی نے کبھی غمگین نہیں دیکھا تھا۔ وہ سسکیاں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید وہ رو رہا تھا۔ میں بے چین ہو گیا۔ میں اس کمرے کی قید سے باہر نیلے آسمان، ستاروں اور روشنیوں میں جانا چاہتا تھا۔ میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ جب میں یہاں کنول کماری کی بجائے خود آیا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں کبھی آنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ انسان روشنی سے کتنا مانوس ہے۔ تب ہی تو وہ موت کے اندھیروں سے ڈرتا ہے۔

کیا میں یہاں ایک عمر تک بیٹھنے کے لیے آیا ہوں۔ یہاں سے میری رہائی کب تک ہو سکے گی۔

شاید ایک زمانے کے بعد میں تو اس کو ایک زمانہ ہی کہوں گا۔ رادھے کرشنن نے سر اٹھایا۔ اس کے چہرے کی جھریوں میں آنسو تھے۔ اس کا منہ آنسوؤں سے دھلا ہوا تھا اور آنکھوں کی وہ مردہ کیفیت بھی ذرا بدل چکی تھی۔

وہ بولا: ''آپ نے یہاں آنے اور تکلیف کرنے کی بڑی مہربانی کی ہے۔''

میں نے کہا: ''یہ میرا فرض تھا۔ میں پہلے آنا چاہتا تھا مگر یونہی نہیں آیا۔ آج میں کنول کماری کی طرف سے پیغامبر ہوں۔ آپ نے انہیں بلایا تھا نا۔ وہ مصروف تھیں، آ نہ سکیں میں آ گیا ہوں۔

رادھے کرشنن اب ایک ہوش مند کی طرح بول رہا تھا۔ کہنے لگا، میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ وہ بھی ایک کیفیت ہے۔ دکھ میں انسان کسی ہمدردی کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ پھر میں تو انہیں ایک بہت ضروری کام کی وجہ سے بلانا چاہتا تھا۔ آپ ہی آ گئے بس ٹھیک ہے۔ میں دل کا بوجھ ہلکا کر لوں گا۔ مجھے مرنے میں تو آسانی رہے گی۔ مجھے جاتے ہوئے کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔'' میں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''دکھ تو سبق ہیں، انسان گھبرا کر تو سب کچھ بگاڑ دیتا ہے۔''

''میرے سبق ختم ہو چکے ہیں۔ یہ آخری سبق تھا بھائی اور میں گھبرایا ہوا بالکل نہیں۔

میں بہ ہوش وحواس کہہ رہا ہوں کہ اس بوجھ کو سینے پر لیے مرنے سے میری روح آوارہ پھرتی۔ اب میں سکون سے مر سکوں گا۔ اس بات کی خوشی ہے۔ اچھا ہوا آپ آ گئے۔''

''میں آپ کی باتیں بالکل سننے کو تیار ہوں مگر......''

''گویا آپ سوچ رہے ہیں اب زندہ رہ کر مجھے کوئی اور کام بھی انجام دینا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں میرے سب کام ختم ہو چکے ہیں۔ میں بالکل فارغ ہوں۔ میرے لیے دنیا تو اسی دن ختم ہو گئی تھی جس دن میرا ختم ہوئی۔''

''میرا ختم ہوئی کیا مطلب؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''میرا تو۔'' اور میں جملے کو پورا نہ کر سکا اور کوئی ایسی بات نہ تھی جو کرنے کے قابل ہو۔ میں چپ ہو گیا۔

''آپ حیران کیوں ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی میرا کو اپنی پیاری بیٹی کو ان ہاتھوں سے ختم کیا ہے۔'' اس نے پاگلوں کی طرح اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا جن کی نسیں ابھر آئی تھیں۔ ''قدرت نے مجھ سے انتقام لیا ہے۔ میرا اب واپس نہیں آ سکتی۔ باہر کا غلغلہ بالکل بے بنیاد ہے۔''

اس کی بڑی بڑی آنکھیں سوالیہ نشان بنی اس وقت بھی مجھے دیکھ رہی تھیں۔ جب میں نے اس کا گلا گھونٹا ہے۔ اپنی اکلوتی اور پیاری بیٹی میرا کا...... اور پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا: ''میں اس قابل نہیں ہوں کہ کوئی اچھا انسان مجھ سے بات کرے۔ میں نے اپنی زندگی کے سہارے اپنی پیاری اور سندر بیٹی میرا کو اپنے ہاتھوں سلا دیا ہے۔''

میں ایک پتھر کے آدمی کی طرح جس کی صرف سماعت ہی باقی رہ گئی ہو وہاں بیٹھا یہ سب باتیں سن رہا تھا۔ کیا یہ باتیں سچ تھیں؟ وہ پھر اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا...... میرے قریب آ کر رکا اور بولا: ''پتہ نہیں لگتا عزت کس چیز میں ہے اور کیا ہے۔ ہم اخلاق کی کونسی قدروں کو سچا اور کن کو جھوٹا کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے قانون کیا ہیں۔ ہم ہمیشہ غلط زاویوں سے چیزوں کو دیکھتے رہے اور یہ غلطی آخر تک ہمارے ساتھ ساتھ چلتی رہی اور میں نے تو سچائی اور جھوٹ کے سارے بندھن توڑ کر اپنے لیے ایک راہ بنائی تھی۔ میں اپنے آپ سے اتنا مطمئن تھا جو لوگ اخلاق اور قانون کی باتیں سوچتے ہیں۔ میرے نزدیک وہ بودے اور کمزور ہیں۔ میں نے پرماتما کے اونچے اور شکتی والے ہاتھ کو بھلا دیا تھا۔ میں نے سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور اب دیکھو ان ہاتھوں نے جو پرماتما کے بنائے تھے، مجھ سے بدلہ لے لیا ہے۔ میں نے اپنی میرا کو اپنی بیٹی کو اپنی اکیلی اور اکلوتی بیٹی کو خود ہی ختم کر دیا۔''

میں اسے بولنے دینا چاہتا تھا۔ میں اس سے کچھ بھی نہیں پوچھنا چاہتا تھا۔

اس کی زبان بنارکے چل رہی تھی۔ ''میں عورت کے وجود کو ایک کھلونا سمجھتا تھا۔ میں نے عورت کو ہمیشہ ایک بے جان خوبصورت رنگین کھلونا سمجھا ہے۔ عورت کا ایمان اور اس کی عزت میرے نزدیک کوئی شے نہیں۔ دولت نے ایسے بہت سے کھلونے میرے لیے خرید دیئے تھے۔ میرے حریم ناز میں اس چھوٹے دروازے سے کتنی ہی عورتیں داخل ہوئیں۔ یہ ہاتھ۔'' اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف پھر دیکھا۔ ''یہ ہاتھ اس قابل ہیں کہ انہیں کٹوا دیا جائے......''

سندری بڑے پجاری جی کی منہ بولی بیٹی تھی۔ میں نے اسے فریب دیا تھا۔ وہ میری باتوں میں آ گئی اور پھر...... جانتے ہو جب اس نے زہر کھالیا تو اس نے ایک ذرا سے پرزے پر لکھ کر مجھے بھیجا تھا۔ ''بھگوان کی آنکھ بند نہیں ہے۔ تم اپنے گناہوں کی آگ میں جلو گے۔'' مجھے اس کے مرنے کا بڑا افسوس ہوا تھا۔ پھر میں بھول گیا تھا۔ میرا یہ خوبصورت گھر دولت کے انبار، نوکروں کی قطاریں، زندگی کی ہر آسائش، میرے لیے گناہ کا تصور غربت تھا، تمناؤں کی بے بسی، میں نے یہ بے بسی کبھی تجربہ نہ کی تھی۔ جب میں اپنے آپ سے مطمئن ہو کر باہر گھومنے نکلتا تو مجھے دنیا اپنے پاؤں میں بچھتی لگتی تھی۔

زمانہ بیت گیا۔ سال نکلتے چلے گئے اور میری میرا بڑی ہو گئی۔ میں اب سنبھل گیا تھا۔ نہیں میں صرف محتاط ہو گیا تھا۔ میرا کے لیے میں نے جو گورنس رکھی، اس کی شکل سندری سے کتنی ملتی جلتی تھی۔ جب وہ بات کرتی آنکھیں اٹھا کر دیکھتی تو وہ بالکل سندری لگتی تھی۔ پر بڑے پجاری جی تو گاؤں سے مدتیں ہوئیں جا چکے تھے اور سندری مر چکی تھی۔ گورنس اپنے کام میں بہت طاق تھی۔ میں اس سے بہت مطمئن تھا۔ میرا اسے دیوانگی کی حد تک چاہنے لگی تھی۔ جب کبھی میں پڑھاتے ہوئے کمرے میں چلا جاتا تو گورنس چپ ہو جاتی۔ اگر کبھی اسے میری طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت ہوتی تو ان آنکھوں میں اتنا غصہ اور حقارت ہوتی کہ میں گھبرا جاتا۔ آخر میں نے آہستہ آہستہ گورنس اور میرا کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ میرے اپنے کام تھے۔ میری زندگی تھی۔ میرے عیش تھے۔ میں مگن تھا۔ مجھے میرا کی طرف سے اطمینان تھا۔ صرف کبھی کبھار مجھے بڑے پجاری جی کی منہ بولی بیٹی یاد آ جاتی تھی۔ جانے کیوں؟

موسیقی سکھانے کے لیے استاد کے ساتھ ایک طبلچی آیا کرتا تھا۔ بڑا سندر اور سجیلا سا۔ ٹیڑھی پگیا پہنے، وہ طبلچی کسی طرح نہیں لگتا تھا۔ اس کے انداز اس کے طریقے اور عادات میں ایک

سلاست سی تھی۔ ایک روانی سی۔ میں نے میرا کو اکثر ریاض کرتے دیکھا ہے۔ گورنس پاس بیٹھی اونگھتی رہتی یا کتابیں پڑھتی رہتی اور میرا میری پیاری اور اکلوتی بیٹی جس کے لیے میں زندہ تھا' ریاض کرتی۔

میں بھگوان کے ہاتھ سے بے خبر تھا۔ میں ساری دنیا کو بھول گیا تھا۔ مجھے اپنی میرا ایک پھول کی طرح آہستہ آہستہ کھلتی معلوم ہوتی اور میں سوچتا رہا میری بیٹی کے لیے کوئی شہزادہ کوئی راجہ اِندر ہی ٹھیک رہے گا۔ اتنی پیاری اور کامنی سی ہے۔ ایسی خوبصورتی اور نزاکت تو راج محلوں میں بھی نہیں ہوگی۔ آخر کشتری خون اس کی رگوں میں تھا۔ جب چودہ برس کی ہوئی ہے تو بیس سال کی معلوم دیتی تھی۔ کتنا لمبا قد تھا' شرمگیں آنکھیں' پدمنی بھی اس سے زیادہ خوبصورت نہیں ہوگی۔ میں سوچتا' میں پرتاب ہوں اور یہ حسین بیٹی میری ہے۔

یکایک گورنس نے رخصت مانگی۔ اسے ضروری کام سے اپنے شہر جانا پڑ گیا تھا۔ گھر میں کوئی بڑی بوڑھی بھی نہ تھی۔ نوکروں کی پلٹنیں تھیں' پھر بھی جس دن گورنس رخصت ہوئی ہے' میرا بری طرح رو رہی تھی۔ اس شام میں نے پوچھا تھا کیوں میرا تم نے آج ریاض کیا ہے' کہنے لگی نہیں۔ استاد شام کو آئیں گے۔

میں نے کہا: ''شام کو کیوں صبح کو کیوں نہیں؟''

بولی: ''یونہی طبیعت نہیں چاہتی۔ اور پھر گوئیاں بھی تو کہہ گئی ہیں کہ ریاض رات کو اچھا رہے گا (وہ اپنی گورنس کو گوئیاں کہتی تھی) میں نے کہا' معمولی بات ہے دن میں نہ سہی رات سہی۔ صرف یہ خیال تھا اس کے آرام میں فرق پڑے گا۔

پھر راتوں کو جب میں اپنے کمرے میں دادِ عیش دیتا' میری بیٹی میرا کے ریاض کرنے اس کے ستار کے تاروں کی ٹنٹناہٹ اور طبلے کی تھاپ مجھے سنائی دیتی رہتی۔ اس سجیلے اور بانکے سندر طبلچی کی صورت میری آنکھوں کے سامنے پھرتی۔

چند دنوں بعد شاموں کو ستار کے تاروں کی ٹنٹناہٹ بھی سنائی نہ دی۔ میں نے صبح ناشتے پر پوچھا' کیوں میرا استاد نہیں آتے کیا؟ بولی وہ بیمار ہیں چند دن نہیں آئیں گے۔ میں مطمئن ہو گیا۔

ایک شام میں یونہی مضمحل تھا۔ اداس نہ جانے دل کیوں ہو گیا تھا۔ باہر جانے کی بجائے باغ میں گھومنے لگا۔ میرا کا کمرہ باغ کے ایک کونے میں ہے۔ شام کا اندھیرا بڑھ رہا تھا۔

میرا خیال تھا وہ کمرے میں ہوگی اور میں اسے جا کر اپنے ساتھ گھمانے باہر لے جاؤں گا اور میں جب دبے قدموں برآمدے میں گیا ہوں تو اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔

میرا کہہ رہی تھی: ''تم غریب ہو تو کیا ہے۔ پیار غربت کو نہیں دیکھا کرتا۔''

اور اس بانکی سجیلی پکیا والے طبلچی کی آواز آئی۔ ''تم مجھ سے دور ہو' شہزادی اور میری تو ماں کا بھی پتہ نہیں کون تھی میں کون ہوں؟'' مجھ میں اور سننے کی تاب نہ تھی۔ میں وہاں سے آ گیا۔ غصے کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ اس سمے مجھے اپنے سارے گناہ' اپنی ساری لغزشیں بھول گئیں' صرف یہ یاد رہا کہ میرا میری یعنی رادھے کرشنن کی بیٹی ہے۔

شام کو کھانے پر میرا کا رنگ بہت زرد تھا۔ وہ انجانے ہی سہمی ہوئی اور ہر حرکت پر خود ہی چونک جاتی تھی۔ میں خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی۔

وہ چیزیں مجھے پکڑاتی اور مسکرا کے بات کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

کھانا ختم ہوا تو میں نے پوچھا: ''میرا تمہارے استاد ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئے۔ ریاض کب ہوا کرے گا۔ سنگیت بھول جاؤ گی۔''

میرا کا رنگ اتنا زرد ہو گیا تھا جیسے وہ ابھی گر جائے گی' مگر اس نے کرسی کا سہارا لے کر صرف کہا تھا۔ ''اچھا بابا!''

اور رات اور گہری ہو گئی۔ اس رات آسمان پر چاند نہ تھا۔ ستارے نہ تھے مگر مجھے موسم کی خوشگواری کا ہوش نہ تھا۔ میں صرف یہ جانتا تھا کہ میرا نے اپنا نہیں خاندان کا اور کل عورت ذات کا ایمان کیا ہے۔ مجھے اپنی ساری حکایتیں بھول گئیں۔ جب رات بھیگ گئی میرے السیشن کتے بھیڑیوں کی طرح باغ میں اردگرد چکر لگانے لگے تو میں اپنی بیٹی کے کمرے میں گیا۔

میں نے کہا: ''میرا جاگ رہی ہو؟''

جب اس نے کہا: ''ہاں بابا!'' تو میرا دل تھوڑی دیر کے لیے محبت سے نرم ہونے لگا۔ وہ کتنی سہمی ہوئی اور مضمحل آواز تھی۔

میں نے کہا: ''آؤ میرا ایسی رات میں تمہیں ایک تماشا دکھائیں۔'' کوئی اور رات ہوتی تو وہ ضرور انکار کر دیتی مگر اس کے سینے میں چور تھا وہ بچی تھی نہ' کچی شاخ سی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور اپنے رات کے لباس میں ایک ہلکی سی شال اوڑھ کر میرے ساتھ آ گئی۔

میں خاموشی سے اس کے آگے آگے چلتا رہا۔ وہ ہمیشہ کی باتونی مجھ سے چند قدم پیچھے

آ رہی تھی۔ میں کوئی اور بات سوچنا چاہتا تو بھی سوچ نہ سکتا۔ مجھے صرف ایک ہی خیال تھا۔ میرا نے ایک گناہ کیا ہے۔ آج میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں' میں اس کا باپ ہر قدم پر ایسے ہی بھنوروں میں سے نکلا ہوں۔ میرے گرد جو لوگ رہتے تھے' ان کی عزت بھی کوئی شے تھی مگر میں نے کبھی اس طرف غور نہیں کیا۔ میرا دل غصے کی بے پناہ آگ میں جل رہا تھا۔ اپنے پیچھے آتی میرا کے قدم میرے دل پر پڑتے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ ایک دم مڑ کر اس کا گلا گھونٹ دوں مگر میں آگے چلتا رہا۔

جب باغ کا بہت گھنا حصہ آیا تو میں نے اس کی آواز سنی۔ پوچھتی ہوئی: ''بابا کدھر جا رہے ہیں ہم؟''

میں نے کہا تھا: ''چپ چاپ میرے پیچھے چلی آؤ۔''

اس کی سسکی مجھے پھر سنائی دی کہتی ہوئی: ''بابا رات اتنی گہری ہے۔ مجھے سردی لگ جائے گی۔ میں واپس جا رہی ہوں۔'' مگر وہ میرے پیچھے آ رہی تھی۔ میں نے ہمیشہ اس کے آرام کا' اس کی بات کا بہت خیال رکھا ہے۔ عاشق باپ کو کیا ہو گیا ہے اور وہ مدہوش سی میرے پیچھے آتی گئی۔

باغ ختم ہو گیا۔ ہم اب اس حصے پر جا رہے تھے جہاں ایک اور دروازہ عین جمنا کے کنارے کھلتا ہے۔ ''تم اگر یہ کھڑکی کھولو۔'' اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا: ''تو تم جمنا کو دیکھ سکو گے۔ جس دروازے سے تم داخل ہوئے ہو اس سے بتدریج بلند ہوتا جا رہا ہے اور باہر کی دیوار سے برابر ہے۔''

مگر میں نے اٹھ کر کھڑکی نہیں کھولی اور رادھے کرشنن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''میں جیب میں اپنی چابی تلاش کر رہا تھا۔ میں اندھیرے میں دیوار کے سائے میں کھڑا چابی ڈھونڈ رہا تھا۔ اس لیے کہ میں اپنی بیٹی اپنی میرا کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ اپنے سارے ڈر کے باوجود مجھ سے لپٹ گئی اور بولی: ''بابا مجھے کوئی تماشا نہیں دیکھنا' چلیے واپس چلیے۔'' مگر میں نے اس کو زور سے پرے جھٹک دیا۔ وہ سہم کر ایک ایسے بچے کی طرح حیران ہوئی کہ اسے کس بات پر ڈانٹ دیا گیا ہے۔ کھڑی ہو گئی۔ وہ اسی طرح کھڑی تھی جس طرح میں نے اسے جھٹکا ہے۔

دروازہ کھل گیا۔ میں اور میرا باہر آ گئے۔ مجھے اپنے پیچھے چوکیدار کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میرے السیشن بڑے بڑے بھیڑیوں کی طرح گھر کے گرد گھوم رہے تھے۔ شہر کی طرف سے کبھی کبھار کتوں کے بھونکنے کی آواز اور پہرہ داروں کی ہوشیار ہوشیار کی صدا سنائی دے جاتی۔

جمنا کے کنارے ہم دور تک چلتے رہے۔ اس جگہ پہنچ کر جہاں درخت دریا پر جھک گئے ہیں اور راستہ الجھا ہوا بھی نہیں ملتا۔ میں ٹھہر گیا اور میرے پیچھے آتی میری میرا بھی ٹھہر گئی۔ میں کھڑا ہو کر اپنا سانس ٹھیک کر رہا تھا۔ میں آنے والے حادثے کے متعلق نہیں سوچ رہا تھا۔ میں تو ایک جلاد سے بھی سخت تھا۔ میرے دل میں رحم کیوں آتا؟ رحم کہاں سے آتا؟

دریا کا پانی میرے قدموں میں میرا کی محبت کی طرح سیاہ تھا۔ کبھی کبھی کنارے سے مٹی کا تودہ آواز سے پانی میں گرتا' جھپاک سا ہوتا اور پھر سطح برابر ہو جاتی۔ لہریں تیز تیز جلد جلد اسی طرح جا رہی ہوں گی۔ میں وہاں کھڑا اسی جمنا کے تٹ پر جہاں کرشنن مہاراج نے دنیا کو بچانے کا پیغام دیا تھا۔ میں رادھے کرشنن اپنی دنیا کو خود ہی برباد کرنا چاہتا تھا۔ میرا میری ایک ہی بچی میری کل کائنات تھی۔ اس کے سوا میرا کوئی نہ تھا۔ میں دیس دیس گھوما ہوں۔ پر میں نے اپنی میرا کی حفاظت یوں کی ہے کہ اس پر سے کبھی کوئی تاریک سایہ بھی نہیں گزرا۔

پھر میں مڑا اور میں نے اس تاریک رات میں اپنی بیٹی سے کہا: ''ادھر آؤ میرے قریب آؤ۔''

وہ سہمی سہمی ڈری ڈری سسکتی بڑھی اور کہنے لگی: ''بابا مجھے ایسی اندھیری رات میں ڈر لگ رہا ہے واپس چلئے۔''

میں نے اس کا بازو پکڑ کر کہا: ''دیکھو جمنا کتنی گہری اور رات کے سمے کیسی سندر لگتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے اس کا پانی ٹھنڈا ہوگا۔''

میرا نے چیخ کر کہا: ''بابا واپس چلئے مجھے نہیں پتا پانی ٹھنڈا ہے یا نہیں۔''

اور اس وقت میں نے کہا: ''تمہیں یہ تو پتہ ہے کہ ایک طبلچی تمہاری محبت کے لیے ٹھیک ہے' تم راجکماری ہو کر بھی اس کو چاہو گی۔''

میرا چیخ کر دوہری ہو گئی۔ ''نہیں بابا نہیں بابا۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''مجھے چھما کر دو۔ میں نے غلطی کی ہے۔'' اس پگلی کو یہ بھی شعور نہ تھا کہ اتنی صفائی سے اپنا قصور ماننے کی بجائے وہ انکار کر دے۔

اور پھر میں نے چیختی ہوئی میرا کا گلا دونوں ہاتھوں سے دبا دیا۔ میں اس وقت ایک راکشس کی قوت اور سختی سے میرا کا گلا دبا رہا تھا۔ وہ بڑی بڑی سوئی سوئی سی آنکھیں میری آنکھوں کے اتنے قریب تھیں کہ میں ان میں بے بسی دیکھ سکتا تھا جیسے میں سورج کی روشنی میں اس زمین کو دیکھوں۔ ان آنکھوں کی گہرائیوں میں حیرت تھی' اپنے گناہ پر ندامت تھی اور ایک التجا تھی مگر میں نے یہ سب نہیں دیکھا۔ تاروں کی چھاؤں تلے میری بیٹی کی وہ آنکھیں جن کو میں غرور سے دیکھا کرتا تھا' میری آنکھوں کے سامنے التجا کر رہی تھیں اور میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میری آنکھوں میں آہنی سختی آتی گئی۔ میرا کا تڑپتا جسم اور اس کی کشمکش میرے ہاتھوں کے نیچے ختم ہو گئی۔ میرا میری اپنی اکلوتی بیٹی میرا مر گئی۔

میں اتنی سرعت سے سب باتیں سوچ رہا تھا۔ میں نے اس کے جسم کے ٹکڑے اتنی تیزی سے کیے ہیں۔ میرا جسم کام کر رہا تھا۔ مجھ میں بے پناہ قوت آ گئی۔ میں نے اپنی نازوں سے پالی ہوئی بیٹی کے جسم کے اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے اور جمنا کے پانی میں بہاتا گیا۔ وہ ٹکڑے جاتے ہی مچھلیوں کا شکار ہو گئے ہوں گے۔

جب میں واپس آیا ہوں تو رات ابھی باقی تھی۔ میں نے کپڑے بدلے ہاتھ دھوئے اور بستر میں لیٹ گیا۔ مگر نیند مجھے اس کے بعد نیند کبھی نہیں آئی۔ اب ایک ہی نیند ہے جس کا انتظار میں کر رہا ہوں۔ صبح کو میرا کی دایہ نے آ کر کہا کہ اس کا کہیں پتہ نہیں' میں اس کے بعد اپنے کمرے سے نہیں نکلا۔ میں نے لوگوں سے ملنے سے انکار کر دیا اور پھر یہ بات کسی نہ کسی طرح مشہور ہو گئی کہ میری اپنی اور پیاری بیٹی میرا بھاگ گئی ہے۔ میں نے اس بات کی تردید کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں اپنا محاسب خود ہی ہوں۔ اگر یہ بات کہ حکومت کی سزا میرے گناہ کو کم کر دے گی' اس بوجھ کو کم کر دے گی تو میں خوشی سے اپنے کو حکومت کے حوالے کر دیتا مگر مجھے تو اس بڑے پرماتما کے سامنے اپنے گناہوں کی سزا کے لیے جانا ہے۔ اس رات مجھے بڑے پجاری جی کی منہ بولتی بیٹی کا چہرہ یاد آتا رہا۔ مجھے میرا یاد آتی تھی اور اس کی گوئیاں' ان آنکھوں کی حقارت اور غصہ' مگر میرے دل میں کوئی شک نہیں تھا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ سُندری زندہ ہو سکتی ہے۔ اس نے زہر کھا لیا تھا۔ پجاری جی کسی اور شہر چلے گئے تھے۔

اور ان سے تیسرے دن میرا کی دایہ نے کہا: "گوئیاں آئی ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

میں نے انکار کرنا چاہا مگر کر نہ سکا۔ گوئیاں کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔

اس عورت نے جس کو میں آج تک گورنس سمجھتا رہا تھا' جس کی آنکھوں میں صرف میرے لیے غصہ اور حقارت تھا' دروازے کی دہلیز میں کھڑے ہو کر کہا تھا: ''میرا کدھر ہے؟''

میں نے جواب نہیں دیا تھا۔ میں خاموش رہا تھا۔

اب بھی وہ مجھے یہاں اس کمرے میں سرخ پردوں کے درمیان اسی طرح کھڑی دکھائی دیتی ہے جب اس نے غصہ بھری آواز میں حقارت سے کہا تھا۔

''میرا کدھر ہے؟''

پھر اس نے آہستہ سے کہا: ''بھگوان کی آنکھ بند نہ تھی تم اپنے گنوں کی آگ میں جل رہے ہو۔''

اور اس لمحے میں نے پہچانا کہ وہ سندری تھی۔ خوف سے میرے جسم میں ایک لہری اٹھی۔ میں کانپ گیا۔

سندری نے کہا تم نے رحم کرنا اپنے وعدوں کا دھیان کرنا کبھی نہیں سیکھا۔ میرا کا قصور نہیں، تمہارے گناہوں نے اسے برباد کیا ہے۔ پرماتما کبھی کبھار باپ کے گناہوں کا بدلہ بچوں سے لیتا ہے۔ وہ نیائے کرتا ہے۔ میں نے ایک عمر انتظار کیا ہے۔ اب میں جا رہی ہوں۔ تم کو معلوم ہو گیا ہے۔ جب کسی باپ کی عزت برباد ہوتی ہے تو اس کا دل کتنا رنجیدہ ہوتا ہے۔ تمہیں اب معلوم ہوا کہ بیٹی کی عزت ایک غریب کے لیے بھی وہی حقیقت رکھتی ہے جو ایک امیر اور بادشاہ کے لیے۔ وہ طبلچی میرا بیٹا ہے سمجھے اور میرا بدلہ اب پورا ہو گیا۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ سندری بڑے پجاری جی کی بیٹی جس کو میں بھولنے کے باوجود بھلا نہ سکا تھا۔

اس کے بعد مجھے معلوم نہیں دن اور رات کہاں ہیں' کون میرے پاس آتا ہے اور کون نہیں، پر ایک سناٹا ہے جس میں صرف یہی آواز ہے۔ ''بھگوان کی آنکھ بند نہیں، تم اپنے گنوں کی آگ میں جل رہے ہو'' اور ٹھیک ہے میں نے اپنے ہاتھوں ہی اپنی ساری عمر کی محنت اور محبت کو برباد کر دیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں میرا چلی گئی' وہ جا کہاں سکتی تھی۔ اس میں تو اتنی ہمت نہ تھی کہ اپنی بات کو پلٹ سکے وہ تو اتنی معصوم اور بھولی تھی' وہ کہاں جاتی۔ میری نگاہوں میں ستاروں کی کمزور روشنی تلے صرف وہ آنکھیں ہیں وہ آنکھیں مجھے کچھ کہتی نہیں۔ بے بس جانور کی طرح ٹکر ٹکر دیکھتی ہیں۔

میں یہ سب باتیں کنول کماری کو بتانا چاہتا تھا۔ میں اس سے یہ التجا کرنا چاہتا تھا کہ

سندری کو کہیں ڈھونڈے اور اسے کہے کہ میں یعنی رادھے کرشن معاف کر دیا جاؤں۔ میری آتما مرنے کے بعد بھی بھٹکے گی۔ اگر سندری نے مجھے معاف نہ کیا ہے تو۔ اس نے اپنا بدلہ لے لیا ہے۔ پھر بھی میں چاہتا ہوں میں ایک گناہ گار اور راکشس معاف کر دیا جاؤں۔ یہ کام ساری دنیا میں صرف کنول کماری ٹھاکر کر سکتی ہے...... پھر اس نے ٹھہر کر کہا۔

''کیا آپ کنول کماری سے کہہ نہ دیں گے۔ سندری کی اتنی بڑی بڑی آنکھیں ہیں کہ صرف ویسی آنکھیں اس کی ہی ہو سکتی ہیں اور کسی کی نہیں۔ ان آنکھوں میں ایک زخمی کیفیت ہے جو آکاش کے نیچے صرف اس عورت کی ہی آنکھوں میں ہو سکتی ہے۔ سندری نے اپنی مُکتی کے لیے کتابوں کا سہارا لیا ہے۔ جن دنوں میں اسے جانتا تھا' وہ صرف ہندی لکھ سکتی تھی اور جس گورنس نے سالوں میرا کی تربیت کی وہ تو ہر زبان میں ماہر تھی۔ سندری جس طرح ستار بجاتی ہے اس طرح تو صرف بڑے پجاری جی کی بیٹی ہی بجا سکتی تھی...... اسے ڈھونڈنا اتنا مشکل نہ ہوگا جتنا اب لگتا ہے اور یہ کام سوائے کنول کماری کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ کنول سے کہہ دینا میں نے اسے بلانے کی جو غلطی کی تھی' اسے بھی وہ بھول جائے۔ میں دوسری بار اس شام کے بعد سے کبھی اس سے ملنے نہیں گیا۔ میں اس کی عزت کرتا ہوں۔ دنیا میں وہ اکیلی عورت ہے۔ جس کو میں پاربتی کے سمان اونچا سمجھتا ہوں۔ میں نے کبھی اپنی آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کی۔ میں جو عورت کو آنکھوں میں نگل جاتا ہوں' میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ماں مجھے دو دن کا چھوڑ کر مر گئی تھی۔ باپ بڑا ہونے تک چل بسے۔ میرا اور کوئی نہیں..... اور میں کنول کماری کی عزت کرتا ہوں۔ کاش میں اس کے چرن چھو سکتا' مگر نہیں میں ایک گناہ گار ان کے پاؤں کو چھونے کے قابل بھی نہیں ہوں اور پھر بھی میں اپنے مرتے سمے اس کے چرنوں کی دھول اپنے ماتھے کو لگانا چاہتا ہوں۔ میں اس کے قدموں میں اپنا ایک تحفہ رکھنا چاہتا ہوں......''

وہ بہت دیر تک چپ رہا اور میں سوچ رہا تھا وہ تحفہ کیا ہو سکتا ہے۔ کیا اس کا دل ہے...... کیا ہو سکتا ہے؟

رادھے کرشن کی آواز آئی میری ہمت نہیں ہوتی پر میں کہہ دوں گا میری اتنی جائیداد ہے۔ میں یہ ساری کنول کماری کے نام کرنا چاہتا ہوں......اور پھر میرا بازو سوکھی انگلیوں میں پکڑ کر بولا۔ ''وہ اسے قبول کر لے گی؟''

میں سوچ رہا تھا کہ میں کیا کہہ سکتا تھا۔ کنول کی عزت کا سوال تھا۔ رادھے کرشنن کی جائیداد لے کر کنول کیا کرے گی۔ لوگ کیا کہیں گے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

وہ پھر بولا: ''کنول کماری جتنے کاموں میں اس روپے کو لگا سکتی ہیں۔ عورت کی مکتی اور ان کی نجات کے لیے میرا گھر کام آسکتا ہے۔ میں جو ساری عمر عورت کا اپمان کرتا رہا ہوں، سوچتا ہوں اب مرتے سمے میں اس ساری جائیداد کو عورتوں کی بہبود اور ان کی بہتری کے لیے کنول کماری کے ہاتھوں میں دیئے جاؤں۔ میں نے اپنی زندگی میں کتنے بڑے بڑے گناہ کیے ہیں اور مرتے ہوئے عورتوں کی بہتری کے لیے اپنی جائیداد دے کر میں سستی سورگ نہیں خرید رہا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کنول کماری کو جو مشکلات روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے اٹھانی پڑتی ہیں، وہ کم ہو جائیں۔ پر وہ اسے قبول کر لیں گی تو......''

میں نے کہا: ''یہ تو ان سے پوچھ کر ہی ہو سکتا ہے۔''

رادھے کرشنن بولا: ''نہیں اب پوچھنے کا وقت نہیں ہے۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھوں گا جس سے اس بڑی اور قابلِ عزت عورت کی کوئی ہتیا ہو۔ میں مرتے ہوئے کوئی بڑا کام نہیں کرنا چاہتا۔ وصیت لکھی جا چکی ہے۔ میں نے کنول کماری کو ایک منتظم کی طرح ہر اختیار دیا ہے کہ وہ عورتوں اور ہندوستان کی عورتوں کو اس دلدل اور گناہ سے نکالنے کے لیے جو بھی کرے کر سکتی ہے...... میرا خیال ہے اس میں تو کوئی قباحت نہیں۔''

اور میں نے کہا: ''آپ کیا کریں گے' آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

رادھے کرشنن اس زور سے ہنسا کہ میں نے سوچا یہ پاگل ہو گیا ہے۔ بولا: ''میں کہیں نہیں جا سکتا۔ میں یہیں رہوں گا۔'' وہ پھر اور زور سے ہنسنے لگا۔

پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا: ''تم کیا سمجھتے ہو میری طرح انسان کہیں جا سکتا ہے۔ کیا آکاش کی بلندیوں پر بیٹھے بھگوان مجھ پر مہربان ہو سکتے ہیں؟''

میں نے کہا: ''بھگوان دَیا کرنے لگے تو......''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''بھگوان اور دَیا کا نام نہ لو۔ اگر وہ دَیا کرنا چاہے گا تو میں اس کی دَیا کو لوٹا دوں گا۔ میں اپنے گناہوں کی آگ میں جل کر مکتی حاصل کرنا چاہتا ہوں اور کنول کماری سے کہنا سندری کو ڈھونڈنا اتنا مشکل نہیں۔ وہ آنکھیں اس دنیا میں صرف اس کی ہو سکتی ہیں۔ وہ کیفیت بھی اس کی آنکھوں میں ہی ہو سکتی ہے۔ میں تمہاری اس اونچی عورت سے

صرف یہی التجا کروں گا وہ اگر سندری سے ملے تو اس سے کہے کہ گنوں کی آگ میں جلنے والا صرف چھما پاکر ہی پوتر ہو سکتا ہے اور بھگوان کی آنکھیں تو بند نہیں ہو سکتیں۔''

ہم دونوں بہت دیر خاموش رہے۔

وہ پھر بولا: ''آپ بھی پوچھیں گے میں نے کنول کماری ٹھاکر کو ہی کیوں منتخب کیا ہے۔ میں اس پر ہی بھروسہ کیوں کرنا چاہتا ہوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے پاس عورت کی سب سے بڑی شکتی ہے۔ اس کے پاس نیکی ہے۔ اس کے بازوؤں میں طاقت ہے۔ وہ میرا کی طرح سندری کی طرح بے بس نہیں ہے۔ وہ مرد سے خائف نہیں، وہ آدمی کی ذات سے ڈرتی نہیں، اس کے لیے مرد صرف اس سطح پر زندہ ہے جس پر وہ خود ہے وہ مرد کو اتنا حقیر نہیں سمجھتی کہ اس کی طرف متوجہ ہونے سے انکار کر دے۔ وہ مرد کو اتنا بلند نہیں سمجھتی کہ اس کے پاؤں میں جھکے۔ میں نے دیس دیس گھوم کر جتنی عورتیں دیکھی ہیں، وہ ان سب سے بلند اور افضل ہے۔ اس کے پاس سچائی اور گہرائی ہے۔ وہ ہماری ماں بہن بیٹی کی طرح قابلِ احترام ہے اور پھر بھی ان سب سے الگ ہے۔ کوئی بات تو ہے کہ اس کے سامنے جا کر گنہگار سے گنہگار میری طرح کا سیاہ کار انسان نیکی کی شکتی کو ماننے لگتا ہے۔ میں تمہیں اپنے دل کی کیفیت بتا رہا ہوں۔ مجھے وہ عورت یاد آ رہی ہے جب زندگی میں پہلی بار میں نے چاہا تھا اور ایک کھوئی ہوئی تمنا کی تھی۔ کاش میں اس عورت سے مخاطب ہونے کے قابل ہو سکوں۔ کنول کی پیشانی پر ایک نور ہے۔ عام آدمی وہ مکٹ نہیں دیکھتے پر میں جو خود اتنا اندھیرا ہوں، میں نے اس کو دیکھا ہے، پر اس کی طرف زیادہ دیر تک دیکھنے کی میری ہمت نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ میرا میری اپنی پیاری اور اکلوتی بیٹی میرا بھی کسی دن اس دوسری عورتوں کی طرح زمانے سے بلند اپنی خوبصورتی اور نیکی کے سہارے کھڑی ہو گی۔ اگر میں نے کنول کو نہ دیکھا ہوتا تو شاید اس شام مجھے میرا کی باتیں سن کر غصہ نہ آتا۔ شاید میں اسے معاف کر دیتا۔ مگر میں دوسری عورت کو دیکھ چکا تھا۔ مل چکا تھا۔ ہم بلندی ڈھونڈنے آس پاس اِدھر اُدھر جاتے ہیں۔ میں نے بلندی اپنے سامنے دیکھ لی تھی۔ میں نے میرا کو اپنی بیٹی کو اس رفعت کی طرف کھینچتے ہوئے توڑ دیا۔ دیکھتے ہو میری زندگی میں کنول کہیں نہیں ہے اور پھر بھی میری بربادی اور میرا یہ اختتام اس کی وجہ سے ہے۔ میں خوش ہوں میں نے زندگی کے اجالوں میں ایک ایسی عورت کو دیکھ لیا جس کی یاد مجھے موت کے اندھیروں کے بعد بھی رہے گی۔ اور اس کے باوجود میں تمہیں یقین دلاتا ہوں جس طرح ایک مرد دوسرے مرد کو یقین دلاتا ہے۔ جس طرح ایک آگ کے کنارے کھڑا آدمی اپنی اصلی کیفیت

دوسرے سے کہتا ہے کہ میں نے کنول کماری ٹھاکر کو چاہا نہیں ہے۔ میں یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ میں یہ خیال بھی اپنے دل میں نہیں لا سکتا تھا......"

وہ کافی دیر تک خاموش رہا۔

اور پھر بولا: "میرا دل مارے خوشی کے ایک کمزور نبض کی طرح آہستہ آہستہ دھڑک رہا ہے۔ یہ سوچ کر کہ میں نے اپنی زندگی میں جیتے جی کنول کماری سے بات کی تھی۔ اس کے پاس بیٹھ کر اس سے ہمکلام ہو کر اور پھر بھی کسی طرح یہ کیفیت کنول سے وابستہ نہیں بلکہ اس اتم شکتی سے دوچار ہونے کی ہے جس کو میں نے اس عورت کے روپ میں دیکھا ہے۔

پھر میری طرف جھک کر کہنے لگا۔ "کیوں تم تو کنول کماری کو ایک زمانے سے جانتے ہو تم ہی کہو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

اور میں سوچ رہا تھا اس کو کیسے بتاؤں کہ میں جو کنول کو ایک زمانے سے جانتا ہوں۔ اس کے لیے اتنا ہی اجنبی تھا، جتنا خود رادھے کرشن تھا مگر میں خاموش رہا، میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

زندگی کے آخر میں یہ باتیں سوچتے ہوئے پاکر تم کہو گے شاید میں نیکی کا سہارا لینا چاہتا ہوں۔ میں اپنی جائیداد ایک اچھے کام کے لیے لگا کر کنول کو خوش کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے سپرد ایک کام کر کے میں سدا اس کی یاد میں رہنا چاہتا ہوں...... شاید میرا لاشعور ایسی باتیں سوچ سکتا ہو مگر نہیں میں ایسی باتیں نہیں سوچ سکتا۔"

وہ ان سرخ قالینوں سے بھرے اور سرخ مخملیں پردوں سے مزیّن کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ آتش دان پر سانپ کے پھن پر پاربتی جی بڑی متانت اور بہت وقار سے بیٹھی تھیں۔ عورت اور سانپ کا تعلق بہت پرانا ہے نا۔

وہ پھر بولا: "تمہیں یاد ہوگا جب میں نے اس رات اپنی سیاہ موٹر کے قریب کھڑے ہو کر کنول سے کہا تھا: "میں نے آپ کو بہت تکلیف دی۔" اور اس نے کہا تھا: "محتاط رہئے نا۔ پھر کبھی ایسی تکلیف نہ دیجئے گا۔"

اسی شام میں نے سوچ لیا تھا کہ جو عورت مرد کی اتنی سی بھی پروا نہیں کرتی جس میں دیوی کی سی آن بان اور طاقت ہے، وہ عورت ہر آگ میں سے گزر سکتی ہے۔ لگاؤ اور محبت بھی آگ بھی عورت کا دیوی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں نے اس لمحے محسوس کیا تھا کہ میں رادھے کرشن

اس کے لیے ایک ایسے بچے کی حیثیت رکھتا ہوں جس کو ابھی تک بات کرنے کی تمیز نہ آئی ہو اور پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ میرے لیے وقت تھم گیا ہے۔ میرے لیے تو کمرے سے باہر کوئی مقام نہیں ہے۔ آپ یہاں بیٹھے بیٹھے اور میری باتیں سنتے تھک گئے ہوں گے۔ آپ کو گھر جانا ہو گا اور پھر بھی کسی نہ کسی طرح میں کسی سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے دل سے ایک بھاری پتھر ہٹانا چاہتا تھا اور ایسے میں پہاڑ کا سا بوجھ اور بھی بھاری ہو گیا ہے۔ دیر تک وہ آتش دان کے قریب کھڑا پاربتی جی کے پاؤں پر انگلیاں پھیرتا رہا اور پھر بولا: ''دیکھتے ہو ہم آخر میں ہمیشہ عورت سے شکست کھاتے ہیں۔ ہم اس سے ہار جاتے ہیں' چاہے وہ بیٹی ہی کیوں نہ ہو۔ ایسی بیٹی جس کی آنکھوں کی زخمی کیفیت مرتے سمے تک یاد رہے جس کی آنکھوں کی بے بسی پکار پکار کر کہے بولو تو سہی بتاؤ تو سہی میں نے کیا کیا ہے۔ کیا کسی کو چاہنا گناہ ہے؟''

میری زندگی میں جھاڑ جھنکاڑ کی طرح صرف عورتیں ہیں۔ دھوکہ کرنے کے لیے دلفریب طریقے ہیں۔ دولت کمانے کے نسخے ہیں اور کچھ نہیں۔ رادھے کرشنن تھوڑی دیر کے بعد پھر بولا: ''اور میں اپنے آپ سے مطمئن اور خود کو کامیاب شخص کی طرح سمجھتا رہا تھا۔ یہی سب کچھ ہے۔ یہی کافی ہے۔ ان سے باہر میں نے کسی شے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔ لوگ میرے سامنے جھکتے تو میں اپنے آپ کو بھگوان کی طرح اونچا اور مکمل سوچتا اور آخر میں جب کارواں در کارواں میری زندگی کی فتوحات میرے سامنے سے گزر رہی ہیں میں سمجھتا ہوں وہ ٹوٹے کھلونوں کے ٹکڑے ہیں۔ مٹی کے حقیر اور ناچیز کھلونے جن سے میں اپنا دل بہلاتا رہا ہوں اور جو زندگی کے آخر میں کسی تکمیل کا کام کسی اچھے کام کا تصور پیش نہیں کر سکتیں۔ میرے دامن میں اب کچھ باقی نہیں۔ زندگی میں ایک آخری کھلونا بھی میں نے اپنے ہاتھوں توڑ دیا۔ میں ایک کمزور اور بزدل کی طرح اپنی اس کیفیت کی بربادی کے اس منظر کو دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا...... اگر ہو سکتا تو دوبارہ میں زندگی شروع کرتا' پر سوچتا ہوں یہ زندگی اگر مجھے پھر سے دے دی جائے تو بھی میں وہی کروں گا جو میں نے اس زندگی میں کیا ہے......'' وہ چپ ہو گیا تھا۔ باہر سناٹا تیر رہا تھا۔ کیا ہم دونوں کسی مزار میں دفن تھے؟''

ہمارے ہاں کوئی ایسا مقصدِ حیات نہیں ہے جس کے لیے ہم کام کریں اور اگر مقصد ہو بھی تو...... وہ اپنی کرسی پر پھر آ بیٹھا تھا۔ تو وہ نگاہوں سے پوشیدہ ہو گا۔ صدیوں کی روایات ہمارے پیشِ نظر ہیں اور یہ روایات ہیں۔ زندگی سے کھیلنا جوں توں زندگی کو گزارنا اور اب سوچتا ہوں جب

اندھیرا ہوگا تو باہر کی روشنی ہمارے لیے کیا کرے گی۔ مذہب اور پر ماتما کے مندر سے لے کر اپنی مکتی تک ہر شے ایک کھلونا ہے...... میں نے مندروں میں مورتی کے سامنے بھی ان منے سر جھکایا ہے۔ پر آج لگتا ہے میں نے سارا کچھ ایک دلچسپ کھیل سمجھ کر کیا تھا۔ میں نے زندگی سے مذاق کیا تھا اور زندگی بھی تو اس بدلے میں مجھ سے مذاق کر رہی ہے۔ آخر میں تھکن کے بوجھ سے چور ہو کر جب میں گر رہا ہوں۔ میرے دامن میں کیا ہے؟ ایک جھوٹی تسلی بھی نہیں...... میں بھگوان کے سامنے جا تو رہا ہوں پر...... میلے کچیلے پھٹے لباس میں کانپتا اور ننگا۔ جب میں اس کے اونچے تخت کے سامنے کھڑا ہوں گا تو کیا وہ میری طرف رحم بھری نظروں سے دیکھے گا۔

وہ کرسی سے اٹھ کر ایک زخمی جانور کی طرح کمرے میں گھوم رہا تھا۔ پھر اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔ پورے چاند کی زرد روشنی قالین پر پڑنے لگی۔ ذرات روشنی میں اڑ رہے تھے۔ ننھے ننھے ذرے جن کا وجود ایک ساتھ مل کر اڑنے اور اڑتے رہنے میں ہی ہے۔ دریا کی بھیگی ہوئی ہوا دفعتہً اندر آ گئی اور روشنی کے ساتھ ہی بڑھنے لگی۔ کھل کر بہنے لگی۔

میری طرف مڑ کر کہنے لگا۔ ''میرا اتنی پیاری تھی۔ اتنی پیاری کہ تم دیکھتے تو دیکھتے ہی رہ جاتے۔''

میں خاموش تھا کیا کہہ سکتا تھا۔

وہ پھر بولا: ''ہمارے ہاں کے جھوٹے رواجوں اور عزت کے جھوٹے پیمانوں کی بھینٹ میرا ہو گئی۔ میں اسے دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا۔ میں نے بھی اپنے مرتبہ پدری سے نیچے اتر کر اس کے ساتھ ملنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میں سوچتا تھا اسے زندگی کی سب ضروریات میسر ہیں۔ اسے دولت کے سارے کھلونے مل گئے ہیں' کتابیں ہیں' سنگیت ہے' اسے اور کیا چاہیے؟ پر میں نے زندگی میں محبت کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔ میں خود بھی تو محبت سے ناآشنا رہا ہوں۔ مجھے اس لڑکی کی کیفیت کیا معلوم ہوتی جب وہ سندری کے بیٹے سے اس بانکے سجیلے طبلچی سے کہہ رہی تھی۔ محبت میں ہر شے جائز ہے۔ قصور میرا ہے میں نے ہی کبھی اس کو اچھی اور بری راہ میں تمیز نہیں بتائی۔ میں نے ہی اسے کبھی صحیح راہ نہیں سجھائی۔ خود بھٹکا ہوں اسے کیا سمجھاتا...... کنول کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا میری میرا بھی ایسی بنے گی۔ پر ہر ایک کے لیے یہ طاقت نہیں ہے۔ میری بیٹی نادان تھی' میں کمزور اور بزدل' مغرور اور بھٹکا ہوا تھا۔''

اس نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

پھر دیر کے بعد کہنے لگا: ''اب مجھ کو کچھ نہیں کہنا۔ کوئی بات باقی نہیں رہی۔''

اور میں نے یہ سوچ کر کہ واقعی اب کچھ کہنے کو باقی نہیں رہا ہوگا۔ کچھ سننے کو باقی نہیں رہا ہوگا، اٹھنے کا ارادہ کرلیا۔

مجھے رادھے کرشنن کی وہ نگاہیں کبھی نہیں بھول سکتیں، وہ اپنے پہلے وجود کا سایہ لگ رہا تھا۔ سفید گھنگریالے الجھے ہوئے بال، میلا لباس، جھکے ہوئے کندھے، جھریوں پڑا چہرہ، میرے جاتے ہوئے وہ وہاں کھڑا تھا۔ اپنی اسی کرسی کے نزدیک مخملیں پردوں کو کھول کر دروازے تک جاتے ہوئے میں نے ایک بار پھر اسے مڑ کر دیکھا۔ کھڑکی سے آنے والی چاند کی روشنی میں شمع بڑی مدھم لگ رہی تھی اور کمرے کی سرخی ایک غبار کی طرح کھلے پردوں سے باہر نکل رہی تھی۔ پھر میں نے پردے چھوڑ دیئے۔ میرے اور رادھے کرشن کے درمیان ایک زمانہ حائل ہوگیا۔ مجھے رام دلارے یاد آرہا تھا۔ اس کی وہ کہانی جس میں طلسم کو توڑنے کے لیے جانے والے شہزادے کو سات آگ کے سمندروں، سات پہاڑوں کی بلندیوں اور سات وادیوں کے نشیبوں میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ پھر سات صحراؤں سے پرے ایک دیوتا تھا جس کے سینے میں طلسم کا راز تھا۔ اس دیو کو مارنے پر ہی جادو کو توڑا جاسکتا تھا۔ بچپن کی کہانیاں اور آج سوچتا ہوں میرے اور رادھے کرشن کے درمیان تو اس سے بھی زیادہ فاصلہ ہے۔ طلسم کو توڑنے والے شہزادے کے لیے تو کامیابی کی کوئی امید تھی۔ میرے لیے تو وہ بھی نہیں ہے، کیونکہ میرے اور اس کے درمیان زندگی ہے۔

کہیں دور سے کسی بانسری کی صدا کانوں میں آرہی ہے۔ یہ بانسری کرشن بھگوان کی نہیں ہوسکتی۔ یہ بانسری اس کی نہیں جس نے جمنا کے تٹ پر گوپیوں سنگ راس رچائی تھی۔ جو ہر ایک کو اپنے وجود میں الگ اپنا اور اکیلا محبوب نظر آتا تھا۔ وہ دل کی طرح کہیں زندگی کے اندر چھپا تھا جو کبھی نظر نہیں آتا۔ جو اس کھیل میں خوشیوں کا مرکز تھا جو بانسری بجاتا تھا تو کائنات جھوم کر رہ جاتی تھی...... یہ دور کا نغمہ پرانے زمانوں کا نغمہ اس کا نہیں ہے اور جانے اس بانسری کی لے میں کیا ہے۔ مجھے بائی جی یاد آرہی ہیں۔ وہ بھی اپنی طرح کی ایک تھیں۔ اپنی مثال آپ تھیں۔ جو کسی اونچی پدوی پر اس لیے نہیں بٹھائی جاسکتیں کہ ان کے پاس خاندان کی روایتوں کی سند نہ تھی۔ مگر کسی طرح وہ چاند کی طرح اکیلی ہی نیلاہٹوں میں تھیں۔ میں چاند اس لیے کہتا ہوں کہ چاند میں بھی داغ ہے نا۔

وہ یادگار رات جب میں نے اور من موہن نے ڈون وارٹن کو اپنے ہاں کی موسیقی سے اصل سچی موسیقی سے اور ایک سچی عورت سے متعارف کروایا۔ اس صبح وہ دوسری بائی جی مرگئیں اور پھر میں تھکا ہارا واپس آ گیا۔ من موہن تیزی سے تاج کے شہر میں سے گزر گیا مگر وہ رات نہیں گزری کیونکہ اگلی صبح ہی ڈون وارٹن میرے دفتر میں بیٹھا کہہ رہا تھا۔

''او بوائے میں یہ تحفہ آسانی سے قبول نہیں کر سکتا۔ میں نے سوچ لیا ہے میں یہ تصویریں واپس کر دوں گا۔ میں نے تو سنا تھا ہندوستان کی عورتیں بڑی شرمیلی بہت ہی دور دور ہوتی ہیں مگر یہ عورت جس سے تم نے رات ملوایا' یہ عورت الگ ہے۔ کیا وہ تمہارے ہاں کی عورت نہ تھی۔ یا صرف وہی تمہارے ہاں کی عورت تھی؟'' وہ سوالوں سے پریشان ہو رہا تھا۔

اور مجھے بھی من موہن کی طرح غصہ آ گیا۔ میں نے سوچا یہ ٹھیک ہے بائی جی ایک بلند کردار کی مثالی عورت ہے۔ پر وہ کسی طرح بھی ہمارے معاشرے میں عورت کے اس مقام کو چھو نہیں سکتی' جہاں نیکی ہے' سچائی ہے' خوبصورتی ہے اور شرم بھی ہے۔ پھر میں نے ارادہ کر لیا کہ میں اسے کنول کماری ٹھاکر سے ملواؤں گا۔ وہ اصل میں ہماری عورت ہے' ہندوستان کی روح کی طرح وہ سب طرف چھائی ہوئی ہے اور وہ ہماری زندگی کی سچی تصویر ہے۔

اور پھر میں نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا' تم شرم کس جذبے کو کہتے ہو؟

دل نے کہا تھا' جس کو تم گھونگھٹ کی اوٹ میں اپنی عورتوں کے چہرے پر دیکھتے ہو جس کو لیے لیے تمہاری بہن دنیا مر گئی' جس کو سنبھالے سنبھالے وہ دوسری عورت ایڑیاں رگڑ کر ہسپتال کے کمرے میں مر گئی' یہی شرم ہے۔

میں نے پھر کہا تھا' نہیں یہ شرم نہیں یہ بزدلی ہے۔ یہ خودکشی ہے۔ تم نے جتنے جھوٹے معیار مقرر کر رکھے ہیں' ان کے لیے تمہارا مرتا ہوا معاشرہ ایک قعرِ مذلت ہے۔ تم خود کنارے پر کھڑے ہو کر اپنی بہنوں کو اپنی ماؤں کو اپنی بیٹیوں کو اس میں دھکیل دو گے۔ اگر وقت پڑے تو تم جو اس کی حفاظت کا ذمہ اٹھاتے ہو' تم جو ان کے خدا بن کر فخر محسوس کرتے ہو' تم انہیں چھوڑ جاؤ گے۔

دل نے کہا تھا' کنول ٹھاکر اور بائی جی زندگی کے دو کنارے ہیں اور دونوں عام لوگوں کی پہنچ سے باہر ہیں۔

میں نے پھر کہا تھا' کوشش کرنے میں کیا حرج ہے جو چیز پہنچ سے باہر ہے' وہ دائرے کے اندر بھی لائی جا سکتی ہے۔ اس کو اپنایا جا سکتا ہے اور دل نے جواب دیا تھا' انتظار کرو' اگر طاقت

ہے تو ذہنوں کو بدل ڈالو۔

میں نے اس کے بدلے کہا تھا' اس کے لیے صدیاں چاہئیں یا پھر کوئی ایسا انقلاب جو سوئی ہوئی بستی کو جگا دے' جو انہیں ہوشیار کر دے۔

اور دل نے کہا تھا' تم کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ گھبراؤ نہیں دھیرج سے کام لو' وقت آنے والا ہے۔

میرا دل ہمیشہ سچی باتیں کہتا ہے۔ کبھی کبھار تو یوں لگتا ہے جیسے یہ الہامی باتیں ہیں۔ میں نے اکثر جاگتے میں دل خوش کُن خواب بھی دیکھے ہیں اور بھیانک بھی مگر دل نے ہمیشہ جب بھی اپنے سے پوچھا ہے' سچی بات ہی کہی ہے۔

اور پھر اسی لمحے رادھے کرشن بھی آ گیا تھا۔ رادھے کرشن یہ پوچھنے کہ میں کنول کماری کو کب سے جانتا ہوں' کیوں جانتا ہوں؟

مرد کی طبیعت میں عورت کے لیے تجسّس بہت زیادہ ہے۔ وہ عورت کی عزت نہیں کرے گا پر عورت کے قریب ہونے اسے جاننے' اس کے حریمِ ناز میں داخل ہونے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گا اور جب وہ ایک کھلونے کی طرح اس کے رنگوں سے آشنا ہو جائے گی تو اُسے بھلا دے گا۔ مرد کے لیے سب عورتوں کا رنگ ایک ہے۔ اور اس کے باوجود کوئی بات ہے کہ وہ اُوب نہیں جاتا' وہ ہر عورت کو قریب سے چھو کر اس سے کھیل کر دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ آدم کی کمزوری ہے۔ ہم اس کا کیا کر سکتے ہیں یا پھر عورت بھی قدرت کے نظاروں کی طرح ہر صورت میں نیا روپ ہوتی ہے۔

رادھے کرشن تو ایک مقناطیس کی طرح عورت کی طرف کھنچتا تھا۔

میں نے اسے بتایا تھا' پر وہ ڈون وارٹن بالکل نہیں' بولا وہ بڑی بے نیازی سے سیٹی بجاتا' ایک فلمی اخبار میں سے تصویریں دیکھتا اور اپنے دیس کے گیت گنگناتا رہا۔ میں اور رادھے کرشن باتیں کرتے رہے۔ عورتوں کی موجودہ تعلیمی حالت زیرِ بحث تھی۔ دوسرے ملکوں کی حکایتیں' آئندہ ترقی کے منصوبے' میں دل میں ہنس رہا تھا کہ یہ شخص ہی ایسا ہے جو دو متضاد زاویوں سے بڑھ رہا ہے۔ اس کی اخلاقی حالت کسی سے پوشیدہ نہ تھی اور اس کے باوجود وہ لڑکیوں کی بہبود کی باتیں ایسے کر رہا تھا گویا اس سے زیادہ خیر خواہ دنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ کنول کماری سے مرعوب ہوا ہے اور اس کے باوجود' وہ اس کا نام لینے کی جراُت نہیں کر سکتا۔ کسی طرح وہ اس کو اپنے حلقۂ احباب

میں سمجھ نہیں سکتا۔ اپنی قوم پروری کے گیت گا کر وہ چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ڈون وارٹن نے اپنی تصویروں سے سر اٹھا کر کہا: ''او بوائے یہ کون عورت ہے جس کا ذکر ہو رہا تھا۔ کیا وہ بائی جی سے بھی بڑی عورت ہے۔''

مجھے پھر غصہ آ گیا۔ مگر میں نے دل میں کہا یہ نہیں جانتا اسے معاف کر دو۔

''ہاں بائی جی سے بھی بڑی، اس سے بھی بلند میں نے اپنے کام میں مصروف ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''تو کیا تمہارے ہاں کئی طرح کی بلندیاں ہیں۔'' اس نے مجھ سے حیران ہو کر پوچھا تھا۔

''نہیں بلندی ایک ہی ہے۔ پاکیزگی ایک ہی ہے۔ معیار الگ ہیں۔'' میں نے اس سے کہا۔

''میں اس دوسری عورت سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔ کیا نام ہے اس کا؟ کنول کماری، کنول تو پھول کا نام ہے۔'' وہ پھر بولا۔

''ڈون وارٹن۔'' میں نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''عورت پھول ہے پر مرجھانے والا نہیں۔''

اور اس نے خوش ہو کر ہاتھ ہلا کر زور سے کہا تھا: ''اب ٹھیک کہہ رہے ہو، عورت پھول ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا۔''

اس دن کام کی زیادتی کی وجہ سے میں کہیں نہ جا سکا تھا۔ ڈون وارٹن نے کہا تھا: ''میں اس پہلی بار بائی جی سے ملنا چاہتا ہوں۔''

اور میں نے کہا تھا، ہمارے ہاں عورتیں بائیاں نہیں ہیں۔ سب بائیاں عورتیں نہیں ہیں۔''

وہ میری بات تو کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا اور تصویریں بغل میں دبا کر چلا گیا۔

مگر شام کو وہ پھر موجود تھا۔ بولا فارغ ہو یا نہیں، مگر میں اس دوسری عورت سے ملنا چاہتا ہوں۔ یہ قطعاً ضروری ہے۔

مجھے اس میں اس رات والے وارٹن کی جھلک پھر نظر آئی جو ایک بچے کی سی بے بسی سے بائی جی سے تصویریں لے رہا تھا۔

میں نے کہا: ''قطعاً ضروری کیسے ہے؟''

اس نے میری باتوں کا جواب نہیں دیا۔ اپنے دیس کے گیت گنگناتا رہا اور میز پر

انگلیوں سے گت بجاتا رہا۔

''سنو وارٹن! میں نے اس سے پھر کہا۔ ''تم کو معلوم ہے جس عورت سے تم ملنے کی خواہش رکھتے ہو وہ بہت بلند اور الگ سی ہے۔''

کہنے لگا: ''میں بچہ نہیں ہوں او بوائے جو تم مجھے سمجھاتے ہو۔ مجھے اچھے اور برے کا پتہ ہے۔ میں کئی سالوں سے تمہارے ہاں کی لاج ونتی عورتوں کو دیکھتا آیا ہوں مگر میں حل کر بتا سکوں گا کہ وہ کیسی ہے۔ جس کا ذکر تمہارے دفتر میں آج ایسے ہو رہا تھا' جیسے وہی اکیلی اور زندہ ہے۔'' اور ہم دونوں کنول کماری سے ملنے چلے گئے تھے۔

اس بات کو کتنی بہاریں بیت گئیں۔ کتنے پت جھڑ کے موسم گزر گئے مگر میری سُونی زندگی میں وہ دن اور شام اسی طرح زندہ ہے اور آج تو ذرات بھی یاد کا عصا لگتے ہیں اور اژدھا کی طرح پھنکارنے لگے ہیں۔ میں موسیٰ کی طرح صحراؤں میں سفر کر رہا ہوں اور خدا کے انعامات بن کر یادیں میرے سُونے دل کو جگا رہی ہیں۔

یہ باتیں تو میں اتنی تفصیل سے کہہ رہا ہوں اور عدالت میں کھڑے ہو کر بیانات دینے والے کی طرح ایک ایک لفظ سنبھل سنبھل کر سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ سب اس لیے ہے تاکہ تم جو اس کہانی کو سن رہے ہو' کنول کماری کی عظمت کا اعتراف کر لو۔ میں' سمجھانے کی ضرورت اس لیے محسوس کرتا ہوں کہ کنول کماری جو بظاہر اتنی آسانی سے زندگی کی لہروں پر بہتی ہوئی اندھیروں میں مرعوب ہو گئی دراصل ایک جنگجو کی طرح بہادری سے مخاطب لہروں سے نبرد آزما رہی ہے۔ اس کی فتوحات جو تمہیں زمانے کے حوادث اور واقعات کی گرم رفتاری کا ایک چھوٹا سا سانحہ لگیں گی' دراصل ایک مرتے ہوئے معاشرے سے زندگی کے آثار لے کر ان کو اندھیرے میں کاشت کرنے کے مترادف تھیں تاکہ وہ اس محبت کی کھیتی کی صورت میں بڑھیں' پھولیں' پھلیں اور آئندہ دنوں کے لیے ایک سایہ دار درخت ثابت ہوں۔

ڈون وارٹن کو اپنے ساتھ لے جاتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ کنول سے راجندر کو ملوانے بھی تو میں لایا تھا۔ پر وہ خط...... اور میری نگاہوں میں راجندر کی صورت اداس مضمحل سی پھر گئی جو کہہ رہا تھا میں نے زندگی میں کوئی غلط کام نہیں کیا' صرف میں نے غلط خواب دیکھے ہیں۔ کنول ٹھاکر کی یہ زیادتی ہے۔ وہ عورت ہے اور راجندر نے ٹھیک کہا تھا' عورت کا غرور اس کے چاہنے والے تھے' عورت کی زندگی اس کی محبتیں ہیں...... اور کنول کی بھی اپنی یادیں ہوں گی' اپنی محبتیں

ہوں گی۔ کیا معلوم ماضی میں کیا ہے۔ میں کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ میں اسے جان گیا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے تو نہیں پر بنتے کتنا ہیں۔

نیرا خلاف توقع ہم کو دیکھ کر بہت حیران ہوئی تھی۔ میرے ساتھ ایک غیر ملکی اجنبی تھا۔ اس گھر میں ملنے والے خاص لوگ آزمائے دیکھے ہوئے گنتی کے لوگ آیا کرتے تھے۔ یہ نہیں کہ کنول کا حلقہ احباب وسیع نہیں تھا' بلکہ جو غلط لوگ کبھی آئے ہیں' غلط ارادے لے کر' فضول منصوبے لے کر' وہ سونے میں سے میل کی طرح خود ہی کٹ کر صاف ہو جاتے۔ الگ ہو جاتے۔ کنول کو ایک برسر اقتدار عورت سمجھ کر ملنے والے لوگ چند دنوں آتے......اور پھر اچانک تھک جاتے۔ کیا کنول ایک کسوٹی تھی کہ ہر انسان اپنے کھرے کھوٹے کو پرکھ کر اپنی برات کو سمجھ لیتا تھا۔

میں نے کہا' جا کر اطلاع کرو' ایک اور صاحب بھی ملنے آئے ہیں۔

وارٹن اس رات کی طرح چپ تھا اور حیرت سے خوشی سے تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے ہنس کر کہا: ''آج تو فرانسیسی شاہکاروں کی سی کوئی بات نہیں ہے نا اور اگر تم کو تا قیامت ان تصویروں کے سامنے کھڑا رہنے کی تمنا ہو تو بھی یہ تم کو اس رات کی طرح تحفتاً نہیں ملیں گی۔''

ڈون وارٹن ہنس کر بولا: ''مجھے ایسی کوئی خواہش نہیں ہے۔ اگر جس عورت کی باتیں تمہارے دفتر میں ہو رہی تھیں۔ یہ وہی ہے تو یہ سارے تحفے جو مل سکیں گے' میرے لیے کافی ہوں گے۔''

میں نے کہا: ''تم ہندوستان کی عورت کو دیکھنے کے درپے کیوں ہو۔ تمہاری اپنی عورتیں حریم وریشم ہیں۔ ان کی نرمی' ان کی بناوٹ' ان کی سجاوٹ اور پھر وہ نظریے' وہ سب ہمارے ہاں کھپ نہیں سکتے' تمہاری زندگی کی تصویر میں سب جگہ عورت ہے' دائیں بائیں اردگرد تمہارے دلوں میں تمہارے ظاہر میں' وہ ہمارے ہاں گھروں کی خوبصورتی زندگی کی سچائی اور اس کی روح ہے۔ تم ہمارے ملک میں سالوں سال رہو' کبھی عورت کو منظر عام پر نہیں دیکھو گے' مگر ہماری روح اس کی ہے' وہ ہمارے اندھیروں کی باوقار ملکہ ہے۔ سمجھے ڈون وارٹن ہمارے ہاں کا تخت بھی پردوں میں ہے اور ڈون وارٹن نے کہا: ''اندھیرے کی اپنی عظمت ہے۔ میں نے بدھ کے مذہب کو مطالعہ کر کے دیکھا ہے۔ وہ پہاڑی گاؤں کی تصویر کو ہاتھ سے چھو کر دیکھ رہا تھا۔ مڑ کر کہنے لگا' ہمارے ہاں کی کنواریوں کی آنکھوں میں سیاہی گہری ہوتی ہے اور جس زندگی میں تھوڑی سی سیاہی نہیں جہاں کچھ تاریکی میں نہیں وہاں کچھ بھی اجاگر نہیں' کچھ بھی خوبصورتی نہیں۔

میں نے کہا: ''باتیں تو بڑے پتے کی کرتے ہو۔ تم نے دیس دیس پھر کر دیکھا ہے کیا تم سمجھتے نہیں ہو، جو مرکز ہمارے ہاں ہے جو نقطہ تمہارے ہاں نہیں اس کا کیا کرو گے۔''

اور ڈون وارٹن میری بات ان سنی کر کے اس پہاڑی گاؤں کی تصویر کو دیکھتا رہا۔

پھر سفید شال اوڑھے کنول آ گئی۔

ڈون وارٹن آتش دان کے قریب اپنے ہاتھ پیچھے کر کے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ مسرت سے نہیں حیرت سے نہیں ایک احترام سے کنول کو دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا: ''یہ میرے دوست ڈون وارٹن ہیں انہیں نادر تصویریں دیکھنے اور بدھ مت کے متعلق کتابیں جمع کرنے کا شوق ہے۔ میں انہیں آپ کے پاس لایا ہوں۔''

اور تب کنول نے اپنی گہری اور پُروقار آنکھیں اٹھا کر ڈون وارٹن کی طرف دیکھ کر کہا تھا: ''میں تصویروں کے متعلق کچھ بتا نہیں سکتی اور مذہب کے لیے بھی میں ابھی اندھیرے میں ہوں مگر پھر بھی آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ تشریف رکھیے۔''

ڈون وارٹن ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور کنول کی طرف دیکھنے کی کوشش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مجھے معلوم تھا وہ کنول کی طرف دیکھنے کی کبھی جرأت نہیں کر سکے گا۔ کسی نے نگاہیں ملا کر اس کی طرف آنکھیں اٹھا کر کبھی بات نہ کی تھی۔ کوئی کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکتا تھا۔

کنول پھر بولی: ''آپ کب سے اس ملک میں ہیں۔ یہاں کا کیا پسند آیا آپ کو؟''

اور ڈون وارٹن نے ایک ہوش مند آدمی کی طرح بات کرتے ہوئے کہا: ''دو سال تو ایک ملک کو دیکھنے اور اس میں سے کسی خاص چیز کو پسند کرنے کے لیے بالکل ناکافی ہوتے ہیں۔''

کنول مسکرا دی تھی۔ جیسے اندھیرے پانی کی سطح پر دفعتہً کوئی پھول آہستہ آہستہ کھلنے لگے۔ بولی۔ ''دوسرے ملکوں سے آنے والے تاج محل کو پسند کرتے ہیں۔''

اور ڈون وارٹن نے کہا تھا: ''میں اس محبت کی روح تلاش کر رہا ہوں جو تاج میں دفن ہے۔''

کنول نے کہا تھا: ''جسم فانی ہے، بھسم ہو جاتا ہے، جل جاتا ہے، راکھ ہو جاتا ہے، پر سوچ زندہ رہتی ہے اور پھر کسی نئے روپ میں پھر سے پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک تاج محل سے نکل کر محبت کی روح نور کی طرح ہمارے چاروں طرف بہتی ہے، ہماری زندگی میں ہے۔''

ڈون وارٹن نے کہا تھا: ''مجھے تو آپ کے چاروں طرف وہ بہاؤ کہیں نظر نہیں آتا۔''

کنول نے کہا تھا: ''غیر ملکی سیاست کو نہیں چھیڑا کرتے۔ یہ ایک نازک مسئلہ ہے۔''

اور وارٹن نے کہا تھا: ''سیاست کو محبت سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا ساتھ پرانا ہے۔''

کنول نے اسی طرح مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا: ''اسپین کے خون میں یہ بات بہت دور سے آئی تھی۔ یہ بھی مشرق کا تحفہ ہے۔''

ڈون وارٹن نے پھر کہا: ''مشرق نے تحفے تو دیئے پر اپنے گھر کی سدھ ہی نہ لی۔''

اور کنول نے کہا تھا: ''مشرق تحفے دیتے ہوئے اپنا آپ لٹا دیتا ہے' اپنا گھر۔ یہ ہمارے ہاں کے رواج ہیں نا۔''

وارٹن نے کہا: ''اپنا آپ لٹنے کو کس نے کہا تھا۔ آنے والے کو سب کچھ نہیں دیا کرتے۔''

''روایتوں نے ہم کو اعتدال نہیں سکھایا اور جب ہم سیکھ سکتے تھے تو دوسروں نے ہمیں ہوش لینے نہیں دیا۔'' کنول نے کہا۔

وارٹن پھر بولا: ''جو لوگ اپنے سبق جلد نہیں سیکھتے وہ انہیں دکھ اور رنج سے سیکھتے ہیں۔''

کنول بولی: ''دکھ اور رنج تو زمانوں سے ہمارا نصیب رہا ہے۔ پر اپنوں کا دیا ہوا غم اپنا لگتا ہے۔ بیگانے محبت بھی کریں تو عذاب ہے۔''

اور وارٹن نے جواب دیا: ''بیگانوں کی محبت کو بھی تاج میں دفن کر دیں۔''

کنول نے ہنس کر کہا: ''مگر دوسروں کو ہمارا تاج ہی سب سے زیادہ پسند آتا ہے۔''

وارٹن بولا: ''ہمارے ہاں تو تاکستان ہے۔ کھنڈرات ہیں حسن ہے اور پتھر ہیں۔ شراب ہے اور رقص ہے مگر کمی ایک شے کی ہے' کاہے کی۔''

''اپنی۔'' وارٹن نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ایک مغائرت سی جو بھاری گفتگو سے چھا گئی تھی' دور ہو گئی۔ اس نے پھر پوچھا: ''آپ نے ملک اور قوم کے لیے کیا اصلاحات کی ہیں؟''

اور کنول نے کہا تھا: ''ملک اور قوم اپنی اصلاح وقت پڑنے پر خود کر رہے ہیں' میں کون ہوں' آپ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں؟''

وارٹن نے کہا: ''کیا آپ ملک اور قوم کا حصہ نہیں ہیں۔ آپ کیا کر رہی ہیں؟''

کنول نے کہا: ''یہ بڑا ادنیٰ سوال ہے۔ میں اس کا کیا جواب دے سکتی ہوں۔ ہر عضو

الگ الگ کام نہیں کیا کرتا۔ سارا جسم حرکت کر رہا ہے۔''

وارٹن چپ ہو گیا۔

گفتگو پھر اسپین کی طرف پھر گئی۔ کنول کہنے لگی: ''میں نے پانچ سال یورپ میں گزارے ہیں مگر اسپین آنے کا اتفاق نہ ہوا۔ سنا ہے اسپین کی یونیورسٹی بہت پرانی ہے۔ اس ملک کی روایات مشرق سے ملتی جلتی اور بڑی عجیب ہیں۔''

وارٹن اپنے متعلق باتیں کرتے ہوئے ہر بات اتنی وضاحت سے' اتنے اعتماد سے اور اتنی روانی سے بتا رہا تھا۔ اس کی ایک ایک بات سے اپنے ملک کا پیار' اپنے رواجوں سے ان ٹوٹ لگاؤ ثابت ہوتا تھا۔ الحمرا کی باتیں کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ غرناطہ کی زمینوں' باغوں اور ویرانیوں کا ذکر کرتے کرتے اس کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ رنج سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ جذبات کی نرمی اور بے پناہ شدت سے پگھل رہا تھا۔ میں اور کنول دم بخود سن رہے تھے۔ وہ دم لینے کے لیے رکا اور پھر کہنے لگا۔ ''وہاں کی ہر شے مشرق کی امانت اور عطا کردہ ہے۔ ہم لوگوں کو ہندوستان سے اس لیے تعلق ہے کہ ہم بھی مشرق کے پس ماندگان ہیں۔''

نیرا چائے لے کر آ گئی اور ڈون وارٹن اپنے ہاں کی شرابوں' سرخ انگوروں اور شاعری کا ذکر کرنے لگا۔

میں نے اتنے سالوں میں پہلی بار کنول کو کھل کر ایک عام عورت کی طرح ہنستے اور گفتگو میں حصہ لیتے دیکھا تھا۔ اسپین کے ذکر میں کوئی بات تھی۔ ڈون وارٹن اس کو مرعوب کر سکے گا' اس کا مجھے کبھی خیال نہیں آ سکتا تھا۔ وہ ایک کہانی سننے والے بچے کی طرح سوال پوچھتی اور جواب سن کر حیران ہو رہی تھی۔

کہنے لگی: ''آپ اسپین کی باتیں یوں کر رہے ہیں جیسے اس سے خوبصورت ملک دنیا میں اور کوئی نہیں۔''

وارٹن نے ہنس کر کہا: ''ہندوستان کی باتیں کرنے والے بھی اس کو راجکماروں' خوابوں' اڑنے والے گھوڑوں' پریوں' دریاؤں اور حسن کا ملک ثابت کر سکتے ہیں نا۔''

''وہ کیسے؟'' کنول نے پوچھا۔

''کیونکہ ہر ملک کے ساتھ وابستہ چند خواب ہیں جو عزیز ترین متاع ہوتے ہیں اور جن کو کسی صورت میں بھی بدلا نہیں جا سکتا ہے۔''

اور کنول نے جواب دیا۔ صورت بدلنے سے حقیقت نہیں بدلا کرتی۔ ہمارے راجکماروں اوراڑنے والے گھوڑوں کا زمانہ بیت گیا' ہم جاگ گئے ہیں۔''

وارٹن نے کہا: ''جب سوئے ہوئے خود اٹھ کر کہیں کہ وہ جاگ گئے ہیں تو دنیا گھبرا جایا کرتی ہے۔''

''دنیا تب گھبرائے گی جب سوئے ہوئے چلنے پھرنے اور ہوش میں آ کر بلندیوں کی طرف بڑھنے لگیں گے۔'' کنول نے کہا۔

''کب؟'' وارٹن نے گھبرا کر پوچھا۔

اور کنول پھر مسکرادی۔

میں خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ میرے لیے وہ دونوں دو ایسے بچے تھے' جو سچ اور جھوٹ کو ملا کر کہنے کی کوشش کر رہے ہوں اور ہنس کر اپنی کامیاب کوشش پر خوش ہو رہے ہوں۔

میں چپ بیٹھنے سے اکتا گیا تھا۔ آج پہلا موقعہ تھا کہ میں نے خاموشی سے باتیں سنی تھیں اور کنول کے گھر میں اتنا چپ چاپ بیٹھا تھا۔ میرا دل گھبرا گیا تھا۔ میں نے اس گھر کا طواف ایک عمر کیا تھا مگر میں تو پھر بھی حاشیہ نشین ہی رہا۔ مرد کی فطرت کے مطابق میں جل رہا تھا۔ میں ایک حاسد کی طرح ڈون وارٹن کو مار دینا چاہتا تھا۔ مجھے اس کا وجود اپنے اور کنول کے درمیان ایک دیوار بن کر حائل لگتا تھا۔ میں کنول کے نزدیک کبھی نہیں ہوا۔ پر یہ فاصلہ ہمیشہ برابر رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ مجھ پر اعتماد کیا ہے۔ تاریک گھڑیوں میں نازک موقعوں پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک میں ہی اس کے ایک دوست اور جلیس کی طرح شریک رہا ہوں۔ میں نے اس کے خوابوں کا احترام کیا ہے۔ میں نے اس کا احترام کیا ہے۔

اور جب کہ میں اپنے اندھیرے میں کڑھ رہا تھا۔ میں اپنی آگ میں جل رہا تھا۔ کنول نے مڑ کر کہا: ''آپ آج چپ کیوں ہیں؟ اس نے تمام عرصہ میں مجھ سے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ شروع سے آخر تک مجھ سے کوئی بات نہ کی تھی اور اب مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ آپ چپ کیوں ہیں؟ کیا میں اس کے لیے ایک کھلونا ہوں' جس کو وہ جب جی چاہے طاق پر رکھ دے اور جب جی چاہے اٹھا لے۔''

میں نے جواب دینے کے لیے بڑی مضمحل سی آواز میں کہا: ''آج میری طبیعت کچھ علیل ہے۔''

''اچھا!'' کنول نے یوں کہا جیسے یہ بات سن کر اسے بڑا رنج ہوا ہو۔ ''کیا بات ہے کیا آپ رات بھر جاگتے رہے ہیں؟''

''ہاں۔'' ڈون وارٹن نے میری بجائے جواب دیا۔ ہم دونوں رات بھر جاگتے رہے ہیں۔ من موہن بھی؟''

کنول نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ڈون وارٹن پھر بولا: ''رات میں نے آسمانی موسیقی سُنی ہے۔ ہندوستان کی خوبصورت ترین عورت کو دیکھا ہے۔''

کنول کا دوسرا سوال بڑا پُر پیچ تھا' بڑا گہرا تھا اور بڑا مشکل تھا۔ مجھے اپنے خول سے اپنی جلن سے باہر آنا ہی پڑا۔ میں نے بتایا کہ من موہن میرا ایک دوست ہے اور رات ہم نے کس طرح گزاری ہے' کنول کی نگاہوں میں بے یقینی تھی' جیسے اسے یہ بات سن کر بڑا افسوس ہوا ہو۔ اسے مجھ سے ایسی امید نہ ہو' میں اپنے آپ کو دل ہی دل میں ڈون وارٹن کے ہمراہ آنے پر کوس رہا تھا۔ آخر میں کیوں نت نئے آدمیوں کو اس سے ملوانے لاتا تھا۔ مجھے اپنی غلطی پر ندامت ہو رہی تھی۔ میں سخت شرمندہ تھا۔ پھر ہم جانے کے لیے اٹھے۔

کنول کہنے لگی: ''کرشنا آج کسی سکول کی میٹنگ میں گئی ہیں۔ مس رام نے اسے بلوایا تھا۔''

میں اور ڈون وارٹن بہت دنوں کے لیے پل سے دوسری طرف جانے والی سڑک کے چوراہے پر جدا ہو گئے۔ اس نے پورا راستہ کنول کے متعلق ایک لفظ نہیں کہا۔ شاید وہ اس کی بلندی کا بائی جی کی بلندی سے مقابلہ کر رہا ہو۔ شاید وہ اس کے اور ہندوستان کی عورت کے درمیان ربط سمجھنے کی کوشش میں تھا۔ جانے کیا بات تھی۔ وہ اپنے دیس کے گیت گنگناتا مجھ سے کچھ کہے بنا اپنے ہوٹل کی طرف جانے والے چوراہے پر مجھ سے جدا ہو گیا۔

ہماری زندگی میں بہاؤ نہیں ایک ٹھہراؤ ہے۔ جب زندگی کے پرانے سوتے خشک ہو گئے' بند ہو گئے تو کم ہوتے پانی میں کیچڑ کے جلجے مادے میں کیڑے پیدا ہو گئے۔ ایسے حشرات الارض جو ہماری ساری دنیا پر قابض ہیں' جنہوں نے ہماری ساری خوبصورتی اور ساری جاذبیت

ایک بدصورتی میں ایک کوڑھ کے داغ میں بدل دی ہے اور اب ہمارے معاشرے کی حالت یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے پر بار ہر انسان اپنے جینے کے لیے دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ میں پرانی داستانوں کو داستان ہی کہوں گی کیونکہ جب ہم نے آنکھ کھولی تو سوائے کہانیوں کے اپنے دامن میں کچھ نہ تھا اور پھر بھی کسی نہ کسی طرح جی چاہتا ہے کہ ان غائبانہ ندیوں کے منبع کا پتہ لگا کر ان کو پھر سے رواں کیا جائے۔ تاکہ سارے ڈھیر خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں اور ہم پھر وہی رواں دواں بہنے والے سمندر پر سفر کرنے والے ملاحوں کی طرح اپنی اپنی ناؤ کو آپ سنبھالیں۔ میں جو یہاں کھڑی آپ کو بتا رہی اور آپ سے التجا کر رہی ہوں۔ میں آپ کو یہ بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ دنیا کی قوموں میں ہماری اجتماعی کوششوں نے ہمیں سر بلند کیا تھا۔ اجنتا کے غار، میگھ دوت، تاج محل اور ہمارا ادب یہ سب اجتماعی ماضی سے ہم کو ملے تھے اور پھر بھی کسی طرح یہ انفرادی کوششوں سے یہ بنائے گئے تھے۔ ہماری رُودادیں، بکرماجیت، اشوک اور اکبر نے بنائی ہیں اور پھر بھی وہ ان کے پس منظر میں نہیں ہیں بلکہ عام لوگ آپ کی طرح کے لوگ جنہوں نے کسی ماضی اور حال کی پروانہ کر کے فن کاروں کی طرح اپنے آپ کو صرف اس لمحے کے لیے زندہ رکھا جو ان کے سامنے تھا اور جو سب سے زیادہ جاندار تھا۔ ملکوں اور قوموں کی اصلاح اجتماعی کوششوں اور انفرادی ایمانداری سے ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے پاس روایتیں ہیں، جن کا کوئی ماضی نہیں ہے، وہ اپنا حال تعمیر کر رہے ہیں اور ہمارے پاس تو سب کچھ ہے۔ ہمارے پاس تو ایسے سوتے ہیں جن کو صاف کر کے ہم پھر اسی خوبصورتی کے خالق اور زمانے کے لاڈلے بن سکتے ہیں۔

ہم دوسروں کی طرف سچائی کے سبق کے لیے کیوں دیکھتے ہیں۔ ہمارا ماضی تو یہی تھا۔ ہم مغرب کی طرف ان حکایتوں کے لیے کیوں دیکھتے ہیں۔ ہم تو ان سے اُتم، سچے، بلند، الگ اور افضل ہیں۔ کوئی یہ سوال یہ کرے گا کہ پرانی داستانوں سے کب تک کام چلے گا اور میں کہتی ہوں ہمیں پرانی داستانوں کی طرح نئی اور اچھی داستانیں یادگار چھوڑنے کے لیے بنانی چاہئیں۔ ہمارے لیے ماضی چھوڑنے والوں نے آئندہ نسلوں کا خیال کیے بنا صرف اس زندہ لمحے کا خیال کر کے کام کیا تھا۔ ہم کسی کا سہارا کیوں لیں اور پھر ہم آئندہ نسلوں کے لیے کیا چھوڑ جائیں گے۔

میں مغرب کی مثال کے خلاف نہیں ہوں۔ پر میں آپ سے یہ پُوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ ہماری مثال لے کر کہیں سے کہیں چلے گئے۔ ہم اپنا چراغ اپنی نگاہوں سے پوشیدہ کر کے ان کی افق پر غائب ہوتی روشنیوں کی طرف ٹکٹکی باندھ کر کیوں دیکھ رہے ہیں؟

آپ اپنی عورتوں کو گھر میں قید رکھنا چاہتے ہیں۔ میں ایک حد بندی کے خلاف نہیں ہوں اور پھر ہر گھڑی مجھے گزرے زمانے کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ وہی ہمارے پاس ہے۔ راجپوتانے کی بیر رانیاں، سوبھاگیہ ست ونتیاں اور چاند بی بی، نور جہاں کیا وہ ہماری نہیں ہیں؟ آپ کہیں گے میں رانیوں کی مثالیں کیوں دیئے جا رہی ہوں۔ پر کیا ہر عورت کے سینے میں نور جہاں، چاند بی بی اور پرتاب کی بیٹی کا سا دل نہیں ہے۔ ہمارا گھر ایسے میں تباہ ہو رہا ہے اور آپ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں عورت کو قید رہنا چاہیے۔ اسے گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ آپ کیوں ہر عورت کے سینے میں اس کی نیکی اور بدی کو سلا کر وہاں ایک دبی دبی سہمی سہمی مظلوم اور بے کس ہستی پیدا کر رہے ہیں۔ جو بولے تو آپ کی زبان سے، دیکھے تو آپ کی آنکھوں سے، چلے تو آپ کے کندھے پر بوجھ ڈال کر۔ اس گونگی، بہری اور اندھی مخلوق کی بجائے تندرست اور روشن دل دماغ کی حامل ساتھی کیوں پیدا نہیں کرتے۔ آپ کا سفر لمبا ہے، راستہ الجھا ہوا ہے۔ ایسے دوست بنا کر زادِ راہ کو اٹھانے کی ضرورت نہ پڑے گی۔

آپ مغرب کی آزادی کی مثالیں دے کر پیش بندی کی خاطر وہ غلطی نہیں کرنا چاہتے جو انہوں نے کی ہے اور میں کہتی ہوں آپ کو پچھتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں ایک سچے انسان کی طرح جو پوتر اگنی کے سامنے کھڑا ہو کر سوگند اٹھاتا ہے، آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آپ کو کبھی پریشان ہونے کی ضرورت پیش نہ آئے گی، کیونکہ ہمارے پاس ایک گزرا زمانہ ہے جو بے راہ روی کے وقت ہمارے کام آئے گا جو ہم کو بھٹکنے سے بچا سکتا ہے۔ ہم آج سے اپنی روایتیں تعمیر کرنے کے لیے تیار ہیں۔ کیا ہم آنے والے زمانوں کے لیے اپنی بہتر اور سچی مثالیں نہیں چھوڑنا چاہتے۔''

یہ کنول کماری کی اس بڑی تقریر کا ایک حصہ ہے جو اس نے اُن دنوں کی تھی، جب رادھے کرشنن کی چھوڑی ہوئی جائیداد کے کئی وارث پیدا ہو کر اس کے خلاف شور مچا رہے تھے۔ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔ اسے پریشان کر رہے تھے۔

آپ سے سچ کہتا ہوں۔ اس دن اسٹیج پر کھڑی کنول کے چہرے پر جو نور تھا وہ صرف ایک سچی، پاکباز اور بلند عورت کے چہرے پر ہی ہو سکتا ہے۔ ایسی عورت جس کے عزائم بلند، جس کے ارادے نیک اور جس کے دل میں گمبھیرتا ہو، وہ ایک عدالت میں بیان دینے والے کی طرح سامنے بیٹھے لوگوں کو جج سمجھ کر نشیب و فراز سمجھا رہی تھی اور پھر بھی کسی طرح وہ ایسی سب وقتی

لغزشوں اور چھوٹی نامعلوم باتوں سے اونچی لگتی تھی۔ وہ لوگوں کو مخاطب بھی کر رہی تھی اور پھر بھی وہ ان سب سے بے پروا اپنی راہ پر تیز گامی سے بڑھنے والی کوئی ماضی کی بیر رانی لگتی تھی۔ اس کے چہرے سے زیادہ خوبصورت کسی کا چہرہ نہیں دیکھا۔ رادھے کرشن نے اپنے اندھیرے کی وجہ سے جس ہالے کو بہت پہلے دیکھا تھا، میں دور جلسے میں دم بخود بیٹھے سینکڑوں کے مجمع میں بیٹھا اس ہالے کو آج دیکھ رہا تھا۔ اتنے بڑے پنڈال سے ایک سانس کی آواز آ رہی تھی۔ سب لوگ خاموش بیٹھے تھے جیسے ان کو کسی جادو کے زور سے پتھر بنا دیا گیا ہو یا کسی آکاش کی شکتی کو دیکھ کر کسی میں بھی ہلنے کی سکت نہ رہی ہو۔

کنول نے کہا تھا۔

''دولت تو محض ایک ذریعہ ہے۔ کُل شے نہیں اور میں اپنی راہ پر کسی دولت کے سہارے نہیں بڑھی ہوں۔ میں تو ایک مزدور عورت ہوں، جس کا کام ہی اس کا سب سے بڑا انعام ہوسکتا ہے۔ مجھے رادھے کرشنن کی اپنے ہاتھوں سونپی جائیداد کا اس کی آخری تمنا سمجھ کر احترام ضرور ہے مگر میں اسے اپنی راہ میں ایک رکاوٹ سمجھ کر الگ بھی کر سکتی ہوں۔ میں کسی ذاتی غرض کے لیے دولت نہیں چاہتی۔ میں نے کبھی دولت کی تمنا نہیں کی۔ ایک مزدور کی ضروریات بہت کم ہوتی ہیں اور میری ضرورت صرف میرے یہ دست و بازو ہیں۔ ان کو آپ مجھ سے چھین نہیں سکتے۔ یہ پرماتما کی دین ہیں اور آج اس بھرے مجمع میں رادھے کرشن کی چھوڑی ہوئی جائیداد میں گورنمنٹ کو اس لیے لوٹا رہی ہوں کہ میرے بھائی بند اس کو جس طرح چاہیں کام میں لائیں۔ میں آپ سے پھر کہوں گی دولت کا سہارا وقتی اور جھوٹا ہوتا ہے۔ کام کے لیے صرف عزم بلند اور بازوؤں میں طاقت چاہیے۔ میں کسی خاص جماعت کے لیے کام نہیں کر رہی۔ مجھے ذاتی مفاد بھی مقصود نہیں۔ کسی شہرت کی مجھ کو تمنا نہیں اور پھر بھی کام میرا ذاتی ہے، کیونکہ یہ میرے دل کی سب سے بڑی تمنا ہے اور اس خاموش بیٹھے ہوئے ہزاروں کے مجمع سے اٹھ کر کنول کماری ٹھاکر کے سب سے بڑے دشمن نے کہا تھا۔

''دیوی جی میں سرِعام آپ سے چھما کی درخواست کروں گا۔ آپ ملک اور قوم کی خاطر اس دولت کو پھر سے قبول نہ کر لیں گی۔''

کنول نے اس کے جواب میں کہا تھا۔

''شریمان آپ ملک اور قوم کے بڑے بڑے لفظ کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔ میں کسی

ملک اور قوم کی خاطر کام نہیں کر رہی۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ مہاراج اشوک اور شہنشاہ جہانگیر کی طرح ملک اور قوم کی خاطر اپنے دل میں بیٹھی اس مزدور عورت کی تسکین کے لیے زندہ ہوں جو حرکت میں، چلنے میں، کام کرنے میں، زندگی سمجھتی ہے کیونکہ اس کے پاس اوڑھنے کے لیے، باہر کی سردی سے بچنے کے لیے سوائے اپنی حرارت کے اور کوئی شے نہیں ہے۔ رادھے کرشنن کی دولت میرے کس کام کی۔ دولت تو رخنہ اندازیاں کرتی ہے۔ میں پھینکی ہوئی چیزوں کو واپس نہیں لیا کرتی۔ یہ میرے آئین کے خلاف ہے۔ یہ ہر انسان کے قانون کے خلاف ہے۔ میں شکریے کے ساتھ اس دولت کو الگ کر چکی ہوں۔ اب یہ میرے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتی؛ کسی کو اس بات کا جواب دینے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ کسی نے نعرے نہیں لگائے، کسی نے بلند آواز سے بات نہیں کی۔

اور کنول کہہ رہی تھی۔ ''عورت اگر دیوی نہیں تو وہ راہ گزاروں کی خاک بھی نہیں۔ اسے پرانے زمانے ہاتھ میں تھما کر چلنا سکھائے؟ میں یہ نہیں کہتی کہ وہ آپ سے آگے نکل جائے گی مگر وہ آپ کے دوش بدوش ضرور چلے گی۔ مغرب میں عورت نے آزادی حاصل کر لی ہے، وہاں زندگی کا مجموعی شیرازہ پریشان ہو گیا ہے، اس لیے کہ وہاں اندھیرا ہے۔ وہاں مذہب کے سوتے کب کے خشک ہو گئے ہیں۔ وہاں اعتدال نہیں ہے۔ آپ آزما کر تو دیکھیے آپ کو پچھتانا نہیں پڑے گا۔ نیک کام کر کے اگر کبھی کبھار انسان کو تیزی سے کامیابی کی روشنیاں افق پر چمکتی نظر نہ بھی آ سکیں تو اسے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ میں کسی رنگین افق کے خوابوں کا ذکر نہیں کر رہی، میں تو اس ٹھہراؤ کی بات کر رہی ہوں جو ہمارے معاشرے پر طاری ہے۔ پرانی ڈگر کو جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کرنے کا کام ہو گا تو ہماری راہیں روشن ہو جائیں گی۔

''یہ کام ایک دن کا نہیں۔ اس میں ہم سب کو مزدوروں کی طرح لگنا اور رات دن کام کرنا ہو گا۔ اس کام کا نتیجہ میرے اور آپ کے سامنے شاید ظاہر نہ ہو کیونکہ ہم تو زندگی کے اس زمانے کے لمحے ہیں مگر سوچتی ہوں آئندہ نسلیں جب اس کام کو ختم کریں گی تو ان کو ہم پر فخر کرنے کا موقع مل سکے گا اور یہ انعام ہمارے لیے کافی ہے۔''

کنول کماری اسٹیج سے اتر کر چلی گئی اور ہم پھر بھی بیٹھے تھے۔ دم بخود چپ چاپ ہمارے اردگرد کوئی آواز نہ تھی۔

وہ بے چینی جو رادھے کرشنن کے بعد سے شہر میں پھیلی تھی، یکسر ختم ہو گئی۔ میں نے

چوراہوں پر چلتے ہوئے لوگوں سے ملتے ہوئے اس بڑی جائیداد کا ذکر کسی کے منہ سے پھر بھی نہ سنا۔ لوگ کنول کماری کا ذکر بھی نہیں کرتے تھے۔ لوگ سوچتے تھے اس دن اسٹیج پر جو عورت بول رہی تھی، وہ کنول کماری نہیں ایک دیوی تھی اور پھر جو روایتیں چلی ہیں، کوئی کہتا تھا میں نے خود دیکھا تھا' اس کے سر کے گرد روشنی تھی۔ کوئی کہتا میں نے آنکھیں بند کیں اور جب کھولیں تو اسٹیج پر کوئی نہ تھا۔ پنڈال میں سناٹا تھا۔ وہ عورت نہیں کوئی روپ وتی تھی، کوئی دیوی تھی۔

ان حکایتوں اور افسانوں کو سن کر میں حیران نہیں ہوا اور ان دنوں تو میں بھی سوچتا تھا' کیا معلوم کنول دیوی ہی ہو۔ کون کہہ سکتا ہے وہ کون ہے۔ میں بھی اسے جانتا ہوں۔

اس بڑے جلسے کے بعد سے اگر کوئی معمولی عورت ہوتی تو اس کے ملنے والوں کی تعداد بڑھ جاتی۔ اس کی تعریفوں کے خطوط آتے اور اس کا ماحول پھیل جاتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ چند ملنے والے جو پہلے آتے تھے' آتے رہے۔ چند لکھنے والے جو پہلے تھے' ویسے رہے۔ بظاہر اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کوئی ایسا سانحہ نہیں ہوا جس سے ظاہر ہوتا کہ اس دن اسٹیج پر کھڑے ہو کر کنول کماری ٹھاکر نے جو فتح حاصل کی' وہ بادشاہوں سے بڑی اور راجاؤں سے بڑی تھی' کیونکہ وہ فتح ایک دیوی کی فتح تھی۔

اور پھر بھی میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں' میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ کنول کماری ٹھاکر ہمارے گھر میں' ہمارے ملک میں' ہمارے گاؤں میں زندہ عورتوں کی طرح ایک معمولی عورت تھی۔ عام عورت جس کے نظریے صرف اس لیے منجھے ہوئے تھے کہ اس پر تعلیم کی چمک تھی اور پھر بھی وہ تعلیم کے اس روغن سے مبرا تھی جس کو نئی روشنی کہا جا سکتا ہے۔ وہ نئی عورت نہیں بلکہ ماضی کے اندھیروں سے آئی ہوئی ایک روح تھی۔ وہ اجنتا کے غاروں سے نکلی ہوئی ایک مورتی تھی۔ وہ بہت پہلے کی اور بہت پرانی تھی۔ میں نے نئی روشنی کو اس کے سامنے ماند ہوتے دیکھا ہے۔ جیسے اس دن چاند کی روشنی کے سامنے شمع بجھ سی گئی تھی۔ یہ نہیں کہ وہ یورپ کے ترقی کرتے لوگوں کے خلاف تھی بلکہ وہ ان سے زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ اس کے سامنے اعتدال کی وہ راہ تھی' دھیرج کا وہ سبق تھا' جو یورپ کی قوموں نے ابھی نہیں سیکھا اور جو سبق مغرب کی قومیں بڑے دکھ سے اپنے آپ کو تباہ کر کے ایک دوسرے سے ٹکرا کر اپنی زندگی کے مرکز کو برباد کر کے اپنے خاندان کو کھو کر اب سیکھ رہی ہیں۔ وہ بلندی کنول کماری کی ہمیشہ سے رہی ہے کیونکہ وہ زندگی کے ان پوشیدہ سوتوں سے آگاہ ہو گئی تھی' جن کی راہ سے ہمارے ہاں بہاؤ جاری رہتا ہے۔ وہ ان

رواں دواں پانی پر اپنی ناؤ کو خود کھیتی رہی، کیونکہ کنول ایک معمولی عورت تھی۔

☆☆☆☆☆

اس شام کے تین چار ماہ بعد میں نے ڈون وارٹن کو پھر دیکھا۔

ہمارے اپنے کام ہیں۔ زندگی کی مصروفیتیں ہیں۔ کبھی کبھار تو ہم ان چکروں میں گھومتے ہوئے اتنے بے سُدھ ہو جاتے ہیں کہ گردوپیش کی خبر نہیں رہتی۔ ہندوستان کی زندگی کا مرکز ہل رہا تھا۔ چند خود غرض لوگوں نے اپنے نظریوں، اپنے منصوبوں اور اپنی راہوں کے لیے حسن کے اس مجسّمے کو تباہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جلا کر اس نشیمن کو خاک سے نئے اور صدہا آشیاں بنائیں۔ کئی زبانوں میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ اپنے خیالات سے عوام کے خیالوں کی دھار کو موڑ لیں، کیونکہ عوام کے ذہن کی سوچ اور اس کی طاقت ایک معمولی سوچنے والے انسان کی طاقت سے بھی کم ہوتی ہے۔ مجمعوں میں آ کر ایک پڑھا لکھا باشعور انسان بھی ایسی حرکتیں کرتا ہے جو وہ اگر تنہائی میں سوچ سمجھ کر کرتا تو شاید اپنے آپ سے شرمندہ ہو جاتا اور اس لیے بڑے بڑے مقرروں نے ہمیشہ عقلی دلائل دینے سے گریز کیا ہے۔ ان کی اپیل عوام کے ذہنوں سے زیادہ ان کے دلوں سے اور عقل سے زیادہ جذبات سے ہوتی ہے۔

صدیوں سے ملک میں اکٹھے رہتے رہتے، نئی نئی جماعتیں معرضِ وجود میں آ رہی تھیں۔ غیر ملکی شعور سکھا رہے تھے۔ کانگریس اور نئی نئی جماعتوں کے زیرِ قیادت ملک کو آزادی اور غارت گری کا سبق پڑھا چکے تھے۔ عام زندگی کے بہاؤ میں وہ روانی تو نہ تھی۔ پھر بھی اس کیچڑ میں سب کو کلبلانا پڑتا تھا۔ اگر بڑے سمندر پر زندہ رہنے کے لیے ایک انسان ہاتھ پاؤں مارتا ہے کہ کہیں وہ ڈوب نہ جائے تو لجلجے سڑتے ہوئے مادے میں زندہ رہنے کے لیے بھی کلبلانا پڑتا ہے۔ یہ اصول یہی ہے۔ وجود کے اندھیرے غاروں میں عام گیتوں کی صدائے بازگشت گونجتی ہے۔

ایک عام بے چینی اور اضطراب تو صدی کے شروع سے ہی ذہنوں میں تھا مگر اب سوچ بھی تھی اور اس پر روز جھٹکے کھا کر آگے بڑھتی گاڑی میں ہم سب سوار تھے۔ میں کنول کماری اور ہمارے اردگرد مرنے مارنے والے ایک صدہا انسان جھٹکوں سے ہم بھی ہل رہے تھے۔ اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی ساری کوششیں فضول تھیں۔

اور ایسی ہی بے اطمینانی کے درمیان میں ایک دن ڈون وارٹن کو میں نے تصویروں کی ایک بڑی نمائش میں دیکھا۔ تصویروں کے موضوع بھی اشتعال انگیز تھے۔ کسی مصور نے آگ

کے شعلوں میں دہکتے اور گرتے مکانوں کے نیچے لکھ دیا تھا۔ ''ہم۔'' کہیں مغل بادشاہوں کے ساغر و مینا کے سامنے لوگوں کو مدہوش دکھا کر لکھا تھا۔ ''پانچ ہزار سال پہلے لوگوں کا خواب۔'' لوگ غصے میں بھرے گھوم رہے تھے۔ ایک کو دوسرے کے خلاف شکایت تھی اور اس کے باوجود معلوم نہیں ہوتا تھا کہ ایسی تصویروں کو نمائش میں رکھنے کی اجازت کیوں دی گئی۔ کیا ہندوستان اب ایسا آرٹ ہی بنا سکتا تھا۔ اجنتا اور ایلورا کے غاروں میں صدیوں نقش و نگار بنانے والوں نے دنیا کو محوِ حیرت کر دیا تھا۔ تاج محل بنا کر دنیا کا سب سے بڑا خواب مجسم کر دیا گیا تھا۔ اب اس ماضی سے نکل کر چنگ و رباب اور شعلے رنگین خوابوں کی پرچھائیں ہی ہمارے دامن میں باقی رہ گئی تھی۔ وہ ہمارا دماغ جو سب سے اعلیٰ تھا، اس میں کیا صرف اب یہ اُلٹے سیدھے زاویے ہی ڈھل رہے تھے۔

ڈون وارٹن ہر تصویر کو غور سے دیکھتا اور آگے بڑھ جاتا، اس کے چہرے پر بڑی بے یقینی اور بڑی ہی مایوسی تھی۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے میری طرف مڑ کر دیکھا۔ ''پھرا و بوائے'' کہہ کر مجھ سے چمٹ گیا۔ ہمارے اِردگرد کھڑے لوگ حیران ہو کر ہماری طرف دیکھنے میں لگ گئے۔

کہنے لگے: ''تم کو ایک زمانے کے بعد دیکھا ہے۔ کیا کیا کرتے ہو؟''

میں نے کہا: ''تم ہی کہیں نظر نہیں آتے، کیا بدھ مت کے کسی وہار میں بیٹھ کر بھگتی سنگیت سیکھ رہے ہو۔''

بولا نہیں: ''بھگتی سنگیت میں اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی اور بدھ مت کے نظریے تمہارے کسی کام نہیں آسکتے۔ میں ان کو سیکھ کر کیا کروں گا۔''

میں نے کہا: ''بڑے ناشکرے ہو کہ بلندیوں سے آگاہ ہو کر بھی ہمارا احسان نہیں مانتے۔''

ہنس کر کہنے لگا: ''احسان مانتا ہوں پر بلندیاں تمہارے لیے کیوں پستیاں بن گئی ہیں۔''

میں ایک دم اُداس ہو گیا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ ڈون وارٹن نے اپنے جملوں کی سختی شاید محسوس کر لی تھی۔ بولا: ''آؤ تصویریں دیکھیں'' اور ہم ہاتھ میں ہاتھ دیئے نمائش گاہ میں گھومتے اور تصویریں دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد اُکتا کر ڈون وارٹن بولا، چلو آؤ چلیں میرے کمرے میں چلیں۔ میں نے کہا۔ ''چلو۔'' باہر ہوا میں بہار کے پتے خوشبوؤں کے ساتھ اُڑ رہے تھے۔ سامنے بڑی سستی سے جھونکوں کے ساتھ ہلتے میرے دل سے ایک دم وہ ساری دُکھن سی ڈھل گئی جیسے کسی

نے میرے دل میں خوشی کا کوئی بول پھونک دیا ہو۔ میری آنکھوں میں ان سب چیزوں کے
ے آنسو آ گئے۔ میری ساری سانسوں میں ایک گیت سا بھر گیا جیسے میں ایک بانسری تھا۔
اور میں نے سوچا یہ ایک لمحہ جب ساری تمنائیں میرے گرد رنگ رنگ پتنگوں کی ط
اڑ رہی ہیں، یہی زندگی ہے۔ اگر ایسے کوئی اور لمحے نہ بھی آئیں، اگر میرے اور خواب پورے بھ
ہوں تو یہ لمحہ زندہ ہے اور میرے بعد بھی زندہ رہے گا۔ یہ لمحہ اتنا مکمل اور اتنا چھوٹا سا ہے، تیتری
ایک خواب کی طرح جو وہ پھول کی ریشمی پنکھڑیوں کی مخملی سطح پر بیٹھے بیٹھے دیکھتی ہے۔

ڈون وارٹن کے پلنگ پر اس کا سلیپنگ سوٹ بڑی بے ترتیبی سے پڑا تھا۔ کتابیں
پر کمرے میں اِدھر اُدھر بکھری تھیں۔ میں نے دل کی خوشی کے مارے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا
فرانسیسی شہکار تو ویسے ہی ہیں۔ تم ان کو واپس کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔"

اور وہ اپنے دیس کی سیور سیتاؤں کا ایک گیت گنگناتا ہوا کہنے لگا۔ "بائی نے کہا تھا
دل کی طرح ایک بار دے کر واپس نہیں لیے جاتے۔" "اچھا میں نے ہنستے ہوئے رک کر کہا:
سے بائی جی نے کہا تھا۔"

"ہاں۔" اس نے اپنی بے ترتیب کتابوں میں سے کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر
ہوئے کہا: "انہوں نے خود کہا تھا۔"

"تو اُن مہینوں میں تم وہاں مصروف رہے ہو۔" میں نے بے یقینی سے کہا۔ "میں س
بھی رہا تھا کہ یہ ایسی ہی بات ہے۔"

مگر ڈون وارٹن نے کہا: "ہاں میں ان دنوں وہیں مصروف رہا ہوں۔ سمجھے میں ا
دل کو بہلاتا رہا ہوں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے دل کے بہلانے سے ذرا پریشان سا ہو کر مذاقاً پوچھا۔

"اس لیے کہ ایک بلندی کو چھو نہ سکا اور دوسری بلندی میرے سامنے تھی۔"

"صاف بات کیوں نہیں کہتے، پہیلیاں کیا بجھوا رہے ہو۔" میں نے اس سے وضاحت
چاہی مگر وہ چپ رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے کمرے کے سامنے بالکنی سے جمنا دکھا
دیتی تھی، نیلے آسمان تلے لیٹی چپ چاپ بہنے والی جمنا۔ جس کو اس رات میں من موہن س
اندھیرے میں سفر کرتے اور کسی نہ کسی وجود سے جو ہمارا اپنا نہیں ہوتا، باتیں کرتے ہیں۔ ہر لحظہ ہما
اندھیرا کسی اور ہی اندھیرے سے مخاطب ہوتا اور کسی اور ہی برتن میں بھرا جاتا ہے...... اور وہ کو

ہے میں نے اپنے سے سوال کیا تھا' وہ کون اکیلی عورت ہے جو تمہارے دل کے مہمان خانہ میں رہتی ہے۔

دل نے کہا تم نے کتنے سالوں اس کے دوار کے باہر کھڑے ہو کر التجا کی ہے۔ تم کتنے ہی زمانے اور کھڑے ہو کر ابھی اس آستان پر صدا کرو گے اور پھر بھی جب مصروف عورت آ کر کواڑ کھولے گی تو اس کے چہرے پر رنج ہو گا۔ وہ کہے گی اس کے سینے میں صرف رنج ہے اور غم کسی کو دیا نہیں کرتے' میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔

اور میں نے کہا: ''میں پھر بھی وہاں سے نہیں ٹلوں گا۔ میں اپنے جلو میں دنیا کی خوشیاں لے کر اس کی تلاش میں جاؤں گا جو اس کا غم مٹا سکے۔'' دل نے کہا'' جانے دو عبث امیدوں سے حاصل۔ اگر غم مٹ گیا تو اس کا دل بھی مٹ جائے گا۔ اس کے سینے میں کچھ باقی نہیں رہے گا۔ وہ بھی نہ رہے گی۔'' میں نے اپنے آپ سے پھر کہا تھا'' کوشش کرنا بھگت کا دھرم ہے۔''

اور دل نے جواب دیا تھا' ؟؟ عبث کوشش کرنا بھگت کا دھرم نہیں' تمناؤں کے اندھیرے سے پار' کس شے کی تمنا رکھتے ہو؟''

میں نے کہا تھا'' کیا تمام دنیا کی فتوحات بھی اس کے قدموں میں رکھ کر تم اس کا غم دور نہیں کر سکتے؟''

دل نے کہا'' وہ صرف غم کی فتح ہے' غم کی دولت ہے' اس کے سینے میں اس کے سوا اور کچھ نہیں رہ سکتا۔ وہ خوشی کی کرن سے چمک سکتی ہے مگر یہ چمک بجھ جائے گی کیونکہ وہ تو اس محبوب کی منتظر ہے جس کا نام بھی اسے معلوم نہیں۔''

میں نے اپنے آپ سے کہا'' کیا وہ دن تمہیں یاد نہیں ہے' جب تم نے راجندر کا خط کنول کماری کو لوٹایا تھا۔ اس دن اور دنوں کی طرح وہ خوش نہ تھی۔ وہ غمگین نہ تھی۔''

میں نے راجندر کا خط واپس کرتے ہوئے کہا تھا'' میں اس کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں۔''

اور اس نے کہا تھا'' میں نے آپ کو کچھ کہنے کے لیے نہیں کہا' راجندر کو آپ ہی لائے تھے نا اور اب یہ کانٹے میرے دامن کے لیے بکھر گئے ہیں ان کو چن بھی...... نہیں سکتی۔''

میں نے وہیں بیٹھے سوچا تھا' کیا کنول کماری ٹھاکر اس پر اعتبار کرتی ہے۔ کیا وہ اس سچائی کو سمجھتی ہے۔ کیا وہ راجندر کو سمجھتی ہے۔ کیا اس کے پردے میں بیٹھی عورت راجندر سے شکست کھا گئی ہے؟

دیر تک میں اپنے خیالوں میں کھویا وہاں بیٹھا تھا اور مارچ کی ہوائیں باہر پھولوں کو ہلاتیں ان کو گیتوں سے بھرتی پھر رہی تھیں۔ میرا دل لہروں اور ہواؤں کے درمیان اُڑ رہا تھا۔ میں نے کہا تھا، کنول کماری اپنی بانسری بجاتی ہوئی تھک گئی ہے۔ اسے نئے گیتوں کی ضرورت ہے۔ اسے پرانے بادبانوں کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ کوئی چرواہا' خدا' کوئی یونان کی وادیوں کا اپالو اس کے کام آسکتا ہے۔

اور کنول ٹھاکر کی آواز مجھے کہتی سنائی دی تھی۔ ''مجھے تو آگے ہی آگے سفر کرنا ہے۔ اندھیروں اجالوں پر سے اکیلی سفر کرنا ہے۔ میں تو اس کی تلاش میں ہوں جو مجسم ِمحبت ہے'' اور پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''ناجیل کو جانتے ہو۔''

''کون ناجیل؟'' میں نے ایک محبت کرنے والے حاسد کی طرح تیزی سے پوچھا۔

اور کنول نے بڑی طمانیت سے ناجیل کے متعلق بتاتے ہوئے کہا تھا: ''آگے ہی آگے سفر کرنے والا برفانی سمندروں پر اکیلا گھومنے والا ناجیل۔'' میں نے بڑی بے یقینی سے اس سے پوچھا تھا۔ ''کرشن کنہیا کیوں نہیں' ناجیل ہی کیوں؟'' اور اس نے شگفتگی سے مجھے بتایا تھا'' اس لیے کہ ناجیل میں وہ سب ہے جو عورت کی قید سے آزاد ہے' وہ ایسا آدم ہے جسے حوّا کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک شِو ہے جسے تکمیل کے لیے کسی پاربتی کا سہارا نہیں ملا' مگر وہ مکمل ہے۔''

میں نے کہا تھا: ''وہ نیا آدم ہماری دیومالاؤں میں نہیں ہے۔''

کنول نے کہا تھا: ''باقی دیومالائیں بھی اپنی ہیں۔ ملک' قوم اور حدوں کی قیدوں سے آزاد ہونے کی ضرورت ہے۔ ایک ہی طرح کی محبت کرتے کرتے ایک ہی طرح کی زندگی صدیوں سے گزارتے ہیں۔ ایک ہی وجود میں قید' ہماری روشنیاں ختم ہوگئی ہیں۔''

میں نے پہلی بار بہت ہمت سے کہا تھا: ''عورت کو اسی آگ میں سے گزرنا پڑے گا تاکہ وہ پوِتر ہوسکے۔''

کنول نے اطمینان سے جیسے اسے میری بات سے ذرا بھی حیرت نہ ہوئی ہو' کہا تھا: ''میں آگ پر سے نہیں گزروں گی۔ میں برفانی سمندروں پر سفر کر رہی ہوں۔ مجھے اکیلے ہی آگے جانا ہے۔''

دنیا کے قانون اپنی عزت خود کروا لیتے ہیں۔

اور کنول نے ہنس کر اس تصویر کو پکڑ لیا تھا، جس میں گھروں میں جینے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ جس پر زردی تھی اور سُونا پن تھا۔ پھر بولی: ''میں زندگی کی اس تصویر سے عاجز ہوں۔ ایک ہی طرح جینے کی عادت، زمانے کی قیدوں سے بے پروا۔ میں اس جمود کو توڑنا چاہتی ہوں۔''

میں نے کہا: ''الگ راہوں کے لیے ہمت کی ضرورت ہے۔''

اور اس نے کہا تھا: ''اگر برفانی سمندروں پر اکیلے چلو تو کسی راہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سمندر پر راہیں کام نہیں آتیں۔''

میں نے دل ہی دل میں بچپن کی ان کہانیوں کو کوس ڈالا تھا جنہوں نے ناجیل کا تعارف کنول سے کروایا تھا۔

اس خوبصورت دن ڈون وارٹن کی بالکنی کے سامنے جھکے جھکے جمنا کو دیکھتے ہوئے میں نے ان سب باتوں کو پھر سے دہرایا تھا اور اندر کمرے میں وہ اپنی بے ترتیب کتابیں اُٹھا کر ایک کونے میں پھینک رہا تھا۔ چیزوں کو درست کر رہا تھا اور زور زور سے گا رہا تھا۔ مجھے اسپین کی وہ سیور سیتائیں یاد آ رہی تھیں جن کی سیاہ آنکھوں میں بجلیاں تھیں۔ مجھے اسپین کے رقص کی ایک تصویر یاد آ رہی تھی جو میں نے عرصہ پہلے کسی کتاب میں دیکھی تھی۔ اس سے زیادہ مکمل تصویر میری نگاہوں سے کبھی نہیں گزری۔

پھر وہ بھی باہر آ گیا اور بولا: ''تمہارے ہاں زندگی اتنی سوئی ہوئی لگتی ہے جیسے اطمینان اور سکون کے علاوہ کچھ بھی نہیں، مگر پھر بھی تم لوگ ہم سے زیادہ غیر مطمئن ہو۔''

میں نے کہا: ''یہ اس ملک کی خصوصیت ہے جو جسم سے زیادہ روح کی حفاظت کرتا ہے۔ ہماری بے اطمینانی ہمارا قومی کردار ہے۔ ہماری زندگی کا سونا اور خاموش ہونا بھی ہماری طرح ہے۔ سطح کے نیچے کتنے طوفان ہیں، تم کیا جانو۔ ایک گمبھیر سمندر کی طرح ہمارے ہزاروں ہی سوتے ہیں جو آ کر ملتے ہیں اور......''

اور ڈون وارٹن نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا تھا: ''تمہاری موسیقی بھی تو سب سے زیادہ تمہارے قومی کردار کا مجسمہ ہے۔ تمہارے ہاں کی عورت بھی تمہاری موسیقی ہے۔ اصل میں تمہارے ہاں ساری زندگی موسیقی کے سمندر سے نُمو اور دوام حاصل کرتی ہے۔ تمہارے ہاں کی موسیقی بھی تمہاری طرح کی ہے۔''

''اصل میں ہمارا ماضی ہم سے زندہ ہے۔ ہم اس سے زندہ ہیں۔''

میں نے کہا: ''آج بہت نیکی کے سائے تلے بیٹھے ہو۔''

پھر وہ اپنا گٹار اٹھا لایا اور بجانے لگا۔ سامنے سوئی ہوئی جمنا تھی، جھکا ہوا نیلا آسمان تھا اور ہوا تھی۔ بہار کی خوشبوئیں تھیں اور بادلوں کے ٹکڑے بڑے بڑے دریا پر سے اڑتے ہوئے گزر رہے تھے۔ تاج کے میناروں اور بلند آسمان کے سینے میں چبھتے ہوئے الگ اور خوبصورت کھڑے تھے۔ دیر تک وہ اپنے گٹار کو بجاتا رہا پھر اسے الگ رکھ کر خاموش بیٹھ گیا۔

میں نے کہا: ''ڈون وارٹن کیا تم مجھے اس لیے یہاں لائے ہو کہ اپنے گرد کی گھن گرج سے الگ ہو کر تمہارے گٹار کی صدائے بازگشت کو اپنے دل میں محسوس کر سکوں۔''

اس نے خاموشی سے جھک کر میرے کان میں کہا تھا: ''میں سوچ رہا ہوں، تمہارے جمنا کے کناروں پر کتنے تاج ہیں۔''

''تاج محل تو دنیا میں ایک ہے۔ واحد اور اکیلا جیسا تمہارے ہاں روم کا گرجا ہے۔ جیسے غرناطہ ایک ہے۔'' میں نے اس کی بات کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

کہنے لگا: ''میں کب کہتا ہوں کہ یہ عمارتیں واحد نہیں ہیں پر پھر بھی ان دلوں کو کیا کہو گے جن میں تاج سے زیادہ خوبصورتی اور گھمبیرتا ہے اور جن میں تاج سے بھی بڑی محبتیں دفن ہیں۔''

''ایسے مقبرے تو ہر ملک میں ہوتے ہیں، بیتی بہاروں کا انتظار کرتے تھک کر بھی جوان رہنے والی محبت کی یادگاریں۔''

''نہیں۔'' ڈون وارٹن نے جمنا کو دیکھتے ہوئے خواب آورسی آواز میں کہا تھا۔ ''میں نے جتنی دنیا دیکھی ہے اس میں ایسے مزار کم ہیں اور اگر کہوں کہ نہیں ہیں تو ٹھیک رہے گا۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' میں نے ذرا تیزی سے پوچھا۔

''اوبوائے۔'' اس نے دفعتہً بات کو پلٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ جو آج نمائش میں دیکھا ہے یہ تمہارا آرٹ نہیں ہے۔ یہ چوری ہے، یہ دھوکا ہے، اس کو جن لوگوں نے بنایا ہے وہ غیر ملکی ہیں۔''

''اچھا......'' میں نے بہت دیر پہلے کی ایسی باتیں یاد کرتے ہوئے کہا۔ ''ایسا تو ہوتا ہی ہے۔''

''تم اتنی بے بسی سے یہ سب کیسے ہونے دیتے ہو۔ تم لوگ کیوں بے انصافی کے خلاف آواز بلند نہیں کرتے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا اور میں نے کہا: ''ہمارے گلے میں ہماری آوازیں گھٹ گئی ہیں۔ ہم بولنا چاہتے ہیں اور بول نہیں سکتے۔ بھائی ہم مجبور ہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو

ہم سب نظام کے آہنی پہیوں کے نیچے نہیں رہے۔ ہمارا سانس بھی مشکل سے نکلتا ہے اور پھر بھی کسی طرح ہم جینے پر مجبور ہیں۔''

''یہ گھٹن تمہاری زندگیوں پر کب تک رہے گی؟۔ طوفان تمہارے دروازے سے باہر چیخ رہے ہیں۔ تیز ہوائیں تمہارے گھر کے گرد چکر لگا رہی ہیں اور تم سوئے پڑے ہو۔'' ڈون وارٹن نے کہا۔

''ہر ملک اپنا سبق سیکھتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے' بڑھنے کے لیے' مگر ایسے میں بھی وقت چاہیے۔'' ہم ابھی جاگے نہیں ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ ''تم غلط کہتے ہو۔'' ڈون وارٹن نے اٹھتے ہوئے اپنا گٹار پرے کر کے کہا۔ ''جس ملک کی عورتیں جاگ گئی ہوں' آزادی اس سے دور نہیں رہ سکتی۔''

''نہ جانے کون سے خوابوں کا ذکر کرتے رہتے ہو۔ کیا تم نے سپنے میں ممتاز محل کی روح کو دیکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں میں نے خواب نہیں دیکھے اور نہ میں خوابوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ میں زندہ عورتوں کا ذکر کر رہا ہوں' کنول کماری ٹھاکر کا۔'' ڈون وارٹن نے کہا اور میرے دل میں اس رات کا حسد اور دکھ جاگ گیا۔ اس رات کا عذاب' جس نے کئی دنوں میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے کئی بار اپنے کو سمجھایا تھا' پر دل سمجھ نہیں سکتا اور پھر بھی کسی طرح مجھے معلوم تھا کہ مجھے کنول سے وہ لگاؤ نہیں تھا جس کو محبت کہا جا سکے۔ مجھے کنول سے وہ عقیدت نہیں تھی جس کو عشق کہا جا سکے۔ مجھے کنول اتنی اچھی نہیں لگتی تھی کہ میں اس پر مرنے لگوں۔ اس کے باوجود ڈون وارٹن نے کنول کا نام جس اطمینان سے لیا ہے' میرا جی چاہتا تھا میں اس کے منہ پر اس زناٹے سے ایک تھپڑ ماروں جیسے اس رات من موہن نے مارا تھا۔ مگر میں ایک بزدل آدمی تھا۔ میرے دل میں کمزوری اور مدقوق تمنائیں ابھی کہیں کہیں سانس لے رہی تھیں۔ پھر میں اس دوسرے آدمی کے دل کو کیسے سمجھ سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ آدمی اس عورت کا ذکر اس طرح کر رہا ہوگا' وہ ایسی طاقت ہے' زندگی کا ایک ایسا رخ' جس سے ہماری بے اطمینانی اور ہمارے ملک کے اضطراب کو ایک ضرب لگائی جا سکے' جس سے ہمارے جمود کو توڑا جا سکے مگر میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

وہ کافی دیر چپ رہا۔ جمنا پر بادل جھک آئے تھے۔ بادلوں میں سیاہی گہری ہو گئی تھی اور سیاہی ہر طرف پھیل رہی تھی۔ میں نے سوچا کسی غیر ملکی مصور کو یہ نہ سُوجھا کہ وہ سیاہیوں

اور بادلوں سے ہی کام لیں۔ سیاہی تو سب سے زیادہ واضح اور زندہ شے ہوتی ہے۔ جہاں اور رنگ ماند پڑ جاتے ہیں، یہ اجاگر ہوتی ہے۔

ڈون وارٹن بولا: ''ایسے میں کافی پیو گے، چائے پیو گے؟''

میں نے کہا: ''پینا کوئی ضروری ہے؟''

کہنے لگا: ''ہاں اپنے آپ کو بھلانے کے لیے پینا ضروری ہے۔ اپنے آپ سے بچنے کے لیے پینا ضروری ہے۔''

میں نے کہا: ''اپنے آپ سے کیوں بچتے ہو، فرار تو بزدلی ہے۔ ہمیں دیکھو رات دن ایسی پریشانیوں سے دوچار ہوتے ہیں، گھبرا جاتے ہیں مگر پیتے نہیں ہیں، تمہارے ہاں یہ بزدلی ہے۔''

اور ڈون وارٹن نے بڑے فلسفی کی طرح کہا۔ ''ہم سب اپنے آپ سے بچنے کے لیے سہارے ڈھونڈتے ہیں۔ ''شراب کا، عورت کا۔'' اور پھر مجھ سے کہنے لگا: ''چلتے ہو چلو آج بائی جی کے ہاں چلیں گے۔''

میں انہیں تقریباً بھول چلا تھا اور آج وہ دفعتہً مجھے پھر یاد آ گئیں۔ میں نے کہا: ''جانے میں تو کوئی ہرج نہیں پر......''

''پر کیوں کیا کہیں جانے کا ارادہ ہے۔ کیا کنول کماری ٹھاکر کے ہاں جا رہے ہو؟'' اس نے ہنس کر پوچھا۔

اور میرے خول میں سے وہ بہادر آدمی جو کب سے کتنے مہینوں سے ڈون کے خلاف سازش کر رہا تھا، باہر نکل آیا۔ میرا وہ اندھیرا جس میں اس غیر ملکی کی طمانیت کے خلاف بغاوت ہو رہی تھی، یکایک روشن ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس ہنستے ہوئے اسپین کے غیر ملکی اور مشرق کی روایتوں کے امین کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ لگا دیا۔

ڈون وارٹن اور زور سے ہنسا، اتنے زور سے کہ میں ڈر گیا۔ مجھے اس کی ہنسی ایک چیخ کی طرح لگی جو دل کو پھاڑ کر پردوں سے باہر نکل آئی تھی۔ وہ ہنستا گیا اور زور سے، اور زور سے۔ میں پہلے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ہنستا ہی جا رہا تھا اور میں وہاں کرسی پر بیٹھا ایک ایسے بے بس انسان کی طرح لگ رہا تھا جس کا سب کچھ کھو گیا ہو۔

جس کا راز ہی اس کا سب کچھ تھا اور اب وہ بھی اس کے منہ سے اچانک نکل گیا ہو۔

میں اپنے دونوں بازو کرسی کے دونوں بازوؤں پر رکھے ایک لاش کی طرح بے حس اور زرد ہو گیا۔

مجھے بہت دنوں کے بعد پہلی بار اس بات میں صداقت نظر آئی کہ ہم سب نیم پاگل ہوتے ہیں۔

ایک زمانے کے بعد ڈون وارٹن نے اپنے آپ کو سنجیدہ کیا۔

میں نے کہا: ''تم کو کس چیز نے اس زور سے ہنسنے پر آمادہ کیا تھا۔ یقیناً میں نے تم کو ہنسانے کے لیے کوئی کام نہیں کیا'' یہ لطیفہ نہیں تھا۔ اب مجھے پھر اس کے ہنسنے پر غصہ آ رہا تھا۔

اور ڈون وارٹن نے اٹھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''او بوائے! اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تم لوگ جذباتی ہوتے ہو۔ یہ تمہارا ہندوستانی خون ہے۔ تمہیں ابھی اپنے سبق سیکھنے ہیں اور تم انہیں دکھ سے سیکھو گے۔ جب کسی قوم کے ذہین آدمی ایسی حرکتیں کرنے لگے ہوں تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ان کے جذبات میں گرمی ہے' آگ نہیں۔ تم لوگ آگ میں کودو گے جلدی یا دیر سے اور پھر وہاں سے صاف ہو کر نکلو گے۔ آہن بن کر' تا کہ دنیا کا مقابلہ کر سکو۔ تم اپنی عورت کی اتنی سی توہین برداشت نہیں کر سکتے۔ تم کس طرح یہ برداشت کرتے ہو کہ تمہارے گرد زندگی میں اتنی بے اطمینانی ہو اور تم آرام سے بیٹھے دیکھتے رہو۔ میں تم کو مبارکباد دیتا ہوں۔ تمہارا وقت آنے والا ہے۔'' اور میں نے اپنے آپ کو ایسا پاگل سمجھا جس کو اپنے پر ذرا سا قابو نہ ہو۔

بڑی بڑی بوندیں بالکنی میں آ کر گرنے لگیں۔ جمنا کا پانی سیاہ لگنے لگا اور ہم تھکے ہوئے آدمیوں کی طرح اندر آ گئے۔

کمرے میں کتابوں کا ڈھیر ایک کونے میں رکھا تھا۔ ایک کتاب میں سے ایک بڑی سی تصویر آدھے سے زیادہ باہر نکلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ کپڑے اس طرح پلنگ پر پڑے تھے۔

ڈون وارٹن بولا: ''یہ میرا مشرقی پہلو ہے' یہ میرا ماضی ہے۔ ہم میں یہ بے ترتیبی یہ پھیلاؤ سے محبت' مشرق سے آئی ہے۔''

میں نے ایک مظلوم کی طرح کہا: ''تم ہر بات میں مشرق کو کیوں گھسیٹ لاتے ہو۔''

اور ڈون وارٹن نے کہا: ''او بوائے میں تم سے سخت ناامید ہو گیا ہوں۔ کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ پھیلاؤ خلوص کا نام ہے جو مغرب میں ناپید ہے۔ جس سے مغرب کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کیا تم ہماری زندگیوں میں اتنی سی بات بھی نہیں دیکھ سکے؟'' میں خاموش ہو گیا اور دروازے میں کھڑا ہو کر بڑی بڑی بوندوں کو رقص کے چکروں میں گھومتے تیزی سے پرواز کرتے دیکھتا رہا۔ اب جمنا پر یہ بوندیں پڑ رہی ہوں گی۔ دریا میں چھوٹے چھوٹے سینکڑوں بھنور ہوں

گے۔ لہروں کے ساتھ بھنور بھی بہتے ہوں گے اور ہوائیں بخارات سے بوجھل پانی کی سطح کو چھوتی ہوئی بہہ رہی ہوں گی۔ پھر مجھے بچپن کی یاد آ گئی۔ برساتوں کی شامیں، جب میں دنیا کے پاس بیٹھ کر اس بالکنی کو اس دوسری اور اندھیرے میں گم ہونے والی بالکنی کے کنگروں کو دیکھتا اور سوچتا تھا کہ ایسی شامیں لامتناہی ہیں اور ختم نہیں ہو سکتیں، میری تمنائیں...... میری بہن کس دُکھ سے مر گئی۔ مگر میں نے اس کا بدلہ لینے کے لیے کبھی کرشن گوپال کے منہ پر تھپڑ نہیں مارے۔ میں نے کرشن گوپال کو کبھی ایک لفظ نہیں کہا۔ ہم اپنی عزت کے تحفظ میں کتنے سطحی ہیں۔

ہم اپنے آپ کو بھی نہیں سمجھتے اور پھر اگر ہمارے خیالوں کے چہروں سے دفعتہً پردہ اٹھ جائے تو کس طرح گھبرا جاتے ہیں۔

ڈون وارٹن نے کہا: ''سردی ہو رہی ہے۔ تم چائے پی لو میں شیری پیوں گا۔ ہم دونوں بائی جی کے ہاں چلیں گے۔''

پھر وہ مجھے اور تصویریں دکھاتا رہا۔ ہم بدھ مت کی باتیں کرتے رہے اور میں یوں محسوس کر رہا تھا، گویا میں نے نہیں، ڈون وارٹن نے میرے منہ پر ایک زوردار تھپڑ لگایا تھا۔

میں نے بینا کو فون کیا کہ شام کو میں کافی دیر سے پہنچوں گا، وہ میرا انتظار نہ کرے۔

اور اس نے کہا تھا: ''بابا بیٹیاں صرف انتظار کرنے کے لیے بنی ہیں، آپ جب بھی آئیں گے مجھے اپنا منتظر پائیں گے۔''

میں نے کہا: ''بینا انتظار کرنے کے دن بیت گئے ہیں۔ ہم لوگ جس راہ پر بڑھ رہے ہیں، وہ دوسروں سے الگ ہے۔'' اور اس نے دوسرے سرے پر ہنس کر کہا تھا: ''میرے بابا ہیں نا ہمیشہ اچھی اچھی باتوں کے وعدے کیے جاتے ہیں۔ پھر وہ باتیں کب ہوں گی۔ اس کا ہمیں پھر انتظار کرنا ہوگا۔''

میں ریسیور رکھ کر سوچ رہا تھا۔ بینا ٹھیک کہتی ہے۔ انتظار کا بھی انتظار ہے۔ ہمارے ہاں کبھی کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی انقلاب نہیں، کوئی بڑی تبدیلی نہیں، صرف لامتناہی انتظار ہے اور ہم ہیں۔ میری بچی ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔

میں کالج کے پاس سے کئی بار گزرا ہوں۔ صدہا دفعہ میں نے اس خاموش بلند اور آدھی جلی ہوئی عمارت کو ہواؤں سے کچھ کہتے سنا ہے، جس طرح بلندیوں پر اپنے خیالوں میں کھوئے

ہوئے بادل آہستہ آہستہ پرواز کرتے اور پانی کے ننھے ننھے جوہڑوں میں جو بارش کے بعد سڑک کے کنارے کے ساتھ بن جاتے ہیں، اپنا عکس دیکھتے ہیں، اسی طرح کنول کماری ٹھاکر کے بعد بھی اس کالج کے در و دیوار میں مجھے کنول دکھائی دے جاتی ہے۔ جانے کیوں؟

ہاں میں سوچتا ہوں یہی وہ بلند عمارت ہے جس پر بہنے والی ہوائیں کنول کماری ٹھاکر کے چمکیلے بالوں سے مس ہوگئی ہیں۔ یہی نیلا ستاروں بھرا آسمان ہے جس نے اس کو لاتعداد بار سورج کے نکلنے سے پہلے تُلسی کے ننھے پودے کو پانی دیتے دیکھا تھا۔ نہ جانے اس تُلسی کے پودے کا کیا ہوا ہوگا؟

بالکل ایسے ہی جیسے ہمیں معلوم نہیں ہو پاتا کہ ہماری پرانی محبتوں کا کیا بنا۔

اور پھر بھی پرانی محبتوں کا ذکر ہمارے دل میں غموں کو تازہ کر دیتا ہے۔ جیسے کسی سوئے ہوئے حصہ جسم میں خون کی گردش ایک بے چین کیفیت بن جاتی ہے مگر اس بے چینی کے ساتھ ہمارا عضو تندرست ہو جاتا ہے۔ زندگی میں واپس آجاتا ہے۔

یہیں وہ کنول کماری ٹھاکر تھی۔ اس کالج کے در و دیوار میں جسے ڈون وارٹن نے بھی چاہا تھا۔

اس دن میں اور ڈون وارٹن بارش کی تیزی کی وجہ سے بھی رُک نہ سکے۔ چائے پی کر ہم دونوں بائی جی کے ہاں چلے۔ سڑک بارش میں دُھلی ہوئی اور اجلی لگ رہی تھی۔ وہ ماحول عُریاں اور سُونا نہیں تھا۔ درختوں کے لنڈ منڈ تنوں پر ہریالی تھی اور بائی جی کا پھاٹک کھلا تھا۔

وارٹن نے اپنا کوٹ برآمدے میں جا کر ایک شانِ بے اعتنائی سے اتار کر لٹکا دیا اور کھڑے ہو کر بوندوں کی تال پر سیٹی بجانے لگا۔

میں نے کہا: ''بندۂ خدا تم نے یہ کیا کیا ہے، کہیں دستک نہیں دیتے کچھ کہتے نہیں ہو، کیا یہاں کھڑے ہو کر بارش کا نظارہ کرنے آئے ہو؟''

مگر وہ اسی بے نیازی سے سیٹی بجاتا رہا اور آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہوا سیٹی رقص کی ایک تال تھی جو شاید اس کے اپنے دیس کی ہو۔ ایک دروازہ کھلا کسی نے چلمن کے پیچھے سے باہر جھانکا۔ اور پھر مجھے اسی مدھر ہنسی کی آواز آئی جیسے کہیں چاندی کی گھنٹیاں ٹنٹنا اٹھیں۔

ڈون وارٹن بولا: ''کیا آج اصول ختم ہے؟''

اور بائی جی نے کہا: ''آیئے اصول بھی احترام کے پابند ہوتے ہیں۔ آج میرے گھر

کی قسمت پھر جاگی ہے۔ آپ بھی آ گئے۔"

یہ جملے مجھے مخاطب کر کے کہے گئے تھے۔

ہم دونوں اندر چلے گئے۔ کمرے میں وہی سویا سا حسن جس میں بناوٹ نہیں' لبھانے کی کوشش نہیں اور آنکھیں جب اوپر سے نیچے نظر جائے تو مندر کے دوار کھل گئے مانو۔"

میں دوسری بار آیا تھا' چپ تھا اور میرا دل گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ میں یوں بھی بولنا نہیں چاہتا تھا۔

بائی جی نے کہا: "کیوں آج ایسی بارش میں ان کو تکلیف کیوں دی۔ ویسے تو میں اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں پھر آنے والے نے ایسا وقت منتخب کیا کہ ان کی تکلیف فرمائی کے لیے فرشِ راہ ہونے کو جی چاہتا ہے۔"

ڈون وارٹن بولا: "نصیب ان کے جن کے لیے آپ فرشِ راہ ہوتی ہیں۔ ہم اتنے دور دیس سے آئے ہیں' ہماری قسمت میں تو چوری چوری چپکے چپکے ہی لکھا ہے۔"

بائی جی ہنس پڑیں۔ بولیں: "اپنی اپنی قسمت ہے۔"

پھر وہ دونوں بدھ مت کے فلسفے پر بحث کرنے لگے اور میں ان کیلوں کو دیکھنے لگا جن سے تصویریں اُتار دی گئی تھیں جو ڈون وارٹن کے کمرے میں لٹک رہی تھیں۔

ڈون وارٹن میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا' بہت دفعہ کہا ہے انہیں کہ "جس علم کو سینے میں لیے پھرتی ہیں' اسے کام میں لائیں مگر یہ کام میں لانے کے سراسر خلاف ہیں۔"

اور بائی جی مسکرا کر بولیں۔ "وقت پڑنے پر خود ہی کام میں لاؤں گی۔ تب تو کسی سفارش کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہر بات کے لیے ایک وقت ہے۔ جب وقت آئے گا' میں پیچھے نہیں رہوں گی۔"

ڈون وارٹن بولا: "اتنا کافر موسم ہے' کوئی اچھی سی چیز سُنا دو۔"

میں نے کہا: "دو سالوں کے عرصے میں ہمارے ہاں کے موسم کا کُفر بھی تم پر اثر کرنے لگا۔"

آہستہ سے بولا: "اِن دو ماہ کے عرصہ میں تمہارے ہاں کے حسن نے مجھے سب کچھ سکھا دیا ہے۔"

بائی جی بولیں: "نہیں آج تم اکیلے نہیں ہو' آج ان سے باتیں کریں گے۔ اس رات

بھی تم ہی سب سے زیادہ توجہ کا مرکز رہے۔ یہ بچوں کی سی عادتیں چھوڑ دو۔"

ڈون وارٹن ہنس کر سیٹی بجانے لگا اور بائی جی نے ایک چاندی کے ڈبے میں سے اپنے گھنگھرو نکال کر پاؤں میں باندھے۔ اسپین کی سیوریستاؤں کا رقص ہونے لگا۔ بائی جی کی چھب ان کی ادا اور اس پر غیر ملکی چیز میں وہ سادگی' ایک سماں بند گیا۔

میں نے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا: "تم نے استاد بن کر خوب طاق لیا ہے انہیں۔"

اور ڈون وارٹن بولا: "اپنا دل بہلانا بھی تو ایک ضروری بات ہے۔"

پھر وہ خاص موسم کی چیز گانے لگیں اور ہم ان کے ہاتھ کے لگائے ہوئے پان کھانے لگے۔

ڈون وارٹن کہنے لگا: "کبھی چائے بھی پلوا دیا کرو۔"

اور بائی جی نے ہنس کر کہا: "نہیں اپنے ہاں کے بھی خاص آداب ہیں' ان میں سے پان بھی ایک شے ہے۔ میں اپنے پیشے کو بدنام کرنا نہیں چاہتی۔"

وارٹن نے کہا: "گویا یہ پیشہ چل رہا ہے۔"

بولیں: "یہ بھی دل بہلانے کا ایک ذریعہ سہی' پھر بھی تجارت کے چند اصول ہیں۔"

اور مجھے ان کی گفتگو سے اس بات کا یقین ہو گیا کہ دونوں کی دوستی پرانی ہو چکی ہے۔

وارٹن نے کہا: "کوئی پوچھے لاکھوں روپے کے تحفے اٹھا کر دے دیتی ہیں تو اس سے تجارت کے نام کو بدنامی کا خدشہ نہیں۔"

بولیں: "وہ ذاتی پسند ہے۔ انسان اس کے لیے اپنا دل بھی لُٹا دیا کرتا ہے۔ ہمارے پیشے میں دل پر کوئی پابندی نہیں' بشرطیکہ سوچ بچار اور عقل سے اس کا سودا کیا جائے۔"

وارٹن بولا: "سوچ بچار کا کیا کام' دل تو ان سودا بازیوں سے الگ ہے اور یہ اصولوں کے خلاف ہے۔"

وہ چپ ہو رہیں اور اپنی چیزوں کو درست کرنے میں لگ گئیں۔ گھنگروؤں کی جھنکار' پان کی سرخی پھر ناک کی کیل۔

ڈون وارٹن بولا: "یہ دوسرا تاج ہے۔ سمجھے' غور سے دیکھ لو۔"

میں نے کہا: "تم انہیں دوسرا تاج کہتے ہو۔ میں سوچتا ہوں' یہ پہلا تاج ہیں' یہ سارا حسن ہوں گی' پر تمہاری اصطلاح میں کس طرح تاج ہیں۔"

کہنے لگا: ''تاج بننے کے لیے سینے میں محبت کا ایک مدفن ہونا چاہیے اور وہ ان کے سینے میں ہے۔''

میں نے کہا: ''بات سوچ سمجھ کر کیا کرو'' مگر بائی جی کا چہرہ ایک دم اتر گیا تھا۔ وہ اداس ہوگئی تھیں، زرد، خاموش۔ ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ میں بھی اپنی بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو رہا۔ مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اتنی سی بات پر بائی جی میں ایک دم تبدیلی کیسے آ گئی۔

کیا ان کے سینے میں بھی کوئی درد تھا۔ ایسی عورتوں سے کبھی نہیں ملا یا ملتا ہوں تو کسی دوست کے ساتھ کسی تقریب سے۔ بولتا بھی کم ہوں اور جو کوفت ایسی محفلوں میں ہوتی ہے، اس کی وجہ سے مہینوں بادہ نوشی سے توبہ کرنے والوں کی طرح الگ الگ مگر یہ معاملہ تو اور تھا۔ بائی جی ڈون وارٹن کے مراسم گہرے ہوگئے تھے۔ وہ پہلا غیر ملکی تھا جو ہمارے ہاں کے سحر سے مدہوش نہیں ہوا، بے ہوش نہیں ہوا بلکہ وہ ہوش مند ہوگیا تھا...... بائی جی کی دریا دلی، ان کا رکھ رکھاؤ، سلیقہ اور شہر سے دور اس ویرانے میں ان کے گھر کا ماحول اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ وہ کوئی معمولی ہستی نہیں ہیں، مگر کون ہوں گی یہ بات سمجھنے اور جاننے کی بھی مجھے چنداں پرواہ نہ تھی اور اسی لیے من موہن کے بعد سے میں نے ادھر کا کبھی رخ نہیں کیا تھا۔

ڈون وارٹن کے چہرے پر افسوس کی کیفیت ظاہر تھی۔ وہ بھی بات کر کے شرمندہ ہو گیا۔ محویت سے بیٹھ گیا۔

اس خاموشی اور اداسی میں باہر زوروں سے پڑتی بارش کی چھتوں پر گرتی بوندوں کی درختوں کو ہلاتی ہوا کی آوازیں تھیں۔ بائی جی ایک سکتے کے عالم میں جیسے انہیں دور کے خوابوں کی کھلتی کھڑکیوں سے جھانکنے سے فرصت نہ ہو۔ جیسے وہ ہمہ تن انتظار، کسی کے لیے نگاہیں فرش راہ کیے بیٹھی ہوں۔ بہت دیر کے بعد انہوں نے اپنی اسی محویت کو توڑا ہوگا۔ مجھے اپنے کانوں میں کسی شعر کے پڑھنے کی صدائی آئی۔ بائی جی کہہ رہی تھیں۔

بے کسی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے دلی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

میں نے بہت لوگوں کو شعر پڑھتے سنا ہے۔ ملکی اور قومی شاعروں کی نظمیں پڑ کر سر دُھنتے سنا ہے مگر اس شعر کو وہ ایک نئی زندگی دے رہی تھیں۔ اس عورت کے کتنے نئے پہلو تھے اور پھر وہ عزت کی اس گدی پر بیٹھ سکتی تھیں، جو ہم اپنی عورتوں کو دیتے ہیں۔ اس کا گھر تو ایک راہ گزر تھا، اس

کے دل کی طرح کئی لوگ بیٹھ کر ستانے بھی لگتے تھے۔ اس کے باوجود اس سائے کو چھوڑنا پڑے گا کیونکہ یہ سایہ وقتی تھا۔ مجھے مدتوں پہلے پڑھی ہوئی ایک نظم یاد آ رہی تھی: ''ایک ذرا سی خواہش جیسے کسی پرندے کے اڑتے پروں کا سایہ ہو۔''

''اے عورت میرے گھر میں آ' فالتو لمحوں کے کوڑے کرکٹ کو باہر پھینک' پنگھٹ سے پانی بھر کر لا اور پھر پوجا کا دروازہ کھول تاکہ ہم بھگوان کی آنکھوں کے سامنے ڈوبتی روشنیوں کے سائے میں ایک دوسرے سے مل سکیں۔''

نہ جانے مجھے یہ نظم کیوں یاد آ رہی تھی اور بائی جی شعر پڑھ رہی تھیں۔ ڈون وارٹن موقعہ کی نزاکت کو سمجھنے کے باوجود سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں دونوں کی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ میرے گرد آوازیں تھیں اور تیز گرتی بارش تھی۔ جمنا کے بھنور اور لہریں تاج محل میں دفن تھیں۔ ہوائیں کھیتوں پر کراہتی پھر رہی تھیں۔ اندھیرا طوفانوں کے نشے سے چور گرتا پڑتا بھاگ رہا ہوگا۔ بوندوں کے بطن میں روشنیاں کانپ رہی ہوں گی اور زمین نئی تخلیق کے بوجھ کو سینے پر لیے کانپ رہی ہوگی۔ نئی خوشی سے نئے درد اور نئے وجود کے احساس سے جب بارش میں سوندھی زمین کی باس مل کر میرے گرد گھومتی ہے تو میں سوچا کرتا ہوں یہ بھی ایک ماں ہے' جس کے وجود سے محبت کی خوشبو نکل کر اسے مدہوش کیے دیتی ہے۔ مجھے عورتیں یاد آ رہی تھیں اور پھر مجھے کوئی بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ میرے خیالوں میں صرف صورتیں سی آتیں اور سینما کی تصویروں کی طرح اندھیرے میں چلی جاتیں۔

ڈون وارٹن دروازہ کھول کر برآمدے میں جا کھڑا ہوا۔ بائی جی بار بار کہہ رہی تھیں۔

بے کسی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے دلی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

اور میں ان سے پوچھنے کی خواہش کے باوجود پوچھ نہیں سکتا تھا۔ پھر انہوں نے ساز کو پرے لڑھکا کر آہستہ سے کہا' جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہوں۔ ''ہیرا بائی تمہاری راہیں مسدود ہیں۔ ہیرا بائی بے کار کی تمنائیں کب تک؟'' اور اس کے بعد جیسے انہیں کسی دوسرے کے وجود کا احساس ہوا۔ بولیں۔ ''اس طرح ذرا ذرا سی بات پر اپنے آپ کو بھلا دینا اچھا نہیں ہے نا۔''

میں نے کہا: ''ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ہر انسان کا ماضی ہوتا ہے جو کبھی کبھار اسے شدت سے یاد آ کر حال کو بھلا دیتا ہے۔''

بائی جی بولیں: ''مصیبت تو یہی ہے کہ یہ میرا ماضی نہیں ہے اور مجھے کبھی کبھار شدت سے یاد نہیں آتا۔ یہ تو ہمیشہ میرے دل کے ساتھ سانس کی طرح رہتا ہے۔ یہ احساس کہ شدت بھی مکمل نہیں۔ یہ احساس کہ تم اپنے آپ کو ٹھیک سے تباہ بھی نہ کر پائے اور سب سے زیادہ اس بات سے آگاہی کہ اگر تم اپنے آپ کو طوفانوں کے سپرد کرو گے بھی تو طوفان تمہیں قبول نہیں کریں گے۔ ایک دوزخ ہے جو تمہارے دامنوں کو نہیں جلائے گی اور یہ کہ تم راندۂ درگاہ ہو۔ تمہیں خدا کی اس زمین پر کوئی شے بھی قبول نہیں کر سکتی۔ تم اس اکیلے پن میں جل بھی نہیں پاتے۔''

ڈون وارٹن' آواز سن کر واپس کمرے میں آ گیا تھا۔ بولا: ''تم نے یہ باتیں مجھے تو کبھی نہیں بتائیں۔''

اور بائی جی نے تلخی سے کہا: ''یہ باتیں غیر ملکیوں کے سننے اور سمجھنے کی نہیں ہیں، تم سے میں کیا کہوں' کیا سمجھاؤں؟''

ڈون وارٹن نے ماتم کرنے والے آدمی کی طرح کہا: ''تمہارے دروازے کے مدتوں پھیرے کرنے کے باوجود ہم غیر ملکی ہی رہے۔ کیا میں انسان نہیں ہوں کہ انسانیت کی زبان سمجھ سکوں۔''

اور بائی جی بولیں: ''بیٹھ جاؤ۔ کھڑے کیوں ہو۔ انسانیت کی زبان بھی الگ الگ ہے جس نے کبھی بے کسی کا مشاہدہ نہ کیا ہو۔ وہ کیا جانے گا' بے کسی کیا ہے۔ رقص و سرود کی طرح ہر ملک کے دل کی زبان بھی خاص ہے۔''

ڈون وارٹن چپ ہو گیا' جیسے وہ ان کی بات سے متفق ہو مگر زبان سے کہنا نہ چاہتا ہو' جیسے کچھ کہہ نہ سکے۔

بائی جی بولیں۔ ''یہ گھر میرا اپنا نہیں' یہ گھر ماں کا تھا اور ماں کا ہی رہے گا۔ اس میں جو کچھ ہے' وہ بھی ماں کا ہے۔ میرا اپنا وجود بھی۔ میں نے اپنی ماں جیسی شفیق ہستی کبھی نہیں دیکھی۔ کم از کم میرے لیے تو ماں ہی سب کچھ تھی۔ پر یہ مت سمجھنا کہ وہ بھی میری طرح سرِ راہ بیٹھ کر اپنے فن کی نمائش کرتی تھی۔ میں نے کبھی اس سے پوچھنے کی کوشش نہیں کی کہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ ہمارا کون ہے کیونکہ مجھے معلوم ہے ہمارا کوئی نہ تھا۔ اس گھر میں لمبی جٹاؤں والے بھکشو آتے رہے ہیں اور چوڑیاں بیچنے والے اور کبھی کوئی نہیں آیا۔ ماں کو چوڑیاں پہننے کا نہیں چوڑیاں جمع کرنے کا شوق تھا' جانے کیوں؟'' وہ خاموش ہو گئیں جیسے باتیں یاد کر رہی ہوں۔

''میں نے اکثر ماں سے پوچھا' ماں یہ تم چوڑیاں خرید کر رکھ لیتی ہو' کبھی یہ پہنتی کیوں نہیں؟''

اور ماں نے مجھے ہمیشہ کہا تھا: ''ہیرا میں اس دن چوڑیاں پہنوں گی جس دن کوئی سہاگ کی چوڑیاں بیچنے والا اصلی چوڑیاں لائے گا۔''

اور میں پوچھتی: ''کیوں ماں کیا یہ اصل چوڑیاں نہیں ہیں۔ سہاگ کی چوڑیاں کیسی ہوتی ہیں ماں؟'' ماں خوابوں میں کھوسی جاتی۔ میں اپنا سوال دہراتی۔ اس کا دامن پکڑ کر اس سے پوچھتی تو وہ کہتی۔ ''دیکھو ہیرا سہاگ کی چوڑیوں کا رنگ بہت سرخ ہوتا ہے چمکیلا۔''

میں کہتی: ''ماں تمہارے پاس تو سرخ چوڑیاں بھی ہیں۔''

وہ بہت نراش سی ہو کر کہتی ''نہیں ہیرا وہ سرخ رنگ بڑا ہی سُندر ہوتا ہے۔ بیٹی اتنا سُندر کہ کہیں کہ اس کی چھب سے سارا جگ روشن ہو جائے۔'' پر شاید ماں کو ویسی چوڑیاں کبھی نہ ملیں کیونکہ ماں نے ڈھیروں چوڑیاں جمع کر لیں۔ جب بھی کوئی چوڑی والا آتا' وہ بے چین ہو جاتی۔ اپنی کتابوں کے ڈھیروں سے سر اٹھا کر باہر آ جاتی اور ایک بچے کی سی محویت ایک پجاری کی سی عقیدت اور ایک بھگت کی سی تمنا سے چوڑیاں خریدتی۔ جب میں بڑی ہوئی ہوں تو چند دنوں مجھے یہ شوق رہا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ اپنے خول میں واپس چلی گئی۔ میں نے سنگیت ماں سے سیکھا ہے۔ میں نے اپنے گیت ماں سے ورثے میں پائے ہیں۔ میرا ماضی کوئی نہیں' میرا مستقبل کوئی نہیں۔ میرا اپنا کوئی نہیں' صرف یہ گیت ہیں۔ یہ ناچ ہے' یہ صورت ہے۔ یہ وجود ہے اور اندھیرا ہے۔ تمنا کا اندھیرا جو میں نے ماں سے ورثے میں لیا ہے۔ یہی گھر ہے اور کتابوں کے ڈھیر ہیں جو مجھے ملے ہیں۔

ایک بار ایک بھگت ایک پجاری ماں سے ملنے آیا۔ یہ کہنے کہ تم بھگوان کرشن کے گھر ناچ کیوں نہیں کرتیں۔

مجھے معلوم ہے' مجھے یاد ہے' ماں نے بہت ہی کانپ کر کہا تھا'' ''بھگوان کرشن کا گھر بہت اونچا ہے۔ مجھے وہاں جانے کی ہمت نہیں۔'' ماں نے بدھ بھگوان کی شرن ڈھونڈی ہو گی' کیونکہ ان کتابوں کے ڈھیروں سے تو یہی لگتا تھا۔ ماں نے مُکتی تلاش کرنے کی بہت کوشش کی ہے۔

پھر ایک دن بھکشو ایک نوجوان کو لایا۔ وہ نوجوان بہت زرد رو اور کمزور تھا۔ جھکی ہوئی کمر' اندر دھنسی آنکھیں' منڈا ہوا سر۔ اس نے کہا ''یہ بھی کچھ سیکھنا چاہتا ہے۔''

اس نوجوان کی آنکھوں میں کچھ تھا۔ ایک بے چینی اس کی زردی میں' ایک بے بسی اور جھکی ہوئی کمر میں ایک خم۔ میں سوچتی تھی وہ مُکتی پا چکا ہے' اب کیوں آتا ہے۔ وہ ماں کی کتابوں کے ڈھیر کے دوسری طرف بیٹھا سارا وقت کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا۔ سر جھکائے روح تک کو جھکائے جب میں ماں سے ناچ سیکھتی وہ تب بھی شاید اسی طرح بیٹھا رہتا ہوگا اور آہستہ آہستہ اس کی زردی' اس کا جھکاؤ مجھے اچھا لگنے لگا۔ میں کبھی کبھی اس سے بات کرنے کی بھی کوشش کرتی مگر اس نے تو جیسے قسم اٹھا رکھی تھی۔ ہاں یا نہ کے سوا اس نے کبھی میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ماں کو پھولوں کا بہت شوق تھا۔ ان دنوں یہ اتنا پر رونق تھا۔ ہمارے گھر کے گرد باڑ اونچی تھی۔ درختوں پر ہریالی تھی۔ وہ صبح سے شام تک پڑھتا اور اندھیرا ہوتے ہی واپس چلا جاتا۔ مجھے نہیں پتہ اگر کبھی اس نے ماں سے بات کی ہوگی' کیونکہ کبھی اس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔

پھر ایک رات آئی۔ ملک میں سب طرف بہت شور تھا لوگ دھڑا دھڑ آ رہے تھے۔ جیلوں میں بھرے جا رہے تھے۔ جلوسوں میں گولی کا شکار ہوتے تھے مگر وہ نوجوان اسی طرح آتا اور شام پڑے واپس چلا جاتا۔ ان دنوں اس سامنے کی سڑک پر سے غیر ملکیوں کی گاڑیاں سارا دن گزرتیں۔ ہمارے اوپر طرح طرح کی آوازیں آتیں اور سڑک پر موٹروں کی ہجوم کی۔ ماں کتابوں میں سر دیئے بیٹھی رہتی۔ بس کبھی کبھار سر اٹھا کر کہتی: ''ہیرا دنوں گزر گئے' کوئی چوڑی والا نہیں آیا۔''

مگر ایک دن صبح جب وہ آیا ہے تو اس نے بڑی تیز اور صاف آواز میں کہا: ''میں یہ چوڑیاں لایا ہوں۔''

ماں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا: ''میرے بیٹے! پر یہ چوڑیاں میرے کام کی نہیں ہیں۔'' ''ان میں سہاگ کی چوڑیاں نہیں ہیں۔ اس دن اس نے نہیں پڑھا' وہ بیٹھا رہا۔ یونہی خلا میں دیکھتا رہا۔ ماں نے اپنی کتابوں سے سر اٹھا کر کئی بار اسے دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ جب مجھے رقص سکھانے کا وقت آیا تو ماں کے ساتھ وہ بھی اٹھ کر اسی کمرے میں آ گیا۔ ہم دونوں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگیں مگر ہم نے اسے کچھ نہیں کہا۔ میں نے کبھی کسی کے سامنے رقص نہیں کیا تھا' پر مجھے اس سے ذرا بھی لاج نہیں آ رہی تھی۔ جب میں تھک گئی تو کہنے لگا: ''یہ زندگی ہے باہر دنیا مر رہی ہے' آج لاشوں کے ڈھیروں سے گزر کر آیا ہوں۔''

ماں کچھ نہ بولی۔

وہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگا: ''تم یہ سب سیکھ کر کیا کرو گی؟'' میں اس سے بات کرتے، اپنے دل کو اُچھلتے ہوئے پا رہی تھی۔

میں نے کہا: ''تم کتابیں پڑھ کر کیا کرو گے۔ تم لاشوں کے ڈھیروں میں سے کیوں گزرے ہو؟''

اس نے کہا: ''کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں یہ کتابیں کس کام کی ہیں، باہر کی دنیا میں میری ضرورت ہے۔''

اور پھر ماں کی طرف دیکھ کر بولا: ''میں تمہارے ساتھ سہاگ کی چوڑیاں خریدنے جا رہا ہوں۔''

ماں پھر بھی کچھ نہ بولی۔

وہ کہنے لگا: ''تم عورت ہو اور عورت رقص ہی نہیں کر سکتی باہر اتنی دنیا تباہ ہو رہی ہے، غیر ملکی ہمارے گھر کو آگ لگا رہے ہیں، تم بندرابن کے گیت گاتی رہتی ہو۔''

میں نے کہا: ''تم کیا کرتے ہو، ہم سب اپنے وجود کے لیے جی رہے ہیں۔ تمہیں کوئی آگ نہیں چھو سکتی کیا؟ تم ہی کچھ کرو۔''

اور وہ چلا گیا۔ کاش میں نے اسے وہ سب باتیں نہ کہی ہوتیں۔ ان دنوں تو مجھے اپنے دل کا بھی حال معلوم نہ تھا۔ وہ چلا گیا اور دوسرے دن وہی بھکشو آیا۔ اس نے کہا، رات جلوس کے آگے جھنڈا لہراتے ہوئے ستیا کام مارا گیا ہے۔ اس کی لکھی ہوئی یادداشتیں وہ لے گیا اور اس کے بعد میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔

وہ بغاوت کی آگ جو ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی تھی، غیر ملکیوں کی گولیوں سے ٹھنڈی کی گئی۔ سارا ملک سونے لگا یا زبردستی سلا دیا گیا۔ مجھے یاد ہے ان دنوں ماں نے کبھی سہاگ کی چوڑیوں کا نام نہیں لیا۔ میں نے کئی بار پوچھا بھی سہی، اس نے صرف یہ کہا تھا، تم کو میں اپنا ناچ اپنا گیت اور اپنے دل کی سب سے بڑی تمنا دے رہی ہوں۔ سہاگ کی چوڑیوں کے ٹوٹے ٹکڑے بھی کافی ہوتے ہیں، کبھی ان سے اچھی کام کی چوڑی بھی نکل ہی آئے گی۔

پھر ماں مر گئی اور اس اکیلے گھر میں، میں نے صرف ستیا کام کے خوابوں میں دن گزارے ہیں۔ اس نے کبھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی مجھے وہ یاد ہے اور ایک رات میں

نے اسے خواب میں دیکھا۔ وہ اتنے اندھیرے میں ہے اور کہہ رہا تھا' ہیرا روشنی جلاؤ۔
میں نے شمع اٹھائی تو وہ بجھ گئی تو وہ پانی میں ڈالنے والی دیا سلائی کی طرح ختم ہوگئی اور ستیا کام کی ہنسی کی آواز مجھے سنائی دی۔ اندھیرے میں اس نے کہا: ''میرا ناچتی رہو' گاتی رہو' ساز بجاتی رہو' پر یاد رکھو سہاگ کی چوڑیاں نہ بھولنا۔'' اب میں ناچتی ہوں' گاتی ہوں' پر سہاگ کی چوڑیاں مجھے کہاں سے ملیں گی' اس کا کیا معلوم' کون میرے لیے چوڑیاں لائے گا' نہ جانے کون؟

ڈون وارٹن بولا: ''تم اتنی سی بات پر بے حس ہو۔ میں لاؤں گا۔''
ہیرا نے سر ہلا کر کہا۔ ''یہی مصیبت ہے تم جو تیار ہو۔ تم میرے لیے وہ چوڑیاں نہیں لا سکتے۔ چوڑیاں کوئی اپنا ہی لائے گا۔ جو اپنا ہونے پر بھی اپنا نہیں ہوگا اور میں نقاب چہرے پر ڈالے راہ گزاروں کی طرف دیکھتی ہوں۔ زندگی کہاں ہے' راگ کہاں ہیں' میرے گرد اتنی سوئی ہوئی دنیا ہے' میرے گھر کے سامنے سے کوئی نہیں گزرے گا۔ کیا ایک کمزور عورت کی طرح میں کسی شے کی تمنا نہیں کر سکتی۔ پر لیے ہوئے سہاگ کی واپسی پر پرارتھنا ہی کر سکتی ہوں اور اب دیکھا تم نے میں تباہ بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ میں اپنے وعدے سے بندھی' آنے والے زمانے میں اپنی قسمت کا لکھا ڈھونڈنے کے لیے زندہ ہوں۔''
اس کے چہرے پر اتنا کرب تھا' اتنا دکھ تھا' میں سوچ رہا تھا اس عورت کی تمنا کتنی عظیم ہے۔ جانے کیا ہونے والا ہے۔ خدا تو ذرّوں کی خواہشوں کا احترام کرتا ہے اور خیال رکھتا ہے۔ ہم کوئی کام نہیں کرتے پر اس ہیرا بائی کے اس ناچنے گانے والی عورت کے لیے سہاگ کی چوڑیاں کوئی تو لائے گا' کبھی تو ٹوٹی چوڑیوں کے ٹکڑے پھر زمین پر پھیلیں گے' ہیرا بائی کی ماں ایک تمنا کے لیے مر گئی اور اب یہ ہیرا جو ماضی کی اس تمنا کے لیے جی رہی ہے۔
اور آج اس اندھیرے میں کھڑا اکیلا میں ہواؤں سے پوچھتا ہوں ہیرا بائی کہاں ہے۔ اس سے کہو رنگ اتنا گہرا اور چمکیلا نہیں ہے پر بہت سے لوگوں نے مل کر سہاگ کی چوڑیاں بنائی ہیں' کیا انہیں پہنو گی؟ مگر ہیرا بائی کہاں ہے؟ ہیرا بائی تم تو خود ہی سہاگ کی چوڑی بن گئی ہو۔ پر کون سہاگن تمہیں پہننے کی ہمت کر سکتی ہے؟
واپس آتے ہوئے بھی بارش تیزی سے پڑ رہی تھی۔ موٹر سڑکوں پر دھول کی بجائے چھینٹے اڑاتی پانی کے ریلے کو تیزی سے آواز سے کاٹتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا تھا ''ڈون وارٹن

اندھیرا گہرا ہو گیا ہے۔ بارش کی بوندوں کی روشنی بھی مدھم ہو گئی ہے۔ میں واپس جاتا ہوں" مگر اس نے کہا تھا: "او بوائے چلے آؤ میں آج بہت اداس ہو گیا ہوں۔ تم اتنے مہینوں کے بعد ملے ہو کیا تم میرے کمرے میں تھوڑی دیر بیٹھو گے نہیں۔" اور میں اس کے کمرے میں چلا گیا۔

وہ دیر تک دروازے میں کھڑا بالکنی سے اندر آتی بارش سے پرے دیکھنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر بولا۔ "تمہارے ہاں بلندیاں بھی کئی ہیں، تمہارے سروں سے بلند پہاڑوں کے سلسلے ہیں اور ان کی چوٹیاں خاموش گمبھیر چپ چاپ پرانے زمانوں کے خواب دیکھتی ہیں۔ تمہارا آسمان اتنا نیلا ہے اور خواب دیکھتا ہے۔ تمہارے ہاں کی سینور یتائیں بھی خواب دیکھتی ہیں۔ او بوائے تمہارے گرد کتنے خواب ہیں، ان خوابوں کا کیا کرو گے؟"

اور میں نے پاگل کی طرح جواب دیا تھا۔ "میں کیا کروں گا۔ خواب اپنی راہیں خود ہی بنا لیں گے۔"

ڈون وارٹن نے کہا تھا: "نیلے آسمان اور سوئی ہوئی زمین سے اوپر خلا میں خواب راہوں کی تلاش میں نہیں ہیں، پر تم جاگتے کیوں نہیں ہو؟"

میں نے کہا تھا: "خوش آئندہ خوابوں سے کون جاگے۔ زندگی کی گھن گرج میں سختی ہے۔"

ڈون وارٹن نے کہا: "صرف تمہاری عورتیں بے چین ماؤں کی طرح جاگ رہی ہیں۔ بے خواب آنکھوں سے خواب دیکھتی ہیں۔ محبت کا دفینہ سینے میں لیے۔ بتاؤ کیا میں نے جھوٹ کہا تھا، تمہارے ہاں تو جمنا کے کنارے تاج ہی تاج ہیں۔"

پھر کہنے لگا میں سوچ رہا تھا کہ بدھ مت میں کیا رکھا ہے کتابوں میں کیا رکھا ہے۔ میں واپس چلا جاؤں گا مگر نہیں اب میں یہاں رہ کر تاج کے خوابوں کا سلسلہ ٹوٹنے کا نظارہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہاں رہوں گا تمہاری فضا میں اتنی بے چینی ہے، کیا تم اسے محسوس نہیں کرتے؟ بارش تھم گئی تھی اور بالکنی پر جھکے ڈون وارٹن کے سر پر قطرے ابھی تک ٹپک رہے تھے۔

میں نے کہا تھا: "اگر یہ طوفان سے پہلے کا سناٹا ہوتا تو بات بھی تھی، اب یہ بے چینی گزرنے والے بادلوں کی طرح نکل جائے گی۔"

اور ڈون وارٹن نے کہا تھا: "میں اس معبودِ حقیقی کی قسم کھا کر کہتا ہوں، میرا دل گواہی دیتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔"

میں نے ہتھیار ڈالنے والے کی طرح کہا تھا۔ "اگر قسمت کی کتابوں میں یہ لکھا گیا ہے

تو ہم آدھی راہ جا کر اس سے ملیں گے، تم مطمئن رہو۔"

ڈون وارٹن نے اس شام کہا تھا: "چاہے تم میرے منہ پر تھپڑ مارو، چپ بیٹھے رہو، میں اس ذکر سے رکوں گا نہیں، حیرت انگیز طور پر یہ دونوں عورتیں ہیرا اور کنول جا رہی ہیں۔ اپنے نام کی طرح ایک سختی ہے اور صرف زمین کے سینے میں دفن ہے۔ ڈھیروں کے نیچے پوشیدہ تاریکیوں میں دوسری کنول کے پھول کی طرح تاریک پانیوں کے سینے پر ڈولتی ہے۔ پھر یہ پھول مرجھانے والا نہیں ہے اور وہ ہیرا بھی سچا ہے۔ میں دونوں کی سچائی کا قائل ہوں۔ کیا ہی اچھا ہو یہ دونوں قریب قریب ہو سکیں؟"

اور میں نے ایک سچ کہنے والے کی طرح کہہ دیا تھا: "نہیں یہ ناممکن ہے۔ پستیوں اور بلندیوں کا ملاپ ناممکن ہے۔ زمین کی سطح کے نیچے اندھیرا ہے۔ ہیرے کی سختی پھولوں کی نرمی سے مس نہیں ہو سکتی۔"

ڈون وارٹن نے کہا: "میں اس برستی بارش کی قسم کھا کر کہتا ہوں پتھر پھول کی طرف آئے گا۔"

میں نے کہا: "دیکھا جائے گا۔" ہم دونوں دیر تک کچھ نہ بولے تھے اور مجھے شوبھا یاد آ رہی تھی۔ صرف شوبھا جس نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا۔

"بھیا۔ بہاریں لاکھ بیت چکی ہیں اور میں اپنا راستہ کھو کر آگ کے سمندروں پر سفر کر رہی ہوں۔ پر آگ کے سمندر پر بہنے کے لیے کسی خاص راستے کی ضرورت نہیں ہے اور کبھی کبھار تو شعلے اتنا بلند اٹھا دیتے ہیں کہ جھوٹی تعریف نام نمود اور شہرت سب کو اس میں بھسم ہوتے دیکھا جا سکتا ہے۔ صرف یہ آگ میرے اندر کے جھوٹ کو جلا نہیں پائی۔ ابھی تک نہیں اور جب تک یہ جھوٹ جل نہ پائے گا میں کنول سے ملنے نہیں آؤں گی۔ وہ جس مندر کے سامنے کھڑی میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں ابھی اس مندر میں جانے کے قابل نہیں ہوئی ہوں۔ ذرا تو سوچو میں یعنی شوبھا بینرجی بھلا کنول ٹھاکر سے آنکھ ملانے کی ہمت کر سکتی ہوں؟ تم کو بتانے سے حاصل۔ تم تو خود سب جانتے ہو۔ مجھ میں اتنا سا ست بھی نہیں چھپا۔ میں اپنی پچھلی خامیوں اور لغزشوں پر شرمندہ ہو سکوں اور اب تو اس وقت کا انتظار کر رہی ہوں جب مجھ میں کہیں دور اندھیروں میں کھویا انسانیت کا ایک چھوٹا سا ذرہ کنول کی روشنیوں سے چمک کر آفتاب بن جائے گا اور وہ شمع جو

میرے ہاتھ میں ہے وہ اپنے سائے سے طویل سڑک کو دشمن اندھیرے میں بدل رہی ہے۔ راہ کے کنارے ہر شے مجھے اپنی دشمن لگتی ہے۔ میرے اپنے قدموں کی صدائے بازگشت گھات میں بیٹھے کسی دوسرے وجود کی طرح لگتی ہے۔ ایسے میں' میں پرارتھنا کرسکتی ہوں کہ مجھے وہ روشنی مل جائے' جس میں دور اور نزدیک ایک دوسرے سے بغل گیر ہوسکیں۔ روشنی کا رشتہ لمبا اور سچا ہے۔ صرف اس کے ذریعے ہی میں کنول کماری ٹھاکر سے مل سکتی ہوں۔"

شوبھا بینر جی جو اپنے پتی کے ساتھ یورپ کے دورے سے واپس آ کر آزادی کے غلغلہ اور دھوم میں کھوسی گئی تھی۔ اس نے ہم سب کو یاد رکھا تھا۔ کرشنا کے بیٹے نند لال کو لانے میں وہ کامیاب نہ ہوسکی تھی۔ صرف کشتی کو دیکھنے اور اس موہوم دھبے کو دیکھتے رہنے میں جو دور سے کشتی کی طرح دکھائی دیتا تھا' میں ان دنوں کنول کماری سے ملنے اکثر جاتا تھا۔ کرشنا کی بے چینیاں بڑھ گئی تھیں کیونکہ مس رام کا اچانک دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا تھا۔

جس دن صبح مس رام مری ہیں' اس دن صبح ہی انہوں نے کرشنا کو پیغام بھیجا تھا کہ تم مجھ سے آ کر ملو۔ مجھے تم سے ضروری باتیں کرنا ہیں۔ کرشنا نے سوچا' دن ذرا اور بڑھ لے اور پھر اسکول کے وقت کے بعد ہی تو ملیں گی مس رام۔ اس کے علاوہ ان دنوں وہ گاؤں گاؤں پھر کر تعلیم کا چرچا کر رہی تھی۔ عورتوں کو گھر کے رکھ رکھاؤ کے طریقے بتاتی پھرتی اور پھر خود ہی ہنستی' میں جب کبھی جاتا مجھ سے کہتی۔

"دیکھو بھیا۔ بھلا سکھانے سے گھر کے رکھ رکھاؤ کا طریقہ آتا ہے۔ اسی کو دیکھو کنولا رانی نے مجھے کیسے کاموں میں لگا دیا ہے۔ زندگی اتنی پرانی ہے اور آسان ہے کہ ہماری تہذیب کے پیمانوں میں یہ کبھی بھی سما نہیں سکتی۔ سانچوں میں ڈھل کر اس کی صورت بگڑ جاتی ہے اور کنول کماری ٹھاکر ایک خواب دیکھنے والے دل کی طرح سوچتی ہے۔ وہ سنوارنے اور زندگی کو پھولوں کی کیاریوں کی طرح ٹھیک کرنے کا کام کر کے پرماتما پر احسان کر رہی ہے۔"

کنول کہتی: "کرشنا تم نے ماں بننے کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے پر نکتہ چینی شروع کر دی ہے اور قطار در قطار پھول ہی خوبصورت لگتے ہیں۔"

کرشنا کہتی "ٹھیک ہے۔ مانتی ہوں مگر جنگل کا خاموش گمبھیر اپنا حسن ہے' تمہاری پھولوں کی کیاریوں کا منہ چڑاتا۔"

اور کنول کہتی: "پھر کیوں دکھ جھیلتی ہو۔ میں تمہیں پریشان نہیں کرتی۔ گھر بیٹھا کرو۔"

کرشنا ہنس کر کہتی: ''کنولا رانی میں بہت خود غرض ہوں سمجھیں۔ میں کام بھی اپنے سے بچنے کے لیے کرتی ہوں۔ جب کبھی فارغ بیٹھ کر سوچتی ہوں، ماضی کا دوزخ منہ کھول کر مجھے نگلنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ پھر میں تمہارے دیہات سدھار اور کھدر کے پرچار میں لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں جُٹ جاتی ہوں...... یہ جانتے ہوئے بھی کہ تہذیب کھوکھلے پن کو فروغ دینے کا دوسرا نام ہے۔''

اور کنول کہتی: ''نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہارے پرانے نظریے کیا ہوئے۔''

کرشنا کہتی: ''جس زندگی میں کوئی ٹھوس حقیقت نہ ہو وہی نظریوں کا سہارا لیتی ہے کنولا رانی۔''

کنول کہتی: ''بس تم اندھیروں میں گھٹتی ہو۔ تمہارے لیے تو ٹھوس حقیقت نندلال ہے اور کچھ نہیں۔''

کرشنا جواب دیتی: ''نہیں، کنول تم تو تلخ ہو جاتی ہو۔ بھائی ہر کام میں نندلال کو گھسیٹ لاتی ہو۔ تمہارا طعنہ نند بن گیا ہے اور میں اپنے کو یشودھا محسوس کرنے لگی ہوں۔ نند ہی میرا سب کچھ ہے۔ تمہیں بھی معلوم ہے، میری ساری دنیا سمٹ کر اس میں آ گئی ہے اور اس کے باوجود میں تمہاری دنیا کی حقیقت سے منکر نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم اپنے خوابوں میں لپٹی رنگ برنگ دنیا کے سنہرے روپ سے مدہوش ہو۔

''جتنی ان رنگوں کی اور مدہوشی کی۔ تمہارے لیے تمہارے وجود کے باہر اور کوئی شے زندہ نہیں......اور جب انسان اوپری دل سے پرچار کرلے، کام کرلے تو اس میں کامیابی کہاں؟''

کنولا رانی تم تو میرے کاموں پر میرے کیے پر پانی پھیر دیتی ہو۔ بھائی اور میں کتنا جان جگر کھپاتی ہوں کہ میرے خون سے تمہاری دنیا میں تمہاری ترتیب دی ہوئی دنیا میں تھوڑی سرخی آسکے۔ ویسے تو میں تمہیں بتاؤں اصل میں میرا دل مر چکا ہے۔ میرے دل میں کوئی تمنا نہیں ہے۔ میرے دل میں کام کرنے کی بھی تمنا نہیں ہے۔ جینے کی بھی اور پھر بھی میں کسی نہ کسی طرح جئے جاتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے جب میں نند سے ملوں گی، اس کے بعد بھی یہ نفرت برابر زندہ رہے گی۔ میں صرف اس لیے زندہ ہوں کہ یہ نفرت میرے وجود میں کہیں موجود ہے۔ میں کسی چیز میں بھی یقین نہیں رکھتی۔ ہمارے پاس یقین کرنے کے لیے کیا ہے۔ پرماتما، پرماتما بھی تو ایک اندھیرا ہے۔ اور اندھیرا دوسروں کو کیا دے سکتا ہے۔ سوچو تو سہی میں یعنی کرشنا بوس کبھی پرچار کرتی اور اس

پر یقین بھی رکھتی تھی۔ پر کنول کماری ٹھاکر اب میری ہمت جواب دے گئی ہے۔ کنول کماری ٹھاکر میں کہاں جاسکتی ہوں؟ کنول خاموش بیٹھی رہتی۔ وہ سوچتی تھی، کون سی ایسی راہ ہے جس سے کرشنا بوس اس پڑھی لکھی زندگی سے مطمئن، کرشنا بوس کو واپس لایا جاسکتا ہے۔ وہ کسی اور زمانے کے خواب دیکھنے والی کرشنا کو کہاں سے لائے۔

اور ایک بار ایسے ہی باتیں کرتے کرشنا نے کہا تھا: ''کنولا رانی تمہاری تہذیب کے یہ سارے جادو مجھ پر اثر نہیں کر سکتے۔ ہمارے مشرق کے سوئے ہوئے آسمان کے نیچے برگد کے پیڑوں سے سارا حسن کام دیوتا کے بازوؤں سے ساری طاقت چھین کر تمہارے شہروں میں کوئی اچھی شے پروان نہیں چڑھی۔ جھوٹ مکر وفریب اور دوسرے کو دکھ دینا، یہی سیکھا ہے نا تم نے اور پھر یہ سارا الزام تم لوگ مغرب کے سر دیتے ہو۔ میرا مطلب ہے تم نہیں دیتی ہو تو کیا ہوا اور لوگ تو دیتے ہیں۔ اس کے باوجود معلوم نہیں قصور کس کا ہے اور غلطی کہاں ہے۔ ہم سب اپنے سے اتنے غیر مطمئن کب سے اور کیوں ہوگئے ہیں۔ یہ روز روز کے جلوسوں جلسوں سے جو نیا ہندوستان پیدا ہو رہا ہے، وہ اپنی حفاظت خود بھی کر سکے گا کہ نہیں؟''

کنول نے کہا تھا: ''تخلیق اپنی حفاظت خود کر لیتی ہے اور جو نیا وجود فروغ پا رہا ہے جو ہماری باتوں، ہمارے کاموں اور ہمارے نعروں میں ڈھل رہا ہے وہ بھی کائنات کی باقی تخلیق کی طرح زندگی کے لیے میرا تمہارا محتاج نہیں ہوگا۔''

''ارے بھئی کب کہتی ہوں کہ وہ تمہارا محتاج ہو پر میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں وہ ہماری حفاظت کر سکے گا؟''

اور کنول کہتی: ''جس دنیا میں یقین نہیں رکھتی ہو اس میں پر امن طریقے سے رہنے کے خواب کیوں؟''

''جینا جو ٹھہرا کسی آستان پر تو سجدہ ریزی کرنا ہی ہوگی۔ امن واماں کا خواب میرے لیے ختم ہو چکا ہے۔ جب دل میں امن نہیں نفرت ہے تو میں خواب کیوں لوں اور پھر بھی میں ہر عورت کی طرح سلامتی کی خواہاں ہوں۔ تم نہیں جانتی ہو مجھ میں کتنے سیاہ نقطے ہیں۔ بھئی اور ان سیاہ نقطوں کو کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ میں بھی نہیں۔''

کنول پھر سوچنے لگتی۔ یہ نہیں کہ کنول کی اپنی راہیں یقینی نہ تھیں مگر اس ہر گھڑی کی بے یقینی سے، وہ عاجز آ چلی تھی۔ کرشنا ہنستی بھی تھی۔ وہ روتی بھی تھی۔ وہ کام بھی کرتی تھی۔ وہ زندہ بھی تھی

اوراس کے باوجود وہ ان سیاہ نقطوں کا ذکر کرتی جو عورت کے وجود میں کہیں نہیں جو اندھیرے میں کبھی نرمی کی طرح مضطرب ہو جاتے ہیں۔

ایک بار کرشنا نے کہا تھا: ''محبت بھی ایک بلندی ہے۔ محبت بھی ایک پستی ہے اور جو پستیوں سے میری طرح آشنا نہیں ہوا جو بلندیوں کو میری طرح چھو نہ سکا اسے کیا معلوم جینا کیا ہے۔''

اس دن میں نے کنول کو ایک ندی کی طرح گھل کر بات کرتے سنا تھا۔ اس نے کہا تھا: ''کرشنا میں اس کا جواب نہیں دے سکتی۔''

اور آج میں اپنے سے پوچھتا ہوں کیا محبت بلندی ہے؟ کیا وہ پستی ہے؟ کیا وہ ایک راستہ ہے؟ دوسرے کا درد جاننے کے لیے کیا درد بننا ضروری ہے؟

کرشنا نے کہا تھا' محبت بہت پرانی ہے' کائنات سے بھی پرانی یہ تو پرماتما ہے۔ شکتی ہے اور اگر تم اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتیں تو تم کچھ بھی نہیں سمجھا سکتیں۔ کنولا رانی سمجھیں میں نفرت بھی کرتی ہوں تو اسی محبت کے سہارے جو زندہ ہے اور باقی چیزوں کی نُمو اور حرارت ہے۔ پہلے اس کے متعلق کچھ سیکھو نہیں' اور پھر تمہاری اس دنیا نے جو دوسروں سے محبت چھیننے کا طریقہ اختیار کر رکھا ہے' اس کو بھی غور سے دیکھو۔ ارے میں کس کس شے کا پرچار کروں کنولا۔''

کنول نے ہنس کر کہا تھا: ''تم جو باتیں کہتی ہو خود ان پر عمل نہیں کرتیں اور کون محبت چھینتا ہے' کس سے کیوں کر؟''

بہت دنوں پہلے کی بات ہے کرشنا نے بتایا تھا' میں اپنے بابا کے ساتھ انڈمان گئی تھی اور وہاں سے نزدیک ہی نکوبار ہے' چھوٹے چھوٹے جزیرے ایک موتیوں کی بکھری لڑی کی طرح۔ اردگرد نیلا سمندر سویا ہوا ہے اور نیچے ناریل کے درخت آسمان کے سینے میں پیوست خوابوں میں کھوئے ہوئے' وہاں کے لوگوں کے پاس تمہارے مہذب لوگوں کی بولی نہیں' لباس نہیں اور عیش کے لوازم نہیں' پر وہ ایماندار ہیں۔ ایک دوسرے کا اپمان نہیں کرتے۔ ایک دوسرے سے انہیں گلہ نہیں ہوتا۔ کوئی کسی کی چیز نہیں چراتا۔ کوئی جھوٹ نہیں بولتا۔ سادے اور سچے لوگ ہیں اور پھر جب تہذیب کا ہاتھ ان پر سچ کی روشنی کی طرح چھا جائے گا تو لوگ عبادت گاہوں میں جانے لگیں گے۔ ایک دوسرے سے دغا کریں گے' چوری کریں گے' لباس پہنیں گے' کام اور عیش کے فرق سے واقف ہو جائیں گے' اب وہ مجسم محبت ہیں' پھر انہیں نفرت کا' لاتعلقی کا معلوم ہو جائے گا اور پھر وہی چکر جو ہمیں پیس رہا ہے' انہیں بھی پیس ڈالے گا۔

اور اس دن دیر تک اس کہانی کے سحر سے ہم سب یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ تہذیب ہمارے ساتھ جو زیادتی کرتی آئی ہے' کیا وہ ہماری دولت نہیں ہے۔ کیا ماضی ہمارے لیے ایک خواب ہے؟

پر زندگی آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ تہذیب کی دی ہوئی نفرت کے باوجود تہذیب کی گرائی ہوئی خاک کے باوجود کیا ہم شکست خوردہ ہیں؟

مگر کنول کو دیکھ کر ہم سب زندگی کے اقرار میں یقین کر لیتے ہیں۔ زندگی کی سچائی میں' موت اور اپنے مقصد کے لیے تگ و دو کرتے ہوئے ہم سوچتے رہے کہ آزادی کے لیے لڑنا چاہیے' وہ کسی قسم کی ہی آزادی کیوں نہ ہو۔ ایک قابلِ فخر شے ہے' کیونکہ کنول کے بغیر وہ سب چیزیں جنہیں اتم سچا اور بلند کہا جاتا ہے کہیں نہیں ہیں اور اس کے باوجود میں آج بھی محسوس کر رہا ہوں کہ اس کے بعد بھی یہ چیزیں زندہ رہیں گی کیونکہ یہ زندگی کے سچ ہیں۔ ان پر یقین نہ کرنا زندگی میں بے یقینی رکھنا ہے۔

اور اس کے باوجود وہ معمولی عورت تھی۔ اس کے گرد کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے عام سطح پر بلند کہا جا سکے۔ وہ نیرا' کرشنا کی طرح کی ہی ایک عورت تھی۔ میں نے اسے دیکھ کر اکثر سوچا تھا دنیا کی پہلی عورت نے جب پہلے مرد سے کہا ہوگا آؤ ہم زمین کو کاشت کریں اس میں بیج بوئیں' اور پھر وہ دونوں کھیتوں کی وسعتوں کو حدِ نظر تک پھیلے ہوئے آسمان کو کسی مقام پر چھوتی ہوئی زمین کو ہل چلا کر خون اور محبت سے کھودتے ہوئے بھی جب نظر اٹھا کر اوپر دیکھتے ہوں گے تو اس پہلی عورت کے چہرے پر بھی صحت مندی' حسن محبت سادگی اور خواب مل کر ایسا ہی ملکوتی سا کیف پیدا کر دیتے ہوں گے' پر میں کنول کماری کو حسین بھی نہیں کہہ سکتا۔ حسن بھی ایک غرور ہے۔ اپنے آپ سے طمانیت اپنے پر ان جاتے ہی ایک تاثر جو میں نے برسوں اس کی صحبت میں رہ کر بھی کہیں نہیں دیکھا۔ عورت قدرتاً تعریف پسند ہے۔ مردوں کے جمگھٹے اپنے گرد دیکھنے سے' چاہنے والوں سے' اس کی جس خود پسندی کی تسکین ہوتی ہے اور مجھے نہیں معلوم اگر کنول کبھی ان باتوں سے مطمئن ہوئی ہو۔ ہمارے ہاں گھروں میں جو بن بیاہی بیوہ عورتیں ہوتی ہیں' ان کا گھر ان کے دوسروں میں دیکھے خواب ہی' ان کا سب کچھ ہوتے ہیں اور شاید یہی ایک حمایت اس عورت کو تھی جس کو ہم کنول کہہ سکتے ہیں۔

انسان کبھی کبھار اپنی مصروفیت سے اکتا کر اپنے متعلق ضرور سوچتا ہے۔ کبھی کبھار تنہائی کو اپنے دل سے باہر نکل کر لہروں کی طرح پھیلتے دیکھتا ہے پھر کیا کنول کماری ٹھاکر نے ایسا سوچا ہے۔ کیا وہ اپنے گرد کی دنیا میں ہوا کی طرح آزاد ہے۔ سوچ کر کبھی پریشانی نہیں اُٹھائی۔ ایک الگ وجود ہونے کی حیثیت سے یہ باتیں میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں جو آپ کو کنول کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ انسان تو اپنے آپ کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ دوسروں کو کیسے سمجھ سکتا ہے اور کنول ٹھاکر تو اتنی معمولی عورت تھی اتنی آسان کہ اگر اس کی کوئی تفسیر کرنا چاہو تو ناممکن ہے۔ مگر جب میں بھی گھبرا گیا ہوں، دشمنوں کی مخالفت سے تنگ آ کر پریشان ہو کر میں نے اپنے کام کی مقبولیت پر غور کیا ہے، ہمیشہ کنول کی صورت نے اس کی ہمت نے مجھے تسلی دی۔ ان جانے ہی ان کا سایہ اندھیروں میں میرا رہنما رہا ہے۔ ہم سب تھک کر مضمحل ہو کر کبھی سوچتے ہیں آخر اس تگ و تاز میں کیا رکھا ہے؟ یہ سوال ہم سب بار ہا زندگی کی دشوار گزار راہوں پر اپنے سے کرتے ہیں، پر اس معمولی سادہ اور سچی عورت نے کبھی یہ سوال اپنے سے نہیں کیا ہوگا کہ اس کے دل میں ایسے سوال کبھی نہیں اٹھے ہوں گے اور اس کے باوجود میں نہیں جانتا اس کے تجربات زندگی کے متعلق کیا ہیں؟ مجھے جو کچھ پتہ چلا ہے وہ نیرا سے اور راجندر سے معلوم ہوا ہے پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح کنول کماری ٹھاکر کی کوئی آسان تفسیر کرنے کے لیے سخت ناکافی ہے۔ انسان اپنے کو سمجھنے سے عاجز ہے۔ وہ دوسروں کو کیا سمجھے گا اور پھر عورت۔

ہماری زندگی سے اگر عورت کی نرمی نکال دی جائے، اس کے چہرے کا حُسن نفی کر دیا جائے اور اس کی عطا کردہ ہمت اور محبت الگ کر دی جائے اگر اس کا عزم چھین لیا جائے تو باقی کیا رہ جائے گا۔

مجھے آج اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ گلی محلوں میں جھگڑا بھی ہو جاتا ہے اور پھر یہ گلی محلے اگر گاؤں کے ہوں اور معاملہ عزت کا ہو تو عورتوں کو دل بڑھانے کے لیے مرد کے پس منظر کام کرنا پڑتا ہے۔ میں ان دنوں ننھیال گیا ہوا تھا۔ گاؤں کی زندگی میں سب طرف سکون ہوتا ہے۔ درختوں کی چوٹیوں پر آسمان ہوتا ہے۔ اپنے خواب دیکھتا ہوا پگڈنڈیاں سوئی ہوئی اڑتی ہوئی راہ گزاروں کی خاک میں چھپی ہوئی، ریت، پانی، میلوں تک پھیلے ہوئے کھیت، مویشیوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹیں اور نیم خوابیدہ شامیں میرے ساتھ دنیا بھی تھی۔ زمین گاؤں والوں کی دولت ہے۔ دولت پر کبھی کبھار لے دے بھی مچتی ہے۔ ہمارے گھر کے قریب دو

خاندانوں میں جھگڑا ہو گیا۔ دونوں طرف سے آدمی لٹھ لے کر نکل آئے۔ میں بھی تماشا دیکھ رہا تھا۔ میں بہت چھوٹا ہوں پر مجھے پھر بھی یاد ہے کہ عورت اپنے بھائی کو لمبا بانس پکڑاتے ہوئے کہہ رہی تھی، تیزی سے باہر نکلو۔ جاؤ یہ مرد کی شان نہیں کہ وہ گھر میں بند رہے۔ یہ لفظ میری یاد میں جم کر رہ گئے ہیں اور میں سوچتا ہوں ہماری تمام تر فتوحات عورت کی محتاج ہیں اور زندگی کی تمام تر مشکلات پر ہم عورت کی وجہ سے قابو پا سکتے ہیں۔ اس کا یاد کیا ہوا بول ایک بات، زندگی کے میدان میں سرشار رکھتی ہے اور ہم رکاوٹوں کی پرواہ کیے بغیر تیزی سے بڑھتے ہیں۔

پر کنول ٹھاکر تو ہماری کوئی نہ تھی اور ہماری فتوحات ہماری اپنی عزت تھیں، ہم اس کے لیے تو کام نہیں کرتے تھے۔ پھر ہماری ہمت اس کی وجہ سے کیوں بڑھتی تھی۔ میں اس کے پاس لاتعداد بار گیا ہوں۔ اس نے کبھی یہ نہیں پوچھا تم آج کل کیا کر رہے ہو۔ تم آج کل کس منزل سے گزر رہے ہو۔ وہ ہمیشہ اپنا اور اپنے کاموں کا ذکر کرنے سے گریز بھی کرتی رہی۔ اگر کوئی ایسا انسان اس سے ملنے جائے تو اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ یہ عورت جو ہماری زندگیوں میں اتنی بلند تھی، حقیقتاً اتنی بلند ہے کہ اس نے کبھی مردوں سے اپنی بات نہیں کی۔ عام لوگ جب کوئی کام کرتے ہیں تو وہ کام ان کی دھن بن جاتا ہے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے صرف ایک ہی ذکر کرتے ہیں۔ میں حیران ہوں کنول کے لیے دھن اور جنون کے لفظ کبھی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اس نے کتنی گہرائی میں ڈوب کر اپنے کام کیے ہیں کہ وہ کام اس کا سانس بن کر رہ گئے اور اپنے سانس کی آمد و رفت کا اپنے خون کی روانی کا اپنے دل کی دھڑکن کا ذکر تو کوئی دوسروں سے نہیں کرتا، یہ تو اتنی معمولی اور روزمرہ کی ہیں جو ہر ایک کے لیے مشترک ہیں، کسی نے کبھی سورج اور دھوپ سے فائدہ اٹھانے کی باتیں نہیں کیں۔ کیا کنول کماری کے کام اس لیے یہ حقیقت رکھتے تھے۔

ہم سب تو اپنے آپ کو بھلانے کے لیے مصروفیتیں ڈھونڈتے اور مصروفیتیں پیدا کرتے ہیں اور مجھے معلوم ہے کنول اپنے آپ کو سب سے زیادہ جانتی تھی۔ کیا وہ کبھی اپنے وجود کے اندھیروں سے ہراساں نہیں ہوئی۔ سال اس کے لیے لمحے تھے اور لمحے سال تھے۔ پھولوں کی کیاریوں کو سنوارتی ہوئی تُلسی کے پودے کو پانی دیتی ہوئی اپنے بھگوان کے چرنوں کو چُھوتی ہوئی کالج کے خاموش لمبے برآمدوں میں پھرتی ہوئی اپنے گرد دنیا کو سنوارتی ہوئی، عورتوں کے مجمعوں میں تقریریں کرتی ہوئی مردوں سے ملتی ہوئی وہ اتنا انہماک کہاں سے لاتی تھی۔

بینا نے کالج سے آ کر مجھ سے کہا ہے: ''بابا آپ کی دوست کیا لوہے کی بنی ہیں؟''

"کیوں بینا؟" میں نے اس سے ہمیشہ کی طرح پوچھا۔ "عورت تو نرمی ہے، وہ لوہا کیسے بن سکتی ہے میری بیٹی۔"

"تو پھر کسی اور شے کی بنی ہوں گی۔ انسان تو تھک جاتا ہے، اُونگھ جاتا ہے، آپ کی دوست پر سے تھکن، اونگھ سب یونہی نکل جاتے ہیں۔"

بینا میری بیٹی وہ تمہیں سکھا رہی ہیں کہ کام کرنے کے طریقے کیا ہیں۔"

"نہیں بابا" بینا شوخی سے کہتی: "ہم ایسے کام کرنے کے طریقوں کو سیکھنے سے یونہی اچھے ہیں۔ ہم انسان ہیں۔"

پھر بھی مجھے معلوم ہے وہ بڑی دیوانگی سے کنول کو چاہتی تھی۔ کبھی گھروں میں بات چل ہی نکلتی ہے۔ شادی بیاہوں میں اور چمکنے والے آفتاب کو بھی بادل کبھی ڈھانپ ہی دیتے ہیں پھر اس کے تو دشمن بھی لاتعداد تھے۔ برائیاں کرنے والے برائیاں ڈھونڈنے والے، اس کے اعتماد سے جلنے والے اس کی خوبیوں کو معمولی کہہ کر ٹھکرانے والے، اس کی شہرت کو نقصان پہنچانے والے اوچھے ہتھیاروں پر اترنے والے، پھر عورتیں جہاں ملتی ہیں شہر کی ساری افواہیں پھر سے زندہ ہوتی ہیں؟ پڑھا لکھا تو اور بھی ڈوبا ہوا ہے۔ ان کا ذکر ہوتا ہے، کنول بھی کبھی کبھار اکثر موضوعِ گفتگو ہوتی۔ نروپما نے ایک دفعہ مجھ سے آ کر کہا:

"تم بیٹی کو روکتے کیوں نہیں ہو۔ برادری کا معاملہ ہے اور یہ جہاں جاتی ہے ایک جنگ کا سماں ہو جاتا ہے۔"

"کیوں۔ کیوں کیا بات ہوئی بینا نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"تم بینا کو کیا سمجھتے ہو۔ وہ یہ نہیں کر سکتی۔ وہ یوں نہیں کر سکتی۔ بغیر یقین کرتے ہوئے کچھ سن بھی لیا کرو۔"

"بھئی بات تو بتاؤ۔" میں نے نیم رضامند ہو کر سننے کی غرض سے کہا۔ "کنول کماری ٹھاکر کالج کی پرنسپل ہوئی ہے۔ مانتے ہیں اچھی بھی ہے پر دوسروں کو بھی ہر حق ہے وہ اس کے متعلق اپنی الگ رائے رکھیں۔ یہ سب کے معاملے میں ٹانگ اڑاتی اور پھر لڑتی پھرتی ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے۔" میں زیرِ لب مسکرا پڑا۔ "میں اسے سمجھا دوں گا تم مطمئن رہو۔" اور اس کے باوجود بھی نروپما کافی دیر تک بڑبڑاتی رہی تھی۔

شام کو میں نے کہا: "کیوں بینو، یہ آج کیا طوفان اٹھایا ہے؟" مگر وہ روٹھی ہوئی تھی۔

بولی ہی نہیں۔

میں نے پھر کہا: ''بینو میری بیٹی نہیں ہو، بولتی کیوں نہیں۔ آج یہ کیا تماشا بنایا ہے تمہاری ماں بہت خفا ہو رہی تھی۔ تم باہر جا کر لڑائی کرتی ہو لوگ کیا کہیں گے؟''

''لوگ، لوگ سب طرف لوگوں کی باتیں۔ میں اب باہر نہیں جایا کروں گی۔ کہیں بھی نہیں اور پھر ماں بھی تو دوسروں کے سامنے ڈانٹنے لگتی ہے۔ لوگ کیوں باتیں کرتے ہیں، ایسی لایعنی فضول باتیں جن کا سر پیر بھی نہیں ہوتا۔ میں نہیں سُن سکتی۔ مجھ میں برداشت کی طاقت نہیں، ماں کو کہہ دو مجھے کہیں نہ لے جایا کرے۔''

''آخر معلوم بھی ہو بات کیا ہے؟'' میں نے سمجھانے اور تسلی دینے کے انداز میں کہا اور بینا رونے لگی۔ میں نے کہا ایسی بڑی بڑی لڑکیوں کو روتے لاج نہیں آتی۔ رام رام۔'' پر وہ پھر بھی ہنسی نہیں۔ اس کے چہرے پر ذرا سی مسکراہٹ نہیں آئی۔ میرا یہ حربہ بھی ناکارہ گیا۔ میں نے پھر کہا:
''اچھا بھئی رولو۔ پھر یہ تو بتاؤ کیا بات ہوئی تھی؟''

بینا نے رک رک کر کہا: ''آج وہاں عورتیں اور لڑکیاں بیاہ کے گھر میں باتیں کر رہی تھیں۔''

''ارے بھائی کیا باتیں، کچھ سمجھ بھی آئے۔''

''آپ کی دوست کے متعلق کہہ رہی تھیں......'' اور اس نے نئے سرے سے رونا شروع کر دیا۔

میں نے اس سے اور کچھ نہیں پوچھا۔ مجھے معلوم تھا یہ باتیں سدا ہوں گی۔ پستیوں اور بلندیوں کا خدا واسطے کا بیر ہے۔ پھر کنول کو قریب سے دیکھنے اور دُور سے دیکھنے کی بات بھی ہے۔ وہ تو چمک ہے۔ بادلوں کی بجلی کی گرمی، چاند کی زردی اور ٹھنڈک جھرنے کی نرملتا، طوفانوں کی چنچلتا، اور خوشبو کی مدھرتا، لوگ اسے برا بھی کہیں گے، اچھا بھی کہیں گے، پر وہ ایسی عورت ہے جس کے ارادت مند زیادہ اور دوست کم سے کم ہوں گے۔

دوستی تو ایک طرح کی اکائی اور وحدت ہوتی ہے اور وہ تو اپنی اکائی خود اپنی وحدت بھی آپ ہے۔

اس کے بعد بینا نے ماں کے ساتھ شادیوں بیاہوں میں جانا چھوڑ دیا۔ وہ اپنے پر یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اسے کنول سے ایک نیاز مند پجاری کی سی عقیدت تھی اور وہ صرف بینا

کے دل میں بیٹھی مورتی ہی نہیں وہ تو کالج میں پڑھنے والی بہت لڑکیوں کے دل کی مورتی تھی۔ان دنوں کالج ایک مندر کی طرح پوتّر اور مقدس جگہ بن گیا تھا۔ تعلیم اور ذوق شوق کی جو روانیاں میں نے ان دنوں دیکھی ہیں ایک عمر گزار کر اس کے بعد کبھی دیکھ نہ پایا ہوں۔

اس میں اور عورتوں کی طرح اوپر ہی اوپر سطحی پن کیوں نہیں تھا؟ میں نے ملک کی لیڈر اور اونچی کرسیوں پر بیٹھی عورتوں کو اتنے غور سے دیکھا ہے اور کسی طرح بھی مجھے کنول میں ہوتا ہے؟ وہ ٹھاٹ نظر نہ آیا جو لیڈر عورتوں کے چلنے میں ان کی تقریر میں اور ان کی باتوں میں ہوتا ہے۔''اس کی نرم آواز اپنی ٹھنڈک سے سکون بخشتی ہے۔حیرت ہے وہ مردوں کے مجمعوں میں کھڑی ہو سکتی تھی اور پھر بھی جب کوئی اجنبی اس سے ملنے آیا تو اسے ایک طرح کی جھجک محسوس ہوتی۔شاید یہ اس کا مشرقی پن اس کا ہندوستانی پن یا ٹھیٹھ عورت پن تھا۔

ہمارے ہاں جو عورتیں مغرب کے طریقوں پر چلتی ہیں' یورپ کے طرز اپناتی ہیں' ان کا ذکر کرنا فضول ہوگا۔پر اپنے یہاں بھی تو ایک عمر گزارنے کے بعد زمانے کے نشیب وفراز سے آگاہ ہو کر انسان میں ایک لاپرواہی سی آجاتی ہے جو اپنے پر اعتماد سے پیدا ہوتی ہے۔کنول ٹھاکر ہر کام کو بہت اہتمام سے سوچ کر شروع کرتی ہے اور اس کے گرد اس لاپرواہی کا کبھی احساس نہیں ہوا۔شاید اس کا اعتماد بھی اس کے رکھ رکھاؤ سے ہی پیدا ہوا تھا یا اس کا رکھ رکھاؤ اور سوچ بچار اس اعتماد کا ایک حصہ تھی جس کی وجہ سے اسے کبھی کسی کام میں ناکامی نہیں ہوئی۔کبھی اس کے اقدام غلط نہیں ہوئے۔کبھی اس کی تدبیریں اوچھی اور کچی نہیں ہوتیں۔یہ پختگی تو اس کے وجود کا ایک حصہ تھی۔یہ پختگی کنول ٹھاکر تھی۔

آج ستاروں بھرے آسمان تلے کھڑا میں اپنے آپ کو ایک نئی چیز ذرے کی طرح محسوس کر رہا ہوں۔ایسے ذرے کی طرح جس کا وجود کوئی حقیقت نہ رکھتا ہو اور پھر بھی یونان کے ہیرو ایکینز کی طرح ہم میں سے ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی جنگ فتح وشکست کے پلڑوں کی طرف محض ہماری وجہ سے جھک سکتی ہے اور جب میدان میں بالآخر اپنی زرہ بکتر پہن کر نکلتے ہیں تو کوئی نہ کوئی تاک کر ہماری ایڑی میں تیر مارتا ہے اور یہ نازک کمزور حصہ' عورت کے سینے میں بھی دل ہے اور مرد کے سینے میں بھی۔یونانی ہیرو تو گرنے میں شان سمجھتا ہے اور ہماری طاقت اس بات میں صَرف ہو جاتی ہے کہ ہم تیر کھا کر بھی لڑتے رہیں اور ہار کھا کر پلٹ نہ جائیں' گر نہ جائیں۔شاید

عام انسان اور ایک ہیرو میں یہی فرق ہوتا ہے کہ انسان تیر کھا کر گھائل ہو کر زخمی جسم کو گھسیٹتا زخمی دل کو بھلا کر لڑتا رہتا ہے اور ہیرو یونانی دیوتاؤں کی اولاد ایکلیز کی طرح ایڑی میں تیر کھا کر گر جانا ہی اپنی مکتی سمجھتا ہے۔ ہیرو کے جسم میں کمزوری ایک ہے اور انسان تو چھلنی کی طرح رخنوں سے ہی تعمیر کیا گیا ہے۔ انسان تو سب سے بڑی کمزوری ہے۔

پھر ہماری عورت ٹرائے کی ہیلن ہے' ضد کی پکی۔ وہ اپنے چاروں طرف تباہی بربادی دیکھ سکتی ہے' اپنے وجود کے اندر شکست و ریخت' پر وہ اسی سفر پر واپس اپنی بات سے پھرنا نہیں جانتی۔ شاید عورت کی فطرت ساری دنیا میں بنیادی طور پر اس ضد سے اٹھائی گئی ہے جو اتفاق سے عورت کے خمیر میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ جس کو ست' سچ' دھرم' نیکی اور جانے کن کن ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ اور پھر بھی یہ کُل کا بوجھ' یہ ایک بہت بڑی طاقت کا' امانت کا بار مجھے ستاروں سے زیادہ اپنے سینے پر محسوس ہوتا ہے۔ ستارے تحیر کے مارے چمکتے ہیں اور میں تو ایک ناچیز ذرہ ہوں میں تو چمک بھی نہیں سکتا۔ مجھے تو چمکنے کی زبان بھی نہیں دی گئی۔ صرف بوجھ دیا گیا ہے' جس کو اٹھائے اٹھائے میں تھک گیا ہوں۔ کبھی کبھار جب انسان کائنات کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ذرہ بھی سمجھتا ہے اور ستاروں سے بلند کون سمجھ کر سکتا ہے کہ انسان کیا ہے؟

صرف کبھی کبھار لگتا ہے' کچھ سمجھ میں آ رہا ہے۔ افق کے کناروں سے روشنی چھو رہی ہے۔ جب من موہن لکھتا ہے کہ وہ بائی جی جو اس صبح اسپتال میں مر گئیں۔ کرن کے لیے مریں۔ کرن جوان کا اپنا نہیں کسی غیر کا بیٹا تھا۔

اس صبح جب میں اور من موہن ایک بالکل غیر اور اجنبی عورت سے اس کے بسترِ مرگ پر پہلی اور آخری بار متعارف ہوئے ہیں تو ہمیں کبھی یقین نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ عورت کُتنی ہے۔ ستاروں سے بھی اونچی اور پھر بھی ساحل پر کھڑی ایک بالکل ناچیز ذرّے کی طرح بے بس۔ موت کے سامنے حالات کے سامنے حادثات کے سامنے انسان بے بس ہی ہو جاتا ہے۔ مستقبل کو آنے والے زمانے کو نگاہوں سے چھپا کر پرماتما کو کیا ملا۔

ان یادداشتوں اور خطوں سے جو کہانی ترتیب دے کر من موہن نے مجھے خط لکھا' وہ خط مجھ سے کہیں کھو گیا۔ دنوں وہ خط میرے میز کی دراز میں پڑا رہا اور وہ واقعات میرے دماغ میں دہکتے انگاروں کی طرح جلتے رہے۔ پھر وہ خط کہیں کھو گیا۔ پر اس یاد سے انگارے اسی طرح زندہ رہے۔ انگاروں میں ستاروں کی سی تابانی تو نہیں آ سکتی۔ مگر وہ میرے دماغ کو روشن کرتے ہیں۔

میں اندھیرے میں کھڑی کُنتی کو دیکھتا اور دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ادھیر تھ، تاڑی پینے اور کبھی کبھار کُنتی کو مارنے سے بھی نہیں چوکتا تھا، کیونکہ وہ ایک کسان تھا۔ دھرتی کا سادہ اور سچا بیٹا۔ جب گیہوں کی سنہری بالیوں پر سے ہوا گزرتی اور دھوپ کے نور میں دور دور تک بچھے کھیت جھومتے تو وہ مدہوش سا ہونے لگتا۔ ان آوازوں میں جو سرگوشیاں کرتے جھونکوں کے دل میں پوشیدہ ہوتیں، اسے اپنے سارے خوابوں کی صدائیں سنائی دیتیں۔ وہ کھیتوں کے کنارے اوپر اڑتے پرندوں اور نیلے آکاش تلے پھیلی زمین کو دیکھ کر سوچتا میں پرماتما کا کتنا پیارا اور اچھا انسان ہوں اور سنہری بالیاں سرسراتی ہوائیں جھومتی قہقہے لگاتی رہتیں۔ دھوپ کا سنہرا، بالیوں کا سنہرا مل کر اس کے گرد سپنوں کے محل بنانے لگتے۔ دھرتی کی باس اس کے نتھنوں میں ایک آواز بن کر آتی۔ اسے ایک بچے کی طرح للکارتی۔ اندھیرے میں اسے ڈھونڈتی، اسے پکارتی ہوئی اور غرور سے اس کا سر اونچا ہو جاتا۔ وہ سورج کی شکتی کو اپنے میں ڈھلتے دیکھتا، اپنے کو ساری دنیا سے اونچا اور عظیم سمجھتا مگر عظمت اور عظیم سے تو خود آشنا نہ تھا اور پھر بھی اس کے سینے میں دل پھیلنے لگتا۔ اتنی آہستہ دھڑکتا جیسے اس عورت کا دل جس کو اندھیری سڑک پر اپنے محبوب کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہو اور جس میں اتنی طاقت نہ رہے کہ وہ دوار تک جا سکے اور پنگھٹ پر پانی بھرتی، کلسے کو مانجھتی، اسے چمکاتی، بے آواز قدموں سے گلیوں میں گھومتی کنتی بھی ایسے ہی خوابوں میں کھو جاتی۔ پر کبھی کبھار اس کے سینے میں ایک ہُوک سی اٹھتی، جن دنوں کھیتوں میں کام ختم ہو جاتا، گیہوں سنہری ہونے لگتی اور ادھیر تھ تاڑی پیتا کسانوں کے ٹولے میں ناچتا گاتا رہتا تو اسے اپنے آنگن میں ان ننھے قہقہوں کی کمی محسوس ہوتی جو اس کے وجود کے اندر کہیں پوشیدہ ضرور تھے، پر باہر نہیں آتے تھے۔ اس کے اپنے اندھیرے کے پردوں کو پکڑ کر الگ کرتے ان ننھے ہاتھوں کے سحر سے نیند آنے لگتی۔ وہ آنگن میں پیڑ پر کھلتے پھولوں کو دیکھ کر سوچتی کیا ہی ہو اگر ان میں سے کوئی پھول ایک ننھا سا ذرا سا پیارا بچہ بن جائے۔ ہوا میں ہنسی کے مارے جھولتا نئی کونپلوں کے پیچھے شریر آنکھوں سے جھانکتا اپنی پتیوں کی طرح شفاف اور نرم آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھتا۔ پوجا کے سمے بتا کر جب وہ آتی تو اسے اپنے گرد ایک انجانی سی خوشبو کا احساس ہوتا جو دھرتی کی اس باس سے الگ تھی جسے وہ صدیوں سے اپنے اس جنم سے بھی پہلے جانتی تھی۔ وہ خوشبو اسے اِدھر اُدھر دیکھنے پر مجبور کر دیتی۔ کوئی ننھے قدموں سے اس کے پیچھے آ کھڑا ہوتا۔ جب شام کو گائے کو نہلانے اور دودھ دوھتے ہوئے وہ ان آوازوں میں کھو جاتی تو اسے لگتا

کوئی آنگن میں کھڑا رو رہا ہے مگر درختوں سے پرندے اڑتے اور بیٹھتے' ان سب آوازوں میں سارا وقت گھری کنتی جب ادھیر تھ سے بھی بات کرتی اور اپنے خوابوں میں ان ننھی صداؤں کو سینے میں کھو جاتی تو تاڑی کے نشے میں دھت وہ اسے پیٹنے لگتا۔ وہ پٹتے پٹتے بھی کھوی جاتی۔ سوچتی ابھی کوئی اندر کوٹھری سے نکل کر باہر آئے گا اور ادھیر تھ کو کہے گا کیوں بابا تم ماں کو کیوں مارتے ہو۔ میں اب بڑا ہو گیا ہوں تم میری ماں کو نہیں مار سکتے۔ کنتی منتظر رہی مگر کوئی نہ آتا اور تاڑی کا نشہ ہرن ہونے لگتا۔ ادھیر تھ مارتے مارتے تھک سا جاتا اور پھر کونے میں پڑے اپنے حقے پر تمبا کو جما کر انگارے رکھتا اور پیتے ہوئے سوچتا کنتی کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے پہل وہ مار کھا کر روتی تھی۔ وہ پٹ کر چیختی تھی۔ اب وہ اتنی بے حس کیوں ہو گئی ہے۔ اب اِسے کیا ہو گیا ہے۔ پھر وہ بھی خوابوں میں کھو سا جاتا' حقے کی نالی اس کے منہ میں دھری رہتی اور وہ کش لگانا بھول جاتا' بس وہ خواب دیکھتا یہ کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے' اس کے چاروں طرف رونق ہے۔ اس کے جوان جوان پوتے اس کی ہرنوں کی سی آنکھوں والی بیٹیاں' پوتیاں۔ سب طرف خوشی ہے۔ پوجا کا دن ہے۔ وہ نئے کپڑے پہنے ہوئے اس سے آشیرباد لینے آئے ہیں۔ وہ ہر ایک کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ انہیں جیب میں سے ایک لمبا بٹوا نکال کر پیسے دے رہا ہے۔ بچے اس کے کندھوں سے چمٹے کہہ رہے ہیں' نہیں دادا ہم تو اور لیں گے۔ وہ ضد کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے چھوٹی لڑکی زمین پر لوٹ رہی ہے۔ اس کے سنہرے بال ہوا میں بکھرے ہوئے ہیں اور آنسوؤں سے چہرہ میلا ہو رہا ہے۔ وہ اپنی مٹھیاں آنکھوں میں دیئے زور زور سے چیخ رہی ہے۔ وہ اسے زمین سے اٹھا لیتا ہے اور اس کے کپڑے جھاڑ کر اسے اپنی گود میں اٹھا لیتا ہے۔ بچی روتے روتے ہنس پڑتی ہے۔ اتنے زور سے جیسے بادلوں کی سیاہی سے ایک دم سورج کی کرنیں نکل آئیں۔ پھر وہ توتلی زبان سے کہتی ہے۔ ''دادا تم ہمیں میلے میں نہ لے چلو گے۔ دادا'' وہ اس کا چہرہ اپنے ننھے ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ''دادا مجھے بتاؤ جب چاند اس بڑے پیڑ کی ٹہنیوں میں پھنس جاتا ہے تو کوئی اسے پکڑ نہیں سکتا'' اور پاس ہی کھڑا اس کا بڑا بھائی کہتا ہے'' ''کتنی بے وقوف ہے بھلا کوئی چاند کو بھی پکڑ سکتا ہے۔ نہیں پکڑ سکتا نا دادا۔'' وہ اس سے سوال کرتا ہے۔

بچی پھر کہتی ہے اپنے بھائی کے جواب کو اَن بنا کر کے ''بھلا بھلا چاند میں کون رہتا ہے۔ ماں کہتی تھی چاند میں ایک بڑھیا ہے۔''

لڑکا پھر کہتا ہے: ''چاند تو اتنا بڑا ہے بہت بڑا ہے بہت بڑا' اس میں کوئی بڑھیا نہیں رہ

کوئی آنگن میں کھڑا رو رہا ہے مگر درختوں سے پرندے اڑتے اور بیٹھتے' ان سب آوازوں میں سارا وقت گھری گنتی جب ادھیرتھ سے بھی بات کرتی اور اپنے خوابوں میں ان ننھی صداؤں کو سینے میں کھو جاتی تو تاڑی کے نشے میں دھت وہ اسے پیٹنے لگتا۔ وہ پٹتے پٹتے بھی کھوسی جاتی۔ سوچتی ابھی کوئی اندر کوٹھری سے نکل کر باہر آئے گا اور ادھیرتھ کو کہے گا کیوں بابا تم ماں کو کیوں مارتے ہو۔ میں اب بڑا ہو گیا ہوں تم میری ماں کو نہیں مار سکتے۔ کنتی منتظر رہی مگر کوئی نہ آتا اور تاڑی کا نشہ ہرن ہونے لگتا۔ ادھیرتھ مارتے مارتے تھک سا جاتا اور پھر کونے میں پڑے اپنے حقے پر تمبا کو جما کر انگارے رکھتا اور پیتے ہوئے سوچتا کنتی کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے پہل وہ مار کھا کر روتی تھی۔ وہ پٹ کر چیختی تھی۔ اب وہ اتنی بے حس کیوں ہو گئی ہے۔ اب اِسے کیا ہو گیا ہے۔ پھر وہ بھی خوابوں میں کھو سا جاتا' حقے کی نالی اس کے منہ میں دھری رہتی اور وہ کش لگانا بھول جاتا' بس وہ خواب دیکھتا یہ کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے' اس کے چاروں طرف رونق ہے۔ اس کے جوان جوان پوتے اس کی ہرنوں کی سی آنکھوں والی بیٹیاں' پوتیاں۔ سب طرف خوشی ہے۔ پوجا کا دن ہے۔ وہ نئے کپڑے پہنے ہوئے اس سے آشیرباد لینے آئے ہیں۔ وہ ہر ایک کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ انہیں جیب میں سے ایک لمبا بٹوا نکال کر پیسے دے رہا ہے۔ بچے اس کے کندھوں سے چمٹے کہہ رہے ہیں' نہیں دادا ہم تو اور لیں گے۔ وہ ضد کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے چھوٹی لڑکی زمین پر لوٹ رہی ہے۔ اس کے سنہرے بال ہوا میں بکھرے ہوئے ہیں اور آنسوؤں سے چہرہ میلا ہو رہا ہے۔ وہ اپنی مٹھیاں آنکھوں میں دیئے زور زور سے چیخ رہی ہے۔ وہ اسے زمین سے اٹھا لیتا ہے اور اس کے کپڑے جھاڑ کر اسے اپنی گود میں اٹھا لیتا ہے۔ بچی روتے روتے ہنس پڑتی ہے۔ اتنے زور سے جیسے بادلوں کی سیاہی سے ایک دم سورج کی کرنیں نکل آئیں۔ پھر وہ توتلی زبان سے کہتی ہے۔ ''دادا تم ہمیں میلے میں نہ لے چلو گے۔ دادا'' وہ اس کا چہرہ اپنے ننھے ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ''دادا مجھے بتاؤ جب چاند اس بڑے پیڑ کی ٹہنیوں میں پھنس جاتا ہے تو کوئی اسے پکڑ نہیں سکتا'' اور پاس ہی کھڑا اس کا بڑا بھائی کہتا ہے'' کتنی بے وقوف ہے بھلا کوئی چاند کو بھی پکڑ سکتا ہے۔ نہیں پکڑ سکتا نا دادا۔'' وہ اس سے سوال کرتا ہے۔

بچی پھر کہتی ہے اپنے بھائی کے جواب کو اَن سنا کر کے'' بھلا بھلا چاند میں کون رہتا ہے۔ ماں کہتی تھی چاند میں ایک بڑھیا ہے۔''

لڑکا پھر کہتا ہے: '' چاند تو اتنا بڑا ہے بہت بڑا ہے بہت بڑا' اس میں کوئی بڑھیا نہیں رہ

سکتی۔ ہیں نا دادا!''

اور یہ باتوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رہتا۔

راتوں کو وہ سب بچے اس کے گرد اکٹھے ہو کر کہیں گے ''دادا ہمیں وہی کہانی سناؤ' جہاں کا راجا سفید چاندی کے محلوں میں رہتا ہے۔''

اور رانی کے پاس ایک ہیرا ہے' جس کی قیمت سات راجوں کی قیمت سے بھی زیادہ ہے۔ دادا پھر ہمیں وہ کہانی بھی سناؤ جس میں راج کمار ایک اتنی اچھی سی راج کماری سے بیاہ کرتا ہے۔ کیوں دادا وہ کہانی بھی سناؤ گے نا۔

وہ اپنے خواب سے چونک جاتا' کُنتی کلسے سے پانی انڈیل کر گلاس کو بھرتی اور اس کے سامنے کھانا پروس دیتی۔ کنتی کے چہرے پر رنج نہ ہوتا' غصہ نہ ہوتا جیسے وہ ابھی ابھی پٹی نہ ہو۔ جیسے اس نے اپنے خوابوں کو پھر سے جوڑ لیا ہو۔ وہ دونوں اپنے خواب ایک دوسرے سے کبھی نہ کہتے۔ وہ خواب ان کے اپنے دِلوں میں اندھیرے میں کھلنے والے پھولوں کی طرح بڑی خوشبو سے مہکتے' پر انہوں نے اپنے سپنوں کا ذکر کبھی نہیں کیا۔ شاید ان کی دہقانی زبان میں سپنوں کے لیے کوئی لفظ نہ تھے۔

پھر ایک رُت بدلنے پر بہت بڑا میلہ ہوا۔ دور دور سے لوگ آئے۔ ادھیر تھ تاڑی پی کر نشے میں دُھت سب سے بلند آواز میں گاتا اور ناچتا رہا۔ لوگ تھک گئے پر صبح سے شام تک کسی نے اس کو ہارتے نہیں دیکھا۔ شام رات میں بدل گئی اور منڈپ سُونا ہونے لگا۔ گاؤں کی گوریاں چھیلے اور چھوٹی دکانوں والے سب لوگ دکانیں بڑھا کر چلے گئے۔ کہیں کہیں چھکڑوں کے نیچے لوگ ابھی تک سو رہے تھے۔ ہوا میں سردی تھی' خنکی تھی اور پھر منڈپ میں گھومتے ہوئے ادھیر تھ کو اپنا دل اتنا سُونا لگا' اتنا سُونا کہ اس کا من گھر جانے کو نہ چاہا۔ وہ وہیں کھیت کی منڈیا پر بیٹھ کر چاند کو دیکھنے لگا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ چاند کا چہرہ ایک بچے کی سی بے بسی اور معصومیت سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔

رات اور گہری ہو گئی۔ گلیوں پر بھی سناٹا سا تیرنے لگا۔ سنہری بادلوں کا گیت کچھ چپ ہو گیا۔ وہ گھر کو پھرنے لگا۔ پر اس نے سوچا میں منڈپ میں سے ہو کر چلوں' اسے ایک آوارہ روح کی طرح اس سُونے پن میں اکیلے گھومنے سے بہت مزہ آیا۔ دور درختوں کے نیچے ایک کونے میں ایک بڑی زرد مدھم اور ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ میلے کے بعد تو اس ویرانی میں آتے ہوئے بھی ڈر لگا

کرتا ہے۔ یہ روشنی کیسی، کسان کی ازلی دلیری نے اسے تجسس پر آمادہ کیا۔ ادھیرتھ آگے بڑھا۔ چھکڑے کے نیچے چیتھڑوں میں لپٹی ایک عورت تھی اور آدمی زمین پر بیٹھا رو رہا تھا۔

ادھیرتھ نے آگے بڑھ کر پوچھا: ''بھیا کیا بات ہے کیوں رو رہے ہو؟''

مگر آدمی نے کوئی جواب نہ دیا، وہ ذرا تیز آواز میں رونے لگا۔

ادھیرتھ نے پھر پوچھا: ''میلہ تو ختم ہو گیا۔ بھیا تم یہاں کیوں رو رہے ہو۔ کیا بات ہے؟ بتاؤ کوئی کام میرے کرنے کے لائق ہو۔ میں تمہاری مدد کروں۔'' اس آدمی نے بتایا کہ یہ عورت اس کی بیوی ہے۔ رات بچے کی پیدائش میں ختم ہو گئی۔ اسے بہت دور جانا ہے۔ میلے میں اس کے چند روپے بھی چوری ہو گئے ہیں۔ وہ اتنا اکیلا ہے، بچے کے نام پر ادھیرتھ کا دل زور سے دھڑکا۔

اس نے پوچھا: ''پھر کیا کرو گے بھیا؟''

آدمی نے جواب دیا: ''میں بچے کا کیا کروں گا وہ زندہ ہے اور اس کو پالنے کا کام مجھ سے کیسے ہوگا؟''

ادھیرتھ کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے پھر کہا: ''بچہ، تم بچے سے گھبراتے ہو؟'' مگر اس کا دل اور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنے دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔

آدمی نے کہا: ''عورت کے بنا بچے کو کون پالے گا۔ اگر میں اسے لیے پھرتا ہوں تو وہ سردی اور بھوک سے مر جائے گا۔ دونوں طرح سے بچہ تو زندہ نہیں رہے گا۔''

ادھیرتھ نے کمزور اور دھڑکتے دل کے باوجود آہستہ سے کہا: ''تم اس سے پریشان ہو تو بچہ مجھے دے دو۔ میں پالوں گا۔'' اس آدمی نے پہلی بار اپنے گھٹنوں سے سر اٹھایا اور کہا: ''رام تمہارا بھلا کرے۔ تم نے مجھے بچا لیا۔ میں ہتیکاری نہ بنا اور ادھیرتھ کے سارے جسم میں ایک تشنج کی سی کیفیت تھی۔ اس کی زبان خشک ہو گئی تھی۔ اس کا سانس سینے میں زور زور سے چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سُن ہوتے جا رہے تھے مگر ان ساری کیفیتوں کے باوجود وہ زمین پر بیٹھا اپنے وجود کے ایک ایک تار سے منتظر ہوا کی طرح بے قرار وہاں بیٹھا تھا۔

آدمی نے اٹھ کر چیتھڑوں میں لپٹی عورت کے پہلو سے کپڑے میں لپٹا بچہ اٹھا کر ادھیرتھ کے ہاتھ میں تھما دیا اور ادھیرتھ اپنے آپ کو اتنا کمزور محسوس کر رہا تھا کہ اگر اس کو ایک قدم ہلانے کو کہا جائے تو وہ بھی نہ ہلا سکے گا۔

پھر دوسرے آدمی نے عورت کی چیتھڑوں میں لپٹی لاش کو اٹھا کر چھکڑے میں رکھا۔ چند

میلے کپڑے سمیٹے اور مریل بیل کو جوت کر درختوں سے پرے جانے والی کچی سڑک پر مڑ گیا۔ اس نے جاتے ہوئے ادھیر تھ سے ایک لفظ نہ کہا۔ جیسے وہ دونوں بس دو ذرے تھے کہ ملے ہوں اور جدا ہو گئے۔ بہت دیر تک ادھیر تھ اپنے ہاتھوں میں بچے کو پکڑے اس زرد ٹمٹماتی روشنی کو غائب ہوتے دیکھتا ہے۔ بچہ اس کے ہاتھ میں سردی کی وجہ سے یا زندگی کی وجہ سے ہلا تو اسے احساس ہوا۔

اور اس رات اگر کوئی ادھیر تھ کو تیز قدموں سے راہ گزاروں اور گاؤں کی گلیوں میں سے گزرتے دیکھتا تو اسے یقیناً معلوم ہو جاتا کہ وہ آندھی سے بھی زیادہ تیز جا رہا ہے۔

گھر کے کواڑ پر کھٹکھٹاتے ہوئے اس نے زور سے کہا: ''کنتی دروازہ کھولو، کنتی جلد کھولو۔''

کنتی نے ابھی ابھی ایک خواب دیکھا تھا کہ وہ تُلسی کے پودے کو دیکھ رہی تھی کہ پودا ایک ننھے تھن تھنے ہنستے بچے میں بدل گیا۔ اس نے کواڑ کھولا تو ادھیر تھ نے بچہ اس کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ لو۔''

دونوں چاند کے نیچے ستاروں بھری رات میں آنگن اور کواڑ کے بیچ میں کھڑے بچے کی طرف دیکھ رہے تھے جس کی ذرا ذرا سی آنکھیں کھلی تھیں اور جو چاند کی طرف دیکھ رہا تھا اور دونوں ہاتھوں کی ننھی ننھی بند مٹھیوں کو بڑی بے بسی سے اپنے سینے کے قریب آہستہ آہستہ ہلاتا تھا۔ ادھیر تھ نے کنتی کی طرف دیکھا اور کنتی نے ادھیر تھ کی طرف پھر دونوں کوٹھڑی میں آ گئے۔

ادھیر تھ نے کوٹھڑی کا کواڑ کھلا رہنے دیا۔ کنتی بولی: ''جلدی کواڑ بند کر دو۔ بچے کو ٹھنڈ لگ جائے گی۔'' اور اُس بات بات پر پیٹنے اور خفا ہونے والے ادھیر تھ نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔

اس کے بعد بہت راتیں کنتی نے اور ادھیر تھ نے جاگ کر بسر کیں۔ بچہ بیمار ہو جاتا۔ وہ روتا تو دونوں بے چین ہو جاتے۔ کنتی اسے کہتی تم گھر میں اتنی زور سے بولتے ہو، بچہ نیند سے جاگ کر رونے لگتا ہے۔ بچہ ڈر جاتا ہے۔'' اور ادھیر تھ نے اس دن سے آہستہ بولنا شروع کر دیا۔ ادھیر تھ نے کبھی اسے نہیں پیٹا۔ اس نے کسان ٹولے میں کبھی راتوں تک بیٹھ کر پھاگ نہیں گایا۔ لوگ کہتے یہ ادھیر تھ بدلتا جا رہا ہے مگر وہ بھاگ کر جس جگہ بھی ہوتا کام سے تھک کر گھر بھاگتا۔ اگر بچہ سویا ہوا ہوتا تو وہ بڑے سکون سے ایک طرف بیٹھ کر اس کے جاگنے کا انتظار کرنے لگتا۔ بچہ جاگ کر رونے لگتا تو کُنتی ہر چیز چھوڑ چھاڑ کر اسے گود میں لے لیتی۔ ادھیر تھ کہتا: ''مجھے بھی تو اُٹھانے

دو۔ لاؤ میں اسے چپ کراؤں۔ لاؤ تم تھک گئی ہوگی۔"

مگر کُنتی بچے کو گود میں لیے آنگن میں پھرتی رہتی اور ادھیر تھا اتنے غرور سے اتنے اطمینان سے بیٹھا اپنا حقہ پیتا۔ اگر چولہے پر دودھ رکھا ہوتا تو رسوئی میں جا کر اسے بلانے لگتا۔ دونوں مل کر کام کرتے۔ سوئی ہوئی سہ پہروں کو جب وہ بچے کو جھلاتی تو زور زور سے لوری گانے لگتی۔ اس آنگن میں جہاں اتنا سُونا پن ہوتا تھا۔ کنتی کے گیت کو بجتے اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے۔ وہ اپنے انگ انگ میں ایک جھنکار محسوس کرتی۔ اس کے لیے یکا یک دنیا جاگ گئی تھی۔ یہ سازوں بھری گیتوں بھری سنہری پنگھٹ پر پانی لینے جاتی تو کسی سے کھڑی ہو کر بات بھی نہ کرتی۔ کہتی "میں بچے کو سُلا آئی ہوں۔ وہ ڈر کر روئے گا تو اسے کون تھپکے گا۔" باقی عورتیں ہنستیں، اس سے مذاق کرتیں، کوئی مارے جلن کے کہتی: "ہم سب کے بھی بچے ہیں، کُنتی کو بچہ مل گیا ساری سکھیوں کو بھول گئی ہے۔"

اور پھر پاس ہی دوسری اپنے کلسے کو پانی سے بھرتی کہتی۔ "تمہاری بات اور ہے۔ تمہارے تو اپنے بچے ہیں اس کا اپنا کوئی نہیں نا۔"

باقی عورتیں چند لمحوں کے لیے خاموش ہو کر شاید سوچنے لگتیں کہ اپنے اور بیگانے کا فرق کیا ہے۔ کیا تخلیق میں حصہ لینے والی عورت ہی بچے سے پیار کر سکتی ہے۔ کیا وہی اس کے دکھ درد جان سکتی ہے۔

اور پھر کرن پاؤں چلنے لگا۔ وہ توتلی زبان سے باتیں کرنے لگا۔ وہ کام کرتی روٹی پکاتی آنگن میں ادھر ادھر پھرتی کنتی کے پیچھے پیچھے جاتا۔ اسے دیکھ کر زور سے ہنستا اور کنتی کے ہردے میں ماما ابلنے لگتی۔ وہ اسے اونچا اٹھا کر کہتی 'میرے کرن' تم کہاں تھے اور کرن زور زور سے ہنستا۔ کنتی اسے ہوا میں اتنی زور سے اچھالتی کہ اس کے بالوں کی چوٹی کھل کر ناگن کے سے سیاہ جال کی صورت میں اس کے گرد بکھر جاتی۔ کنتی کی روح ایک ہرنی کی طرح محبت کے اس سر سبز شاداب جنگل میں کلیلیں کرنے لگی تھی۔

فصل کٹنے کے دن قریب آتے۔ پھر کھلیان میں اناج اکٹھا ہو جاتا' پھر اسے گاہنے کا کام ہوتا۔ اب کرن ذرا اور بڑا ہو گیا تھا۔ کُنتی اسے لے کر کھلیان پر چلی جاتی۔ وہ اناج کو چھاجوں میں بھر کر سر سے اوپر اٹھاتے ہوئے اور پھر دانوں کو سنہری ندی کی طرح زمین پر گرتے دیکھ کر سوچتی میرا کرن بڑا ہو کر اتنی دولت کمائے گا اور کرن اناج کے ڈھیروں پر بیٹھا نیند سے جھومتا

رہتا۔ اس کے سنہری بال دانوں کے سنہری دھوپ کے سنہرے کی طرح اناج کی ہوا میں اڑتے رہتے۔ اس کے رخساروں پر سیب کا سونا ہوتا۔ کنتی اس کی طرف دیکھتے دیکھتے اپنا کام بھی بھول جاتی۔ اس کے ہاتھ سر سے اونچے اٹھتے رہتے اور چھاج میں سے دانے ختم ہو جاتے۔ کرن ہنس کر چلّا کر کہتا۔

''ماں تم کیا کر رہی ہو' دانے تو کب کے ختم بھی ہو چکے۔''

کنتی اپنے خوابوں میں جاگتی' کرن کے منہ سے ماں کا لفظ سن کر اس کے دل کی دھڑکن کتنی تیز ہو جاتی اور ادھیر تھ بھی زور سے ہنستے ہوئے کرن سے کہتا: ''تمہاری ماں کو خواب دیکھنے کی عادت بہت دنوں سے ہے۔''

کرن پھر کہتا: ''بابا تم یہ اناج بیچ کر میرے لیے کیا لاؤ گے اور ادھیر تھ کا سر غرور سے اونچا ہو جاتا' وہ کسی کا تو بابا تھا نا کوئی اسے باپ کہتا تھا نا۔

پہلے وہ اور کُنتی شاموں کو ہی چپ چاپ چولہے کے پاس بیٹھ کر اپنے اپنے خیالوں میں لیٹے چپ رہتے تھے۔ اب سردیوں کی تیز ہواؤں میں بھی کنتی کو کبھی بیٹھنے کا موقع نہ ملتا۔ وہ کوٹھڑی سے رسوئی میں' وہاں سے آنگن میں اور پھر باہر گائے کے پاس جاتی اور کرن سارا وقت ایک سائے کی طرح اس کا پیچھا کرتا۔ اس کی ساڑھی کا پلو پکڑے ہوئے وہ روٹیاں پکاتی تو کرن آ کر اپنے ننھے ہاتھوں سے آنکھیں بند کر لیتا۔ ''ماں' بھلا بوجھو تو کون ہے؟''

اور کُنتی ایک سحر زدہ کی طرح بیٹھی رہتی چپ۔ اس لیے کہ کہیں کرن رنجیدہ نہ ہو جائے یہ سوچ کر کہ ماں نے اسے فوراً بوجھ لیا ہے۔

پوجا کے سمے وہ اس کے پاس بیٹھ کر پوچھتا رہتا۔ ''ماں تم کیا پڑھتی ہو؟ ماں تم زور زور سے کیوں بولتی ہو۔ آنکھیں کھولو' اور کُنتی اپنے بھگوان کو بھول کر جھک کر کرن کو پیار کرنے لگی۔

گائے کو دوہتے ہوئے وہ پیچھے کھڑا کہتا۔ ''ماں تم کیا کر رہی ہو۔ لاؤ میں کروں اور کنتی ہنستی ہنستی دوہری ہو جاتی۔ کرن بھی ہنسنے لگا۔ دونوں کی ہنسی مل کر سہاگ کا گیت بن جاتی اور کنتی سوچتی کرن بڑا ہوگا۔ پھر شہنائیاں بجیں گی۔ وہ نگر کی سب سے سُندر لڑکی کو بہو بنا کر لائے گی۔ آخر اس کا کرن بھی تو اتنا سندر ہے' بالکل چاند کی طرح کا۔ سردیوں کی گرم اور خوشگوار دوپہر کو کرن کے لیے رضائی سیتے اس کے کپڑوں کو ٹھیک کرتے وہ سوچتی رہی۔ یہ سوچ ہی اس کی زندگی بن کر رہ گئی تھی۔ کُنتی گاؤں کی مصروف ترین عورت تھی۔ وہ سکھیوں سہیلیوں سے بے نیاز ہو گئی۔ اس کی دنیا

سمٹ کر کرن میں آ گئی۔

انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر کرن کو پجاری جی کے پاس پڑھنے بٹھا دیا۔ وہ دونوں اسے بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے۔ گاؤں کے بابو کی طرح بڑا اور اونچا انسان جو کتابوں سے پڑھ کر باتیں بتا سکے گا۔ وہ اسے کہانیوں خوابوں کے دیس سے نکال کر کھیت اور کھلیان سے بھی اُونچا بنانے کی تمنا رکھتے تھے۔ شام کو کرن جب سیاہی سے بھرے چہرے اور کپڑوں سے گھر آتا تو کنتی دوڑ دوڑ کر ایک خادمہ کی طرح اس کا کام کرتی۔ وہ کھیلنے جاتا تو تھوڑی دیر میں گھر بھاگ آتا۔ جوہڑ پر کاغذ کی کشتیاں تیراتے تھک کر وہ کُنتی کے پاس آ جاتا۔ وہ ہر کام چھوڑ کر اس کے پاس بیٹھ جاتی۔ بارش کے دنوں میں وہ کوٹھڑی کی چھوٹی سی نیچی کھڑکی کھول کر بیٹھ جاتا اور کہتا: ”ماں، اب تم ان پریوں کی کہانی سناؤ جو بادلوں کے تخت پر سوار ہو کر تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلی جاتی ہیں۔ کنتی بادلوں کی سیاہی کے سحر اپنے خوابوں کے دھندلکے اور کرن کی آواز کی خوشی میں کھوئی اسے کہانی سناتی رہتی۔ پھر ادھیرتھ کہتا: ”کرن بیٹے پجاری جی تمہیں مارتے تو نہیں ہیں؟“

”نہیں بابا۔“ وہ کھڑکی میں بیٹھا ہوا کہتا۔ ”وہ تو بہت پیار سے پڑھاتے ہیں بابا۔“

اور پھر ادھیرتھ کرن سے باتیں کرنے لگتا۔

وقت گزرتا گیا۔ سال بیت گئے۔ کرن بڑا ہو گیا۔ اس نے مندر کے پجاری سے سب کتابیں پڑھ لی تھیں۔ وہ پڑھنے میں بہت طاق تھا۔ گاؤں کے سب لڑکوں سے ہوشیار۔ لوگ کہتے ادھیرتھ کا بیٹا تو بہت ہی سُندر اور بڑا ہی ذہین ہے۔ لوگ کرن سے جلنے بھی لگے تھے۔

کرن نے دوسرے گاؤں کے اسکول سے آٹھ جماعتیں پاس کر لیں۔ کُنتی کے پاؤں میں راگ سا گونجنے لگا تھا۔ اس کی ساری آتما ایک پھول کی طرح کھل رہی تھی۔ وہ پھر سے جوان ہو رہی تھی۔ ادھیرتھ زیادہ محبت سے کھیتی باڑی کرتا۔ اب ان کو خواب دیکھنے کا وقت بھی نہیں ملتا تھا۔

اس دن گھر میں ایک بیاہ کی سی رونق اور ایک یوکیہ کی سی چہل پہل تھی۔ جب دوسرے گاؤں سے اسکول کے بڑے ماسٹر اور پجاری کنتی کے گھر میں آئے۔ انہوں نے کہا: ”کرن بڑا ہوشیار لڑکا ہے۔ اسے وظیفے پر دوسرے شہر پڑھنے کے لیے بھیجنا چاہیے۔ جب بڑے ماسٹر کہہ رہے تھے کہ انہوں نے بہت کم لڑکے کرن کی طرح ذہین اور کام کرنے والے دیکھے ہیں تو ادھیرتھ کی آنکھوں میں مارے خوشی کے آنسو آ گئے اور کُنتی اپنے گھونگھٹ کے پیچھے پھر خوابوں کے

دُھندلکوں میں کھوگئی۔

کرن کو شہر میں اسکول پڑھنے بھیج دیا گیا اور کنتی کو اب ذرا فرصت سی مل گئی۔ وہ اپنے ہمسایوں سے پنگھٹ پر مندر میں جہاں کہیں اسے موقع ملتا یہ ذکر لے بیٹھتی اپنے کرن کی باتیں۔ وہ پڑھے گا' پھر بڑے بابو کی طرح شہر میں ایک افسر بنے گا اور عورتیں کہتیں ہم اپنے بچوں کا سکھ نہیں دیکھتے اور یہ عورت دوسرے کے بچے کو پال کر سکھ یوگ رہی ہے۔ اپنی اپنی قسمت ہے نا۔ بھگوان تو ہی نیائے اور انیائے کرنے والا تجھ سے کیا گلہ۔

اور پھر ایک سال بارش نہیں ہوئی۔ گاؤں میں قحط پڑا۔ فصل تباہ ہوگئی۔ سوکھی کھیتی سے اسے روپے بھی وصول نہ ہو سکتے تھے کہ کرن کو ہر ماہ خرچ بھیجا جا سکتا۔ کنتی نے ادھیرتھ سے چوری بہو کے لیے بنائے ہوئے زیور مہاجن کے پاس گروی رکھ دیئے۔ آ کاش تانبے کا ہو گیا تھا۔ پانی کی ایک بوند بھی نہ برستی تھی۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ کھیتوں میں خاک اڑنے لگی۔ درخت سوکھ گئے۔ کنوؤں کا پانی تارے کی طرح دور چلا گیا۔ زمین کے سوتے خشک ہو گئے۔ ادھیرتھ چوپال سے آ کر چپ چاپ کنتی کے پاس بیٹھ جاتا۔ وہ دونوں اب پھر بھیانک خوابوں میں ڈوبنے لگے تھے۔ مگر کنتی کو پھر یاد آ جاتا کرن کو خرچ بھجوانا ہے۔ اس کے کپڑے اس کے سو فکر۔ دونوں باتیں کرنے لگتے۔ شاید انہوں نے کبھی اس بات کو سوچا بھی نہ تھا کہ کرن ان کا اپنا نہیں۔

گھر کے زیور بیچ کر بیلوں کی جوڑی بیچ کر گھر کی چیزیں بیچ کر' خرچ چلتا رہا۔ چھٹیوں میں کرن گھر آیا تو خوش تھا۔ اسے کتابوں سے فرصت نہ تھی۔ اسے کیا معلوم قحط کیا ہوتا ہے۔ پھر اسی شام اس نے گائے کو دیکھا۔ کہنے لگا: ''ماں گائے کو چارہ نہیں کھلاتی ہو' سوکھ کیوں گئی ہے؟'' اور کنتی نے ایک مضمحل سی ہنسی ہنس کر جواب دیا۔ ''یونہی بیٹا یہ بوڑھی ہو گئی ہے۔ تم کوئی گائے خرید دیں گے۔'' بک چکی چیزوں کے متعلق کبھی کبھی کرن پوچھ بیٹھتا۔ ''ماں یہ چیز گھر میں ہوا کرتی تھی' کہاں گئی اور کنتی کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتی۔ کسی نہ کسی طرح دونوں بیٹھ کر سر جوڑ کر قرض دام سے کرن کے لیے چیزیں لاتے۔ نہ جانے انہیں کیوں یہ خیال تھا کہ کرن کو اگر گھر کی اس کمی کا معلوم ہو گیا تو اس کا دل کُڑھے گا۔ تھوڑے دنوں کی بات تو اور ہے پھر کرن بابو بن جائے گا۔ ان کے دن پھر جائیں گے۔

چھٹیوں میں کرن نے کہا: ''ماں تم میرے خطوں کو کیسے پڑھتی ہو؟ تم پڑھی لکھی بھی نہیں ہو۔ ماں کتنی بری بات ہے کہ تم میرا لکھا بھی نہیں پڑھ سکتیں'' اور کنتی نے پجاری کے گھر جا کر پڑھنا

شروع کر دیا۔ قحط کے دنوں میں جب ہر طرف روپے کا سوال تھا' روٹی کا سوال تھا' پانی کا سوال تھا اور اس طرح کے اتنے سوالوں کے باوجود کنتی نے اس لیے کہ کرن کہتا ہے ماں تم میرا لکھا پڑھ بھی نہیں سکتیں' پجاری جی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ پر چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ کرن دوسرے دن شہر واپس چلا گیا۔ کنتی کے خوابوں میں بھوک اور مستقبل کے خوف کے ساتھ ایک ہی خوشی بہار کے آخری پھولوں کی طرح ڈولتی رہتی۔ کرن بڑا افسر بن جائے گا۔ کرن بڑے بابو سے بھی بڑا بن جائے گا اور پھر روپے کا کھٹکا یہ کہ بچے کو وقت پر خرچ نہ پہنچ سکے گا۔ ایک بھیانک خیال بن گیا۔ ادھیرتھ کی خاموشی بڑھ گئی۔ اردگرد بھوک سے مرتی دنیا میں صرف گاؤں کے مہاجن کے پاس اناج تھا۔ اس کے پاس روپے تھے' اس کے پاس خوشی تھی۔ دنیا سے ہر شے غائب ہو گئی تھی۔ گاؤں سے سب زندگی پر ایک بحران' موت کا سا سکوت طاری تھا۔

اور ایسے میں ادھیرتھ کو بخار ہونے لگا۔ اسے دارو کے لیے پیسے نہیں ملے۔ کرن کو بھیج کر جو بچتا وہ تو بالکل ناکافی تھا۔ ادھار کہیں سے نہیں ملتا تھا۔ روپے صرف مہاجن کے پاس تھے اور مہاجن آسمان کی طرح دور اور زمین کی طرح سخت تھا۔ کنتی اپنے دامن میں بجھتے ہوئے چراغ کی طرح جو امید لیے پھرتی تھی' وہ بھی ادھیرتھ کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اس کے دن اب کاہے پھر سکتے تھے۔ گھور اندھیارے نے اس کے گرد گھیرا کر لیا۔ کرن کا خط آتا: "ماں آج کل یہاں بڑے زوروں سے نئی نئی باتیں ہو رہی ہیں۔ تم نئی باتوں کو کیا سمجھو گی ماں۔ پھر یہاں پر تو اتنے بڑے بڑے مہاتما اور اچھے لوگ ہیں۔ جو دیش بھگتی کا پرچار کرتے ہیں۔ دیس کی سیوا تو سب سے بڑا دھرم ہے۔ ماں اور مہاتما جی کہتے ہیں اس سے بڑا دھرم کوئی نہیں۔ گاندھی جی کا نام تم نے کبھی نہیں سُنا ہو گا۔ ماں وہ بھی کہتے ہیں۔ پُرش کا دھرم اس کا دیس ہے جو انسان دیس پر جان لگا دے گا وہ پرماتما کی نظروں میں بہت اونچا ہو جائے گا۔ میں تمہیں یہ باتیں یونہی لکھ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ پر میں سب تمہیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ تم سوچ لو کہ میں بھی دھرم کی سیوا دیس کی سیوا کرنے کی کوشش کروں گا اور تمہارا بیٹا اپنی جان لڑا کر بھی وہ اونچا نام حاصل کر لے گا۔ دیکھو تو سہی پھر لوگ کہیں گے کرن کتنا بڑا آدمی تھا' کتنا اچھا آدمی' جس نے دیس کی سیوا میں گاندھی جی کے کہنے پر اپنا آپ لگا دیا۔ صرف ایک خیال آتا ہے تم گھبرا جاؤ گی تو مجھے دکھ ہو گا اور تم تو آج کل میرا خط خود پڑھتی ہو نا تمہیں پتہ لگ جائے گا کہ دیس کی سیوا کے لیے کچھ دان بھی دینا پڑتا ہے۔ تم نے ایک عرصہ سے خرچ نہیں بھیجا نا اور میں نے سُنا ہے گاؤں میں اناج

نہیں ملتا۔ پر میرا اپنا یہ خیال ہے بھگوان نے تمہیں دُکھ سے محفوظ رکھا ہوگا۔ ہمارے گھر تو سب کچھ ہے۔ تم بابا کی کوئی بات نہیں لکھواتی ہو، وہ تو اچھے ہیں؟''

تمہارا کرن

کرن کی ماں کنتی نے اس دن ادھیڑ تھ کو بھلا کر پھر سے یہ سوچنا شروع کیا کہ روپے کہاں سے ملیں گے۔ روپے کہاں سے آئیں گے۔ دیش بھگتی اور سیوا۔ گاندھی جی اور دھرم کے سارے لفظ اس کے سامنے دھبوں کی طرح تیر گئے۔ اسے صرف یہی یاد رہا کہ کرن نے خط میں روپوں کا ذکر لکھا ہے اور روپے کہیں نہ کہیں سے لے کر بھیجنا ہوں گے۔

اس شام کنتی کئی بار خالی ہاتھوں کوئی شے گروی رکھنے کے لیے نہیں، صرف قرض مانگنے مہاجن کے ہاں گئی۔

گھونگھٹ کی اوٹ سے اس نے دیکھا مہاجن کے چہرے پر بڑی ہی پاپی مسکان تھی۔ اس نے کہا: ''کُنتی رانی۔ روپے تو یونہی نہیں ہیں۔ دنیا سے الوپ ہوگیا ہے۔ تم کو خالی ہاتھوں میں کیا دے سکتا ہوں۔ کچھ لاؤ تو بات ہے۔''

اور کنتی نے کہا تھا: ''سیٹھ جی میرے پاس تو کچھ نہیں۔ میں تو ہر شے آپ کے پاس گروی رکھ چکی ہوں۔ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے اور کرن کو خرچ کی ضرورت ہے۔ تھوڑے دنوں میں کرن بابو بن جائے گا۔ آپ کے روپے واپس کردوں گی۔''

سیٹھ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا تھا: ''تمہارے پاس اب بھی بہت کچھ ہے کُنتی رانی۔ تمہیں پتہ نہیں ہے۔ صرف تمہارے پاس تمہاری مدُھر مسکان ہے۔''

اور کُنتی تڑپ کر یوں پیچھے ہٹی تھی، جیسے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ اسے اپنی بھی سدُھ نہ رہی۔ بے خیالی میں اسے گھونگھٹ کا بھی خیال نہ رہا۔ مہاجن ہنس رہا تھا۔ کنتی واپس چلی گئی۔

اس دن وہ سارا وقت کانپتی، روتی، تانبے کی طرح کے آسمان کو دیکھتی اور ہاتھ ملتی رہی۔ اس کی قسمت میں یہ بھی بدا تھا۔ اسے، بھگوان کو پکارنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ بس وہ کانپتی روتی اور ہاتھ ملتی رہی۔ اسے رہ رہ کر مہاجن کے لفظ یاد آتے اور پھر اس بخار کی سی کیفیت پر ایک اور خیال چھا گیا۔ کرن شہر میں بھوکا پھرتا ہوگا۔ کرن کے پاس روپے نہیں ہوں گے تو وہ کس سے مانگے گا۔ اپنے بچے کا سوکھا ہوا زرد چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ جو کہتا ماں دیکھو تو سہی تم نے مجھے روپے نہ بھیجے۔ گاؤں میں کسی کے پاس زہر منگانے کے لیے بھی پیسے نہ تھے۔ پجاری

جی اس کا سوال سن کر ہنس پڑے۔ بولے ''کنتی رانی کیا سوال ہے روپے کہاں سے آسکتے ہیں۔ سمجھتی ہو کتنا قحط ہے۔ اب تو کوئی مندر میں بھگوان کے سامنے بھی دان نہیں رکھتا۔ ہر طرف بھوک برستی ہے۔ ایسے میں تم کو روپوں کی ضرورت کیسے آپڑی۔ کرن لڑکا ہے۔ اپنا کام کسی نہ کسی طرح خود چلالے گا۔ تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔''

اور پھر ہر طرف سے مایوس ہو کر کنتی نے کہا کہ مہاجن نے تو کہا تھا' میرے پاس میرا اپنا آپ تو ہے۔ میری مدھر مسکان اور جیسے کسی نے اسے نئی ہمت دے دی ہو۔ وہ اٹھی اس شام اپنی پٹاری کھول کر اس نے برسوں کی پرانی لالی اپنے ہونٹوں پر ملی۔ اپنے گالوں میں تھوڑا سا رنگ لگایا۔ آنکھوں میں برسوں پہلے کا سوکھا کاجل ڈالا۔ وہ گجرا کئی بار اس کے آنسوؤں سے ڈھل ڈھل گیا۔ مگر اس نے اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح تسلی دی۔ ''میں یہ سب کرن کے لیے کر رہی ہوں۔ اپنے بیٹے کے لیے' وہ ٹھیک لکھتا ہے۔ مجھے اچھی اور دھرم کی سیوا کی باتیں کیا پتہ ہیں۔ میرا بیٹا جب بڑا آدمی بن جائے گا تو......'' وہ آگے کچھ سوچ ہی نہ سکتی تھی۔ کرن بڑا آدمی بن جائے گا' پر ایسے گھور پاپ کے بعد وہ اس کی ماں کہلانے کے قابل کیسے رہے گی اور کاجل نئے سرے سے اس کی آنکھوں سے چہرے پر پھیل گیا ہو۔

رات ہوگئی۔ وہ اپنے لالی والے ہونٹوں کو کاٹتی آنسوؤں کو آنکھوں میں واپس لاتی تیزی سے مہاجن کی حویلی کی طرف جارہی تھی۔ مہاجن نے پھر کہا: ''کیا لائی ہو کنتی رانی۔ روپے تو یونہی نہیں ملتے اور پھر آج کل تو روپے کا الوپ ہو گیا ہے۔'' اور کنتی نے لالٹین کی روشنی میں اپنا گھونگھٹ ہٹا دیا۔

اس رات تیزی سے گھر جاتی مٹھی میں روپے دبائے وہ سوچ رہی تھی کہ کرن کو روپے ناکافی ہوں گے' اسے یہ روپے کافی نہیں ہوں گے۔ جانے اسے یہ روپے کب تک مل سکیں گے۔ کرن کہیں آج بھوکا ہی نہ ہو' کرن کہیں آج بے کسی سے ہر آنے والے کو نہ دیکھ رہا ہو۔ اسے اپنے گھور پاپ کی کوئی سدھ نہ تھی اور آکاش پر سیاہ گھٹائیں تیزی سے جمع ہو رہی تھیں۔ سیاہی کے بطن میں بارش کے قطرے تھے۔ دنوں گزر گئے۔ کنتی میں کوئی شے ٹوٹ گئی تھی۔ کنتی میں کوئی حصہ مرگیا تھا۔ کنتی ایک زندہ لاش تھی۔ کنتی صرف کرن کی ماں تھی۔ روپے واپس آگئے کرن تو کہیں نہ تھا۔ نہ جانے کرن کہاں تھا۔ نہ جانے کرن کہاں ہوگا اور پھر اس کے اسکول سے کرن کے بڑے ماسٹر کا لکھا ایک خط آیا۔ کانگریس کی ستیہ گرہی جلوس میں وہ سب سے

آ گے تھا۔ اس کو گولی لگی تھی۔ سینے کو چیر کر گولی اس کے دل کو چھوتی پار نکل گئی تھی۔ وہ ایک دیش بھگت کی طرح آخری لمحے تک مسکراتا رہا۔ اس نے دیس کی سیوا کے لیے اپنی جان دی تھی۔ انہوں نے لکھا ہے دَھن ہے ایسی ماں جس کا پوت دیش کی آن کے لیے آزادی کی جنگ میں مارا گیا۔ آخر میں انہوں نے لکھا تھا کہ اس کا سامان اسکول میں محفوظ ہے۔ اس کا بابا یا ماں جب بھی چاہیں سامان لے جا سکتے ہیں۔

تو گویا اب کوئی بھی نہیں رہا۔ کرن بھی نہیں، ادھیر تھ بھی نہیں۔ تُلسی کے پودے میں سے جس ہنستے تھن تھنے بچے نے اپنی شریر آنکھوں سے اسے جھانکا تھا۔ وہ بھی چھپ گیا۔ یہ خواب ختم ہو گیا۔

پر زندہ بھی تو رہنا تھا اور چاروں طرف موت کہیں نہ تھی۔ زیست اناج کی طرح مہنگی اور صرف طاقت سے ہاتھ آ سکتی تھی۔ اس کے دامن میں تو عزت بھی نہیں رہی تھی۔ اس کا غرور بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ وہ تو ایک خالی ڈھانچہ تھا اور پھر کنتی نے دھندا شروع کر دیا۔ وہ کنتی رانی سے کنتی بائی بن گئی جس رات وہ کنتی سے بائی بنی ہے، اس رات ایک برس کے بعد بھگوان نے اپنی آنکھ کھولی۔ سوکھے کھیت سیراب ہو گئے۔ سوکھے گاؤں میں ہریالی واپس آ گئی اور اسی وقت پجاری جی نے مندر کے گھنٹے بجوائے۔ لوگ گاؤں کی گلیوں میں گھومنے لگے۔ خوشیاں پھر سے برسنے لگیں۔ زندگی نے پرواز کرنے کے بعد اونچی گھٹاؤں سے پھر دھرتی کو تاکا تھا۔

مگر کنتی بائی کے کھیت کو کون جوتے گا۔ کون بوئے گا اور اس کا تھا ہی کون؟

اور یہی کنتی بائی اس رات چھکڑے میں کراہتی بیمار اور موت کی راہ تاکتی ہوئی اسپتال میں آ کر مر گئی۔ کنتی کب مری اس کا کوئی نہیں کہہ سکتا اور مرنے کو شاید سوائے بھگوان کے کوئی نہیں جانتا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا، جو دولت چھپانے کی تھی، وہ اس نے لٹا دی۔

اور من موہن نے لکھا تھا میں سوچتا ہوں کہ میں کہیں بھی نہیں ہوں۔ ہم لوگ جو اپنے آپ کو اتنا بلند اور اونچا سمجھتے ہیں، ہم تو ذرّے بھی نہیں ہیں۔ اونچائی کہاں ہے، کیا وہ انسان کے دل میں ہے یا آکاش کی بلندیوں پر۔

اور میں بھی آج ستاروں بھرے آسمان تلے کھڑا اپنے کو ایک ناچیز ذرے کی طرح پاتا ہوں اور پھر بھی مجھے وہ عورت یاد آ رہی ہے جو ان تاروں سے بہت اونچی تھی۔ اتنی اونچی کہ تم یا میں

کوئی اس بلندی کی طرف دیکھنے اور اسے چھونے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ تم یا میں کوئی بھی اس عظمت کی طرف بڑھنے اور اس کا خیال کرنے کا نہیں سوچ سکتے۔

اور من موہن نے مجھے لکھا تھا' قربانی میں عظمت ہے۔ وہ قربانی جو محبت کے لیے کی جائے اس میں بڑائی ہے اور میں سوچتا ہوں وہ قربانی جو اس محبت سے بچنے کی خاطر کی جائے اس میں تو عظمت اور بڑائی سے زیادہ ایک رِفعت ہے۔ ایسی رفعت جس کی راہ میں ستارے گرد بن جاتے ہیں' کیونکہ وہ قربانی کسی نصب العین کی خاطر کی جاتی ہے۔ پر کوئی مجھے بتائے کیا ہمارا کوئی نصب العین بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارا یعنی فانی انسانوں کا یہی میرا تمہارا اور کنول کماری ٹھاکر کا کوئی نصب العین۔

میری اپنی زندگی تو الجھی راہوں سے بچنے میں صرف ہوئی ہے۔ میں خود تو ساری عمر اپنے پاؤں کے کانٹوں کو راہوں سے چُننے میں مصروف رہا ہوں۔ میں بتا چکا ہوں کہ میں بزدل ہوں۔ میں نے کسی نہ کسی طرح یوں تو سانس کی ڈوری کو ہاتھ سے پکڑے پکڑے ان شاہراہوں کی پیمائش کی ہے جن سے کنول گزری ہے۔ ایک سادہ دل دہقاں کی طرح جو بادشاہ کی آمد کی خبر سن کر صبح سے ہی راستے کے کنارے منتظر ہو۔ میں بھی اُن راہوں پر اس کے گزرنے کا نظارہ کرتا رہا ہوں۔ اس کے جلوس کا انتظار کرتا رہا ہوں اور آخر میں سوچتا ہوں یہ تو میری نگاہیں تھیں جو اس کے جلو میں انجمنیں دیکھتی تھیں۔ وہ تو تن تنہا اکیلی ہی راہبانہ زندگی گزار کر ان گزرگاہوں سے چپ چاپ چلی گئی پر میں نے کیا دیکھا؟ کیا میری نگاہوں نے جو دیکھا وہ ایک خواب تھا؟

انسان کی کوششیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ انسان لڑکھڑا جاتا ہے۔ مشکلات سے گھبرا جاتا ہے اور اسی لیے ذہنی شکست خوردگی سے نڈھال ہو کر وہ خواب دیکھتا ہے۔ کیا میں نے بیکار کے خواب دیکھے تھے؟ اور پھر بھی میں اس بات پر ایمان کی حد تک یقین رکھتا ہوں کہ کنول کماری ٹھاکر کا کوئی نصب العین ضرور ہوگا۔ جب اس کی کوئی منزل نہ تھی اسے کوئی ذاتی فائدہ مقصود نہ تھا اس نے اپنی زندگی اس طرح کیوں گزاری جیسے اس نے گزاری ہے؟ پر نصب العین لائحہ عمل اور مقصد تینوں لفظ مجھے کنول سے بڑے بے تعلق سے لگتے ہیں' اس لیے کہ جب کبھی میں نے کنول سے ذکر کیا ہے کہ انسان کی زندگی کا کوئی مقصد ہونا چاہیے۔ میری زندگی کا یہ مقصد ہے' انسان کی پیدائش کا مقصد ہے' تو وہ ہنس دیتی۔ بس اس کے ہنس دینے سے ہی مجھے اپنی باتوں کا جواب مل جاتا۔ یہ کنجوسی کی حد

تک مختصر جواب تھا۔ جو مجھے اپنے استفسار کے بدلے ملا۔ پر اس کے باوجود بھی میں نے دل میں ہمیشہ سوچا ہے کہ کنول کی زندگی کا ضرور کوئی مقصد ہوگا۔

میں نے کرشنا کو اور اسے اکثر بحث کرتے سنا ہے۔ کرشنا بھی زندگی کا ایک الگ نظریہ تھی۔ کُنتی کی طرح وہ صرف ایک ماں تھی۔

کرشنا نے ہمیشہ کہا ہے: ''کنولا رانی سنو میری بات۔ تخلیق کائنات کے متعلق کبھی پڑھا ہے؟''

اور کنول نے کہا: ''تخلیق کائنات کوئی ایسی چھپی ہوئی بات نہیں جس کے لیے کسی خاص مطالعے کی ضرورت ہو۔''

کرشنا نے پوچھا: ''نہیں تم اس کا مطلب نہیں سمجھتی ہو۔ تم وہ نہیں ہو جو میں ہوں۔''

کنول نے جواب دیا۔ ''بس تم اپنے آپ کو اس لیے مکمل سمجھتی ہو کہ تم نندلال کی ماں ہو۔''

کرشنا نے کہا: ''اگر تم ہر بات میں نندلال کو گھسیٹ لاتی ہو تو یہی سہی میں نند کی ماں ہوں۔ میں یشودھا ہوں سمجھیں اور ماں سے بڑھ کر تخلیق کی بلندی کو سمجھنے کی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ تم وہ گتھیاں نہیں سلجھا سکتیں جو تخلیق میں حصہ لے کر خود بخود سلجھ جاتی ہیں۔''

کنول نے کہا: ''میں ایسے رازوں کو راز ہی نہیں سمجھتی جو کسی دور میں جا کر خود بخود سلجھ جائیں۔''

کرشنا نے تھک کر کہا: ''تم صرف ضدی ہو کنولا۔ میں تمہارے لیے اور کوئی لفظ استعمال نہیں کر سکتی اور وہ جیسے مارے تھکن کے سر جھکا کر کرسی کے بازو پر جھک جاتی۔ پھر جیسے کسی کو کوئی بات یاد آئے۔ ایک آخری حربہ' کوئی آخری داؤ۔''

''دیکھو کنولا رانی اپنے مالی کو دیکھو' کتنا بوڑھا ہے' کتنے زمانوں سے تمہارے ساتھ ہے اور پھر بھی اپنے کمزور بازوؤں پر سیڑھی اٹھائے' پودوں کی رکھوالی کرتا' درختوں کے زرد پتوں اور سوکھی شاخوں کو کاٹتا پھرتا ہے۔ نئے بیج بوتا ہے' تمہارے کالج کے آس پاس سب کوٹھیوں میں اس کے دیئے ہوئے پودوں سے رونق ہے۔ وہ تو کسی پر بھی بھروسا نہیں کرتا۔ وہ زمین کو خود کھودتا ہے اور جب ہر طرف نئے پھول کیاریوں میں لہلہانے لگتے ہیں تو اس کی دل کی کیفیت ایک ماں کی سی ہوتی ہوگی جو اپنے دل میں اپنے بچوں کو بڑھتے پھلتے پھولتے پروان چڑھتے پا کر ہوتی ہے۔''

میں نے کہا: ''نہیں' تم صرف ''ماں'' ہو اور تمہیں چاند بھی ماں لگتا ہے۔ تمہیں سورج

کی دُھوپ سے لے کر اندھیرے کی دوڑ تک سب ایک ماں کی طرح لگتے ہیں اور سنو تو سہی کرشنا بوس کبھی یہ تو سوچو تم ماں سے الگ ہو کر ایک عورت ہو کر بھی زندہ رہ سکتی ہو۔ بھائی میری بات مانو کبھی کبھی ہی سہی ایک الگ حیثیت سے بھی جینے کی کوشش کرو۔ کبھی ہی دن میں ایک بار ہی سہی نند کے خیال سے چھپ کر صرف ایک عورت بن کر دنیا کو دیکھا کرو۔ پھر تمہیں معلوم ہو کہ جینے کے لیے صرف ماں ہونا ہی ضروری نہیں ہے......اس دن اس نے جھک کر ایک منحنی سی ذرا سی تصویر اٹھالی......اور بولی یہ تصویر یہاں پمی چھوڑ گیا ہو گا نا۔''

''ہاں۔'' کرشنا نے کہا۔ ''تم پمی سے بات کرتی نہیں ہو اور تم کیا جانو۔'' اس نے بات کو ادھورا چھوڑ دیا۔

''میں کیا جانوں پمی کون ہے۔ ہے نا کرشنا بوس۔'' کنول نے ہنس کر کہا۔ ''تم بھی کیا جانو پمّی کون ہے؟ پمّی تو مالی بابا کے بیج سے اگا ہوا ایک ننھا پودا ہے جس کو تم سب طرف بکھرا پاتی ہو۔'' اور کرشنا نے حیرت سے دیکھا تھا۔

''بھئی ہر بات کا مذاق اڑانے کی عادت اچھی نہیں کنولا سمجھیں۔ یہ عادتیں تم نے مس رام کے ورثے میں پائی ہیں۔''

''ہاں ہاں کچھ اور کہو کرشنا بوس۔'' کنول نے جھک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے مس رام کی عادتیں ورثے میں پائی ہیں۔'' اور وہ ہنس دی۔

''یوں مت ہنسو۔'' کرشنا نے تقریباً بسورتے ہوئے کہا۔ ''مس رام تمہاری ہی طرح کی عظیم عورت تھیں جو اتفاقاً مر گئیں۔ ورنہ تمہاری طرح کے لوگوں کی زندگی بہت لمبی ہوتی ہے۔''

اور کنول نے کہا: ''مس رام ذرا سی مر گئی ہیں۔ ویسے تو زندہ ہیں۔ چاہے میرے وجود میں ہی ہوں۔'' وہ ہنس رہی تھی۔

''ٹھیک کہتی ہو۔ وہ عورت جو تمہارے وجود میں زندہ ہے مس رام کے وجود میں بھی زندہ تھی۔ حیرت انگیز طور پر جاگ رہی تھی۔ جب سب حسیں سو گئیں تو وہ عورت جاگتی رہی تھی۔''

کنول نے اس کی بات کاٹ کر کہا: ''اور وہ عورت یقیناً ماں ہو گی جو اتفاق سے مجھ میں بقول تمہارے زندہ نہیں؟ کیوں کرشنا بوس؟'' اور کرشنا نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

''دیکھو کنول قدرت کے قوانین کا مذاق اڑانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ قدرت اپنا انتقام زود یا بدیر لیتی ہے۔ جیسا اس نے مس رام سے لیا ہے۔''

''ہر بات میں مس رام، مس رام، میں تو ان کا نام سنتے سنتے تھک گئی ہوں بھائی۔ جس دن سے وہ پرلوک سدھاری ہیں، ہمارے گھر میں وہ حیرت انگیز طور پر زندہ ہوگئی ہیں۔ وہ نہانے سے لے کر کھانے تک سارے لوازمات میں گھسی ہوئی ہیں۔''

''میرا خیال ہے کرشنا۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''ان کا بھوت تمہارے سر پر سوار ہو گیا ہے۔''

''بھئی کوئی اچھی بات بھی کیا کرو، بھوت کی باتیں کون کرتا ہے۔ کیا تمہیں بھوتوں میں یقین ہے؟''

''پہلے تو نہیں تھا، اب ہو گیا تھا۔ جب سے مس رام مری ہیں، مس رام کا بھوت اب سارا وقت ہمارے گھر میں رہتا ہے۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''کنولا رانی۔'' کرشنا نے پھر کہا تھا۔ ''بری بات ہے۔ کسی کا مذاق نہیں اڑاتے......

اور پھر جیسے وہ مریں بیچاری ان کا کوئی تھا نہ کوئی پُرسانِ حال، اسکول کے بورڈنگ میں اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے ان کی جان نکل گئی اور پھر وہ ان کے خطوں اور پرانی چیزوں کے الم غلم ڈھیر جو الماریوں سے نکلے ہیں۔ ان کو جنون ہو گیا تھا۔ تنہائی عذاب اور مصیبت نے ان کو نیم پاگل کر دیا تھا۔ کسی سے بولتی نہ تھیں۔ کسی سے بات نہ کرتیں وہ تو میری قسمت اچھی تھی ورنہ لوگ تو کہتے تھے وہ پرانی دوستوں سے بات نہیں کرتی تھیں۔ کبھی کسی کو پہچان کر بھی انہوں نے کبھی کسی کا نوٹس نہیں لیا اور میں تو رشک کرتی ہوں اپنے پر۔ مخبوط الحواس مس رام نے مرتے سمے مجھے یاد کیا۔ کیا ہی خوش گلو اور خوش لباس عورت تھیں۔ بھائیوں نے مدتوں زور دیا کہ شادی کر لو، اپنا گھر آباد کرو۔ بڑھاپے میں کوئی سہارا تو ہوگا۔ نہیں مانیں۔ ان کا خیال تھا زندگی کسی دوسرے انسان سے مل کر دُوئی میں بدل جاتی ہے۔ آخری دنوں میں سُنا ہے راتوں کو رویا کرتی تھیں۔ پر یہ بھی تو بڑی بات ہے۔ ان کو روتے کسی نے کب دیکھا ہوگا اور میں کہتی کنولا رانی کہیں یہ حال تمہارا نہ ہو۔''

''خدا جانے تم کیا سمجھتی ہو شادی کو اور جنسی محرومی کو۔ کیا نجات کا صرف یہی راستہ رہ گیا ہے۔ بقول تمہارے کیا تم نے بوڑھی عورتوں کو اس طرح بیزار اور اداس نہیں دیکھا۔ کیا اولاد کا منہ دیکھنے کو ترستی عورتیں نہیں دیکھیں۔ اپنا حال ہی دیکھ لو اور پھر بھی تم ماں ہو، تم کو ان محرومیوں سے مفر نہیں ہے۔ محرومیاں عبادت میں ناکامی سے اور ناکامی کوئی بھی انسان کسی دور میں کسی تکلیف کی وجہ سے اٹھا سکتا ہے۔ زندگی کا پس منظر جنس اور صرف جنس ہی نہیں ہے۔ پھر میں نے کب انکار کیا

ہے کہ جنسی محرومی انسان کو وقت سے پہلے مضمحل نہیں کر دیتیں۔ پر اس کے علاوہ بھی تو اور کچھ ہیں۔ جو خوشیوں کے سوتوں کو ڈھانپ سکتے ہیں۔''

''میں تم سے جیت نہیں سکتی بھائی۔'' کرشنا نے کہا۔ ''میں تو صرف یہ سمجھتی ہوں کہ ماں بننا بھی ایک آدرش ہے۔ ایک رفعت ہے۔ ایک بلندی ہے۔ تم پڑھی لکھی عورت ہو میں تم سے بحث نہیں کر سکتی۔''

''بس یہ ہیں تمہارے ہتھیار کرشنا بوس۔ جب تم بات نہیں کر سکتیں تو مجھے پڑھا لکھا کہہ دیتی ہو۔ پڑھا لکھا تو جانے کون ہے۔''

''شروع ہو گئی اتراہٹ اب اگر میں تم سے کہوں نہیں کنولا رانی تم واقعی ہی پڑھی لکھی ہو میں سوگند اٹھا کر کہتی ہوں تم سے بڑا اور کوئی نہیں پھر تو مانو گی۔''

اور اس بحث میں ہمیشہ یا تو چائے آ جاتی یا کسی تصویر کا ذکر ہو جاتا یا شہر کی کسی ہونے والی بڑی تقریب کا۔

کنول ٹھاکر تقریبوں سے گھبراتی تھی۔ وہ بہت کم جلسوں اور مجلسوں میں حصہ لیتی تھی۔ لوگ اس کو اس کا غرور اور جانے کیا کچھ کہتے ہوں، پر میں تو اسے اس کی قدرتی جھجک سمجھوں گا۔ اس نے بہت کم اپنے آپ سے کسی کالج سے باہر کی تقریب میں جانے کی رضامندی ظاہر کی ہے اور پھر بھی کوئی ایسا نہیں تھا جو کنول ٹھاکر کو نہ جانتا ہو۔ اگر کسی کا مشہور ہونا اور ہر دلعزیز ہونا اس بات میں ہے کہ اسے لوگ جانتے ہوں تو میں کنول کو ایک بہت شہرت یافتہ عورت کہوں گا۔ قدرت کی شکتیوں کی طرح لوگوں نے بھی اسے راستہ دیا ہے۔ وہ ہر ایک سے وہی بات کہہ سکتی تھی جو اسے سننے کی سب سے بڑی تمنا ہو اور اس کے باوجود اس نے کبھی کسی کی جھوٹی تعریف نہیں کی، کسی کی خوشامد نہیں کی۔ شاید کنول کی نگاہوں میں وہ قوت تھی جو مقناطیس کی طرح انسان کی نیکیوں کو ہی سطح پر لے آتی ہے۔ وہ دوسروں سے ملتے ہوئے اپنا آپ بھول جایا کرتی تھی اور اس کے باوجود وہ ایسی عورت تھی جسے اپنا آپ ہمیشہ یاد رہتا تھا اور اس لیے وہ اپنی بات کرنے سے گریز کرتی تھی۔ اس میں دھوپ کی شکتی تھی جو بڑے انسانوں کے سینے سے بھی دھرتی کی پوشیدہ طاقتوں کی طرح نیکی باہر سے آتی ہے اور میرا خیال ہے اگر کنول ٹھاکر کسی کی طرف متوجہ ہوتی تو شاید اس کی ساری ہستی فنا ہو کر رہ جاتی اور شاید اسے اپنی طاقت کا احساس تھا کہ اس نے کبھی ایک لمحے کے لیے کسی کی طرف جھکنا پسند نہیں کیا اور اس کے باوجود وہ ہر ایک کے لیے محبت تھی۔ وہ راحت تھی، ایک ایسی

چمک جس سے چیزیں اپنے قدرتی اصل اور سچے روپ میں ظاہر ہو سکیں۔

میں زندگی میں صرف ایک شخص کو جانتا ہوں اور راجندر پرشاد کو جس نے کنول ٹھاکر کو اس کے وجود سے الگ کر کے ایک عورت کے روپ میں چاہا ہے اور میں حیران ہوتا ہوں۔ اس میں کتنی چمک ہوگی۔ راجندر پرشاد نے جس نے کنول ٹھاکر کو چاہنے کا جتن کیا اور محبت کی محرومی نے جس کو ان راہوں پر لگا دیا، جن پر ایک عام آدمی لگ نہیں سکتا۔ کنول ٹھاکر نے ہر ایک کو اپنی محبت میں پناہ دی ہے اور پھر بھی اس نے کسی سے محبت کی؟ کنول ایک لمحہ ہے اور پھر کنول اتنی آسان ہے، اتنی آسان۔

نیرا سے میں کنول کے بعد ملا ہوں۔ صرف ایک بار۔ میرا مطلب ہے جب ہم ان آگ کی محرابوں سے پار ملے ہیں۔ آگ کی محرابوں کے دوسری طرف جہاں ہم سب مل چکے ہیں۔ اور نیرا سے، مجھے معلوم ہوا کہ کنول تو اس سے بھی عظیم تھی۔ جتنا ہم اس کو جانتے تھے اور اس کے باوجود وہ ایک بڑی ہی سادہ عورت تھی۔ بالکل نیرا کی طرح، شوبھا کی طرح ایک عورت۔

مجھے ایک دن یاد آ رہا ہے اور دنوں کی طرح بالکل معمولی سا دن۔ سہ پہر کو میں یونہی دفتر میں اپنے معمول کے مطابق گیا تاکہ کام کی رفتار دیکھ لوں۔ اخبار ترقی کر چکا ہے، میرا اپنا ذاتی اخبار۔ ہندوستان کے کونے کونے میں اس کی خبروں کی صحت مندی اور مضامین کی برجستگی، سچائی اور اصولوں کی پابندی کو سراہا جاتا تھا مگر اخبار نے یہ شہرت ایک مدت کے بعد حاصل کی تھی۔ میں نے ایک مزدور کی طرح برسوں دفتر میں بیٹھ کر رات اور دن اپنے ٹکڑے کی طرح اخبار کو ایک زندہ حرکت سمجھ کر اس کے لیے کام کیا ہے۔ کوئی کام بھی ہو، کامیابی ایک دن میں اور آسانی سے میسر نہیں ہوتی۔ میں نے اپنی ان تھک کوششوں اور محنت شاقہ سے اپنے اخبار کے لیے وہ مقام پیدا کیا تھا، نئے عملے کی تقرری کے بعد بھی میں نے برسوں ہر روز ایڈیٹر کے ساتھ مل کر خود خبروں کی صحت عبارت اور تصحیح کا کام کیا ہے۔ کبھی کبھار تو مجھے لگتا ہے میں نے بینا کو اور اخبار کو ایک ہی پروان سے پار چڑھایا ہے۔ بینا کو تو میں کام کے ریلے میں مصروفیت کے عُمق میں بھول بھی گیا ہوں، پر اخبار تو میرا خواب اور میرا سانس تھا۔ اخبار کو میں کبھی نہیں بھولا ہوں۔ اخبار میرے لاشعور میں دولت کے حصول کا ذریعہ نہیں تھا۔ شہرت کے لیے ایک زینہ نہیں تھا۔ دفعۃ الوقتی اور زندگی کو کسی نہ کسی طرح گزارنے کا ایک سہارا نہیں تھا۔ اخبار تو میرے دل کی ان تمناؤں کی زندگی تھا جو اساس

تھیں جو فرض سے بھی بڑھ کر میرا اپنا آپ ہی بن گئی تھیں۔ میں ایک کامیاب انسان ہو کر بھی آخر میں اپنے آپ کو کامیاب نہیں سمجھ رہا۔ میرا کام تو ایک مالی کی طرح کا' اگر ہرے بھرے باغ کی چند دن خبر گیری نہ کی جائے تو اس میں فضول گھاس اگ آتی ہے اور جھاڑ جھنکاڑ سے خوبصورت راستے ڈھنپ جاتے ہیں۔ میں نے اپنے کاموں میں ایک سچی محویت کے ساتھ دلچسپی لی ہے۔ کام میں' میں ہمیشہ کام بن کر رہ گیا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو بھلا دیا ہے۔ اخبار کے لیے اگر مجھے کسی در پر سوالی بن کر جانا پڑا ہے تو میں نے اس سے گریز نہیں کیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ میرا ذریعہ معاش تھا بلکہ اس لیے کہ وہ میری زندگی کا دورانِ خون تھا۔ وہ میرا دل تھا اور مجھے اس بات سے بھی ہمیشہ ایک گونہ تسلی نہ رہی کہ میرے دفتر میں بیٹھے لوگوں نے کبھی اپنے آپ کو میرا تنخواہ دار ملازم نہیں سمجھا۔ انہوں نے بھی ہمیشہ اخبار کو اتنی نرمی سے اپنے دل میں جگہ دی ہے جیسے یہ اخبار ان کی آخری خواہش اور سب سے بڑی تمنا ہو۔ میں نے اپنے دفتر میں بیٹھے اکثر دل کی تیز دھڑکن کے ساتھ سنا ہے کہ دفتر کے چپڑاسی تک سے جب اخبار کا ذکر کیا جائے تو وہ اپنے سر کو فخر سے بلند کرے' اپنی آواز میں ایک خاصیت پیدا کر کے بات کرے گا۔ گویا اخبار کسی اور کا نہیں۔ صرف اس کا اور اس کا ہے جیسے اخبار اور خبروں کا خلاصہ۔ مضامین شائع کرتے اور حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کرنے کا ایک آلہ نہیں اس کا کوئی بچہ ہے۔ اس کو سب سے عزیز اور سب سے پیارا۔ میں نے ایڈیٹر سے لے کر پرنٹر اور کاتب تک کو باتیں کرتے' سن کر سوچا تھا' اب اس اخبار کا کام کبھی بگڑ نہیں سکتا۔ یہ سب لوگ اس کے لیے اپنی بہترین کوششیں صرف کرتے تھے اور اس کے باوجود مجھے معلوم ہے کہ روایات میں نے خود بنائی تھیں۔ روایات ایڈیٹر نے بنائی تھیں' روایات اس چپڑاسی نے بنائی تھیں جو دفتر سے بیٹھ کر آنے والے کا خیر مقدم کرتا اور اس سے بات کرتے ہوئے اسے راستہ دکھاتے وقت یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ایک بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا اپنی حکومت کے سرسبز و شاداب علاقوں کا ذکر کر رہا ہو۔ آنے والوں کو بتا رہا ہو کہ ان جگہوں میں یہ خصوصیت ہے اور اس کے باوجود لوگ میرے عملے کے اخلاق کو سراہتے اور ان کی عادات کی تعریف میں رطبُ اللسان رہتے تھے۔ ایڈیٹر سے لے کر معمولی اخبار بیچنے والا ملازم لڑکا اپنی آنکھوں میں خواب لیے گھومتا تھا اور یہ خواب میں آج بھی فخر سے سر اونچا کر کے کہتا ہوں ان کو اخبار نے دیئے تھے۔ اخبار جو میرے خون سے پروان چڑھا تھا۔ اخبار تو میرا سانس تھا۔ اس سہ پہر کو میں معمول کے مطابق دفتر کا ایک چکر لگا کر واپس جانے والا تھا۔ دوسرے کمرے میں خبروں کے ایڈیٹر کا دفتر

تھا۔ رپورٹر آ رہے تھے۔ کسی نہ کسی دفتر میں ہر لمحے فون کی گھنٹی بجتی۔ ہیلو ہیلو کی آوازیں آتیں اور پھر بھی خاموشی تھی۔ تیز تیز چلنے والے ملازم بھی قدموں سے آواز نہیں نکالتے تھے۔ جیسے دفتر کوئی شیش محل ہو۔ جہاں بولنے اور تیزی سے چلنے کی ممانعت ہو۔ سب لوگوں نے اپنے اپنے اصول خود ہی بنا لیے تھے۔ مجھے کبھی کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں پڑی، کبھی نہیں۔

نیوز ایڈیٹر کے کمرے سے بولنے کی آواز آئی۔ ''نہیں یہ خبر ٹھیک نہیں ہو سکتی یہ خبر غلط ہے۔'' اور رپورٹر کہہ رہا تھا: ''میں نے خود اس کی صحت مندی اور غلطی کے متعلق پوچھ لیا ہے۔ میں نے اس کو اچھی طرح چیک کیا ہے، یہ خبر غلط نہیں ہے۔''

پھر تھوڑی دیر خاموشی رہی اور پھر آواز آئی: ''مگر سمجھ میں نہیں آتا یہ بات کس طرح ممکن ہو سکتی ہے۔'' آواز میں بے یقینی بہت تھی۔ جیسے بات کی صحت پر نہیں واقعہ کی صحت پر اعتماد نہ ہو۔ میں حیران ہو رہا تھا۔ بات کیا ہو سکتی ہے۔ کون سی ایسی خبر ہے جس پر نیوز ایڈیٹر اور رپورٹر متفق نہیں ہو رہے ہیں۔

پھر چند لمحوں کے بعد میرے کمرے پر بڑے مؤدّب طریقے سے کسی نے دستک دی۔

میں نے کہا: ''اندر آ جائیے۔''

نیوز ایڈیٹر نے آ کر وہ خبر میرے سامنے رکھ دی۔ راجندر پرشاد سکسینہ نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اسے معلوم تھا راجندر میرا بڑا گہرا دوست ہے۔ وہ ذاتی طور پر بھی اسے جانتا تھا اور اس لیے وہ حیران ہو رہا تھا کہ حکومت کے ذمہ دار عہدہ پر متمکن شخص جو محکمے میں فی الواقع ترقی کر رہا ہو، کس طرح ایسے اقدامات کا ذمہ دار ہو سکتا ہے، یقیناً یہ خبر غلط ہے۔

میں کافی دیر تک اپنے سامنے پڑے کاغذ کو دیکھتا رہا۔ مجھے بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر میں نے کہا۔ ''رپورٹر کو بلاؤ۔''

رپورٹر پتلا دبلا بڑا محتاط اور ذہین آنکھوں والا شخص تھا۔ اس نے رپورٹر سے چل کر بہت ترقی کی ہے۔ وہ اب بھی کہیں ضرور اپنی ذہانت اور لیاقت سے ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہو گا۔

میں نے کہا: ''گنپت یہ خبر تم لائے ہو؟''

''جی ہاں!'' اس نے ذرا سر جھکا کر میری بات کا جواب دیا۔

میں نے اور کچھ نہیں پوچھا۔ پر میرا دل کہہ رہا تھا۔ راجندر کو اس فیصلے پر کسی ایسی شے

نے مجبور کیا ہوگا جو فوری اور پھر بھی اپنا اثر کرنے میں گہری ہو۔ راجندر کو اپنے کام، اپنے عہدے کے ساتھ ایک عشق تھا۔ وہ سطحی لگاؤ نہیں جو حکومت کے ذمہ دار افسروں کو اپنے کام سے وقتی دلچسپی کی وجہ سے ہو جاتا ہے۔ اسے اپنے کام کا احساس تھا۔ وہ ان تھک محنت کرنے والا اور کبھی گھبرانے والا نہ تھا۔ جذباتی تو وہ کسی صورت میں نہیں ہو سکتا۔ مشکل سے مشکل وقت میں، میں نے اسے اپنے فیصلوں پر مضبوطی سے کاربند دیکھا ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب اسے دوراہوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا اور اس نے اپنی راہیں کبھی بے یقینی سے نہیں چنیں۔ اس نے اپنے دل کے معاملوں میں بھی کبھی جذبات کا ساتھ نہیں دیا اور اسی لیے اس نے اپنی چاہت کے لیے بھی کنول کماری کو منتخب کیا تھا مگر لوگوں کی طرح سطحی آدمیوں کی طرح وہ اپنے عشق کا تذکرہ کبھی نہیں کرتا۔ اس نے مجھ سے بھی کبھی اپنے دل کی بات نہیں کی۔ وہ قبر کی طرح خاموش اور سمندر کی طرح گہرا تھا۔ اسے اپنی طاقتوں پر یقین تھا مگر اتنا نہیں کہ وہ اسے غلط راہوں پر چلا دیں۔ مگر پھر بھی اس میں ایک کام سے پیار کرنے والے سچے انسان کی سی بے باکی تھی۔ وہ بڑے اندھیرے میں کود جانے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اندھا دھند نہیں کھلی آنکھوں سے دیکھا کرتا کہ وہ اندھیروں کے رازوں کا پتہ چلا سکے۔ میں جب بھی اس سے ملا ہوں سیاسی گفتگو جب بھی چلی ہے ہندوستان کا مستقبل جب بھی سامنے آیا ہے۔ اس نے ہمیشہ کہا ہے کہ جب وقت آئے گا تو میں کسی سے پیچھے نہیں رہوں گا۔ میں غیر ملکی حکومت کے نمبردار کی حیثیت سے جب تک اپنے ملک کی خدمت کر سکتا ہوں کر رہا ہوں اور جب میں سوچوں گا کہ میرے لیے کام کرنے اور آگے بڑھنے کا وقت آ گیا ہے تو میں کسی سے پوچھے بنا اپنے دل کے فیصلے پر چلوں گا۔ اسے اپنے ملک سے عشق تھا، راجندر پرشاد کو۔ راجندر کو جانتے ہوئے اس کے استعفیٰ کی خبر سن کر آنے والے حالات سے پریشان نہ ہونا ناممکن تھا۔ میں نے سوچا کہ اب کوئی بات کہنا بے فائدہ ہے۔ خبر اگر اخبار میں نہیں چھپے گی، پر منظرِ عام پر آئے گی تو ضرور اور اس لیے اس کو روکنا بے فائدہ ہے۔ میں نے نیوز ایڈیٹر اور رپورٹر کو اجازت دے دی۔

اِسی صبح مجھے ڈون وارٹن کا فون آیا تھا کہ شام کو ہم چند تصویریں دیکھنے کسی انگریز کے ہاں جا رہے ہیں جو حکومت کے ایک عہدے پر فائز اور وارٹن کا ایک نیا ملاقاتی تھا۔ ڈون وارٹن کی ملاقات لوگوں سے ہمیشہ کتابوں اور تصویروں کے سلسلے میں ہو جاتی تھی۔ اسے میرے پاس یہاں دفتر ہی آنا تھا اور اس لیے اس خبر کو سن کر بھی بجائے راجندر کے پاس جانے کے میں وہیں بیٹھا اور

وارثن کا انتظار کرتا رہا۔ عوام اور تمام تر ہندوستان بیدار ہو رہا تھا۔ اس بیداری میں وہ کیفیت نہیں تھی جو پلنگ پر لیٹے لیٹے خواب میں جاگ کر پھر سو جانے والے کی ہوتی ہے۔ یہ تو تخلیق کا دکھ تھا۔ ماں کا دکھ، جب وہ کراہتی ہے اور پھر بھی نئے پن کی کیفیت سے سرشار ہوتی ہے جو کھلی آنکھوں سے خندہ پیشانی سے اپنا دکھ برداشت کرتی ہے اور پھر بھی اسے درد بیتاب کرتا ہے۔

پہلی کروٹوں میں اور اس میں فرق تھا اور پھر بھی ہم سب پریشان تھے۔ غیر ملکیوں نے اپنا داؤ چلا دیا تھا۔ ان کا وار خالی نہیں گیا۔ صدیوں سے ملک میں رہنے والے پھوٹ کی وجہ سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ مسلمان اور ہندو کا سوال روایتوں کا سوال ہے۔ الگ تمدن کا سوال درپیش تھا اور جذباتی عوام اس کو ایک مذہبی رنگ دے رہے تھے۔ راجپوتانے کے شور بیروں نے اکبر اور اورنگ زیب کے درباروں میں داد دینے کے بدلے انعامات حاصل کیے تھے۔ مغلوں کے درباروں میں ہندو اور مسلمان سر جوڑ کر حکومت کے مسائل پر غور کرتے رہے تھے۔ پھر غلامی کا ایک دور آیا۔ انگریزوں نے ملک کو تباہی کے بیج بو کر کاٹنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ ہر روز جلسے ہوتے، جلوس نکالے جاتے اور مادرِ ہند کے حصے بخرے کرنے کے لیے تیاری ہونے لگی۔ صدیوں کے بھائیوں کو ایک دوسرے کے خلاف شکایت ہونے لگی۔ ریزولیوشن، نعرے، اشتعال انگیز تقریریں، جذباتی حد بندیاں اور سب اتنے دکھ سے منتظر تھے۔ بظاہر مطمئن دلوں کے ساتھ ہم لوگ مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ ایک دوسرے کا نہیں اپنا۔ ہم اپنے آپ کو اپنے وجود سے اپنے خول سے باہر نکل کر ایک فاصلے پر ملنا چاہتے تھے تاکہ جذبات ہمیں اندھا نہ کر دیں اور پھر بھی حکومت ہمیں ایک چٹان کی طرح کھینچنے کے لیے جاتی تھی۔ ہم اندھا دھند بھاگ رہے تھے، موت یقینی تھی۔ اگر موت نہیں تو کم از کم ایک عرصے کے لیے ہمارے دست و بازو تو ناکارہ ہونے والے تھے۔ ہمارے اردگرد بھی امن تھا، مگر باہر سے خبریں آ رہی تھیں، فسادات ہو رہے تھے، جگہ جگہ سے لوگ ایک دوسرے کے گلے کاٹتے گھروں کو آگ لگاتے اور ہجوم کی صورت میں بڑھ رہے تھے۔ مسلمان اور ہندو دونوں جاتیوں کے لیڈر سوچ رہے تھے۔ روز خبروں سے گھبرا کر اپنے بیانات دیتے اور پھر بھی حالات اسی طرح سے جاری تھے۔ حکومت امن کروانے کی کوشش میں درپردہ اتنے تنخواہ دار ملازموں کے ذریعے واقعات کو ہوا دے رہی تھی اور ہم سب سوچ رہے تھے، شاید امن ہو جائے، شاید ہم لوگ مرنے سے بچ جائیں۔ باپ کے مرنے پر جس طرح جائیداد کے حصے بخرے کیے جاتے ہیں، کچھ وہی حالت ہماری تھی۔ ہمارے دماغ معطل ہو چلے تھے۔

سوچ اور مصیبت کے احساس نے ہمارے ذہنوں کو کند کر دیا تھا اور اس کے باوجود بظاہر ایک سکون تھا۔ پر جسم کے ایک حصے کو اگر کوئی تکلیف پہنچے تو سارا جسم درد محسوس کرتا اور بے چین ہوتا ہے۔ ویسی ہی حالت ہماری تھی۔ اس کے باوجود کہ سب کام ابھی اسی سلامتی سے چل رہے تھے، دل کھوکھلے ہو چکے تھے مگر چہروں پر ہنسی تھی۔

اور اب ڈون وارٹن کا انتظار کرتے ہوئے اپنے دفتر کی چمکیلی میز کی طرف دیکھتا، میں سوچ رہا تھا۔ کیا راجندر کے لیے وقت آ گیا ہے۔ کیا ہم سب کے لیے بھی کام کرنے اور سوچنے سے زیادہ عمل کا وقت آ گیا ہے۔ کیا بالآخر ہم کو دشمن سے روبرو ہو کر دستی جنگ میں حصہ لینا ہوگا۔ پر ہمیں کرنا کیا ہے۔ دشمن نے راہیں مسدود کر دی ہیں۔ ہم کس طرف بڑھ سکتے ہیں۔ ہمارے لیے امن کی کون سی راہیں خالی ہیں۔ کیا ایسے میں ہندو مسلم سے اونچے ہو کر ہم کو محض انسانوں کی طرح کام کرنے کا کوئی موقع مل سکے گا؟ یہ سب سوال پریشان کُن تھے مگر پھر بھی ضروری سوال تھے ان سے رہائی کسی طرح بھی نہیں مل سکتی تھی۔

عوام جذبات سے مغلوب ہو کر اندھا دھند جلوس نکال رہے تھے اور ایک مذہبی جنگ کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ بڑے بڑے انقلاب عوام کے مرہونِ منت ہوتے ہیں اور عقل سے زیادہ انقلاب کا ذمہ دار جذبہ ہے۔ وقتی شوق ایک ذوق اور اس لئے سے اونچے اٹھ جانے کی ایسی تمنا جو ساری روح کو نگل لے جو وجود کو کہیں نہ رہنے دے، جس میں انسان پگھل جائے اور عقل مند آدمی، ٹھنڈے دل سے چیزوں پر صورتِ حال پر غور کرنے والے انسان کبھی بھی انقلابوں اور تاریخوں کے مؤجد ان کو بدلنے والے نہیں ہوا کرتے۔ کام کے لیے تھوڑے سے جنون کی ضرورت ہے، ایک دیوانگی کی ضرورت ہے۔ عام لوگ اس دیوانگی کو پیدا کر سکتے ہیں اور دلائل پر عمل کرنے والے سوچنے والے آدمی کبھی بھی اپنے کو زمان و مکان کی ان قیدوں سے الگ نہیں کر سکتے۔ ہماری تہذیب اور سوچ ہم کو سلامتی کی شاہراہوں پر لے جاتی ہے پر دہقان جنگل کی پُرپیچ گھنی آبادی سے اپنی راہ نکال لیتے ہیں۔

اور پھر بھی سوچ رہا تھا راجندر تو عوام میں سے نہیں ہے۔ وہ کبھی جذبات سے مغلوب نہیں ہوا۔ پھر کون سے انسانیت کے تقاضے نے اس کو اس عمل پر، اس فوری اقدام پر آمادہ کیا ہے۔ اور پھر وہی سوال، کیا آخر میں میرے لیے بھی وقت آ گیا ہے میں کیا کر سکتا ہوں؟ ہر انسان اپنے حلقے میں اپنے ماحول کے سازگار ہونے سے یہ سوچتا ہے کہ وہ جو کچھ عوام کے لیے کر رہا ہے، کافی

ہے۔ اس کا اپنا بھی تو کوئی حق ہے۔ اس کا اپنا بھی تو کوئی وجود ہے۔ وہ خود بھی تو زندہ ہے۔ عام حالات میں ہر انسان اپنے متعلق پہلے سوچتا ہے اور ہنگامی حالات میں بھی ہر انسان اپنے متعلق پہلے سوچتا ہے۔ ہر صورت میں اجتماعی زندگی کا ساتھ دیتے ہوئے بھی' یہ اپنا تحفظ ہوتا ہے جس سے انسان عمل کرنے اور کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے' اپنی سلامتی اپنا امن ہی مقصود ہوتا ہے۔ کیا راجندر نے اپنے متعلق سوچنا شروع کر دیا ہے۔ انسانیت کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ تو ہر ایک کے سینے میں ہوتا ہے مگر ان سوالوں کے انتظار سے پریشان ہونے کے باوجود میں ڈون وارٹن کا انتظار کرتا رہا۔ وہ غیر ملکی جس کے ملک میں عورتوں کی آنکھیں اتنی سیاہ ہوتی ہیں کہ جب وہ رقص کرتی ہیں تو آنکھیں ستاروں کی طرح چمکنے لگتی ہیں۔ ڈون وارٹن کے ملک کی سیور سیتائیں اور وہ خود بھی تو اس ملک کا باشندہ تھا' جس سے بائرن نے اپنا ہیرو منتخب کیا تھا۔ ڈون ژوان جس کا ملک آہو چشم عورتوں اور نارنگیوں کے لیے مشہور تھا۔

ڈون وارٹن کمرے کا پردہ اٹھا کر اندر آ گیا اور بولا: ''او بوائے' تم تو اتنے پژمردہ دکھائی دے رہے ہو۔ کیا کسی نئے عشق میں مبتلا ہو گئے ہو؟''

میں نے کہا: ''میں ڈون ژوان نہیں ہوں اور پھر بھی ایک نیا عشق آج کہیں میرے اندر دل میں خون کی طرح پھیل رہا ہے۔''

اس نے اپنی شوخی اور سنجیدگی کو ہمیشہ کی طرح یکی کر کے کہا: ''نہیں تم عشق میں مبتلا نہیں ہو سکتے' تم اپنے گرد امن اور سلامتی کو چاہتے ہو۔ تم عقل مند ہو۔ عشق کے لیے تھوڑا سا دیوانہ ہونا ضروری ہے۔ عشق میں پریشانیاں ہیں' اس آگ کی محراب کے نیچے سے گزر کر ہیکل میں داخل نہیں ہو سکتے' تم میں جذبہ صادق نہیں ہے۔'' اور وہ اپنی انگلیوں سے میز پر گت بجانے لگا۔

میں نے کہا: ''تم لوگ آگ کی محرابوں کا ذکر یوں کرتے ہو گویا تم نے ان کا تجربہ کیا ہو۔''

اور اس نے اسی طرح سیٹی بجاتے اور انگلیوں سے میز پر گت بجاتے' سر کے اشارے سے کہا: ''ہاں' میں تو ان محرابوں کے نیچے سے نکل چکا ہوں۔'' اور ''وہ محراب تم کو ہیرابائی کے گھر کے سامنے دکھائی دیتی ہے۔'' میں نے کہا۔

ہیرابائی' ہیرابائی وہ زور زور سے ہنس کر بولا۔ ''میں ہزار بار ایسے عشق پر لعنت بھیجتا ہوں جو عشق اتنا آسان ہو کہ تم آنکھ کھولو اور محبوب تمہارے سامنے کھڑا ہو۔ میں ایسے محبوب منتخب

نہیں کرتا جو آسان پسند اور نزدیک ہوں۔ میرے لیے ان عورتوں میں کوئی کشش نہیں، جو اپنا آپ تیزی سے ہر ایک کے سامنے آسان کتاب کی طرح ظاہر کر دیتی ہیں"...... اور پھر تھوڑی دیر رک کر بولا: "تم جانتے ہو میں تھوڑا مشکل پسند ہوں، مشرقی ہوں۔ مجھے صرف وہی چیزیں اپنی خوبصورتی سے اپنی طرف کھینچتی ہیں جو میری پہنچ سے باہر ہوں۔ میں صرف ایسی عورتوں سے عشق کر سکتا ہوں جو دور دور اور پردوں میں لپٹے رنگوں کی طرح میرے اور اپنے درمیان باعزت فاصلہ رکھیں...... تم مجھے ڈون ژوان کہتے ہو اور میں بھی اس ہیرو کی طرح ساری عمر کسی ایسی معشوقہ کا انتظار کرتا رہا جس کی غزالیں آنکھیں میری آنکھوں سے کبھی ٹکرا نہ سکیں جس کے جسم کی سفیدی میرے خوابوں میں چاند کی چمک بن جائے۔ میں اس کے لیے بے قرار ہوں مگر میری آہیں اس تک پہنچ نہ سکیں۔"

وہ خاموش ہو گیا۔

اور دفعتہً میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کیا یہ شخص کنول کماری کو چاہتا ہے۔ صرف وہی ایک عورت ہے جو ڈون وارٹن کی محبوبہ کے معیار پر پوری اترتی ہے اور پھر بھی کسی طرح وہ ادائیں جو عورت کے لیے ضروری ہیں، اس میں کہیں نہیں ہیں۔ اس میں تو ادائیں کہیں نہیں ہیں۔ ادا اور بناوٹ تو اس کے پاس سے نہیں گزری۔ میں نے اپنی نگاہیں اٹھا کر ڈون وارٹن کی طرف دیکھا جو اپنے خوابوں میں لپٹا ہوا بڑی ہی اداس اور خاموش بہت غمگین اور پھر بھی اپنی آنکھوں کی چمک کی وجہ سے وہ حیرت انگیز طور پر سب دنوں سے زیادہ زندہ لگ رہا تھا۔

پھر میری طرف مُڑ کر کہنے لگا۔ "تم اپنی نئی محبوبہ کا اپنے نئے عشق کا ذکر کر رہے تھے۔ اس کا کیا ہو رہا ہے۔ اصل میں میں اپنی باتیں زیادہ کرتا ہوں۔ ایک کمزور اور احساسِ کمتری کے مارے ہوئے انسان کی طرح مجھے اپنا آپ بہت جاذبِ نظر اور بہت بلند دکھائی دیتا ہے۔ میں نے اپنی ایک عمر عشق کرنے میں گزاری ہے اور پھر بھی میں آپ رونا چاہتا ہوں۔ ان محبتوں کے لیے جو میری راہ سے گزر نہ سکیں۔ ان محبوب عورتوں کے لیے جن سے میں مل نہ سکا۔ ان اچھی عورتوں کے لیے جنہوں نے میری طرف توجہ نہ دی۔ اپنے سے پہلے گزر جانے والے، ان زمانوں کے لیے جب میں ایک جانباز کی طرح اپنی محبوبہ کے لیے مر سکتا تھا۔ اگر میں کئی بار پیدا ہو کر مروں تو بھی یہ افسوس میرے دل سے کبھی نہیں مٹ سکتا۔ میں ایک دنیا بن کر ان ساری خوبصورتیوں کو اپنے اندر دیکھنا چاہتا تھا جو کبھی میری ہو نہ سکیں۔"

میں نے کہا: "مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہے۔ تمہارے رنج کو میں محسوس کرتا ہوں۔"

زور سے ہنس کر ڈون وارٹن نے کہا: ''او بوائے' تم تو ایک جواہر کی طرح قیمتی دوست ہو۔ میں کبھی تم کو گم نہیں کروں گا اور پھر بھی تم گم ہو جاؤ گے۔ ان ہیروں کی طرح جو مندر کی مورتی کے ماتھے پہ چمکتا ہے اور وہاں سے باہر نہیں آ سکتا۔ تم سب میرے لیے گم ہونے والے ہو۔''

میں نے کہا: ''وہ کس طرح وہ کیونکر؟''

بولا: ''دیکھتے نہیں ہو تمہارا ملک ایک نئی پیدائش کے بوجھ سے کانپ رہا ہے۔ میں غیر ملکی ہوں۔ چند دنوں میں چلا جاؤں گا اور تم اپنے نئے مندر میں رکھی جانے والی مورتیوں میں کسی ایک کے ماتھے میں جڑ کر میرے لیے اندھیروں میں گم ہو جاؤ گے۔''

میں نے کہا: ڈون وارٹن آنے والے حالات کی خبر کسی کو نہیں۔ پر تم یہاں کیوں نہیں ٹھہرتے ہو؟''

کہنے لگا: ''میں تمہاری دعوت کے بغیر یہاں ٹھہر کر اپنے مقدر کا انتظار کروں گا۔ مجھے تمہاری آزادی سے زیادہ اپنے نصیب کے لیے کسی معجزے کا انتظار ہے۔ میں آسمان کی طرف دیکھتا ہوں۔ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ میری پوجا اور تپسیا بے فائدہ نہیں جا سکتی۔''

میں نے کہا: ''کون سی پوجا اور کون سی تپسیا' کیا تم ہیرا بائی کے ہاں روز نہیں جاتے۔ تمہارا تو ماتھا بھی گھس گیا ہوگا۔''

اور ڈون وارٹن نے کہا: ''پہلے ہر دفعہ اپنی عورتوں کے ایمان کے لیے تم میرے منہ پر تھپڑ مارتے تھے۔ آج میرا جی چاہتا ہے تمہارے منہ پر ماروں۔ تم نے میرے دل میں بیٹھی عورت کا ایمان کیا ہے۔''

میرا دل پھر زور سے دھڑکا۔ مگر میں نے سوچا اگر اس کو یہاں کی کسی عورت سے لگاؤ ہو سکتا ہے تو صرف ہیرا بائی سے اور کسی سے نہیں۔ پھر یہ غیر سنجیدہ قسم کا آدمی جوان محبوباؤں کے لیے روتا ہے' جو اسے مل نہ سکیں جو کلو پیٹرا اور ہیلن کے لیے ماتم کرتا ہے۔ یہ کبھی بھی سنجیدگی سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔

پھر میں جانے کے لیے اٹھا اور ڈون وارٹن سیٹی بجاتا' گیت گانے کی کوشش کرتا میرے ساتھ باہر نکل آیا۔

اس انگریز کے گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ فوری احکامات کے تحت وہ صبح سے ایک فساد زدہ علاقے کا دورہ کرنے کے لیے چلا گیا ہے۔ اس کی بیوی نے ہم کو بیٹھنے کے لیے کہا' مگر ڈون وارٹن

نے سر کے اشارے سے انکار کر دیا۔ ساری باتیں مجھے ہی کرنا پڑیں۔ ڈون وارٹن ایک لفظ نہیں بولا۔

واپس جاتے ہوئے میں نے کہا: ''یہ تم کو کیا ہو گیا تھا' تم اس عورت سے ایک لفظ نہیں بولے۔''

کہنے لگا: ''مجھے اس کی ضرورت سے زیادہ اونچی سکرٹ اور کسا ہوا لباس دیکھ کر وحشت ہو رہی تھی۔ جس شخص کی بیوی اس قسم کی ہو سکتی ہے۔ ایسا لباس پہن سکتی ہے' وہ شخص کبھی بھی باذوق نہیں ہو سکتا۔''

میں نے کہا: ''پھر بھی تم ہم لوگوں کو بدذوق اور جانے کیا کیا کہتے ہو؟''

اس نے میری بات کاٹ کر کہا: ''تمہارے ہاں کی معمولی عورت ایک کہار کی بیوی میں بھی وہ نزاکت اور شرم ہوتی ہے کہ یہ لوگ اس کو صدیوں تک پہنچ نہیں سکتے اور پھر بھی اپنے آپ کو ترقی یافتہ اور جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے عورت کو اتنا ارزاں کیا ہے کہ وہ بالکل عُریاں ہو کر رہ گئی ہے۔''

میں نے کہا: ''تم مشرق کے حسن سے مسحور ہو اور کوئی بات نہیں۔ تمہیں یونہی اپنے ہمسائیوں کی خوبی کھلتی ہے اور اب تو دیکھو یہ کس خوبصورتی سے ہمارے حصے بخرے کرنے کو تیار ہیں۔''

ڈون وارٹن کہنے لگا۔ ''میں تمہارے ساتھ کسی سیاسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ جب پہلے پہل ہماری ملاقات ہوئی تھی تو میں نے کہہ دیا تھا کہ میں کسی سیاسی بحث اور تمہارے افق پر جمع شدہ بادلوں سے علاقہ نہیں رکھوں گا۔ اس کے باوجود بھی اور ملکوں کی طرح یہاں سیاست کو زندگی سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔'' پھر وہ خاموش ہو گیا اور کافی دیر تک کچھ نہ بولا۔

اپنے ہوٹل کے سامنے اتر کر اس نے کہا: ''وہ وقت دور نہیں' میں اپنے مشرقی ہونے کا ثبوت دوں گا۔ کس طرح دوں یہ کہہ نہیں سکتا' پر اوبوائے' کوئی بھی تو نہیں کہہ سکتا کہ آنے والے دنوں میں کیا ہونے والا ہے اور میں کس قابل ہوں۔'' پھر میری موٹر کے کھلے پٹ پر اس نے جھک کر کہا: ''اوبوائے' مجھے تمہاری زندگی میں' قسمت پر' بے پناہ اعتبار بہت بھلا لگتا ہے۔ پر یہ تو بتاؤ تم اس پر اتنا اعتبار کیوں نہیں کرتے۔ اتنا اعتبار کہ اس کو اپنے خیالوں کے مطابق بدل سکو۔ تم لوگ اپنے خیالوں اور قسمت میں اتنی دشواری کیوں رکھتے ہو' سمجھ میں نہیں آتا۔''

اور میں نے بھی اسی دکھ سے کہا تھا: ''جانے کیا ہونے والا ہے اوبوائے' ہم وہ نہیں

ہیں۔ ہمارے خیال اپنے ہیں اور قسمت دوسروں کے ہاتھ میں'' اور میں نے موٹر اسٹارٹ کر دی۔ وہ میرے جاتے ہوئے بھی قوی ہیکل جسم اور حیرت انگیز طور پر بھولی شکل لیے وہیں کھڑا ہوا ہاتھ ہلا کر مجھے الوداع کہہ رہا تھا۔ ڈون وارٹن نہ جانے کیسی باتیں کرتا تھا وہ؟

راجندر جمنا کے کنارے اپنی پُر فضا کوٹھی کے لان میں جہاں وہ اکیلا ہی رہتا تھا' تن تنہا تھا۔ سفید بادل آسمانوں پر آہستہ آہستہ پرواز کر رہے تھے اور سردیوں کی یہ سہ پہر ڈھل کر شام بننے کو تیار تھی۔ اور سورج جھکتے جھکتے بھی آسمان میں تھا۔ میرا دل یکایک اداس ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں گا۔ میں راجندر سے کیا پوچھنے آیا ہوں۔ میں اس سے کس بات کے متعلق استفسار کروں گا اور جب اس باعمل شخص نے وقت آنے کا اعلان کر دیا تو اب میں کیا کہنے آیا ہوں۔ وہ لان میں اکیلا تھا۔ بانس کی کرسیاں سبز گھاس پر ایک میز کے اردگرد رکھی تھیں اور وہ یعنی راجندر پرشاد سکسینہ وہاں اکیلا تھا۔

مجھے موٹر سے اترتے دیکھ کر وہ اٹھا اور پھر سوچ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس نے خطرے کو آگے جا کر ملنے کی بجائے اس کا انتظار کرنا پسند کیا۔

میں نے جا کر کہا: ''آج اکیلے اور بے وقت یہاں کیوں بیٹھے ہو؟''

اور اس نے کہا: ''آج تم بے وقت اور بڑے گھبرائے ہوئے کیوں آئے ہو؟'' وہ ہنس پڑا۔

میں نے کہا: ''یہ کہنے کا وقت آ گیا ہے' پر ایسی جلدی ہی کیوں اور ایک دم کیوں؟ پرسوں میں تم سے ملا تھا اور آج تم نے بے وقت آنے کا اعلان کر دیا ہے۔ بتاؤ کیا کرنا چاہتے ہو؟''

اور میں نے دیکھا ہمیشہ کے ذہین اور تیز فہم حاضر جواب راجندر کے چہرے پر وہی اداسی آ گئی' جو ان دنوں رہا کرتی تھی جن دنوں وہ دو ماہ کے لیے غائب رہا تھا اور جن دنوں کے آخر میں کنول ٹھاکر نے مجھے راجندر کا وہ خط دکھایا' جس کو کنول ٹھاکر نے اپنی ہتک سمجھ کر آخر میں مجھے بتایا تھا کہ وہ تو ناجیل کی طرح برفانی سمندروں پر اکیلی سفر کرنا چاہتی ہے۔ وہ تو ان خوابوں کے پیچھے پریشان ہے جو خواب اس کے اپنے نہیں ہو سکتے' جو اس کے دامن میں ستاروں کی طرح روشن ہیں مگر جن کو ہاتھ سے چھونے پر ان کی ساری چمک غائب ہو جاتی ہے۔

وہ اٹھ کر لان کے سبزے پر چکر لگانے لگا۔ ٹہلتا رہا اور پھر پھولوں کی کیاریوں کے گرد گھومنے لگا۔ بھنورے کلیوں پر جھوم رہے تھے۔ سوئے ہوئے سے' تتلیاں رنگین پروں کو جھکتی ایک سے دوسرے پھول پر جا کر بیٹھ جاتیں' سورج مشرق کی طرف سے آ کر اپنا چکر پورا کر کے سونے

کے لیے مغرب کی طرف جھک رہا تھا اور مجھے وہاں بیٹھے اپنے بچپن کی کہانیاں یاد آ رہی تھیں۔ بادل سیاہ اور گہرے ہو گئے تھے۔ بادل اور نیچے جھک آئے تھے اور جمنا کے کنارے راجندر پرشاد سکسینہ کی کوٹھی سے تھوڑی دور پرے جمنا کا سب سے بڑا خواب اس میں جھک کر جھانک رہا تھا اور پوچھ رہا تھا مجھ سے بھی بڑا خواب ہو گا؟

پھر بڑی بڑی بوندیں پڑنے لگیں اور سدھائے ہوئے مؤدّب خادم کہیں اِدھر سے اُدھر نکل کر کرسیاں اٹھانے بڑھے۔ میں نے کہا: "راجندر تم کوئی دیو ہو جس کے حکم پر، جس کے اشارے پر چھوٹے دیو دوڑتے ہیں؟"

وہ ہنس پڑا۔ اور بولا' میں دیو ہوں۔ پر ایسا دیو جو عذاب تنہائی سے پس رہا ہے اور جس کی تنہائی ہمیشگی کے دامنوں سے جا ملے گی۔ جس کی قسمت میں کبھی بھی دوسرے انسانوں کی طرح زندگی سے مسرتیں حاصل کرنا اور خوشیاں لینا نہیں ہیں کیونکہ میں نے اپنی خوشیاں ان موہوم چیزوں سے وابستہ کر رکھی ہیں جن کا کوئی وجود نہیں۔ میں نے محبت کے لیے وہ زمین منتخب کی تھی جس پر کبھی کچھ نہیں اگ سکتا۔ پر میں تمہیں پھر کہتا ہوں میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ صرف میں نے غلط خواب دیکھے ہیں اور پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا' تم ہی بتاؤ' کیا غلط خواب دیکھنے کے لیے ایک عمر کا عذاب ملا کرتا ہے۔ کیا غلط خواب دیکھنے کا نتیجہ بھی دنیا میں دوزخ ملا کرتا ہے۔"

میں نے کہا: "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بظاہر تو تم آج تک سیدھی راہوں پر چلتے رہے ہو۔"

"سیدھی راہیں......؟" راجندر نے پھر ہنس کر کہا۔ "تم سیدھی راہوں سے کیا سمجھتے ہو کیا ایک زاہد و پارسا کی ایسی زندگی جس میں دل پر کچھ بھی بیت جائے مگر اس کا اقرار نہ کیا جائے۔ مندر میں دیوتا کے سامنے ناچنے والی دیوداسیوں کا حسن سینے میں ہلچل مچا دے مگر اف نہ کی جائے۔ کیا سیدھی راہوں سے تمہاری مراد یہ ہے۔"

"نہیں نہیں یہ نہیں۔" میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب تھا آج تک تم نے اپنے عہدے کو ایمانداری سے نبھایا ہے۔ تم نے ایک سچے انسان کی طرح ایمانداری سے زندگی گزاری ہے۔"

"ایمانداری' سیدھی راہیں۔" راجندر نے پھر ہنس کر کہا۔ "ٹھیک کہتے ہو دنیا کی نظروں میں' میں سچا اور ایماندار ضرور ہوں' پر ایک ایمانداری اپنے سے بھی ہوتی ہے۔ ایک وفا انسان اپنے ساتھ بھی تو کرتا ہے۔ ایک سیدھی راہ وہ بھی ہے جس پر وہ خود چلتا ہے اور ایسی کوئی

بات مجھ میں نہیں ہے۔ سمجھے بھائی میں سچا نہیں ہوں، ایماندار نہیں ہوں، میں ایک شکست خوردہ اور شرمندہ انسان ہوں۔"

بارش اب زوروں پر شروع ہو چکی تھی۔ تیز ہوا میں درخت سائیں سائیں کر رہے تھے اور برآمدے میں کھڑے ہوتے ہوئے بھی، مجھے سردی لگ رہی تھی۔ میں کانپ رہا تھا۔ بارش تیز اور موسلا دھار پڑ رہی تھی۔ بوندیں مل کر دھند میں بدل گئی تھیں اور ہمارے گرد سارا ماحول ایک نیلے سے دھوئیں میں چھپ گیا تھا۔ اوپر سیاہ گھٹائیں تھیں اور غبار تھا۔ بارش پڑنے کی مختلف آوازیں تھیں۔ درختوں کی سائیں سائیں درختوں پر بارش پڑنے سے شائیں شائیں کی صدا آتی۔ برآمدے کی چھت پر پانی پڑنے سے اور پھر نالیوں کے ذریعے زمین پر گرنے سے دھائیں دھائیں اور دھپ دھپ کی آواز آتی۔ ہم دونوں بالکل خاموش تھے۔ راجندر برآمدے کے ساتھ لگی عشقِ پیچاں کی بیل کو کانپتے اور ہوا کے ساتھ آہستہ آہستہ جھولتے دیکھ رہا تھا اور میرا اپنا خیال ہے وہ کچھ بھی سوچ نہیں رہا ہوگا۔ ہم دونوں کھوئے ہوئے انسانوں کی طرح ایک مکان میں پناہ گزین تھے۔ کمروں کے پردے ہوا کے زوروں سے ہل رہے تھے۔ جیسے روحیں ادھر ادھر تیزی سے گزر رہی ہوں۔

پھر کبھی کبھار تیز گرج کی آواز سنائی دیتی۔ بجلی کی لہر ایک لمحے کے لیے اس دُھند اور دُھوئیں کو روشن کر دیتی۔ درختوں کے پتے چمک اٹھتے۔ پھولوں کے رنگ گہرے اور تیز جاذبِ نظر لگتے، جیسے کسی لوہی روشنی سے انہیں دھو دیا گیا ہو اور بجلی چمک کر بادل کی سیاہی کو اور بھی گہرا کر دیتی اور بھی واضح۔ اصل میں گھٹاؤں کی سیاہی کبھی گہری نہیں ہوتی۔ گھٹائیں سرمئی ہو سکتی ہیں اور اس سے بھی زیادہ سرمئی پر سیاہ کبھی نہیں گڑ گڑ، گڑ گڑ۔ جیسے تیزی سے کوئی طوفان سے بھاگ کر چھپ رہا ہو اور طوفان چنگھاڑتا اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ ہوا کے رخ سے بوندوں کا رُخ بھی بدل جاتا ہے۔ پھر راجندر نے سردی سے کانپتے ہوئے کہا: "آؤ کمرے میں چل کر بیٹھیں۔ ایسا رونا تو بہت ہو چکا۔"

اس بڑے باعمل آدمی کے منہ سے رونے کے لفظ سن کر مجھے دکھ ہو رہا تھا۔ میں اس کے دکھ کو سمجھتا تھا۔ اس سے واقف تھا اور پھر بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا مصیبت ہو سکتی ہے، جس نے اسے مجبور کر کے اپنے عہدے سے بھی برگشتہ کر دیا۔ مجھے معلوم تھا۔ آج سے کئی سال پہلے وہ کنول کماری ٹھاکر کو چاہتا رہا ہے۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ عشق اپنی دوا خود ڈھونڈ لیتا

ہے۔ وقت کے ساتھ سارے دکھ مُندمل ہو جاتے ہیں اور جینے کے لیے انسان کو بہت ہی ڈھیٹ بننا پڑتا ہے۔ ٹھوکر کھا کر سنبھلنا' گرنا اور پھر بھی چلتے رہنا' غم کھانا اور غم کو بھلانا۔ ماضی کو اتنا دور سمجھنا کہ وہ تمہیں کوئی تکلیف نہ دے سکے۔ دل پر لاکھ آفتیں آتی ہیں اور انسان چلتا رہتا ہے' کیونکہ وہ سمجھتا ہے' اس کی کوئی منزل ہے۔ اس کے راستے پُر پیچ اور کھوجنے کے قابل ہیں یا پھر زندگی پہاڑ سے تیز رفتار گاڑی میں اترنے کے مترادف ہے۔ راہ رواں ہے۔ تیزی سے اترتے جا رہے ہو' وادی کے نشیب میں پہنچ سکو گے اور اگر نہیں تو ٹھوکر کھا کر کسی گہرے غار میں گر جاؤ گے' جہاں سے نکلنے کے لیے کوئی راستہ نہیں' کھڈ ہیں' نالے ہیں' نشیب ہیں اور بس۔

پر اس بات کو بھی تو سالوں گزر چکے ہیں۔ کنول کماری ٹھاکر کو وہ بھلا چکا ہوگا۔ کم از کم کنول کی خاموشی اس کا جواب ہوگی۔

میں اور راجندر پرشاد سکسینہ بیٹھنے کے کمرے میں چلے گئے۔ کمرے کے پردے ایک بہت پیارے رنگ کے ساتھ جیسے بادلوں کی سیاہی میں کبھی کبھار ایک دھانی رنگ جھانکتا ہے۔ آگ خوب روشن تھی' تیز جل رہی تھی۔ شعلے آتشدان پر لگی سنگ سرخ ٹائلوں کو چمکا رہے تھے۔ کبھی کبھار بارش کے قطرے چمنی کے راستے انگاروں پر گرتے تو ایسی آواز آتی جیسے کوئی آنسو کسی چتا پر گرا رہا ہو۔ سوں سوں ایسی ہلکی آواز کہ صرف اسی گھر کی خاموشی میں سنی جا سکتی تھی۔ راجندر نے روشنی نہیں کی۔ ہم دونوں کرسیاں کھینچ کر آگ کے پاس بیٹھ گئے۔ وہ بولا موسیقی سے تمہیں اتنی دلچسپی ہے' آؤ آج پرانے استادوں کے ریکارڈ سنائیں۔ پھر اس نے آتش دان کے قریب ہی لگی ہوئی کوئی گھنٹی بجائی۔ ایک خادم آ گیا' جس نے ہمارے قریب تپائی پر گراموفون رکھا اور ریکارڈوں کے ڈبے' وہ جس خاموشی سے آیا تھا واپس چلا گیا۔

راجندر نے کہا: ''کیا سنو گے۔'' وہ ریکارڈ الگ کر رہا تھا۔

میں نے کہا: ''جو سنوا دو گے' سلیمان بادشاہ۔''

وہ ہنس کر کہنے لگا: ''سلیمان بادشاہ کیوں کہتے ہو صلیب دیا گیا عیسیٰ کیوں نہیں' بھائی میں تو عیسیٰ ہوں۔ میں نے اپنے ریشمی دل کو باریک ڈوریوں میں کاٹا اور پھر اس پتلی ڈوری کے ساتھ اپنے کو اس اندھیرے کے ساتھ لٹکا لیا جو میری زندگی کے خودرَو پودے کو ڈھانپے ہوئے تھا۔''

میں نے کہا: ''شاعر ہو گئے ہو کیا۔ آج تک کس کی صُحبت میں رہے ہو؟''

کہنے لگا: ''اگر آج تک جو سختیاں میں نے برداشت کی ہیں، تم کرتے؟ اگر اس آگ سے تم گزرتے جس سے میں گزرا ہوں تو تم یقیناً ایک مہا قوی کی بجائے ایک دیوتا بن گئے ہوتے پر میں فانی انسان ہوں۔ بڑا خشک قسم کا، ہر شے کو اسی روشنی میں دیکھتا ہوں جس میں وہ مجھے دکھائی دیتی رہی اور اس کے باوجود بھی میں یہ کہتا ہوں میں نے غلط خواب دیکھے ہیں۔''

پھر یہ ریکارڈ ایک خوبصورت ڈبے سے نکال کر دوسرے میں رکھتا گیا۔ دونوں ڈبے اخروٹ کی لکڑی کے تھے۔ کشمیر کی لکڑی، اتنا نفیس کام تھا، ان پر اور پھر بھی انہیں بنانے والے غربت، عسرت اور تنگی کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ازل سے انسان کا نصیب رہا ہے۔ خوبصورتی کو تخلیق کرنے والے کا ہاتھ اندھیرے میں رہتا ہے۔

اندھیرا چاہے وہ غربت کا ہو یا مورتی کے اندر کی گمبھیرتا کا۔ وہ گراموفون میں چابی بھر رہا تھا۔ ہاتھ کی حرکت ایک دائرے کی صورت میں تیز تیز ہو رہی تھی۔ ہاتھ جہاں سے چلتا وہیں پر پھر وہاں سے آگے پھر وہیں جیسے زمین کی حرکت ہو۔ سورج کی، چاند ستاروں کی، اجرامِ فلکی کی اور جیسے اپنے دائرے میں خود انسان کی، انسان کی جس سچائی کو جھٹلاتا ہے، اسے پھر قبول کرتا ہے۔ جس روشنی سے بھاگتا ہے، پھر اس میں پناہ لیتا ہے، جن دکھوں سے چھپتا ہے، پھر ان کے سامنے آتا ہے۔ اس کا ایک آستان ہے، کسی دوار کی ایک چوکھٹ ہے۔ جس کو چھوڑ کر وہ اِدھر اُدھر الجھے راستوں سے تیز تیز بھاگتا ہے اور آخر میں یونانی دیوتاؤں کی طرح پھر وینس کے مندر میں سجدہ ریزیاں کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اسے کہیں مفر نہیں، اسے کہیں چھٹکارا نہیں...... باہر بارش بہت تیز ہو رہی تھی۔ آتش دان میں آگ تھی، لپکتے ہوئے شعلے اور گراموفون پر۔

''امید ان سے کیا تھی اور وہ کیا کر رہے ہیں
خود ہی بنا رہے تھے خود ہی مٹا رہے ہیں''

انسان کو اپنے سے کیا کیا امیدیں ہوتی ہیں، اصل میں انسان کسی سے امید نہیں رکھتا۔ یہ سب امیدیں اسے اپنے سے ہوتی ہیں اور پھر یہ پکار بھی اس کے دل میں اپنے خلاف ہوتی ہے۔ انسان اپنے کو خود ہی بناتا ہے اور خود ہی مٹاتا ہے۔ نظامِ کائنات کے اس سارے چکر میں وہ خود ہی امیدوں کا مرکز ہے اور خود ہی اجالوں کا نقطہ ہے اور ہماری ساری تگ و دو انہیں مرکزوں اور نقطوں کو ڈھونڈنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ ہم سارا وقت اپنے سے بچتے اور اپنے پر ہی عاشق ہوتے رہتے ہیں۔ یہ اتنے آئینہ خانوں میں ہمیں اتنا ہی جلوہ نظر آتا ہے اور ہم دنگ ہو کر، گھبرا کر

اور شرما کر سوچتے رہتے ہیں۔ اندھیروں سے اجالوں کی طرف اور وہاں سے پھر اجالوں اور تاریکیوں کی طرف جیسے باہر بارش کے ریلے سے خطرات ایک سمت میں پھر دوسری پھر پہلی سمت کو دھکیلے جارہے تھے اور بارش بھی...... مسلسل...... اور متواتر ہو رہی تھی۔

ریکارڈ تیز اور سریلی آواز میں بجتا رہا۔

"کس کی صدا یہ آئی کس نے مجھے پکارا
کوئی مجھے بتائے کیا وہ بُلا رہے ہیں"

گانے والی ایک گم کردہ راہ کی طرح جسے اپنے ساتھیوں کی آوازیں لاشعور سے سنائی دیں، چیخ چیخ کر پوچھ رہی تھی۔ کوئی مجھے بتائے کیا وہ بُلا رہے ہیں، کیا وہ بُلا رہے ہیں مگر کوئی اس کی صداؤں کا جواب نہیں دے گا اور کون بتا سکتا ہے کب اور کیسے میں، کون بلاتا ہے؟

راجندر نے ریکارڈ الگ کر دیا اور پھر ایک نیا ریکارڈ لگایا۔ چابی دی، سوئی بدلی اور کھٹکے کو درست کیا، پھر اسے گھمایا تو ریکارڈ اپنے محور کے گرد گھوم رہا تھا۔ پھر اس نے سوئی کو ریکارڈ پر رکھ دیا اور خود آتش دان کے قریب سے اٹھ کر کھڑکیاں کھولنے لگا۔ ہوا تیز تھی۔ ایک جھٹکے سے پردے اڑنے لگے اور یخ کرنے والا ایک جھونکا اندر آ گیا۔ آگ کے قریب بیٹھے بیٹھے ہی میں کانپ گیا۔ گانے والے کی بھاری گمبھیر اور پرسوز آواز سنائی دینے لگی۔

اے کاتبِ تقدیر مجھے اتنا بتا دے
کیوں مجھ سے خفا ہے تو کیا میں نے کیا ہے

اندھیرے میں کھڑکی کے قریب کھڑا راجندر اڑتے پردوں میں چھپ جاتا، کبھی نظر آنے لگتا۔ جیسے یہ صدائیں اس کے گرد پھر کر پوچھ رہی ہوں، جگنو کی چمک نہیں، ستاروں کی روشنی نہیں، اندھیرا اتنا گہرا ہے، ہم کدھر جائیں؟ سب کے حصے میں رنگین بہاریں آئی ہیں اور ہمارے حصے میں ہمارے نصیب سے وہ بہاریں کہاں گئیں؟ گھر کی خاموشی میں یہ آواز گونج رہی تھی۔ آتش دان کی سرخ ٹائلیں شعلوں کی روشنی میں چمک رہی تھیں اور اس روشنی کے دائرے سے ذرا پرے، ذرا آگے، ذرا اوٹ میں پردوں کے پیچھے راجندر کھڑا برستی بارش اور تاریکی کے اس دائرے سے باہر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ریکارڈ ختم ہو گیا۔ میں نے گراموفون بند کر دیا مگر اس نے کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر مجھ سے نہیں پوچھا کہ تم اور کیوں نہیں سنتے۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔ اس نے مڑ کر

میری طرف نہیں دیکھا۔ پھر نوکر چائے لے کر آیا۔ خاموشی اور سلیقے سے چائے رکھ کر وہ الٹے قدم واپس چلا گیا۔ کسی اندرونی کمرے میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ بڑے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر نوکر نے کہا: ''صاحب آپ کے لیے'' اور راجندر قالین پر اپنے خیالوں میں چلنے والوں کی طرح پاؤں رکھتا اس بڑے دروازے سے اندر چلا گیا۔ آتش دان میں شعلوں کی زبانیں لپک رہی تھیں اور اس کے اوپر اندھیرے کے اس دائرے میں رکھی بدھ بھگوان کی مورتی تھی۔ آنکھیں بند ایک انگلی کو اٹھائے ہوئے اپنا آسن جمائے بدھ بھگوان وہاں براجمان تھے۔ اس بے اطمینانی کے دور میں بدھ بھگوان کے چہرے پر شانتی غنیمت تھی، کافی تھی۔ اس مرتی مارتی، ایک دوسرے کو دھکیلتی دنیا اور ماحول کی سرخی میں اس کی بند آنکھوں کا سکون ایک سہارا تھا۔ اس اندھیرے میں ان کی اٹھی ہوئی انگلی جس روشنی کی طرف اشارہ کر رہی تھی، وہ روشنی ازلی ابدی سچی اور کبھی نہ ٹلنے والی تھی۔ بھگوان کی اس مورتی کے بطن میں جو نور تھا، اس پر یقین کر کے ایک گونہ اطمینان ہو سکتا تھا اور پھر بھی راجندر پرشاد جس کو ہم سب راجن کہتے تھے، ابھی ابھی بدھ بھگوان کی مورتی کی طرف پیٹھ کیے کھڑکی سے باہر بارش اور بوندوں، دھند اور خوشبوؤں کو دھرتی کی بارش اور جنم جنم کے اندھیرے کو دیکھ رہا تھا، وہاں اس کے لیے کیا ہو سکتا ہے؟ میں جب بھی کبھی آیا ہوں میں نے اس کمرے میں اس کے بزرگوں کی تصویریں بڑے بڑے فریموں میں ہر طرف لٹکی دیکھی ہیں اور اب سوائے اس مورتی کے سارا کمرہ خالی تھا۔ دیواریں ایک نیلی جھلک لیے سفید تھیں اور چھت اندھیرے میں تھی۔ اس غبار میں جو شعلوں سے نکل رہا تھا۔ کمرہ بالکل پرسکون اور آرام دہ، جاذبِ نظر اور خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔

راجندر آ گیا، اتنا خاموش اور اداس تھا، کہنے لگا ''بھئی چائے پیو آخر بے حس و حرکت کیوں بیٹھے ہو؟''

میں نے کہا: ''تم خود ہی غائب ہو گئے تھے۔ میں تمہارا انتظار کرتا رہا۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی ہو گی۔ یہ میرے انتظار کی سزا ہے۔''

راجن کے ہاں دو چیزیں پرانے زمانوں سے آئی ہیں۔ اس کے خاندان کے مہاپُرش اور اس کے ہاں کے چائے پینے کے برتن، مہاپُرش تصویروں اور فریموں میں قید دیواروں کے ساتھ لٹکے نئی پود کو پھلتا پھولتا دیکھتے اور خوش ہوتے رہتے ہیں اور چائے کے خوبصورت برتنوں پر بنی ننگے کیوپڈ کی تصویریں، فرشتوں کی تصویریں، پروں اور معصومیت کی تصویریں، اپنے گرد کی دنیا کا

منہ چڑاتی رہتی ہیں۔ جنگلوں کے اندھیروں میں غائب ہوتی ہیں۔ دوشیزائیں اور ان کے تعاقب میں جاتے ہوئے پری زاد' آگے ہی آگے درختوں اور اندھیروں میں چھپی پگڈنڈیوں پر جانے والے' یہ زندگی سے حسن لینے والے نوجوان کہیں سرسبز کُنجوں میں اپنی دوشیزاؤں کو پکڑ لیتے ہیں اور کائنات کو نیند آنے لگتی ہے۔ کائنات آنکھیں بند کر کے سکون کا سانس لیتی ہے۔ سیپ میں بند دو موتیوں کی طرح جنگلوں کی تاریکی میں بند دوشیزائیں اور پری زاد۔

عام دعوتوں میں اس کے ہاں وہ خوبصورت برتن استعمال نہیں ہوتے' مگر جب کوئی اکیلا اور خاص دوست آتا ہے' کوئی ملنے والا' کوئی جاننے والا' پھر پچھلی صدی کی ان تصویروں والے چائے پینے کے ظروف کی نمائش ہوتی ہے۔ آج بھی اس شام کے سناٹے' اندھیرے اور حسن میں' راجندر پرشاد سکسینہ کے یہاں میں نے پچھلی صدی کے ان خوبصورت برتنوں میں چائے پی۔ پیالوں میں ننھے کیوپڈ تھے۔ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے' درختوں کی ٹہنیوں کو پکڑ کر اس پر جھولتے ہوئے جانے کیوپڈ اندھا کیوں ہے۔ ہمارا کام دیوتا تو اندھا نہیں ہے۔ ہمارے کام دیوتا کی بانہوں میں تو گیت بھرے ہیں اور پھر بھی کام دیوتا اندھا نہیں ہے۔ اپنی ننھی سی کمان سے تیر چلاتا ہے۔ میں نے جب بھی کبھی کام دیوتا کو دیکھا ہے مجھے افریقہ کے حبشی یاد آ گئے۔ کانگو کے طاق میں رہنے والے حبشی جن کے پاس زہریلے تیر ہوتے ہیں جو مادر زاد ننگے رہتے ہیں اور جب سورج تاریک پانیوں میں غروب ہونے لگتا ہے تو ساحل کے کنارے ان کی عورتیں یوں ناچتی ہیں کہ آسمان بھی دنگ رہ جاتا ہے۔

پیالوں پر کیوپڈ بھرے ہوئے بنے تھے۔ سفید چینی سے اور ان کے گرد پس منظر سبز تھا۔ گہرا سبز جیسے جنگل کا اندھیرا ہو جیسے درخت کی ہریالی ہو' جیسے کبھی کبھار راتوں کا رنگ ہوتا ہے۔

راجن نے خوشبودار چائے پیالوں میں انڈیلی۔ میرے دل کی دھڑکن میں کام دیوتا ناچ رہا تھا۔ آہستہ قدموں سے اور چائے کے گھونٹ گرم اور سکون دہ وہ میرے حلق سے نیچے اتر رہے تھے۔ مگر راجن کی چائے اس کے سامنے یونہی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ وہ پیالے سے اٹھتی بھاپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا: ''کیا بات ہے چائے کیوں نہیں پیتے؟''

وہ چونک پڑا' جیسے اکیلے میں کسی نے اسے چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔ ہنس پڑا اور اٹھا کر پیالی منہ سے لگائی۔

میں نے کہا: ''کیا بات ہے' تم کو یوں کھوئے ہوئے میں نے کبھی نہیں پایا اور تمہاری بیٹیاں تو تین چار سال پہلے ہی تھم گئی تھیں۔ اب تو تم گاتے بھی نہیں ہو اب کیا بات ہوئی' کون سی سوچ نے تم کو پریشان کر دیا؟''

وہ پھر بھی چپ رہا۔ بولا نہیں۔ چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر پیتا رہا اور اپنی نگاہوں کو اٹھتی ہوئی بھاپ میں گاڑے رہا۔ اس کی خاموشی مجھ پر بوجھ بن کر بیٹھنے لگی۔ میرے دل میں اتنی بے چینی تھی اور پریشانی سی' ایک اضطراب باہر کی صدائیں' میں اپنے آپ کو دفعتہً اکیلا اکیلا جس کا کوئی ٹھکانہ نہ ہو جس کا کوئی نہ ہو میرا پرانا دیوانہ پن مجھ پر پھر سے طاری ہونے لگا۔ مجھے ایسے میں کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ میرے جسم میں ایک کیفیت تھی جس کو اینٹھن کہا جاسکتا ہے اور پھر بھی میں حیرت انگیز طور پر یوں محسوس کر رہا تھا کہ میں پگھل رہا ہوں' میں بہہ رہا ہوں۔ ابھی ابھی ایک گھونٹ چائے اور پی کر میں بہہ جاؤں گا۔ میں نے پیالے کو زور سے ایک آواز کے ساتھ میز پر رکھ دیا۔ مجھے لگ رہا تھا اگر میں نے اور چند لمحے اسے نیچے نہیں رکھا تو یہ میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جائے گا اور خوبصورت کیوپڈ سبز جنگل میں ٹوٹ کر رونے لگے گا۔ ساری فضا ماتم کی صداؤں سے بھر جائے گی۔

راجن پھر چونک پڑا اور بولا: ''کیا بات ہے بہت خفا ہو؟ دوست دھیرج سے کام لو۔''

میں نے کہا: ''دھیرج سے کام لیتے لیتے ایک عمر گزر گئی۔ کبھی کبھار یہ جی بھی تو چاہتا ہے کہ انسان اپنے بازوؤں کو سر کے اوپر اٹھا کر آزاد پرندوں کی طرح مسرتوں میں تیرنے لگے۔ ہر وقت دھیرج کا سبق تم نے کہاں سے سیکھا ہے؟''

وہ بولا: ''دھیرج سے کام لیتے ایک عمر گزر گئی تھی مگر اب میں نے دھیرج کو تمہارے لیے چھوڑ دیا ہے۔ آج میں کود گیا ہوں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اندھیرے کے اس پار میرے لیے کیا ہے؟''

میں نے کہا: ''یہی پوچھنے میں آیا ہوں کہ تم اندھیرے میں کیوں کود گئے ہو۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ آتش دان کے سامنے جا کر پھر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ کمرہ ایک دم سے یخ کرنے والی ہوا سے بھرا ہوا تھا اور راجندر کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر یوں تھے گویا وہ ایک بندھا ہوا مجرم ہے اور عدالت کے سامنے کھڑا بیان دینے والا ہے۔ چھت پر تیز بارش ۔۔۔ معلوم ہوتا تھا' کوئی بھاگ رہا ہے۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے کھڑکی کے پردے

کے اُڑنے کی روشنی میں صرف ایک سرخ پھول نیچے کو جھکا جھول رہا تھا۔

راجندر نے کہا' اندھیرے میں بھی ایک جاذبیت تھی اور میں تین سالوں سے ان کے اس پار دوسرے کنارے کو دیکھنے کے انتظار میں ایک قیدی جانور کی طرح اپنے پنجرے میں ٹہل رہا تھا۔ آج میں نے اپنے پنجرے کے دروازے خود ہی کھول دیئے ہیں۔ مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ یہ بند کواڑ تو بہت پہلے کھل سکتے تھے' مجھے گزرے سالوں کا' گزرے دنوں کا افسوس ہے۔

میں اس کی بات کچھ سمجھ رہا تھا کچھ نہیں۔ پر میں نے پوچھا یہ پہیلیوں میں باتیں کیوں کر رہے ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتے' آخر اتنے بڑے اقدام پر تمہیں کس چیز نے آمادہ کیا ہے۔ کیوں کیا ہے؟''

وہ کمرے میں گھومنے لگا۔ اس فراخ خوبصورت اور سادہ کمرے میں جس کی دیواروں پر کبھی اس کے مہاشوں کی تصویریں تھیں۔ نہ جانے وہ تصویریں کہاں گئیں؟

وہ کمرے میں گھومنے لگا۔ پھر میرے سامنے آ کر ٹھہر گیا اور بولا: ''تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔ اتنی سادہ اور آسان بات بھی نہیں۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بات اتنی سادہ نہیں جتنی تم کہتے ہو اور پھر میں کیا جانوں تم نے کس جذبے کے تحت اپنے عہدے سے فراغت حاصل کی ہے۔''

راجندر بولا: ''تم عہدے کو کیوں اتنا گھسیٹتے ہو۔ وہ بھی ایک پناہ تھی۔ میں نے جائے پناہ بدل ڈالی ہے۔ پہلے میں اکیلا تھا' اب ہم دو ہیں۔''

''کون؟'' میں چونک پڑا۔ اب حیران ہونے کی باری میری تھی۔ پہلے میں صرف تجسس کے بارے پوچھ رہا تھا' اب اس میں حیرت تھی' اضطراب تھا۔

وہ کمرے میں گھومتا رہا اور پھر میرے سامنے کھڑا ہو کر بولا: ''تم کنول کماری ٹھاکر کو جانتے ہونا' وہ اور میں۔''

اگر وہ مجھ سے یہ کہتا کہ ہمالیہ اپنی جگہ سے ہل کر بحرِ ہند میں گر گیا ہے۔ اگر وہ کہتا آکاش کے سارے تارے بھی زمین کے پھولوں میں بدل گئے ہیں اور سورج کی گرمی چاند کی زردی اور ٹھنڈک میں بدل گئی تو میں یقین کر لیتا مگر اس بات پر یقین کرنا کہ کنول کماری ٹھاکر اور راجندر کسی پناہ گاہ میں اکٹھے ہو گئے ہیں' ناممکن تھا۔ پھر میں نے سوچا شاید راجندر پاگل ہو گیا ہے۔ میں کس طرح سوچوں کنول جس کی منزل ناجیل کی طرف برفانی سمندروں پر اکیلے سفر کرنا تھا۔

اس نے راجندر پرشاد سکسینہ کو ایک ساتھی کی طرح قبول کر لیا۔ کیا وہ اکیلے پن سے گھبرا گئی ہے؟ کیا اس کے اصول بدل گئے ہیں۔ پھر اس عورت کے اصول تو کوئی نہ تھے، وہ تو اپنا اصول خود تھی۔ کنول جس کے لیے مرد صرف بڑے بچوں کی طرح یکا یک دماغی طور پر بڑھنے سے رک کر جسمانی طور پر بڑھ گئے تھے یہ کیا یہ اس کنول کماری ٹھاکر کی بات کر رہا ہے۔ جس نے راجندر کا خط مجھے دکھاتے ہوئے کہا تھا: ''راجندر پرشاد نے میرا ایمان کیا ہے۔'' کیا اس کے لیے ایمان کا مطلب بدل گیا ہے؟ میں خاموشی سے وہاں بیٹھا ایک ایسی آگ میں جلتا رہا جس کا تجربہ اس سے پہلے بھی نہ ہوا تھا۔ یہ آگ حسد کی آگ نہ تھی۔ یہ جلن بھی نہ تھی۔ یہ تو ایک اور ہی طرح کا عذاب تھا۔ راجندر کے لفظوں نے مجھے اس ٹھنڈک کے سمے بھی ایک بھٹی میں گرا دیا تھا جو مجھے معلوم ہے جلائے گی نہیں بس پگھلائے گی اور میں اس جلن میں ابلتا رہوں گا مگر بھسم نہیں ہو سکوں گا۔ میرا کچھ نہیں بن سکے گا۔ پر یہ کس طرح ہو سکتا ہے، کیونکر ممکن ہے کہ کنول کماری ٹھاکر اور راجندر پرشاد سکسینہ نے مل کر ایک گھر بنانے کا سوچا ہو؟ کیا کنول کے پردے میں بیٹھی چھپی ہوئی عورت پردوں کے پیچھے سے نکل آئی ہے۔ کیا ندی کا بہاؤ ڈھلوان کی طرف تھا؟ کیا کنول نے مان لیا ہے کہ اس کی آنکھوں کی جلا میں جو غرور ہے اس کو راجندر نرمی سے بدل دے؟...... مجھ پر بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی اور پھر بھی مجھے معلوم تھا کہ میں ایسے دس جنم کے چکروں سے نکل کر بھی کنول کے سامنے اپنا سوال پھر دہرانے کی ہمت نہ پا سکتا تھا۔ اب میں ایک ایسے بے وقوف کی طرح لگ رہا تھا جس کے سامنے اس کی ساری دولت اٹھا کر دوسرے لے جائیں، تہی دست اور خالی دامن اپنے آپ پر ہنسنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکے گا۔

اس خوبصورت کمرے میں راکھ اڑ رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو ایسے صحرا میں کھڑا محسوس کر رہا تھا، جس کے چاروں طرف آگ کا سمندر لہریں مار رہا ہو۔ میں اکیلا ہوں اور مجھے پار اترنے، کہیں جانے کے لیے کبھی راستہ بھی نہیں مل سکے گا۔ میں ایک کھویا ہوا بھٹکا ہوا راہی ہوں۔ زندگی میں جس عورت کو میں نے چاہا ہے، اس کو کوئی اور لے جائے...... پر عورت کوئی روٹی کا ٹکڑا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ اگر عورت عورت ہے تو اس کی اپنی مرضی ہے پھر بھی میں گم کردہ راہ تھا۔ میں نے ایک عمر اس کا انتظار کیا۔ اپنا ماتھا گھسا اور آخر میں وہ، اپنا آپ کسی اور کو دے رہی تھی۔ آدمی کی فطرت کے حسد اور جلن کے جذبے نے مجھے بے یقین کر دیا تھا اور اس کے باوجود میں راجندر کے سامنے بیٹھا طمانیت سے آتش دان میں لپکتے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔

راجندر کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ تیز تیز چل رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر کے بعد میں نے اپنے دماغ میں ابھرتا ایک سوال پایا تو پھر یہ اضطراب کیوں' بے چینی کیوں؟ راجندر اور کنول کماری ٹھاکر اگر مل کر کام کرنا چاہتے ہیں تو راجندر اتنا مضطرب کیوں ہے؟ اور اس کا اس کے عہدے سے کیا تعلق ہے؟ کیا یہ طلسمی کہانی ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میرے سامنے میرا دوست تھا۔ میں کنول کماری کو بھی جانتا تھا اور پھر بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ حالات یکا یک اتنے الجھ گئے ہیں؟

آخر میں نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے پایا تھا: ''تو پھر کب تک تم کنول کو لا رہے ہو اس گھر میں۔''

راجندر نے میرے سامنے کھڑے ہو کر مجھے یوں دیکھا گویا میں پاگل ہو گیا ہوں۔ اسے میرے سوال کے لفظ سمجھ نہیں آ رہے تھے۔ اس نے بہت غور سے میری طرف دیکھا۔ اتنے غور سے کہ میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ میری شکل پر کون سی عجب بات تھی جس نے راجندر کو غور سے میری طرف دیکھنے پر آمادہ کیا۔ میں نے اپنے سر کو زور سے جھٹک دیا۔ راجندر کی آنکھوں سے بچنے کے لیے میں نے پھر لپکتے شعلوں اور آتش دان پر لگی سرخ ٹائلوں کو گھورنا شروع کر دیا۔

راجندر زور سے ہنسا۔ میں تیزی سے اٹھا اور اس کے کندھے سے پکڑ کر اسے زور سے کرسی میں بٹھا دیا۔ میں پریشان تھا۔ میں سوچ رہا تھا' کتنا اچھا اور صاحبِ ذوق' تقریباً بے حد مکمل اور خوبصورت سا انسان کیسے تباہ ہو گیا ہے۔ تنہائی نے راجندر کا کیا حال بنا دیا ہے۔ مجھے اسے ہنستے دیکھ کر' دیوانہ وار ہنستے دیکھ کر سخت افسوس ہو رہا تھا۔ میں نے گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور راجندر نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ہنستا جا رہا تھا۔ زور زور سے پیٹ کو پکڑے ہوئے اور پھر دوسرے ہاتھ سے گھنٹی کی طرف بڑھتے ہوئے میرے ہاتھ کو پکڑ رہا تھا۔ بہت مشکل سے جانے کس طرح اس نے مجھ سے کہا۔ ''پاگل ہو گئے ہو کیا؟''

اور وہ اور بھی زور سے ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی نے' اس کی باتوں نے' اکیلے گھر کی وحشت نے' برستی بارش کی آوازوں نے مجھے نیم پاگل کر دیا تھا۔ میں کچھ سوچ نہیں سکتا تھا۔ میں کچھ سمجھ نہیں سکتا تھا' کون پاگل تھا میں یا راجندر؟''

ایک زمانے کے بعد اس نے اپنی ہنسی پر قابو پایا اور پھر کہا: ''تو ہاں ایک بار اور کہو کیا کہا

تھا۔تم کب لا رہے ہو، کنول کماری کو اس گھر میں؟"

"ارے بندۂ خدا کیا تم اس کے علاوہ اور کچھ نہ سمجھ سکے کہ کب لا رہے ہو کنول کماری کو اس گھر میں۔" وہ پھر ہنسنے لگا۔

میں پھر بھی کچھ نہ سمجھا مگر شرمندہ سا ہو گیا۔ نہ جانے میں نے کون سی ایسی بات کہہ دی تھی اور پھر بھی میں نے اپنے حالوں وہی سوال کیا تھا جو میں کر سکتا تھا۔ وہ یقینی اور سادہ سوال جو میرے دماغ کے اندھیرے میں آ سکتا تھا۔

اس میں کون سی ایسی بات تھی، جس نے راجندر کو پاگلوں کی طرح ہنسنے پر آمادہ کیا تھا۔

پاگل کون تھا میں یا راجندر؟

اور میں کرسی میں آتش دان کی سرخ ٹائلوں کے سامنے ایک ہارے ہوئے انسان کی طرح بیٹھ گیا۔ میں نے کچھ سمجھنے کی کوشش کو فضول سمجھ کر چھوڑ دیا۔

راجندر پھر اٹھا اور اس نے اسی طرح کمرے میں چکر لگانے شروع کر دیئے۔ ہم دونوں ایک طلسم میں قید تھے۔ دونوں پاگل تھے یا کم از کم ہم میں سے ضرور ایک پاگل تھا۔ چائے کے برتنوں پر بنے ہوئے سفید کیوپڈ اپنی کمانوں کو سرنگوں کر کے سبزے پر بیٹھے سوچ رہے ہوں گے۔ ان دونوں پاگل انسانوں میں سے کس کا دل ہمارے تیروں سے زخمی ہے اور کیا ہمارے تیروں میں اب وہ زہر نہیں رہا جو زندگی کو، وجود کو، یہاں تک کہ موت کو، کڑوا اور ناقابلِ برداشت کر دیتا ہے۔ بے چارے ننھے ذرا ذرا سے پیارے بچوں کی طرح برفانی جنگلوں میں گھومتے چاند کی سی دوشیزاؤں کا تعاقب کرتے کیوپڈ، اس گھر میں اپنی کمانوں کو سرنگوں کیے، اپنے خیالوں کے سمندروں میں ڈوبے شرمندہ اور مجحوب سے بیٹھے ہوں گے۔

راجندر کھڑکی میں جا کر کھڑا ہوا اور ہاتھ اسی طرح پیچھے باندھ لیے۔ خاموشی کا سمندر تھا، جس میں ہم ڈوبتے جا رہے تھے اور پھر بھی حیرت انگیز طور پر زندہ تھے اور پھر وہیں سے بولا:

"آخر تم کو کس خیال نے ایسا سوال پوچھنے پر آمادہ کیا ہے؟"

میں تو ہمہ تن سوال تھا۔ میں نے ایک سوال نہیں پوچھا تھا۔ میں تو بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا اور پھر بھی مجھے اب کچھ نہیں پوچھنا تھا۔ صرف پیالوں پر بنے کیوپڈ میرے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کی کمانیں سرنگوں تھیں۔ وہ کھڑکی کے پاس بولا: "تم کنول کماری ٹھاکر کو ایک زمانے سے جانتے ہو، تم کنول کے عزیز اور قریب دوستوں میں سے ہو اور پھر بھی تم نے مجھ سے ایسا سوال کیا۔

بتاؤ تم نے اس کا اپمان نہیں کیا ہے کیا؟''

میں پھر بھی خاموشی سے بیٹھا رہا۔ میں دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ عورت کو کون جان سکتا ہے۔ حوا کی بیٹیوں کو آدم کے بیٹے کبھی سمجھ نہیں سکتے۔ عورت تو اپنے کو شاید خود نہ سمجھ سکے۔ اسے میں اور راجندر کیا سمجھیں گے۔ وہ واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا: ''سنو تمہارا یہ سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور اس کے باوجود میری ساری تلخ کامیاں' میری زندگی کی ساری حسرتیں' میری ساری آرزوئیں اور تمنائیں تمہارے چند لفظ واپس لے آئے ہیں۔ تم نے آج میرے وجود کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ میں نے جو تسلی بڑی مشکل سے بہت سالوں سے حاصل کی تھی' وہ تم نے چھین لی ہے۔ میں نے کئی سالوں سے یہ سمجھنا شروع کر دیا تھا کہ صرف میں ہی واحد انسان ہوں جو کنول کو ایک عورت کے روپ میں دیکھتا ہوں تم سب اسے ایک دیوی سمجھ کر اس کی پوجا کرتے ہو' تین سال پہلے میں نے ایک ٹھوکر کھائی تھی اور پھر میں سنبھل گیا۔ میں نے بھی اسے اپنے خیالوں میں ایک دیوی بنا لیا۔ ایک ایسی ہستی جس کے پاؤں بھی میری پہنچ سے باہر تھے جو میرے مندر کے دوار کھول کر کبھی میرے سُونے من میں نہیں آئے گی اور جب میں نے مندر کا دروازہ بند کر دیا جب میں نے اپنے دل سے مورتی کے رکھنے کی جگہ بھی ہٹا دی' جب میں خوشبوئیں بجھا چکا اور دیئے بھی اندھیرے ہو گئے تو تم یہاں بیٹھے ہوئے مجھ سے کہہ رہے ہو۔ میں کنول کو گھر کب لا رہا ہوں۔ تم نے میری نظروں میں اسے پھر عورت بنانے کا جتن کیا ہے۔ دیکھا تم نے آج کیا کر دیا ہے۔ تم نے میرے سکون کو ہی برباد نہیں کیا۔ تم نے اپنی دیوی کا اپمان کیا ہے۔ نہ جانے اس کی کیا سزا ہو گی۔ یہ تم جانو اور اب میں سمجھ رہا ہوں تم سب اپنے خیالوں میں اتنے دنوں سے اسے ایک عورت کی طرح سمجھتے رہے اور پھر بھی وہ تمہاری پہنچ سے دور رہی۔ بتاؤ تم نے اسے اتنا اونچا اور بلند کیوں بنا دیا تھا؟''

وہ چپ ہو گیا۔ مجھے اپنے سوال پر افسوس رہا ہو تھا۔ مجھے راجندر پرشاد کے جاگنے پر افسوس ہو رہا تھا۔ مجھے وہ خط یاد آ رہا تھا۔ ہم سب سے زیادہ ہمت اس میں تھی۔ اس میں جرأت تھی اور پھر بھی کنول اس کے خیالوں میں اونچی اٹھتی گئی۔ جانے کیوں ہم سب کنول کی پوجا کرتے رہے۔ کیا وہ حقیقتاً اس پوجا کے قابل تھی یا پھر یہ بھی ہماری نگاہوں کا روغن تھا۔ یہ کیا تھا؟ ہم نے ایسا کیوں کیا تھا' کون غلطی پر تھا۔ راجندر یا میں یا میری طرح کے اور صدہا لوگ جو اس حلقے میں تھے' پاگل تھے ہم؟ ہم نے ایک عورت کو پوجنا چاہا۔ وہ جو حیرت انگیز طور پر زندہ اور ہم سب سے بھی

زیادہ باہمت تھی مگر اس کی ہمتوں نے کبھی یہ نہیں کہا تم میری پوجا کرو، تم مجھے چاہو۔ مجھے معلوم ہے جن دنوں اسے راجندر نے خط لکھا تھا' وہ کتنی اداس تھی' اسے رنج تھا کہ کوئی ایک عورت کی طرح اسے چاہ سکتا تھا اور پھر بھی اس نے کبھی اپنے آپ کو بلند بنانے کی کوشش نہیں کی۔ ایک معمولی اور دہقان عورت کی طرح جو کھلیانوں اور پگڈنڈیوں پر اپنے خوابوں اور سپنوں میں الجھی اکیلی ہی گنگناتی پھرے' وہ بھی تھی۔ میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اگر نروپما کی جگہ کنول ہوتی' اگر میری اپنی بینا میری بہن دنیا کی جگہ ہوتی تو حالات کچھ اور ہو سکتے۔ اسے دیکھ کر تو مقابلے کا کبھی خیال نہیں آیا۔ اس میں وہ شکتی کہیں نہ دکھائی دیتی تھی۔ کبھی نہیں جس سے ہم سوچ سکتے کہ وہ دل کے حالات کا اور اپنے گرد دنیا کا مقابلہ کر رہی ہے۔ میں نے اپنے سے آج راجندر کے گھر بیٹھے سالوں کے بعد سوال کیا۔ کیا میں کنول کو پوجتا ہوں؟ میرے دل نے کہا نہیں' تم اسے پوُج نہیں سکتے۔ پوجا کے لیے اس قابل بننے کے لیے پتھر کا دل بھی لانا ہوگا اور مجھے کیا راجندر کو معلوم تھا' کنول کا دل اتنا نرم تھا کہ وہ دوسروں کی ذرا سی تکلیفوں سے بے چین ہو جایا کرتی تھی۔ اس نے دوسروں کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔

میں نے آج تک سمجھا تھا' انسان آسان ہے اور اسے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کی کوئی نہ کوئی آسان تفسیر ہو سکتی ہے پھر کنول اس سے بھی دور تھی' جس طرح نیرا کی کوئی آسان تفسیر نہیں ہو سکتی' جس طرح نیرا کو سمجھنے کے لیے کوئی سہارا نہیں لینا پڑتا' جس طرح شوبھا کو جاننے کے لیے اس کے خط کافی تھے' اس طرح کنول کماری ٹھاکر کے لیے اس کے کام کافی تھے اور پھر بھی میں کہتا ہوں اس کے کام ایسے نہ تھے جن کا پس منظر اور منظر وہ خود ہی ہو۔ ہم لوگ ہر کام پر اس کے ساتھ رہے ہیں۔ وہ اکیلی نہ تھی۔ وہ ہم سب کا ایک حصہ اور ہم سب میں سے تھی۔

میں راجندر کے سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اصل میں راجندر کے سوال کا جواب نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم نے کنول کو بلند' اچھا یا اعلیٰ نہیں بنایا تھا وہ تو ہمارے درمیان اسی طرح آئی تھی۔

پھر میں نے راجندر سے کہا: ''تم بتاؤ تم کن سالوں کا ذکر کر رہے ہو' تم نے اسے دیوی کیوں سمجھا' کیا تم نے کبھی ہم سے اس کے متعلق سوال کیا تھا؟''

راجن بولا: ''دیکھو تم مجھے واپس لے جانا کیوں چاہتے ہو؟ میں کس بات کی تفسیر کروں' میں تم سے کیا کہوں کہ تم سمجھ سکو۔ میں نے تمہیں دوست بنایا ہے۔ تم میرے نزدیک بھی رہے ہو۔ پر میرے دل کا ایک کونہ تھا' جس پر صرف کنول کماری ٹھاکر قابض تھی۔ میں نے پہاڑوں میں چھپے

غاروں کی طرح اسے صرف اس کے اعتراف پر نہیں کہا کہ تم نے مجھے کیوں دور رکھا۔ مجھے معلوم تھا ہر انسان کی طرح میرے دل میں بھی وہ غار تھا جس میں کبھی کبھار روشنی ہوتی تھی۔ میرے کاموں نے اس غار تک جانے کی راہیں الجھا رکھی تھیں۔

اور وہ پھر بولا: ''میں تم سے سوال کیا کرتا' یہ میرا ذاتی معاملہ تھا۔ ہر ایک کی طرح اور پھر بھی میں نے سوچا تھا' تم سب اسے پوجتے ہو' میں بھی اسے پوجتا رہوں گا۔''

میں نے کہا: ''تو اب کیا بات ہوئی ہے۔ اب بھی اپنے خوابوں میں گم رہو۔ اب تم نے راہ کیوں گم کر دی ہے اور پھر بھی تم کہتے ہو تم کو اور کنول کو مل کر ایک ساتھ کام کرنا ہے۔''

راجندر ہنس پڑا۔ بولا۔ ''کنول اور میں مل کر کام کریں گے۔ کنول اور میں ساتھ چلیں گے۔ تم سوچتے ہو کنول کبھی کسی کی مدد چاہے گی' اسے کسی ساتھی کی ضرورت ہے؟ بھائی تم غلط سمجھ رہے ہو۔ اس نے مجھے راستہ دکھایا ہے اور یہی وہ سطح ہے جس پر کھڑا میں کنول کماری کے پہلو میں رہوں گا۔ یوں کہ اس کا چہرہ میری نگاہوں سے پوشیدہ رہے گا۔''

میں نے کہا: ''آخر کیا کام ہے۔ کیا بات ہے۔ الجھی باتیں کیوں کر رہے ہو؟''

اور راجندر نے کہا تھا: ''میں خود الجھا ہوا ہوں۔ مجھے بھی تو راہ دکھائی نہیں دیتی۔ سالوں کے بعد میں کل کنول سے ملنے گیا تھا۔ سمجھتے ہو تین سال بعد میں اسے دیکھنے گیا تھا۔''

''کیوں؟'' میں نے اچانک اپنے آپ کو پھر سوال کرتے ہوئے پایا۔

''یونہی۔'' راجندر نے کہا۔ ''تین سال گزرے میں نے ایک انسان کی طرح اپنے دل کی دھڑکنیں اس تک پہنچانے کا ذریعہ ایک خط کو بنایا تھا۔ ان دنوں میں اپنی طاقتوں پر اپنے حسن پر نازاں اور طمانیت سے اپنی فتوحات کی طرف بڑھتا تھا۔ میں نے سوچا تھا' وہ اگر مجھے قبول نہ کرے گی تو کم از کم ناراض نہیں ہوگی۔ ہر عورت کے سینے میں ایک کمزور حصہ ہے۔ اس کی تعریف کر دو تو وہ خوش ہو جائے گی۔ اس کو چاہو تو وہ دل میں اپنے سے مطمئن ہوگی۔ بظاہر وہ تم کو جھڑک دے مگر وہ تمہارا خیال کرنا شروع کر دے گی۔ تم اس کی نگاہوں میں خار بن کر ہی سہی' سہانا خواب بن کر ہی سہی کھٹکنے لگو گے۔ تم اس سے دور ہو کر ہی سہی اس کی توجہ کا مرکز بنے رہو گے۔ وہ تمہارا ذکر کرے گی' چاہے نفرت سے ہی سہی' میں کتنی عورتوں کو جانتا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کنول ٹھاکر اس قابل ہے کہ اس کے سامنے سر جھکایا جائے اور میں نے سر جھکایا تھا۔ میں نے اسے لکھا تھا کہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ پھر مہینوں میں غائب رہا۔ میں نے سوچا وہ کسی نہ کسی

سے میرا ذکر ضرور کرے گی۔ مجھے برا بھلا کہے گی' مگر اس نے میرا ذکر کبھی نہیں کیا۔ پھر میں نا امید ہو گیا اور میں نے سوچنا شروع کیا کہ اس کے سینے میں دل نہیں اور کم از کم اگر وہ عورت ہے تو بہت بلند ہے......اور اب آخر میں اب......"

میں نے کہا: "تم نے اب کیا کیا ہے؟"

کہنے لگا: "تین سال کا کافی لمبا عرصہ ہے۔ میں نے سوچا وہ مجھے دیکھ کر خوش نہ ہو گی تو حیران ضرور ہو گی۔ اس کا دیرینہ رنج بھڑکے گا' وہ مجھے یہ تو کہے گی کہ تم نے وہ خط کیوں لکھا تھا......"

وہ پھر چپ ہو گیا اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ باہر بارش اتنی آہستہ ہو رہی تھی جیسے کوئی رو رہا ہو۔

وہ کھڑکی کے سامنے کھڑا اڑتے پردوں کے درمیان اتنا بے بس اور دکھی لگ رہا تھا جیسے کوئی بڑا بچہ دفعتاً اپنی انتہائی پیاری تصویر کے خراب ہو جانے سے رنجیدہ ہو کر یہ امید اس کے دل میں ہو کہ اس کے بزرگوں میں سے کوئی بھی آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہے گا: "رنجیدہ کیوں ہو' چلو تمہیں نئی تصویر دلائے دیتے ہیں۔"

کافی دیر کے بعد مڑ کر کہنے لگا: "مگر میری ساری امیدیں بے فائدہ تھیں۔ وہ آتش دان کے قریب کھڑی گلدان میں نئے سیاہی مائل سرخ پھول اور پھر اس کے چہرے کی سفیدی' دفعتاً ان تین سالوں کے عرصے میں میں نے جتنی کوششیں اپنے آپ کو ایک انسان بنانے کے لیے کی تھیں' مجھے بے فائدہ معلوم دیں۔ اس کے بالوں کی لمبی چوٹی اسی طرح لٹک رہی تھی۔"

اور اس نے اسی رسان سے جس سے وہ نیرا کو بلاتی ہے' جس طرح وہ مالی سے بات کرتی ہے' جس طرح وہ چپڑاسی سے کام کرنے کو کہتی ہے' مجھ سے بھی کہا تھا: "تشریف رکھیے۔"

تب میرے دل میں اتنی آگ تھی۔ میں اپنی ٹھنڈ سے مطمئن ہو کر وہاں گیا تھا۔ مگر اس کی ایک نگاہ ہی کافی تھی۔ میں دوزخ میں بگڑتی آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ رنگ تک وہی تھا' آتش دان پر گلدان بھی وہی تھے۔ میں نے اپنے دل میں کہا تین سال تین لمحے بن گئے ہیں اور میں نے اقرار کر لیا۔ میرا جی چاہتا تھا میں وہاں سے بھاگ آؤں مگر میں وہاں بیٹھا اسے گلدان میں پھولوں کو درستی سے لگاتے دیکھتا رہا۔

پھر میں نے بات کرنے کے لیے کچھ کہنے کے لیے اپنی آگ اور خاموشی سے بچنے کے لیے کہا: "آج کل کیا کام ہو رہا ہے؟" اور تب اس نے اپنی بڑی بڑی ستاروں کی تابانی اور نور سے

بی آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

''تباہی ہو رہی ہے۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ میرا دل اتنے زور سے دھڑکا تھا' اتنے زور سے کہ شاید کنول اپنے دل کی کوئی ایسی بات کرے جس سے میری تسلی ہو سکے۔ تین سال میں نے جس موہوم امید پر ان راہ گزاروں پر منتظر بیٹھنے میں بسر کیے جو کنول کماری ٹھاکر کی راہ گزاریں نہیں ہیں' شاید اس کی موہوم امید کا کوئی سہارا ہو۔

''ملک کی حالت اتنی دگرگوں ہے۔ ہندو مسلم فسادات ہونے والے ہیں۔ جلوس نکلتے ہیں۔ کانگریس اور مسلم لیگ انتخابات' کیا کوئی ایسا نہیں ہے جو ان حد بندیوں سے بلند ہو کر محض انسانیت کے لیے کام کرے۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو اپنے ذاتی مفاد کو نظر انداز کر کے صرف انسان بن کر ان سارے اختلافات کو مٹانے کی کوشش کرے۔ میں اکیلی ہوں اور عورت ہوں' میں جو کچھ کرنا چاہتی ہوں حالات اس کے خلاف ہیں۔ یہ کام مرد کر سکتے ہیں۔'' کنول کماری یہ باتیں کہتے ہوئے اتنی دکھی لگ رہی تھی' اتنی پریشان ایک عام عورت کی طرح آنکھوں میں آنسو بھرے پریشان حال۔ چند لمحوں پہلے کی گلدان میں طمانیت سے پھول سجانے والی کنول نہیں تھی۔ جس نے بڑے رسان سے اپنی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''تشریف رکھیے۔''

اور اسی لمحے میں نے کہا تھا: ''میں کام کروں گا۔'' میں نے اپنے دل سے وعدہ کر لیا تھا۔ میں وہ مرد بنوں گا جو کنول کماری کے خیال میں ایک معاشرے کو ایک تہذیب کو مرنے سے بچا سکتا ہے۔

راجندر کھڑکی میں کھڑا پردے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے باہر کے اندھیرے میں دیکھتا' میری طرف پیٹھ کیے یہ سب باتیں کہہ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا وقت کے سیلاب ہیں' وہ ایک ناچیز ذرہ ہے اور جب معاشرہ مر رہا ہو' خودکشی کر رہا ہو۔ جب حکومت اتنے ریشمی خوابوں کے پھندے اس کے لیے تیار کر رہی ہو' جب ایک مقدس تہوار کی طرح مرنے اور مر جانے کی تمناؤں پر پرورش پا رہی ہو تو راجندر یا بھگوان بھی عوام کا دل نہیں موڑ سکتے اور اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ ہم سب سے بڑے خواب دیکھنے والی کنول ٹھاکر ہے' جو صرف اپنے خیالوں کے ایوانوں میں رہتی ہے۔ جو اپنے راستے خود بناتی ہے مگر اسے اپنے گرد پھیلی سختی کا کوئی احساس نہیں ہے۔

اس لیے نہیں کہ وہ احساس اسے جگا دے گا بلکہ ایک کمزور انسان کی طرح وہ چاہتی ہے

کہ دنیا کا رخ بدل دے، مرتے ہوئے معاشرے اور درد سے بے تاب ملک کو وہ بچا لے۔ ایک کمزور عورت کی طرح جس کے دل میں محض یہ خیال ہو کہ وہ کام کرے گی تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ اس نے اپنے خیالوں کا رنگ ان سب پر چھڑک دیا ہے، جو اس کے حلقے میں آئے ہیں جو اس کے دوران میں کہیں دو چار ہوئے ہیں۔ کنول ٹھاکر کے لیے اور کوئی لفظ نہیں کہا جا سکتا۔ صرف یہ کہ وہ خواب دیکھتی ہے......

راجندر نے پھر آہستہ سے کہا اور اس لیے میں نے اپنے عہدے کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ میں نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اب میں کام کروں گا۔ سمجھے میں کام کر کے کنول ٹھاکر کو دکھا دوں گا کہ کام کی زیادتی میں اسے بھی بھلا سکتا ہوں۔ صرف وہی عورت نہیں ہے نا۔"

میں خاموش وہاں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یہ دونوں کنول اور راجندر دو مجنوں ہیں جنہوں نے سوچا ہے کہ جلتے ہوئے گھر پر اپنی محنت سے آگ کا اثر نہیں ہونے دیں گے۔ اپنے خوابوں میں کھوئے ہوئے، مجھے اس لمحے وہ دونوں انتہائی معصوم اور نا قابل بیان حد تک عزیز میرے اپنے دل کے ٹکڑوں کی طرح قریب لگے۔

راجندر پھر کہنے لگا۔ میرے چاروں طرف اتنا اندھیرا ہے مجھے معلوم نہیں میں کیا کر سکوں گا۔ حالات اس قدر بگڑ رہے ہیں۔ ملک چند دنوں میں ایک بہت بڑے انقلاب سے دو چار ہونے والا ہے۔ نہ جانے میں کچھ کر بھی سکوں گا یا نہیں۔ پھر بھی کنول ٹھاکر کے لیے میں اس آگ میں کود جاؤں گا۔ مجھے ساری انسانیت کنول کی وجہ سے اتنی دکھی لگتی ہے۔ ورنہ تم جانتے ہو سب ملک اپنے سبق سیکھتے رہتے ہیں۔ اور غلامی کے اس دور سے نجات جب بھی ملے گی، تباہی یقینی ہوگی، جس طرح ہم میں سے ہر ایک زندگی اور وقت کے لمحے جلتا رہتا ہے۔ اس حصے کو جلاتا رہتا ہے جس میں جھوٹ ہے، فریب ہے اور غلط ہے۔

میں نے کہا: "تم نے اپنا آپ داؤ پر لگا دیا ہے کوشش کر دیکھو۔"

اور اس نے کہا: "کوشش کر دیکھو یہ کیوں؟ میں اپنے آپ کو ختم کر کے بھی انسانیت کو بچانے کا طریقہ سوچوں گا۔ آخر اپنے آپ کے لیے زندہ رہنے سے زیادہ بہتر تو یہی ہے کہ ہم انسانیت کی خدمت میں ختم ہو جائیں۔ معاشرہ مرے یا زندہ رہے۔ تہذیب ڈوبے یا پار اترے۔ ہم غلام رہیں یا آزاد ہو جائیں، انسانیت کو بہر حال زندہ رہنا ہوگا۔"

میں نے کہا: "تو تم ایک خواب کے لیے لڑنے والے ہو۔"

''انسانیت ایک خواب ہے کیا؟'' اس نے میرے قریب آتے ہوئے پھر پوچھا۔

''نہیں۔ انسانیت تو ایک خواب نہیں' البتہ تم دونوں کنول کماری اور تم' دونوں جس بات کے لیے جدوجہد کر رہے ہو' وہ تو ساری تباہی کے بعد بھی تباہ ہونے سے بچ رہے گی' کیونکہ وہ اصل ہے۔ وہ سچ ہے' وہ نیکی ہے۔ آگ میں جھوٹ جلے گا' ناسور جلیں گے۔ ایسی چیزیں جن کا وجود خطرناک ہے مگر انسان باقی رہے گا اور اس کی انسانیت۔''

راجندر نے میری طرف مڑتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ تم بھی غلط کہتے ہو۔ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ تو اس بات کی شہادت ہے کہ اس زلزلے میں بہترین چیزیں تباہ ہوں گی۔ خواب اور حسن' نیکی اور سکون۔''

میں نے کہا: ''یہ چیزیں تو ازلی ہیں' زندگی کی اساس ہیں۔''

اور راجندر نے کہا: ''اب کے بنیادیں بھی ہل جائیں گی۔''

میں نے کہا: ''دیکھا جائے گا۔''

پھر جیسے اور کچھ کہنے کے لیے باقی نہ رہا ہو۔ وہ آتش دان میں انگاروں کو ٹھیک کرنے لگا اور میرے دماغ میں ایک بہت پرانا گیت ابھرنے لگا۔

یہ تو شمع کی ریت پرانی جل جل کے بجھ جائے
پروانے کی پریت دیوانی ہنس ہنس پنکھ جلائے

نہ جانے کیوں میرے دماغ میں یہ گیت تیرتا رہا۔ باہر بارش تھم چکی تھی۔ صرف تیز ہوا چل رہی تھی۔ درختوں کی بھیگی ہوئی شاخیں ایک دوسرے کے ساتھ رگڑ کھا رہی ہوں گی۔ دیوانوں کی طرح ایک دوسرے پر گری جاتی ہوں گی۔ پتے دوہرے ہو رہے ہوں گے۔ درخت جھک رہے ہوں گے اور بھیگی ہوئی شام پر سے بادلوں کی سیاہی اٹھتی جا رہی تھی۔ جمنا پر سے یہ گھٹائیں گوکل کی گوپیوں کی طرح بڑی چنچلتا سے تیز تیز گزر رہی ہوں گی اور جمنا کے کناروں پر جو تہذیب صدیوں سے پروان چڑھی تھی' کیا اس کی تباہی کا وقت آ گیا ہے؟ کیا تاج بناتے شاہ جہان نے جو خواب دیکھے تھے' ان کے مسمار ہونے کی گھڑی آ پہنچی؟ اگر ایسا ہونا برا ہے تو پھر ہم کیا کر سکتے تھے۔ ہم تو انسان تھے۔ فانی' کمزور' مجبور اور خوابوں میں لپٹے ہوئے۔ تھوڑے سے جنونی' ذرا دیوانے اپنی دھن میں آگے ہی آگے بڑھ جانے والے انسان۔

حالات بدستور بگڑ رہے تھے اور پھر بھی ہم سب مطمئن تھے کہ کوئی معجزہ ہوگا۔

ہندوستان کے پرانے مندر ہندوستان کی سربفلک مسجدیں، ہندوستان کے راجکماروں کے قصے جن پر خون کی تہہ نہیں چڑھے گی۔ غیر ملکی لاکھ ہمیں دیوانے سمجھ کر گرانے کی اسکیمیں سوچیں، پر ہم بچ جائیں گے۔ ہم گریں گے نہیں۔ آخر ہمارے پاس ہمارا پرامن ماضی تھا۔ ہم مر نہیں سکتے۔ ہم تباہ نہیں ہو سکتے پر کاش! میرے یہ سارے خواب سچے ہوتے۔

وہ لمحہ اب بہت پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ اتنا پیچھے کہ میں یا میرا کوئی ساتھی کنول ٹھاکر یا نیرا اسے چھو نہیں سکتے۔ وہ لمحہ ہمارا اپنا نہیں تھا اور میں سوچتا ہوں راجندر کے خوبصورت کمرے میں جہاں اس کے مہاشوں کی تصویریں ہوا کرتی تھیں اور جہاں اس شام چینی کے پیالوں پر بنے ہوئے کیوپڈ اپنے تیر کمان سرنگوں کر کے سوچ رہے تھے۔ وہ ایک لمحہ ایک بخار کی سی کیفیت میں وہاں سے نکل بھاگا ہوگا تاکہ ہم میں سے کوئی اسے پھر نہ چھو سکے، پھر دیکھ نہ سکے۔

اس رات گھر آ کر مجھے سہ پہر کی ڈاک سے آیا ہوا شوبھا کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا۔

جو اپنے لیے کچھ نہ کر سکا وہ بھلا دنیا کو کیا بچائے گا اور پھر بھی سوچتی ہوں ابھی کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ باقی ہے۔ اتنا شور اتنی پریشانی ہے۔ دیوانوں کی طرح دنیا کس موڑ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ کیا چٹان کے بعد گہرا سمندر نہیں ہے؟ لوگ گرنے اور اپنے آپ کو تباہ کرنے کا کیوں سوچ رہے ہیں اور پھر بھی انسان ہمیشہ کھلی آنکھوں سے سوچ سمجھ کر ہی تباہ ہوا کرتا ہے۔ انسان اس چٹان سے اپنے آپ کو آزادی کے سمندر پر تیز رو جہازوں پر چڑھانے کے لیے بھاگ رہے ہیں اور مجھے معلوم ہے چٹان کے آخر میں کوئی ایسا نیچا کنارہ نہیں ہے، جس سے جہازوں تک رسائی ہوگی اور ایسے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے دشمن سوچی سمجھی تجویزوں کے تحت دوستوں کے بھیس میں ہمارے درمیان گھومتے اور ہمیں بتاتے ہیں کہ تباہی سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ ملک کے حصے بخرے ہو رہے ہیں تو ہونے دیئے جائیں۔ مسلم اور ہندو وجود کے الگ الگ حصے ہیں۔ ان کو الگ ہو جانا چاہیے اور مجھے یہ سب باتیں سن کر اپنا جسم سوتا ہوا، اپنا دل بجھتا ہوا لگتا ہے۔ پہلے جوگی مہاراج نے مجھے اپنے میکے کے گھر سے اپنے سسرال کے آنگن میں اُگے ہوئے پیپل سے الگ کر دیا تھا۔ اب کوئی مجھے میرے خوابوں سے الگ کر دے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ہم مر کر بھی ہندو اور مسلم نہیں ہو سکتے۔ ہم صرف انسان ہیں۔ یہ ہمارا پیارا سا گھر ہے اور اس کی تباہی اگرچہ یقینی ہو پھر بھی بہت تکلیف دہ اور قاتل ہوگی۔

پہلے بھی کسی نے مجھے بتایا تھا مُکتی یہی ہے کہ ہم کشٹ اٹھائیں اور اپنے آپ کی قربانی دیں۔ تب تو میں نے اپنے دل کے بدلے یہ بات آنکھ بند کر کے سویکار کر لی تھی۔ اس کو کوئی بھی سمجھ نہیں سکتا۔ پر میں جانتی ہوں کہ قربانی دینا کتنا مشکل ہے۔ زندگی موت سے بھی بدتر ہو جایا کرتی ہے۔ انسان مر نہیں سکتا۔ میں نے ان آگ کے سمندروں پر برسوں سفر کیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ ایسی کشتیوں پر جو اپنی نہ ہوں سفر کرنا کتنا مشکل ہے اور میرے دل میں ابھی سکون نہیں آیا تھا کہ کسی نے پھر کان میں کہہ دیا ہے کہ پھر قربانی کرو پھر مورتی کے سامنے کچھ بھینٹ چڑھاؤ۔ پھر خوابوں کے دھندلکوں میں لپٹے ہوئے سوئے چلنے والوں کی طرح کسی نہ کسی شے سے ٹکرا کر تباہی یقینی ہو گی۔

کہنے والے بتاتے ہیں کہ سب کچھ پُرامن طریقے سے چپ چاپ نہیں ہوا کرتا' زندگی کی بنیادیں ہل جایا کرتی ہیں۔ ایک تباہی میں اپنے وجود کے اندر دیکھ چکی ہوں۔ کیا دوسری تباہی سے بھی مجھے دوچار ہونا ہو گا؟

پہلے میں نے سوچا تھا' شاید اپنے گرد دنیا کے لیے کچھ کر کے مُکتی ہو جائے گی۔ اب سوچتی ہوں جب اپنی دنیا ہی وہ نہ رہی تو کیا ہو گا۔ نجات نہ ہو گی' اب تو وہ سہارا بھی نہیں رہے گا۔ انسان مر مر کر جیتا ہے۔ انسان نے یہی سیکھا ہے کہ مرے اور پھر زندہ ہو اور پھر بھی انسانیت مجروح ہو جایا کرتی ہے۔ انسانیت کو تو میں نے بھی مجروح کیا تھا۔ اب اس کو میری طرح اور بہت سے کریں گے۔ کیا ہو گا کچھ کہہ نہیں سکتی۔ پر اسی طرح جیسے اپنی تباہی سے پہلے مجھے سپنوں میں ہر طرف خون کی باس اور رونے کی آوازیں زندہ لگتی تھیں۔ بالکل ویسے ہی اب بھی سپنے مجھے بتاتے ہیں کہ موت کہیں نزدیک ہی کسی اچانک موڑ پر انتظار میں کھڑی ہے' مرنا مشکل ہے۔ کسی نہ کسی طرح موت کے یقینی ہونے کے باوجود جینا کتنا مشکل ہے اور مرنا بھی مشکل لگتا ہے۔ نہ جانے کیا ہو گا اور میں پھر بھگوان سے نہیں' تم سے پوچھتی ہوں۔ تم اگر کبھی جھکے ہو تو پوچھنا تو سہی کہ بھگوان کوئی اپائے نہیں کر سکتا۔ آنے والے انقلاب کو روکنے کا کوئی طریقہ نہیں جانتا۔ ایک آتش فشاں اندر ہی اندر سلگ رہا ہے۔ یہ بھی ایک آزمائش ہو گی' پر کیسی کہہ نہیں سکتی۔

تمہارا تو اختیار ہے تم تو اتنے لوگوں سے ملتے ہو' تم ہی کچھ بتاؤ۔ میں اپنے پتی کے ساتھ جن دنوں یورپ میں گھومتی تھی۔ اجنبی ساحلوں پر جا رہی تھی۔ ان دنوں رقص کرتے اور بیگانی موسیقی کے ساتھ بہتے ہوئے میں نے سوچا تھا' کیا ہی اچھا ہو اگر ہمارا اپنا ملک اس موسیقی سے

پاک ہو جائے۔ دوسرے دیس میں کوئی اپنے یہاں کا نغمہ نہیں جانتا اور ہم کیوں دوسرے لوگوں کے ساتھ اتنے پیار سے رہتے' ان کے آگے جھکتے اور ان کے مرہون منت ہوتے رہتے ہیں۔ میرا اپنا پتی لاکھ عیسائی سہی پر اس کا دل اپنے ملک سے بہت پیار کرتا ہے۔ قومیت کی وجہ سے وہ دو راہوں کے سنگم پر کھڑے ہو کر سوچنے والوں کی طرح صرف سوچتا ہے۔ کچھ کہتا نہیں ہے۔ میں نے ایک دن اسے کہا تھا' ''ہمارا ملک کسی نہ کسی طرح دوسرے لوگوں کی غلامی کے بندھنوں سے چھوٹ جائے گا۔''

اور اس نے ہنس کر کہا تھا: ''شوبھا تم انگریزوں کو ابھی تک بدیسی کہتی ہو اور اس کے باوجود میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ ملک آزاد ہو جائے۔''

اس دن میری اور ڈانیل کی بحث ہو رہی تھی۔ وہ کہتا تھا انگریزوں کو غیر ملکی کیوں کہتی ہو اور اس کے باوجود وہ کہتا ہے کہ وہ بدیسی نہیں ہے۔ اسے ہندوستان سے پیار ہے۔ دیکھا نا کیسی متضاد باتیں ہیں۔ پر میں کہتی ہوں ایسے میں جب اپنوں کا اعتبار نہیں ہو سکتا' غیر کا کیا اعتبار۔ دیکھو تو سہی میں نے مریم کنواری کی طرح ستاروں بھری چنری اوڑھ تو لی ہے پر یہ چنری مجھے پرائی ہی لگتی ہے۔

اور اب سردیاں ہیں۔ گیہوں کی بالیاں سنہری ہوتی ہوں گی۔ دھوپ کھلتی ہو گی تو آنگن میں گاؤں کے گھروں میں سکھیاں سہیلیاں جمع ہو کر چرخے کاتتی ہوں گی' گیت گاتی ہوں گی۔ گنے کے کھیت پک کر رس بنانے کے لیے تیار ہوں گے۔ بیلنے چلتے ہوں گے تو گرم گرم اتنا سوندھا ہوا اور خوشبودار رس نکلتا ہو گا' جس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی شراب اور کوئی بھی مغربی چیز پیش نہیں کی جا سکتی۔ پھر بڑے بڑے کڑھاؤ چڑھتے ہوں گے۔ خوب ڈھیروں آگ جلتی ہو گی اور اس کا پکتا گاڑھا ہوتا گرم اور لذیذ گڑ میں بدلتا ہو گا۔ بتاؤں مجھے اس بدیسی طریق سے بنائی چینی کے مقابلے میں اصل ذائقے والا گڑ ہی اچھا لگتا ہے اور میں گھومتی ڈانیل کے کندھے سے کندھا ملائے چلتی ہوئی خوابوں میں ڈوب جاتی ہوں۔ گاؤں' رہٹ' دور تک پھیلے کھیت' ہریالی اور زمین کی سوندھی باس۔ یہ مجھے یاد آتی رہتی ہے۔ کبھی کبھار روئے کی ٹمٹماہٹ میں راتوں کو چرخے کی آواز آتی ہے گھوں گھوں۔ پھر قہقہے' رت جگے' ترنجن اور گیت۔ بابل کے ڈولیوں کے ڈھولک پر تھاپ کے اچھوتے گیت اور اب میرے یہ خواب بھی تباہ ہو جائیں گے۔ ایک زلزلہ سا آنے والا ہے۔ پھر سب کچھ الٹ پلٹ ہو جائے گا۔ کھیتوں میں ویرانی ہو گی' خاک اڑے گی۔

آج کل من موہن براجمان ہیں۔ ہمارے ہاں مہمان ہیں۔ وہ کنول کماری ٹھاکر کی باتیں کرتے ہیں اور مجھے اتنی شرمندگی ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے ڈوب مروں۔ پر میرے ڈوبنے کے لیے کوئی سمندر بھی گہرا نہیں ہے۔ میں نے کنول کے ساتھ کیا کیا نہیں کیا اور پھر بھی اس کی نیکی ہے کہ اس نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ کنول تو دیوی ہے۔ تمہاری بیٹی بینا تو اب بہت بڑی ہو گئی ہوگی۔ اس کا بیاہ کرو گے تو مجھے بلانا۔ میرے بازوؤں میں گاؤں کے ناچ مچلتے ہیں۔ میرے دماغ میں پرانے گیت تیرتے ہیں۔ بینا کے بیاہ میں خوب رونق ہوگی۔ پر جانے تم مجھے بتاؤ کہ نہیں۔ میں ہوں بھی تو اس قابل کہ مجھے بھلا دیا جائے مگر پھر بھی شوبھا ہوں۔

شوبھا کا خط پڑھ کر طبیعت پر ایک بوجھ سا بیٹھ گیا۔ راجندر ڈون وارٹن اور پھر شوبھا سب اپنی اپنی جگہ پریشان تھے۔ کنول بھی پریشان تھی اور میں کیا میں خاموش تھا۔ مجھ پر ابھی تک باہر سے کسی نے زور نہیں دیا تھا کہ اپنے اخبار کی پالیسی بدلوں۔ کسی کے خلاف اشتعال انگیز تحریر لکھوں یا کوئی ایسی بات جس سے معلوم ہو سکے کہ ہم لوگوں کو بھی سیاست کی بہتی رو کے ساتھ جانا ہے۔ میرا اخبار ایک غیر جانبدار نقاد کی طرح حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتا تھا۔ ایڈیٹر اتنا ذہین اور بے باک آدمی تھا کہ مجھے ایڈیٹورل میں دیکھنے کا موقع نہیں ملا؟ میں مطمئن تھا۔ پر آج ان سب باتوں نے میرے بھی سوئے ہوئے دماغ کے کسی حصے میں کاری ضرب لگانی شروع کی۔

انسانیت مجروح ہو رہی تھی اور اس کے لیے بیٹھ کر آنے والے دور کا انتظار کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ جس تباہی کا احساس کنول کو ہو گیا' شوبھا کو ہو گیا' وہ احساس جس کے تحت ڈون وارٹن نے کہا تھا کہ تمہاری عورتیں حیرت انگیز طور پر جاگ رہی ہیں۔ کیا میں سویا ہوا تھا؟ اور اس رات پہلی بار ایک مطمئن نہیں بلکہ ایک مضطرب انسان کی طرح میں ٹہلنے لگا۔ میں رنجیدہ تھا کہ اب تک میں نے کچھ کیا کیوں نہیں۔

بینا اندر سے آئی تو بڑی اداس سی تھی۔ اس کو دیکھ کر طبیعت کا اضمحلال کچھ کم سا ہونے لگا۔ میں نے کہا'' کیا بات ہے بڑی چپ ہو؟'' بینو بولی'' یہ روز روز کی بارش بھی تو خوب تنگ کر دیتی ہے۔ آج شام کو ہم ایک جلسے میں جانے والے تھے۔''

کون سا جلسہ؟ میں نے یونہی پوچھ لیا۔'' تم نے وہاں کوئی تقریر کرنا ہوگی' تبھی اتنی پریشان ہو۔''

نہیں بابا۔ میں نے تو کچھ نہیں کہنا تھا۔ ہاں آپ کی دوست آج وہاں گئی ہوں گی اور اسی لیے مجھے رنج ہے۔ وہ اتنا کم نکلتی ہیں مہینوں کے بعد کسی عام جلسے میں جاتی ہیں اور لے کے آج شام کو بارش ہوگئی۔

میں نے کہا، بارش تو ایک طرف، اگر زلزلہ بھی آیا ہوگا تو بھی کنول وہاں گئی ہوگی۔ اس نے تقریر کی ہوگی اور ہاں جلسہ کس سلسلے میں تھا۔ ''مجھے کیا پتہ؟'' بینا نے نئے سرے سے بارش کو کوستے ہوئے کہا۔ ''میں بڑی پاگل ہوں۔ یونہی ذرا سی بارش سے ڈر گئی۔''

''ٹھیک کہتی ہو بینو۔ بارش سے ڈرنا بے فائدہ ہے۔ لڑکیوں کو بہت باہمت ہونا چاہیے اور تم تو سنا ہے دیش بھگت ہو۔''

''میں تو جانے والی تھی۔ ماں ہی روک کر کھڑی ہوگئی۔ آج ماں نے بھی تو جانا تھا۔ اس کی نئی ساڑھی پانی میں خراب ہوتی، مجھے بھی نہیں جانے دیا۔''

نروپما کی نئی ساڑھی کے خیال سے ہنس پڑا۔ ''اچھا تو آج تمہاری ماں نئی ساڑھی پہننے والی تھی۔''

''بابا آپ تو مذاق کرتے ہیں جب کسی جلسے میں جاؤ سب ہی لوگ تو اچھے کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ سب عورتیں نئی نئی ساڑھیاں رنگ برنگ کپڑے خوب ٹھاٹ سے نکلتی ہیں سب۔'' بینا نے اسی روٹھے انداز میں کہا۔

''تم کون سے کپڑے پہننے والی تھیں۔ میں بھی تو دیکھوں۔'' میں نے اسے مناتے ہوئے کہا۔

''ہم ہم تو کبھی نئے کپڑوں کے چکر میں نہیں پڑتے۔ آپ کی دوست کہتی ہیں کہ عورت کی شان سادگی میں ہے۔ اچھے خیالات اور نیکی میں ہے۔ لڑکی کا زیور بہادری اور شرم ہے۔ دھرم اور مستقل مزاجی ہے۔ ہمارے کالج میں تو کوئی رنگ برنگ کپڑوں کے چکر میں نہیں پڑتا۔ سب لڑکیاں اتنی سادہ ہوتی ہیں۔''

''اچھا۔ میں نے یوں کہا جیسے مجھے اس بات کا آج ہی معلوم ہوا ہو تو تمہاری پرنسپل تمہیں کہتی ہیں کہ سادگی اچھی ہوتی ہے اور پھر بھی تمہاری ماں آج نئی ساڑھی پہن کر جانے والی تھی۔''

''ماں کی بات اور ہے۔ بابا ماں تو عورت ہے نا اور عورتوں کو تھوڑی سجاوٹ معاف

ہے۔ جلسوں میں بھی بیاہ شادیوں کا سا سماں ہوتا ہے۔ ہر کوئی دوسرے سے پوچھتا ہے۔ کیوں بھئی یہ کپڑا کیسے لیا' کہاں سے خریدا؟ ہم بھی ایسا ضرور خریدیں گے۔ رونق تو اسی بات کی ہوتی ہے۔"

"تو تم ایسے جلسے میں جانے والی تھیں جہاں یہ پوچھا جاتا ہے کپڑا کہاں سے خریدا اور کیسے خریدا۔ کنول کماری ایسے جلسے میں تقریر کرتیں۔ تقریر بھی شاید کپڑوں کے بھاؤ تاؤ کے متعلق ہوگی؟" میں نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

"جی ہاں آپ کو جیسے پتہ نہیں کہ جب آپ کی دوست کہیں جائیں تو کپڑوں کے متعلق بات کریں گی۔ وہ تو خود ایسی سادہ ہیں۔" مجھے کیا معلوم تمہاری پرنسپل ہیں۔ میں کیا جانوں کیسی ہیں۔ میں نے تو عورتوں کے جلسے میں کبھی اسے بولتے نہیں سنا۔" میں نے پھر کہا۔

"بابا آپ کیوں ہنستے ہیں۔ ایسے بڑے بڑے مردوں کے جلسے میں تو وہ بولتی ہیں' پر خیر عورتوں کی باتیں' آپ کیا جانیں۔" بینا نے بھی اب ہنسنے کی سوچی۔ "آج کل جلسے خوب زوروں پر ہیں۔ بابا۔" بینا نے پھر کہا۔ "ملک کی آزادی کا دن قریب آنے والا ہے اور پھر ملک کے دو حصے ہونے والے ہیں۔ کہتے ہیں سب لوگ الگ الگ ہو جائیں گے۔ مسلمان ایک طرف' ہندو دوسری طرف۔ مجھے تو اس بات کا بڑا دکھ ہے بابا۔ آپ کچھ نہیں کر سکتے کہ یہ کھنڈت نہ پڑے اور میری ساری سہیلیاں اتنی اچھی لڑکیاں ہیں۔ عائشہ چلی جائے گی تو میں کیا کروں گی۔ بلقیس کے بنا میں جی نہیں سکتی۔ ہائے رام میں کیا کروں بابا آپ ہی کچھ کیجئے نا۔" وہ پھر اداس ہوگئی۔

میں نے کہا: "تمہاری پرنسپل کیا کہتی ہیں۔ ان سے کہو وہ کوئی علاج کریں۔"

"بابا۔" بینا نے پھر کہا۔ "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ وہ بے چاری عورت ہیں کیا کریں گی۔ آپ اخبار کے ذریعے حکومت پر زور کیوں نہیں دیتے کہ وہ ایک دم ایسی باتیں بند کردے جو لوگ آزادی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں' ان کو بتانا چاہیے کہ بٹ کر ملک کی شکتی کم ہو جائے گی۔ ہم دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کمزور ہو جائیں گے اور پھر ہم تو صدیوں سے اس ملک میں اکٹھے رہتے آئے ہیں بابا۔ عائشہ کہتی ہے کہ اس کے مہاپرش آٹھ سو سال سے یہاں رہتے ہیں ان کا مکان آپ نے دیکھا ہے بابا اتنا پرانا اور بڑا ہے۔ بالکل محل لگتا ہے۔ میں تو اس کے کئی کمروں میں ابھی تک جا نہیں سکی۔ وہاں جھروکوں میں ایسی ٹھنڈی ہوا آتی ہے کہ بس کسی پنکھے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

"عورتیں بہت کچھ کر سکتی ہیں بھئی......" میں نے تھک کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں کوئی

ایک سال سے آزادی کے اس غلغلے کے ساتھ باتیں سنتا آیا تھا۔ پر بینا نے آج سے پہلے کبھی بھی اس قدر زور دے کر باتیں نہیں کہی تھیں۔ وہ سیاسی دماغ کی کرشمہ سازیوں سے بے خبر تھی۔ اخبار کبھی کبھار پڑھتی۔ کہتی بابا نہ جانے کیوں مجھے نئی خبریں پڑھ کر ڈر لگتا ہے۔ دنیا تیز بھاگ رہی ہے اور کہیں گر جائے گی۔ مجھے تو پرانی زندگی اچھی لگتی ہے۔ سوئی سوئی سی جس میں کوئی شور نہ ہو۔ مجھے پرانے مکان اور پرانے رواج اچھے لگتے ہیں۔

میں نے اس کو کئی بار کہا تھا۔ بینا اخبار پڑھنے سے انسان باہر کی دنیا سے باخبر رہتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ ایک تعلق محسوس کرتا ہے اور اس نے کہا ہے بابا تعلق جو اخبار پڑھ کر پیدا کیا جائے جھوٹا ہے۔ اخبار پڑھے بِنا بھی میں تو اپنے آپ کو زمانوں کی بہتی ندی کے سنگم پر کھڑا پاتی ہوں اور پھر مجھے سمجھانے کے سے انداز میں کہتی۔ ''دیکھئے نا بابا دوسروں کے لیے کچھ کرنا' اپنے آپ کو اتنا اچھا بنانا کہ تم لوگوں کے کام آسکو۔ اپنے کو ہر وقت تیار رکھنا' خدمت کرنے کے لیے بھینٹ چڑھانے کے لیے اور پھر بابا ہمدردی کا ایک الگ مذہب ہے' ایک الگ زبان ہے۔ دکھیا اور ضرورت مندوں کے لیے محسوس کرنا' اور زندگی میں ایسے جینا کہ تم دکھوں کو کم کرسکو' یہ اصل تعلق ہے۔''

یہ سب باتیں سن کر مجھے معلوم ہو جاتا کہ کنول کماری بینا اور اس جیسی صد ہا لڑکیوں کے دماغ میں ان سب خیالات کی زبان ہے۔ جس کالج میں ہر قدم پر فکر اور عمل کی ساری قوتوں سے یہی باتیں دیکھنے میں آئیں گی وہاں جہاں ہر گھڑی یہی سکھایا جائے گا' وہاں کی لڑکیوں کا ایسے خیالات پر عمل کرنا کوئی بہت بڑی بات نہیں۔ میں بینا کی طرف سے مطمئن تھا۔ پر اس شام بینا نے کہا' آپ غلط کہتے ہیں بابا۔ عورتوں کا ایک الگ دائرۂ عمل ہے۔ قوتِ بازو اور زور سے جو کام ہو سکتے ہیں وہ ہم نہیں کرسکتے۔

''کس طرح نہیں کرسکتے؟'' میں نے بحث کرنے کے طریقے سے کہا۔ ''مجھے بتاؤ۔''

''سنئے بابا۔ پرماتما نے عورت کو گھر سدھارنے اور زندگی کے ان سوتوں کی حفاظت کے لیے بنایا ہے جو عام حالات میں مرد کو ان پھیلے ہوئے سمندروں پر آگے ہی آگے بڑھائیں۔ پر ایسے وقت میں جب سیاہی ریشہ دوانیاں اور گتھیاں الجھ گئی ہوں' عورت کیا کرسکتی ہے۔ عورت کو ہر قدم پر مرد کی مدد کی ضرورت ہے اور مرد کو عورت کی۔ اس کام کو کوئی بھی بنا ایک دوسرے کے نہیں کرسکتا اور پھر بھی آپ لوگ زیادہ طاقتور ہیں۔ انسانیت کے لیے کچھ کیجئے۔''

''انسانیت کا لفظ تو آج میں نے راجندر سے بھی سنا تھا جس کو زندہ رکھنے کے لیے وہ

کنول کے کہنے پر انجا نے سمندروں پر اپنی کشتی کھینے چل نکلا تھا۔''

میں نے کہا: ''تم نے راجپوتانے کی رانیوں کی کہانیاں نہیں پڑھیں۔ تم نے اپنی ہندوستان کی ایسی عورتوں کی باتیں نہیں سنیں۔ انسانیت کو عورت بچا سکتی ہے۔''

''بابا۔'' بینا نے چڑ کر کہا۔ ''راجپوتانے کی رانیاں پرانی باتیں ہیں۔ ہندوستان کی مغل رانیاں بھی بیت گئیں۔ اب حالات میں فرق ہے۔ اب تو سب کچھ بدل گیا ہے۔ ایسے میں جب سارا وقت آزادی کا شور ہے اور ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اتنی بے اطمینانی ہے ایسے میں تو مرد ہی کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ پرانے وقتوں کا اور اس مارا ماری کے زمانے کا مقابلہ کرنے لگتے ہیں۔''

''اچھا بھائی اچھا تقریر نہ کرو۔ مان لیا تم کبھی کبھی ذرا ذرا سے انعام لے آتی ہو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''آپ ہنس کر ہر بات خراب کر دیتے ہیں۔ بھلا میں کوئی تقریر کر رہی ہوں۔'' وہ ذرا زچ ہو گئی۔ ''میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ عورت کا کام ایک محدود دائرے کے اندر ہو سکتا ہے۔ سیاست اور یہ شور و شغب یہ سب عورتوں کی سمجھ اور ان کے ہاتھ سے باہر ہے۔ اس کو آپ درست کیجیے گا۔''

''اچھا بھائی اچھا۔'' میں نے پھر اسی طرح سے کہا۔ ''تم کوئی سپاہی ہو یا کسی کی ایجنٹ جو مجھ سے زور دے دے کر کہہ رہی ہو۔ یہ کر دو وہ کر دو۔ میں تو کچھ کرنے سے رہا۔ ملک کے حالات خود ہی راہیں بنا لیں گے۔''

''خود ہی راہیں بنا لیں گے۔ وہ کیسے؟'' بینا اب ذرا سرخ ہو کر بحث کے رنگ میں بات کرنے لگی۔

''یوں کہ اب تم کھانا کھلاؤ۔ میں تھکا ہوا ہوں۔ پھر آرام سے بیٹھ کر تمہیں سمجھاؤں گا کہ جب حالات یکسر بگڑ جائیں تو اس طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے انسان ایک تنکے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دور جس سے ملک بے تاب ہے' یہ درد خود ہی دوا بن جائے گا۔ گھبراؤ نہیں۔''

مگر بینا کی سمجھ میں یہ بات کیسے آ سکتی تھی۔ اس کو تو کالج میں انسانیت اور نہ جانے کیا باتیں سننے کو ہوتی تھیں۔ میری بات کا کنول کے مقابلے میں یوں بھی اس پر کم اثر ہوا کرتا تھا۔ کنول کی بات دلوں میں پیوست ہو جایا کرتی تھی اور میں نے تو جب سے بینو کو کالج میں داخل کروایا' اس کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا۔ اس کا دماغ فضول باتوں اور احساسِ کمتری کے بندھن سے آزاد

ہو گیا تھا۔ ہر بات کے متعلق اس کی رائے اتنی صائب اور سلجھی ہوئی ہوتی تھی اور میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ کنول کالج کی پرنسپل ہے۔

"کیوں بینو۔" میں نے کئی بار اس سے پوچھا تھا۔ "تمہارے کالج کی سب لڑکیاں ایسی ہی سر پھری ہیں۔ تمہاری طرح کی؟"

"میں بالکل سر پھری نہیں ہوں بابا۔" وہ لڑنے لگتی۔ پہلے میں بینا کو ایک ننھے پودے کی طرح برے اثرات اور باہر کی مسموم ہواؤں سے بچانے کی خاطر ہر وقت اپنے ساتھ لگائے رکھتا۔ زوپما پر مجھے بھروسہ نہیں تھا۔ پھر باقی بچوں کے بوجھ گھر کے کام دیکھ بھال میں وہ گھری، وہ کسی طرح بھی بینا کی طرف اپنی توجہ نہ دے سکتی تھی اور مجھے سوائے بینا کے کسی کو دیکھنا نہ تھا۔ پر ہائی اسکول پاس کرنے تک بینا بھی کافی بڑی ہو گئی اور جب کالج میں گئی ہے میں ہر پریشانی سے آزاد تھا۔ کنول کی سی عورتیں یا جن کو میں جانتا تھا' ان میں سے کنول کی سی عورتیں خال خال بھی نہیں تھیں۔ میں مطمئن کیسے نہ ہوتا۔

کھانے کے بعد بینا نے مجھے پان دیتے ہوئے کہا: "اچھا بابا اب سمجھائیے کہ درد خود ہی کیسے دوا بن جائے گا؟"

میں نے پان لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "سمجھائے دیتے ہیں۔ فکر کی کیا بات ہے۔" اور میری لائبریری میں رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ بینا نے لپک کر فون ریسیو کیا۔ اس کی آواز لائبریری میں سے آ رہی تھی۔ ابھی اسی وقت۔ گیارہ بجے۔ اچھا بہت اچھا۔" اندر آئی تو منہ لٹکائے ہوئے تھی۔ بڑی بیزار سی کہنے لگی۔ ایک تو بابا اتنے مصروف ہیں۔ ابھی سے کہ فون آ گیا۔ اخبار والوں کی کوئی میٹنگ ہے۔ رات کے گیارہ بجے آپ کو بلوایا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی وقت ہے بلانے کا۔ اتنی سردی ہے۔ ایسی تیز ہوا چل رہی ہے۔ یہ کیسے لوگ ہیں؟"

میں نے کہا: "دیکھا نا بڑی بنتی ہو سیوک اور انسانیت کی حفاظت کرنے والی عورتیں یہ کر سکتی ہیں کہ ان کے بابا کو رات کے گیارہ بجے کام سے جانا پڑ جائے تو لڑکیاں بڑبڑاتی پھریں گی۔ لاؤ میں نہیں جاتا۔ تم سے باتیں کرتا ہوں۔"

"نہیں بابا۔" بینا نے ہنس کر کہا۔ "آپ جائیے میں تو یونہی کہہ رہی تھی کہ آپ مصروف ہیں، کبھی مجھے بیٹھ کر سمجھاتے تک نہیں ہیں کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے سمجھانے کو کنول جو کافی ہے۔ میں کیا سمجھاؤں

گا۔ عورتیں صرف سمجھانے کا کام کر سکتی ہیں۔ باہر کے کام ہم دیکھیں گے۔''

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ رات کے گیارہ بجے میٹنگ بلانے کا کیا مطلب ہے۔ میں نے شبیر حسین کو فون کیا۔ ان کا بھی اپنا اخبار تھا۔ کیا وہ چل رہے ہیں؟ انہوں نے انکار کیا۔ کہنے لگے: ''مجھے تو کوئی اطلاع نہیں آئی۔'' میں اور بھی حیران تھا۔ پھر میں نے سردی کی سختی محسوس کرتے ہوئے کپڑے پہنے اور بینا کو شب بخیر کہہ کر چلا گیا۔

راستے میں سوچ رہا تھا کہ حالات یکا یک خراب ہو رہے ہیں۔ انقلاب ہماری چوکھٹ کے باہر کھڑا ہے۔ وہ منتظر ہے کہ ہم اسے اندر بلالیں۔ اس صدی کے اتار چڑھاؤ یکے بعد دیگرے میری نگاہوں کے سامنے پھر گئے۔ آزادی کے لیے کشمکش کب سے ہو رہی تھی۔ جدوجہد' ستیہ گری جلوسوں پر گولیاں بارش کی طرح برسی تھیں۔ بڑے بڑے لیڈروں نے برسوں جیلیں کاٹی تھیں۔ کئی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر آزادی کے نام پر قربان ہو گئے۔ لوگوں نے اپنا نام' اپنی جائیدادیں' اپنی زندگیاں ملک کے نام پر قربان کر دیں۔ انسان کتنا جذباتی ہے۔ انسان آنکھیں بند کر کے خوبصورت خوابوں کے لیے...... راہوں پر مارا مارا پھرتا ہے۔ انسان سے زیادہ رومان پسند کوئی نہیں ہے۔ سب ہی رومان کے پیچھے خوابوں کے پیچھے دیوانے ہیں۔

پر کیا یہ طوفان جو آنے والا ہے۔ کیا یہ انقلاب جس کا خیر مقدم ہم کرنے والے ہیں' کیا یہ پرامن ہوگا۔ کیا جس آزادی کے لیے ہم نے اتنی قربانیاں کی ہیں کیا وہ پرامن ہوگی۔ انگریز ملک کو بالآخر چھوڑ رہے تھے۔ غیر ملکی جانے والے تھے مگر یہ بے چینی کیسی؟ انہوں نے آخر میں ملک کے دو حصوں کا خواب دلوں میں ڈال دیا تھا جس کے دو حصوں کو الگ کر کے نہ جانے کیا ملے گا مگر اس طرح ان کی اہمیت قائم رہے گی اور اس کے باوجود بھی آنے والے وقت کے متعلق سب ہی بے چینی سے بات کر رہے تھے۔ دونوں ملک یعنی دو خوابوں کے دو علَم بردار تھے۔ ایک ابھی نیا تھا۔ دوسرا کہنہ مشق تھا۔ پر صیاد کا کہنہ مشق ہونا اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ دیکھنے کی بات تھی جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ہم تو حالات کے دھارے کا رخ موڑنے سے رہے۔ ایک سمندر بڑھتا آ رہا تھا۔

جھٹکے کے ساتھ کار رکی۔ ضلع کے حاکمِ اعلیٰ کی کوٹھی آ گئی تھی۔ ایک باوردی سپاہی نے آگے بڑھ کر بڑے ادب سے کہا' ''آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔''

اور میں حاکم کے پرتکلف ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔

جب الوداع کہنے کا وقت آیا تو میں نے کنول پر ایک نظر بھی نہ کی۔ کام کی زیادتی مصروفیت میں آگ کے طوفانوں میں نعروں کے شور میں جے' جے کی صداؤں میں کنول کماری ٹھا کر میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ پہلے تو مجھے یقین نہیں آیا اور اب بھی میں اسے اسی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ اس کی سفید ساڑھی کا پلو' سیاہ بال' وہ آنکھیں جن کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی میں کبھی جرأت نہیں کرسکا۔ اندھیرے کے اسی لمحے میں جب بھی چاروں طرف انسانیت مرتی مارتی بھاگ رہی تھی۔ مجروح نہیں زخمی نہیں قتل کی جارہی تھی اور ڈون وارٹن مجھے بیٹھا اپنی روداد سنا رہا تھا۔ ڈون وارٹن واپس جارہا تھا۔ ڈون وارٹن سیاہ آنکھوں والی سینوریتاؤں کے دیس کا ایک باسی ہمارے اپنے دیس سے اس لیے جارہا تھا کہ انسانیت اتنی دکھی ہوگئی ہے۔ ایک دم سے کتنی پریشان ہوگئی ہے۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو سوچا پچھلا زمانہ ایک خواب تھا۔ کنول کماری ٹھا کر بھی میرا ایک خواب تھی۔ ہم سب دیوانوں کی طرح ایک خواب کے پیچھے گھومتے رہے تھے۔ کہیں کچھ نہیں ہے۔ کہیں کوئی بھی نہیں مگر بینا نے کہا تھا ''بابا آنکھیں تو کھولیں۔ دیکھیں نیرا آئی ہے۔ بابا اب تو دنیا میں کچھ امن ہوگیا ہے اور نیرا آئی ہے۔'' میں نے بڑے دکھ سے کروٹ بدل کر دیکھا تھا۔ نیرا میرے قریب ہی زمین پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ سسکیاں روکنے کی کوشش میں اتنی بے بس نظر آرہی تھی۔ میرا دماغ ایک زمانے میں نیرا کی طرف گھوم گیا۔ ان دنوں تو نیرا کے چہرے پر سانولی سی بڑی الھڑ سی سندرتا ہوا کرتی تھی۔ پھر ایک زمانے کے بعد میں نے نیرا کو دوبارہ دیکھا۔ جب بینا جوان تھی اور میں اسے کالج میں داخل کروانے گیا تھا۔ اس شام چائے پر میں نے نیرا کو دیکھا تھا اور اس بات کو کتنے زمانے گزر گئے۔ نیرا پھر آئی تھی مگر کنول کے بغیر۔ میں نے کبھی نہیں کہا۔ نیرا کا تصور نہیں اسے دیکھ کر جانے کیوں میں کنول کو ایک خواب نہ سمجھ سکا۔ کنول کماری ٹھا کر میرے لیے پھر سے زندہ ہوگئی۔ مگر پھر میں خون کے سمندر میں ہو؟ کے سمندر میں لہروں کی چیخوں کے سمندر میں ڈوب گیا۔ میرے گرد لوگ بھاگ رہے تھے۔ سفید چہروں' سیاہ آنکھوں والی دہشت زدہ عورتیں' ننگے سر ننگے پیر دوڑ رہی تھیں۔ بچے رو رہے تھے۔ میں انسانی جسموں کے ٹکڑوں پر سے پھلانگ رہا تھا اور پھر ہر طرف خون کی بوباس پھیل جاتی۔ میرا سر بوجھل ہوگیا۔ میں خون کے ایک سمندر میں تیرتا' بہتا' ڈوبتا چلا گیا۔ خون میرے نتھنوں' میری آنکھوں میں مل گیا۔ میرا سانس رک گیا...... صرف کبھی کبھار مجھے اپنے گرد صرف ایک آواز آتی۔ بینا کی

آواز۔ میں ہاتھ بڑھا کر اس کا دامن پکڑنا چاہتا تھا۔ میں ڈوب رہا تھا اور بچنے کی خاطر اس کا سہارا لینا چاہتا تھا۔ پر خون کی لہریں مجھے بہا کر لے جاتی ہیں۔ ایک رو کے ساتھ اور دور چلا جاتا۔ بینا کی آواز ساحل پر دکھائی دینے والی روشنی کی طرح مجھ سے اور بھی دور ہو جاتی۔

ہم کتنے بے بس ہیں۔ جسم جس کے سہارے ہم پردوں کو اٹھاتے ہیں، جس کے سہارے ہم بھگوان کو بھی اس کے تخت سے اتارنے کو تیار ہوتے ہیں۔ وہ جسم کبھی تھک بھی جاتا ہے۔ ذرا سا تھوڑا سا زخمی ہو جاتا ہے تو دل اور دماغ بھی اپنا کام کرنا بند کر دیتے ہیں اور ہم اس لمحے اس بات کو باور کرتے ہیں کہ انسان ایک کیڑے سے بھی کم ہمت اور مجبور ہے۔

یہ خون کا سمندر، آوازیں میرے گرد گھومتے رہتے۔ صرف بینا کی آواز تھی جو کہ زندہ تھی۔ کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا جیسے کسی نے میرا سر اونچا اٹھایا ہے۔ میرے منہ میں کچھ ڈالا ہے۔ اور سر کو پھر نیچے رکھ دیا جاتا۔ میں پھر خون کے سمندر میں ابھرنے ڈوبنے لگتا۔ ایک جہاز کی طرح جو تیزی سے ڈوب رہا ہو۔ مجھے اپنے گرد خون کی سرخ جھاگ میں سے انسانی چہرے نظر آنے لگتے۔ ہر حباب میں سے انسانی آنکھیں جھانکتیں۔ لہروں میں سفید ہاتھوں کے ریشمی جسموں کے ٹکڑے میرے جسم سے ٹکرا ٹکرا کر دور چلے جاتے اور وہ آنکھیں التجا کرتی ہوئی وحشت کے مارے کھلی ہوئی، سوئی ہوئی خوف سے پتھرائی ہوئی آنکھیں میری بینا کی طرح ہی کھلے بالوں والی ننگے جسموں والی لڑکیاں، اس خون کے سمندر میں ڈوبتی ابھرتی چلی جاتیں۔ خون کی اتنی بلند لہریں اٹھتیں اور میرے منہ میں خون کا ذائقہ بہت کڑوا ہو جاتا۔ سرخ جھاگ مجھے اپنے میں چھپا لیتی اور میں ڈوب جاتا۔

میں فسادات کی تاریخ بتانے نہیں جا رہا۔ میں واقعات کو پھر سے بتانا نہیں چاہتا، پر آج کنول کماری ٹھاکر کو ایسے میں یاد کرتے ہوئے مجھے ان دنوں کی طرف جانا پڑے گا۔ نیرا اس خون کے سمندر میں ڈوبنے کے بعد بھی مجھے ملی ہے۔ زخمی اور انسانیت کے درد سے بے تاب اس مرتی ہوئی مجروح دنیا سے دوسرے کنارے کا نقشہ دیکھتی ہوئی کنول کو زخمی اور بے قرار چھوڑ کر نیرا میری طرف آئی تھی۔ ہم آگ کی محرابوں سے پار ملے تھے۔ ہم اپنا سبق سیکھ چکے ہیں۔ کیا انسان دکھ کے بعد اپنا سبق سیکھ لیتا ہے؟ اس آگ میں ہم نے سارا کچھ پھینک دیا۔ ڈون وارٹن نے ٹھیک کہا تھا، ہم نے اس آگ میں جل کر اپنے آپ کو خاکستر بنتے دیکھا ہے اور راجندر نے بھی ٹھیک کہا تھا۔ اس آگ میں حسن، نیکی، انسانیت اور وہ درد بھی جل گیا جو ایک کو دوسرے کے ساتھ تھا۔ وہ

ہمدردی بھی اس آگ میں فنا ہوگئی جس کے سہارے انسان زندہ رہتا ہے اور اس کے باوجود مجھے معلوم ہے کہ ہم زندہ رہیں گے' کیونکہ شوبھا نے کہا تھا' انسان مر مر کر زندہ ہوتا ہے۔ زخموں سے چور ہو کر انسان پھر تندرستی اور صحت مندی کی طرف لوٹتا ہے مگر ابھی ہمارے زخم زمانوں تک نہیں بھریں گے۔ یہ گھاؤ بہت گہرے ہیں۔ یہ گھاؤ بہت مہلک ہیں۔ ہم جانبر ہو سکے تو جی سکیں گے اور ہماری عمر بہت لمبی ہوگی' مگر مصیبت تو یہی ہے کہ یہ دکھ جان لیوا ہے۔ یہ عذاب جس میں ہم سب جھونک دیئے گئے یہ سورگ اور نرک جس کا وعدہ ہم سے پرماتما نے کیا تھا' پر ان دنوں بھگوان کہاں تھا۔ ہم سے وعدہ کرنے والے کہاں تھے۔ ہم کو راہ سجھانے والے کہاں تھے۔ اپنی شکتیوں پر ناز کرنے والے' اپنے آپ کو مضبوط سمجھنے والے کہاں تھے؟ جب ہم آگ کی دیواروں کو پھاندر ہے تھے۔ جب ہم آگ کے سمندروں پر تیر رہے تھے تو کوئی بھی ہمیں بچا نہ سکا۔

لوگ لیڈروں' بڑے لوگوں اور تقریروں پر یقین رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں ریزولیوشن پاس کرنے سے' پریس کانفرنسیں بلانے سے' سب کام آپ سے آپ ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ ٹھیک ہو جایا کرتے ہیں۔ پر مجھے معلوم ہے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ کانگریس کے مہاتما جی نے اور لیگ کے قائد نے عوام کے نام اپیلیں شائع کروائیں تھیں۔ ساری دکھی بستی کو پھر سے شائع کرنے کے لیے کیا کیا نہ کیا گیا ہوگا۔ پر کچھ بھی نہیں بنا۔ کیونکہ ہم اس نقطے سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ ہمارا دکھ بھی ہماری دوا نہیں بن سکا۔ کیونکہ وہ انسانیت جس کا نام لے کر کنول کماری دکھی ہوگئی تھی' وہ انسانیت جس کے نام پر راجندر پرشاد نے کام کرنے کے لیے رضامندی ظاہر کی تھی' وہ انسانیت جس کو بچانے کی صدیوں سے کوشش تھی' وہ انسانیت تباہ ہوگئی۔ وہ انسانیت زخمی ہوگئی اور اب ہمارے لیے کام کرنے کو نہیں رہا۔ ہم محض زندگی گزار رہے ہیں۔ گھٹ رہے ہیں۔ جی نہیں رہے۔ کیا انسانیت کے تباہ ہونے کے بعد کوئی جی سکتا ہے۔ کیا سانس کے چلنے کو جینا کہتے ہیں؟

پر میرے ان بہت سے سوالوں کا جواب بھی کون دے گا' کیونکہ ہم سب ہمہ تن سوال ہیں؟ یہ ساری زندگیاں ایک سوال ہے اور اس طوفان میں تو بہت سے بچھڑ گئے' بہت سے ختم ہوگئے۔ سانس کی ڈوری' جس سے میں نے کنول کماری کی راہ گزاروں کو ناپا تھا' میرے ہاتھوں میں سکڑ کر رہ گئی ہے۔ یہ سانس کی ڈوری جو کسی نہ کسی دن خود بخود ختم ہو جائے گی۔ میرے لیے اب کچھ باقی نہیں ہے۔ بینا کو نروپما نے بیاہ دیا۔ اتنی جلدی یہ سوچ کر کہ پرائی امانت ہے کہاں تک سینے سے لگائے رکھے۔ بیٹی کے ہاتھ پیلے کیے' سہاگ کے گیت گائے اور آنگن سے میری بینا کو

وداع کر دیا گیا۔ اور ایسی سیاہی میں یہاں کھڑا کھڑکیوں پر بنے سفید کنول کے پھولوں کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں جو مجھے نظر نہیں آئیں گے۔ کبھی نہیں۔ اسی طرح جیسے کنول مجھے نظر نہ آئے گی اور پھر بھی نیرا نے کہا تھا۔ کنول مر نہیں سکتی۔ میں کب کہتی ہوں کہ وہ مر سکتی ہے۔ بینا بھی نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ کیا میرے دن بیت گئے۔ کیا میں گزر گیا ہوں؟ پر یہ بھی کون جانے کون بتائے؟

میرے گرد تاج کا شہر ہے۔ تاج محل کا سہاگ آج اجڑا ہوا لگتا ہے۔ تاج کا سہاگ اس دن اجڑا تھا جب اس کی پیشانی پر سیندور لگا کر اس کے ہاتھوں میں سرخ مہندی رچا کر اس کو ہڈیوں کے ہار پہنا کر زخموں کے زیور سے نیم جاں کر کے اس کا سوگ منایا گیا اور اسی لیے آج یہ سب چیزیں نہ ہونے سے تاج کا شہر ایک ودھوا کی طرح لگتا ہے۔ ودھوا جس کے کپڑے بڑھا دیئے گئے ہوں جس کا سیندور دھو ڈالا گیا ہو' جس کی چوڑیاں توڑ دی گئی ہوں جسے رسوا کر کے پریشان کر کے ایک کونے میں چپ بیٹھنے کے لیے کہا جائے۔ شہر چپ چاپ ہے' خاموش اور اداس اور تاج محل جمنا میں اپنا عکس دیکھتا سوچ رہا ہوگا۔ یہ سب کیا ہوا ہے۔ شاہ جہان کی شان و شوکت اس نے دیکھی تھی۔ شاہی جلوسوں کے شور و غلغلے سنے تھے۔ مزدوروں کے گیت ایک ایک پتھر میں رچے تھے اور تمنائیں۔ پر آج سے پہلے وہ شور کیسا تھا۔ کیا قیامت آئی تھی۔ وہ سب چیخیں اور کیا معلوم اب کیا ہونے والا ہے۔ جمنا کی لہروں پر عکس کانپتا اور سوچتا ہے۔ وہ کیا تھا' وہ سارا غلغلہ کیا تھا' مگر اسے جواب کون دے کوئی بھی تو نہیں جانتا کہ وہ سب قیامت کیوں اٹھی تھی اور پھر ہم بھی زندہ کیوں ہیں۔ نہ جانے کیوں؟

کہیں کوئل دور درختوں کے جھنڈ میں بے وقت کی بولی بول رہی ہے۔ کیسے پکارتی ہے پگلی۔ کون اس کی پکار سنے گا اور پھر بھی وہ پکارتی جاتی ہے۔ اس اجڑے دیار میں اس کی صداؤں پر دھیان کون کرے گا۔ خون کے دریاؤں' لہروں کے بہاؤ شور اور پریشانی کے بعد کوئل کو کون کہتا ہے کہ وہ درد بھری آواز میں پکارے۔ کوئل تم دنیا ہو کیا۔ ڈال ڈال پات پات کیسے پکارتی ہو۔ دنیا میں یہاں ہوں۔ پر اب مجھے تمہاری آواز میں اتنا دکھ نہیں لگتا۔ میں کہتا ہوں۔ اچھا ہوا تم بہت پہلے اس دکھ سے چھوٹ گئیں جو دکھ تمہاری جیسی اور بہت سی ستونتیوں کے نصیب ہوا۔ میرے کانوں کے پردے شور سے پھٹ رہے ہیں۔ کھڑکی بند کرو۔ ستاروں کی شمعیں بجھا دو۔ نور کے سارے سوتے مل کر اگر دنیا کی طرف بہنا شروع کر دیں تو بھی وہ میرے دل کے اندھیرے میں میرے گرد پھیلے

اندھیرے کو اجالا نہیں کر سکتے۔ اب کوئی اپائے نہیں۔ اب کوئی بھی علاج نہیں۔ ہم سب دکھی ہیں۔ کیا ہم آزادی کی تلوار کو استعمال کرنے' اسے آزمانے کے لیے اپنے بھائی بندوں کے گلے پر ہی ہاتھ ڈال سکے۔ ننگی انسانیت کے چیختے چلاتے اندھیرے' بہرے گونگے جلوس گروہ' مجھے کیا صرف اسی راہ پر دوڑا سکتے تھے؟

بینا میں پوچھتا ہوں تم کہاں ہو؟ بینا میں چیختا ہوں اور پھر بھی میرے سینے میں کوئی پکار پکار کر کہتا ہے کہ بینا مر چکی ہے۔ میری بیٹی جس کو میں نے اپنے خونِ جگر سے پالا تھا۔ میری بینا جو میرا سب سے عظیم اور بڑا خواب تھی' وہ کیا ہوئی؟ میں نے جوان خوبصورت اور معصوم لڑکیوں کو تاج کے شہر میں پتھرائی آنکھوں سے عریاں جلوسوں کے سامنے چلتے گرتے قہقہوں کے طوفانوں میں ڈوبتے اور برباد ہوتے دیکھا ہے۔ میں پوچھتا ہوں' پر میں کس سے پوچھوں کہ پوچھنے کو کیا رہا ہے۔ کیا کوئی سوال باقی ہے اور لیڈروں نے کہا تھا۔ بڑے بڑے جلسوں میں تقریر کرنے والوں نے کہا تھا' ہم جینا سیکھ رہے ہیں۔ ہم قربانیاں دے کر اپنے آپ کو آزادی کی دیوی کے سامنے بھینٹ چڑھا کر جینا سیکھیں گے۔ انہوں نے کہا تھا جب تک کوئی قوم مرنا نہیں سیکھتی وہ جینا نہیں سیکھ سکتی۔ مر کیا ہم گئے ہیں؟ اور پھر بھی سانس چلتا ہے۔ میں یہاں ستاروں بھرے آسمان کے سامنے زمین کے اندھیرے میں کھڑا اکیلا انسان اپنے آپ سے' اس ہوا سے اس بھگوان سے جو خالی آکاش کے پرے کہیں رہتا ہے پوچھتا ہوں؟ پھر کیا پوچھوں گا مجھے کچھ نہیں کہنا۔ شوبھا نے کہا تھا' وہ بھگوان کے سامنے کبھی نہیں جھکی۔ اس نے بھگوان سے کچھ نہیں پوچھا۔ میں بھی بھگوان سے کیوں کچھ پوچھوں گا۔ اے ستارو! مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے۔ تم اتنے بے بس کیوں ہو۔ آکاش۔ بھگوان سب ایک دھوکا ہے۔ ایک فریب۔

اور نیرا نے تو مجھ سے کہا تھا کہ کنول کماری ابھی تک بھگوان کو پکارتی ہے۔ کیا اسے بھگوان پر اندھیروں کی اس شکتی پر ابھی تک وشواس ہے۔ وہ اندھا بھروسا۔ محبت کی راہوں سے ہم کہاں پہنچے۔ نفرت کی راہوں سے ہم کہاں گئے۔ اندھیروں میں بھٹکے ہوئے ہم کہاں ہیں۔ آج میرا دل اتنا کچھ کہنے کو چاہتا ہے کہ سارے ستارے یہ ساری ہوا میرے سوالوں سے بھر جائے۔ میں چیخنا چاہتا ہوں اور چیخ نہیں سکتا۔

کنول کماری ٹھاکر میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں تم نے ایک اندھیرے سے اپنا سفر شروع کیا تھا اور جب دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی ہو' وہ تب بھی اتنی ہی اندھیری ہے' پہلے امیروں کا اجالا

تھا۔ اب تو وہ بھی نہیں رہا۔ اب حدِ نظر تک کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کنول کماری میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا اندھیرے سے ڈر گئیں۔ ابھی تو زندہ رہنے کا جینے کا دکھ سہنے کا وقت آیا تھا اور ایسے میں تم چل دیں۔ بس تھوڑے سے زخموں اور انسانیت کے تھوڑے دکھ کے لیے موت کے اندھیروں میں فانی انسانوں سے ناتا توڑ کر برفانی سمندروں پر اکیلی ہی سفر کرنے چل نکلی ہو۔ میں نے ہمیشہ یہی سوچا تھا تم خوابوں کے پیچھے دیوانوں کی طرح پڑی ہو۔ اور جب تمہارے خواب ٹوٹ گئے تو تم بھی مٹی کے کھلونوں کی طرح ٹوٹ گئیں۔ تم جو اتنی عظیم تھیں۔ تم جو انسانیت کے مرنے کے بعد بھی اس میں وشواس رکھتی تھیں۔ نیرا نے مجھے بتایا تھا کہ تم زخموں سے چور اپنا ایک ہاتھ موت کے ہاتھ میں دیئے دوسرے ہاتھ سے انسانیت کے زخمی چہرے کو چھونا چاہتی تھیں۔ تم آہستہ سے یوں چلی گئیں۔ جیسے اس دنیا میں صرف سیر کرنے کے لیے چند دنوں کے لیے آئی تھیں۔

تمہارا کالج بھی جس کو تم نے اتنے پیار سے پروان چڑھایا تھا' تمہارے خوابوں کا ایوان۔ وہ بھی آدھا جل گیا اور اسی گھڑی سے زخموں سے بے بس تم نے اپنے خوابوں سے اور ایوان تعمیر کرنے شروع کر دیئے۔ پر کنول ٹھاکر میں تمہیں بتاؤں' یہ خواب بھی ذہن کی تندرستی کے خواب نہیں ہو سکتے۔ نیرا نے مجھے یہی بتایا ہے کہ تم جب بھی آنکھیں کھولتی ہو' اپنے گرد کسی شے کے وجود کا احساس تمہیں ہوتا ہے۔ تم ان سب عورتوں کے نام لے کر پکارتی ہو جنہیں تم نے پناہ دی اور پھر بھی تم اتنی کمزور تھیں کہ ان کی پناہ نہ بن سکیں۔ میں نے ہمیشہ یہی سوچا تھا تم بہت جذباتی ہو' تاج کے شہر میں میرا جی چاہتا ہے' تم پر ایک نیا تاج بناؤں۔ اس سے بھی بڑا' عظیم' خوبصورت اور خوابوں کا سا ایوان' اس تاج میں وہ سوتی ہے جو شاہ جہاں کے دل کی آبادی تھی۔ محبت تاج تعمیر کراتی ہے اور تم نے تو محبت کی خاطر جان دی ہے۔ تم نے تو محبت کے زخموں سے چور ہو کر اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے خون کو بھی پرے دھکیل کر یہی کہا ہے۔ انسانیت کو بچاؤ' کم از کم نیرا نے مجھے یہی بتایا کہ تم یہی کہتی رہی ہو۔

اتنی جذباتی اور پگلی تھیں تم' اتنا بھی نہ سمجھ سکیں کہ دنیا کو سبق کوئی نہیں سکھا سکتا۔ انسان مر گیا ہے۔ اسے زندہ کوئی نہیں کر سکتا۔ مجھے نیرا نے بتایا ہے کہ نعروں کا شور اور ہاہا کار کو سن کر تم یوں چپ ہو گئی تھیں۔ جیسے خواب سے ڈر کر کوئی اٹھے اور پھر بھی اسے معلوم نہ ہو کہ وہ خواب دیکھ رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔ نیرا نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ تم زخموں سے چور پریشان حال کمزور اٹھ کر پھرتیں اور کہتی تھیں' میں کیا کروں' کوئی انسانیت کو بچائے' میں ایک کمزور اور بے بس عورت ہوں۔ کوئی مرد

میری مدد کرے۔ کوئی انسان کو جینا سکھا دے اور میں تمہیں بتاؤں کنول ٹھاکر تم بہت بعد میں آئی ہو ایک صدی بعد۔ اس نفرت کا اس آنے والے انقلاب کا گزر جانے والی قیامت کے بیج تو پہلے بوئے جا چکے تھے اور تم اور میں صرف مزدوروں کی طرح اس کھیتی کو کاٹ رہے ہیں۔ اس سرزمین کو لالہ زار بنانے والے کوئی اور تھے۔ تم سے پہلے گزرے ہوئے اور خوابوں میں ڈوبی پھر بھی تم یہ سوچتی رہیں۔ تم بچا سکتی ہو تم کچھ کر سکتی ہو۔ کنول ٹھاکر جب تم نے سفر شروع کیا ہے تو وقت بیت چکا تھا۔

نیرا نے مجھے بتایا کہ کنول ٹھاکر اتنی تنہا نہ تھی جتنی ہم اسے ملنے والے اس کے اشاروں پر گھومنے اور اسے چاہنے والے سمجھتے رہے ہیں۔ شوبھا نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کو کنول ٹھاکر کے بھیا ملے تھے۔ ہم اسے ایک ایسی ہستی سمجھے جس کا رشتہ دنیا کی محبت اور انسانیت کے درد کے علاوہ اور کسی سے نہیں ہو سکتا پر کنول ٹھاکر بھی ہماری طرح کی ایک انسان تھی بالکل فانی۔

ششما بھابی کی یہ دشا دیکھ کر۔ بھیا کے مرنے کے بعد اس نے ماں کے کہنے کے باوجود بیاہ سے انکار کر دیا۔ اس نے یہی سوچا ہوگا کہ ہٹاؤ اس شیشے کو کل کا کسے پتہ ہے۔ ہاتھ پاؤں، عقل بصیرت سبھی کچھ تو ہے۔ مرد کون سی عورت کو فضیلت بخشتے ہیں۔ عورت ماں ہے تو خدمت گزار، بہن ہے تو خدمت گزار، بیوی ہے تو خدمت گزار، اولاد پیدا کرنا پالنا، یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ بھلا یہ تھوڑے پھرتے ہیں۔ بھوکے، ننگے، ٹھنکتے گلیوں میں، مرد کے بھولے ہوئے فرائض اس کو یاد کروانے چاہئیں۔ عورت کو بیدار کرنا چاہیے۔ ماں نے اس سے کہا تھا ''کنول تم بھولتی ہو، زندگی میں انسان کا اپنا بھی تو کوئی حق ہوتا ہے۔ یونہی بیکار کی الجھنیں کیوں پیدا کرتی ہو۔''

اور کنول نے بہت ادب سے مگر بڑے وشواس سے کہا تھا ''ماں بیکار کی الجھنوں میں تو ششما بھابی تھیں۔ میں اپنا وہ حال نہیں کروانا چاہتی۔''

اور ماں نے چیخ کر کہا تھا ''معلوم ہے تیرے سر پر ششما کا بھوت ہے ورنہ ایسی باتیں کیوں کرتی۔'' ارے وہ بھی کوئی عورت تھی۔ وہ تو ڈائن تھی ڈائن۔ میرے اتنے جوان بیٹے کو نگل گئی۔ بچے کو ہڑپ کر گئی۔ وہ تو کالی دیوی تھی اور پھر مر کر بھی چین نہیں لینے دیتی۔ اب میری اچھی بھلی بچی کے سر پر سوار ہے۔ ماں ہر دفعہ اس ذکر پر نئے سرے سے رونا شروع کر دیتی اور بھابی کو کوستی، پھر برادری کی عورتوں نے محلے کی بڑی بوڑھیوں نے اسے سمجھایا کہ یہ کیا کرتی ہو۔

بیٹی جب کوئی نہیں رہتا۔ جب آسرا سر سے اٹھ جاتا ہے۔ جب تمہارے بابا بھی نہ رہے تو کون ہوگا جس کو تمہاری سدھ ہوگی۔ کوئی آ کر کہتی رام رام کیا زمانہ آ گیا ہے۔ گھور کلجگ ہے۔ ہم نے کبھی کسی لڑکی کو ایسی تیز تیز زبان چلاتے اور باتیں کرتے اپنے معاملے میں بولتے نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے بھی کیا زمانے تھے۔ ہم کو کسی نے پوچھا تک نہیں تھا۔ یہ سارا قصور اس کی ماں کا ہے۔ کیوں پوچھتی ہے پکڑ کر بیاہ کیوں نہیں کر دیتی۔ اور پھر سب اپنے اپنے آنگن میں نیم کے نیچے بیٹھ کر چرخے چلاتیں اور کنول کی زبان درازی کی باتیں کرتیں۔ تعلیم کو کوستیں اور جانے بھگوان کو دوش دینے لگتیں۔ کنول چپ چاپ سب کی باتیں سنتی اور اپنے پڑھنے پڑھانے میں مگن رہتی۔ اس کے بابا نے بہت کچھ سمجھنے اور اپنے کو بیٹی کے معاملے میں مجبور دیکھنے کے بعد اسے ہائی اسکول پاس کروا دیا۔ آگے بڑھنے کی کسی کی ہمت نہ تھی۔ سر پر اور کون تھا۔ بابا زمانے سے ڈرتے تھے۔ ماں بھی دبی زبان سے ہر وقت ششما بھابی کو کوسنے کی بجائے کنول سے پوچھتیں جیسے انہیں یقین نہ ہو۔ اپنی طاقتوں پر (ششما بھابی کے بعد سے انہیں یہ وشواس بہت ہو گیا تھا اور یکایک کنول نے اس بھروسے کی دیواریں گرا دی تھیں) کیوں کنولا اب ہائی اسکول کے بعد تو تم کو نہیں پڑھنا ہے۔ اب تو تم گھر بیٹھو گی ناجوان بچیوں کا باہر پھرنا بھلا نہیں لگتا اور وہ اپنی اکلوتی لڑکی کی بلائیں لینا شروع کر دیتیں۔

پھر ایک دن من موہن کی ماں اسے دیکھنے آئیں۔ ماں نے اس دن کہا تھا۔ کنولا بیٹی جگ کی یہی ریت ہے بیٹیاں گھر سے وداع ہوتی آئی ہیں۔ لڑکی کا اصل گھر اس کے پتی کا گھر ہوتا ہے اور اس نے سوچ لیا تھا۔ چاہے ساری دنیا اس کو کوستی اور گالیاں دیتی رہے۔ وہ کبھی بھی نہیں جھکے گی اور ماں کے رونے دھونے کے باوجود اپنی بات پر اڑی رہی۔ بابا کئی دنوں اندر نہ آئے۔ کتنے اداس اداس رہے۔ آنگن اتنا سُونا ہو گیا اور من موہن کی ماں اپنی بے عزتی پر برادری بھر میں کنول کے خلاف باتیں کرتی رہی پر ایسے میں دوسرے بھیا آڑے آئے۔

انہوں نے کہا ”کوئی بات نہیں لڑکی پڑھنا چاہتی ہے تو اسے کیوں نہ پڑھنے دیا جائے۔ دوسرے ملکوں میں عورت کتنی آزاد ہے۔ خود کماتی ہے، مرد پر بوجھ نہیں۔ ہمارے گھر میں اسے غلام بنا بنا کر رکھا جاتا ہے۔ ضرور کسی مرد کے دامن سے بندھ کر رہے گی“ اور انہوں نے کہہ سن کر کنولا کو کالج میں داخل کروا دیا۔

ان دنوں کنول کو یوں لگا تھا جیسے بھیا سے اچھے تو کرشن بھگوان بھی نہ ہوں گے۔ بھیا

سے مہاپرش تو کبھی اس دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔

پھر واقعات کی ایک آندھی سی اٹھی۔ ماں بابا سے کسی بات پر خفا ہو کر میکے چلی گئی۔ بھیا ایک بدیسی عورت کو بیاہ لائے اور بڑے ماما جانے انہیں کیا ہو گیا تھا۔ ان دنوں تو اس کے گرد ایک طوفان سا آ گیا تھا۔ برادری کی ساری عورتیں کانوں پر ہاتھ دھرنے لگیں۔ بڑے ماما کو کیا کوئی ڈھنگ کا کام نہ سوجھا تھا۔ ان دنوں تو اسے یوں لگا کرتا تھا جیسے ایک دم اندھیکار ہے۔ بالکل گھٹا ٹوپ اندھیرا جس میں روشنی کی ایک کرن بھی نہیں ہے۔ سمندر کی سی لہروں سے گھر کا سکون بہا چلا گیا۔ ہر طرف سونا پن، بیگانگی اور اداسی سی ہو گئی تھی۔ ماں میکے گھر سے واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ کبھی کبھار ان کے پیغام آتے کہ ''پر تما ما کے لیے تم کو اپنی زندگی برباد نہ کرنی چاہیے۔ اس سونے پن اور اکیلے گھر میں جہاں ایک بدیسی عورت ہے۔ تمہارا رہنا کس طرح ہو سکتا ہے۔ تم مان جاؤ تو میں تمہارا بیاہ کر دوں۔ تمہاری ضد بالکل بے بنیاد ہے۔ مان جاؤ تو میں اپنی پرانی اور سب سے اتم آرزو کو پورا کر لوں۔ میری بیٹی کے ہاتھوں میں مہندی لگ جائے تو جس تمنا کے لیے میں جی رہی ہوں۔ وہ بھگوان کے نام سے کسی کنارے لگے۔''

اور کنول سوچتی، ماں کے ہاتھ پیلے ہوئے تھے۔ ان ہاتھوں میں مہندی رچائی گئی تھی۔ ماں بھی جوان تھی اور ایک عمر کے بعد بابا نے کیا کیا۔ نفرت سے اس کا رواں رواں رو اٹھا۔ اس نے بھیا کو دیکھا تھا، پڑھے لکھے عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے حامی۔ اپنی عورتوں سے اتنی حقارت کا سلوک انہوں نے اس لیے کیا کہ وہ آزاد نہ تھیں۔ پڑھی لکھی نہ تھیں۔ مکتی ان کے بچپن کی منگیتر کیسی سندر تھی۔ اس نے ایک عمر تک بھیا کے نام پر ماں باپ کے گھروں بسر کیے اور جب بھیا ایک بدیسی عورت کو بیاہ لائے تو اسے کتنی ٹھیس لگی تھی۔ کنواری لڑکی اونچی آواز میں رو بھی نہ سکتی تھی۔ دکھ اور جلن سے اندر ہی اندر کڑھ کر دو مہینوں میں مر گئی۔ یہ پڑھنے لکھے بھیا ہتیکاری تھے اور پھر بھی کوئی ان سے پوچھنے والا نہ تھا۔ وہ اپنی بدیسی بیوی کو اسی طرح کہانی سنا سنا کر ہنستے رہے اور کنول وہاں سے اٹھ آئی تھی۔ کنول کو عورت کے وجود سے اس بے بسی سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ جینا نہیں چاہتی تھی مگر سانس چلتا تھا۔ وہ اندھیروں میں ٹٹولتی رہی۔ پھر ایک دن بے حد مایوسی میں جب اس کا جی سچ مچ مر جانے کو چاہتا تھا، اتنی بدلی ہوئی بیگانی دنیا میں مفلوج دل اور دماغ بے حس تھے۔ اس نے ایک کتاب اٹھا کر اس کے صفحے کھولے تو لکھا تھا: ''اندھیروں میں اجالا کرنے کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہارے اندر ہی کہیں ہے۔ مگر تمہاری ہمت کا محتاج ہے۔ تم سب سے اتم اور

سب سے بلند ہو کیونکہ اجالا تمہارا مرہونِ منت ہے۔ انسانیت کے ان ذروں کو جو کہیں دور تمہارے اور باقی دنیا کے وجود کے اندر پوشیدہ ہیں' ڈھونڈنے سے تمہیں سب کچھ مل جائے گا۔ اپنے وجود سے اپنی آرزوؤں سے آزادی حاصل کرو۔ کام کرو اور پھر ٹھہر کر نتائج کا انتظار۔ وہ بھگوان کے ہاتھ میں ہے اور بھگوان اپنے کام میں دھیرج پسند کرتا ہے۔ وہ تیزی سے کسی کام کو بھی ختم نہیں کرتا اور پھر بھی اس کو ہی سب طاقتیں ہیں۔ اس کی آنکھ کا اشارہ سارے جنوں کو سارے جگ کو بدلنے کے لیے کافی ہے۔''

یہ اندھیرے میں ایک گیان تھا جیسا مہاتما بدھ کو گیا میں پیڑ کے نیچے ہوا تھا اور کنول نے اپنے اندر کی بلندی کو ڈھونڈنے کے لیے کتابوں کا سہارا لیا مگر کتابیں بھی سہارا نہیں بن سکیں۔ جب انسان اٹھتا ہے تو اس کے اندر کا ایک اندھیرا باہر کے اجالے سے ٹکراتا ہے اور دھندسی چاروں طرف بکھر جاتی ہے جس میں ہر شے دور یا قریب ہونے پر بھی اپنی اصلی شکل میں دکھائی نہیں دیتی۔

کالج میں گزرے ہوئے سال ایک کشمش کے سال تھے۔ اپنے گرد جن لوگوں کو وہ مکمل سمجھتی تھی' ان کی خامیاں جن کو سچا سمجھتی تھی' ان کے جھوٹ جن پر وہ بھروسہ کرتی تھی' ان کی بے یقینیاں جن کے نقشِ قدم پر وہ چلنا چاہتی تھی' ان کی لغزشیں جن کا وہ سہارا لینا چاہتی تھی' ان کا بھٹکنا۔ وہ پھر پریشان ہوگئی۔ استادوں نے اسے سرپھری لڑکی سمجھا۔ ساتھ والوں نے اسے فلسفی جانا۔ ملنے والوں نے اسے عجیب اور سلجھی ہوئی شخصیت پایا۔ جس کی باتیں ان کی سمجھ سے باہر تھیں۔ کنول نے پھر چپ سادھ لی۔ وہ اپنے بھگوان کی مورتی کے سامنے پرارتھنا کرتی۔ ''بھگوان تم جو کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتے اور سنتے ہو۔ زندگی کی سرد مہری اور روشنی میں' میں تمہارے چرنوں میں بیٹھی ہوں۔ کیا تم اس بے یقینی کو میرے گرد سے دور نہ کردو گے؟ بھگوان تم ہی میرا سہارا تھے۔ اندھیرے میں بھٹکے میں تمہارے چرنوں کی روشنی لینے بیٹھی ہوں۔ مجھے راہ دکھاؤ۔ تمہارے بنائے ہوئے یہ مرد جن کو تم نے عورت کی دنیا کا بھگوان بنا دیا ہے' جس نے تم کو دیوتا کی پدوی دے دی ہے' تم جانتے ہو وہ اس قابل نہیں ہیں کہ میں ان کے سامنے سر جھکاؤں۔ دھرم کے ساتھ ساتھ میں نے دنیا کا بھی پالن کیا ہے۔ پر ہر جگہ خالی دل میں خالی نگاہیں ہیں۔ پجاری بھی اندھا ہے۔ جتنا کتابیں پڑھانے والے۔ اے بھگوان روشنی کہیں نہیں ہے۔ کہاں جاؤں؟''

اور ایک دفعہ پھر اسے اپنے اندھیرے دنوں کی روشنی یاد آئی۔ ''روشنی تمہارے اندر ہے۔'' اس نے سوچا وہ ان سب سے بلند ہو جائے گی اور بلندی کے بنا' الگ ہوئے بنا چارہ ہی کون تھا۔ جن لوگوں کے سامنے وہ جھکتی اور جن کو اپنے سے اعلیٰ سمجھتی تھی وہ لوگ اس قابل کہاں تھے؟ صرف اس کے پاس بھگوان کی چوکھٹ رہ گئی تھی اور پھر بھگوان نے اسے ہمت دی تھی۔ اس نے اپنے اندر سے ان روشنیوں کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ کنول کی جگہ کوئی اور ہوتا تو دنیا کو تیاگ کر کھڑا ہو جاتا۔ جنگلوں میں نکل جاتا۔ ایک عورت ایک لڑکی کے لیے تو دنیا کا مقابلہ کرنا بہت مشکل تھا مگر اس نے ہر رات بھگوان کی مورتی کے چرن دھوئے ہیں اور سویرے بے خوف و خطر بنا کسی ڈر اور ہراس کے اپنی راہوں پر چلی ہے۔

جن چوٹیوں تک وہ چڑھتی چلی گئی ہے اور جس بلندی پر میں نے اسے ان دنوں دیکھا تھا جب میں پہلی بار اس سے ملا تھا' وہ بلندی ایک دن میں حاصل نہ کی گئی۔ وہ بلندی بڑی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ اس کو دیکھ کر سوچنے والے یہ بھی سوچتے ہوں گے کہ کئی حاسد عورتوں کی طرح وہ اپنی بلندی میں کسی دوسرے کو شامل کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کسی میں اپنے کو مدغم کرنا نہیں چاہتی تھی اور اس کے باوجود اس غرور سے مبرا تھی۔ اس پستی سے بہت بلند تھی جس کو حسد جلن اور انفرادیت کو قائم رکھنے کی ناکام کوشش کہا جاتا ہے۔

غیر ملکی وفد کے ساتھ کنول بھی اپنے ملکی نمائندے کی حیثیت سے ملاقات کرنے گئی تھی مگر اس کا مطمحِ نظر یہ نہیں تھا اور یہ بھی نہیں کہ بڑائی اس پر ٹھونسی گئی تھی۔ وہ بڑائی اس کے قابل نہ تھی بلندیاں تو اس کے سامنے سرنگوں ہو جایا کرتی تھیں۔ اور پھر بھی دیکھنے والوں نے یہی کہا کہ یہ عورت۔ یہ سانولی سلونی خوبصورت عورت' جس کی آنکھوں کے سامنے تاروں کی تابانی ہیچ اور جس کی روشنی کے سامنے نور بھی مدھم پڑ جاتا ہے۔ یہ عورت جو تعلیم کے محکمے میں ایک معمولی عہدے پر فائز تھی' یہ بھی کسی ایسی راہ سے آئی ہے جس راہ سے خوبصورت عورتیں بامِ عروج تک پہنچتی ہیں۔ بے بیاہی اندھیروں سے اجالوں کی طرف بڑھنے والی عورت نام نمود اور شہرت کی بھوکی ہے۔ میں نے ان دنوں ہی اس کے خلاف یہی باتیں سنی تھیں۔ پر ان دنوں تو باوجود اس کے باتوں کی پختگی اور کم عمری کے اس میں کوئی اور جاذبیت دکھائی نہ دیتی تھی۔ شاید میں کسی جاذبیت کو دیکھنے کے لیے آنکھیں نہیں رکھتا تھا۔

اور یوں بھی ان دنوں عورتوں کی آزادی کا شور تھا۔ عورتیں بڑھ رہی تھیں' ترقی کر رہی

تھیں، نیچے مدارج سے اٹھ کر ترقی کر رہی تھیں۔ معمولی خاندانوں کی عورتیں مانگے کے پر لگا کر شہرت کے بازوؤں پر سوار ہو کر آزادی کے گیت گانے میں حق بجانب تھیں۔ بڑے شریف اور پرانے روایتی گھرانوں میں ابھی تک تعلیم کا رواج کم تھا۔ میں نے سوچا تھا کنول کماری بھی ایملی زولا کی نینا ہے جو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر ایک خوبصورت پھول کی طرح اگ آتا ہے چند دنوں میں باقی عورتوں کی طرح اس ڈھیر میں اس کی پتیاں بھر مل جائیں گی۔ میں چند سالوں کے بعد اس کا نام بھی نہیں سن سکوں گا۔ کنول کماری ٹھاکر! پھر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ٹھاکر داروں کی حفاظت کرنے والوں نے کیا زندگی کی حفاظت کرنے کے لیے مورتی میں جان ڈال کر اسے باہر دھکیل دیا ہے...... پر ان دنوں نئے واقعات کا نئی عورتوں کا سحر مردوں کو معمور کر رہا تھا۔ عورتیں آسمان میں اڑنے والے پتنگوں کی طرح رنگ برنگ سے مزین ہو کر نکلتیں اور چند دنوں میں ان کی ڈور کٹ جاتی۔ ترقی کے میدان میں آزادی کے نعرے لگانے اور کھلم کھلا مرد سے نفرت کرنے والی یہ تتلیاں کسی مرد کی نگاہوں کا شکار اور ان کی ہوسنا کیوں کا نشانہ بن کر گر جاتیں۔ دولت کے ڈھیر پر، جھوٹی محبت کے ڈھیر پر، اونچے نام کے ڈھیر پر اور مرد جب اکٹھے ہوتے خوب ہنستے قہقہے لگاتے۔ عورت یہی ہے کہ بہار میں پھولوں پر منڈلاتے بھنوروں کی طرح یہ بھی چند لمحوں میں آزاد ہو کر پھر گرفتار ہو جاتی ہے۔ مرد تو کہنہ مشق شکاری ہیں۔ ان دنوں تو بامِ عروج تک چڑھنے، مردوں سے مقابلہ کرنے کا جنون لے کر کئی عورتیں آئی ہیں اور پھر ہتھیار ڈال کر پسپا ہو کر مرد کی جے جے کار کے نعرے بلند کرتی واپس کوئے کی طرح ریشمی خوابوں، ریشمی کپڑوں، ریشمی زندگی کے درمیان لوٹ لوٹ گئی ہیں۔

مردوں نے اس تحریک سے فائدہ اٹھایا۔ مرد چال باز ہے۔ عورت کو بڑھتے دیکھ کر اس نے بھی خیالات کا رخ بدل ڈالا۔ پہلے مرد عورتوں کے مقابلے میں سینہ سپر ہو جایا کرتے تھے۔ اب راہوں میں لیٹ گئے۔ انہوں نے دوسری چال چلی۔ انہوں نے عورتوں کی ہاں میں ہلاں ملانا شروع کیا۔ آزادی کے اس شور غوغے میں وہ بھی عورتوں کے ہمنوا ہو گئے۔ بھولی بھالی اور مندروں سے ناآشنا عورتوں کے لیے یہ اپنی فتح تھی اور اس فتح مندی کے نشے میں ان کے سب مہرے پھر مات ہو گئے۔ بازی پھر مردوں کے ہاتھ میں رہی۔

میں ان دنوں نیا نیا زندگی شروع کر رہا تھا۔ اس سارے تماشے کو میں بھی بڑے غور سے اور بہت ذوق وشوق سے دیکھ رہا تھا۔ پھر عورتوں نے چونکنا اور چوکنا ہونا شروع کر دیا۔ اور مردوں نے اپنی ازلی جعل سازی کے سہارے انہیں یقین دلایا کہ نہیں یہ انفرادی شکستیں اور کمزوریاں

ہیں۔ مرد فریبی نہیں ہیں مرد تو سیدھے سادھے بھولے بھالے حوا کے ہاتھوں جنت سے نکالے گئے ہیں۔ آزادی کے شور اور نعروں میں ان دنوں کرشنا بوس اور رویندر کا عشق زوروں سے چلا۔ شادی ہوئی اور پھر مقدمہ۔

اس مقدمے میں، میں نے دوسری بار پھر کنول کو دیکھا تھا۔ میں نے کہا تھا یہ بھی مردوں کی بساط کا ایک مہرہ ہے۔ پٹ جائے گی جس عورت کی وکالت کرنے یہ عدالت میں آئی ہے اس کی طرح یہ بھی تو ایک نازک مزاج اور جذباتی لڑکی ہے اور میں بڑے شوق سے اس کے پٹ جانے کا منتظر رہتا۔ اگر میں نے اسے برستی بارش اور اندھیکار میں اکیلے پن سے گھبرانے کے بجائے ہمت سے کام لیتے نہ دیکھ لیا ہوتا۔ اس رات میں نے پہلی بار حیرت انگیز طور پر انکشاف کیا تھا کہ جس مٹی سے باقی عورتیں بنائی گئی ہیں وہ اس مٹی سے نہیں بنائی گئی۔ جس مرکب سے باقی عورتوں کا خمیر اٹھایا گیا ہے، وہ کنول کو چھو بھی نہیں گیا۔ بیک وقت وہ مرد سے اور اس کی چالوں سے واقف تھی مگر اس سے متنفر نہ تھی اور اس لیے مجھے یقین تھا وہ زندگی میں کسی مرد سے کبھی محبت نہ کر سکے گی۔ اسے مرد کی طاقت پر اعتبار تھا اور اپنی کمزوری پر بھی بھروسہ تھا، اس لیے مجھے معلوم تھا وہ مرد سے کبھی بھی شکست نہ کھا سکے گی۔ ہم شکست تب ہی کھاتے ہیں، جب ہم کو اپنے دشمن کی طاقتوں کے متعلق غلط اندازہ ہو اور کنول تو اس لیے مطمئن تھی کہ اسے مرد کی طاقت پر وشواس تھا۔ وہ مرد سے ڈرتی نہ تھی اور اس کے باوجود وہ باقی نعرے لگانے والی عورتوں کی طرح اس کے خلاف اپنی آواز اٹھانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ زندگی میں مرد کی اہمیت سے واقف تھی اور اس لیے اس نے کبھی اپنے کو دنیا سے الگ کرنے، اپنے کو آزاد کرنے اور فضائے بیکراں میں کمزور پروں کے سہارے اڑنے کا نہیں سوچا۔ جب باقی عورتیں شادی کے خلاف لمبے لمبے مضامین لکھتیں تو وہ ضرور ہنستی ہو گی کیونکہ اسے دھرم کی سچائی پر بھی بھروسہ تھا۔ پرماتما نے عورت اور مرد کا جوڑ بنایا ہے۔ کچھ سوچ کر ہی کیا ہو گا۔ اگر عورت آزاد رہ کر مرد کے بنا کام کر سکتی، دنیا کی گاڑی چل سکتی تو پرماتما کوئی اور راہ نہ سوچتا۔ اس میں وہ نرمی تھی جو ہتھیار اٹھانے والوں کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ ہتھیار رکھ دیں۔ میں نے بتایا تا کہ اس کو دیکھ کر کبھی کسی کو یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت اور سب سے بڑی شکتی، سب سے بڑے جذبے کے خلاف لڑ رہی ہے۔ عورت اور مرد کی جذباتی محبت کے خلاف مگر وہ جذبات سے عاری نہ تھی۔ اسے سب ملنے والے یاد تھے۔ اس نے کبھی کسی سے ایسا سلوک نہیں کیا جس سے خیال کیا جا سکے کہ اسے کسی سے نفرت تھی۔ وہ تو مجسم محبت تھی۔

ہم سب تو اس کی محبت کے سہارے زندہ رہے اور اس کی عطا کردہ طاقتوں کی وجہ سے دنیا کے خلاف اپنے خلاف نبرد آزما رہے ہیں۔ مرد کو سب سے زیادہ مقابلہ اپنے آپ سے کرنا پڑتا ہے کیونکہ مرد بڑا جذباتی اور جلد ہی پریشان ہو جانے والا ہے۔

کنول کماری ٹھاکر یوں اس بڑی زندگی کے سمندر پر اپنی ننھی سی کشتی میں بیٹھ کر اپنے بادبانوں کو مخالف ہوا کے باوجود کھول کر بڑے اطمینان سے چلتی رہی۔ اس بڑے سمندر پر راہیں ناپید تھیں۔ اس نے اپنے لیے شاہراہیں خود بنا ڈالیں۔

نیرا نے مجھے بتایا کہ مرد کے قریب سے گھبرائی ہوئی پریشان عورتوں راہ گم کردہ اور مجبور عورتوں کے لیے کنول نے ایک نادار گھر بنا ڈالا۔ ان دنوں وہ بھی سوچتی تھی کہ یہ طریقہ صحیح ہے۔ اس سے عورتوں کو سنبھال کر ان برائیوں کے خلاف ایک محاذ قائم کیا جا سکتا ہے۔ بڑھتی ہوئی برائی کو روکا جا سکتا ہے۔ کنکروں کو ستاروں کی ضیا بخشی جا سکتی ہے۔ کوئی کام بھی مشکل نہیں اور پرماتما کھیون ہار ہے۔ پار لگا ہی دے گا مگر پرماتما کی شکتی بھی دھیرج چاہتی ہے۔ کام کرنے کے بعد بڑی بڑی دیر انتظار کرنا پڑتا ہے اور نتیجہ پھر بھی کچھ نہیں ہوا کرتا۔

پھر اس نقشے پر اس میدان میں شوبھا بینر جی آ گئی۔ شوبھا ان دنوں زندگی کے کیف سے سرشار آزادی کی ہوا سے بے پئے ہی مخمور اپنے حسن سے مطمئن اور اپنے رنگین دامنوں پر نازاں تھی۔ کنول بھی ناتجربہ کار تھی۔ کام کرنے کے طریقوں سے ناواقف' دنیا کو سدھارنے کے جذبے پر ناقابلِ یقین حد تک ایمان رکھنے والی۔ اس کی راہیں سچی تھیں' اسے کسی کا ڈر نہیں تھا اور اسے اس بات کی خبر نہ تھی کہ دنیا میں نیک ارادوں سے کیے گئے کاموں میں اکثر ناکامی ہوتی ہے۔ دنیا میں سچ کو شکست دینے کے لیے جو طاقتیں کارفرما ہوتی ہیں وہ بڑی ظالم اور قاتل ہیں۔ دنیا کو بدلنے اور سنوارنے کے منصوبے ہی ہمیشہ اندھیروں سے ٹکراتے اور اکثر پاش پاش ہوتے ہیں۔

اس زندگی کے سمندر میں بہتی ان دنوں نادار گھر میں نیرا بھی آ گئی تھی۔ کنول کماری کا نادار گھر ایک سورگ تھا۔ وہ خود عورتوں کی ضروریات کا خیال رکھتی۔ ان کے لیے دوا مہیا کرتی۔ ان کی صحت کا خیال رکھتی۔ ان کی تیمارداری کرتی اور ان کو زندگی کی نیکیوں' اچھائیوں اور آدرشوں کا گُر بتاتی۔ اس کی ہمت سے اس کی محنت سے نادار گھر کی عورتیں پڑھنا لکھنا سیکھنے لگیں۔ اور اس کا ایک خواب تقریباً پورا ہی ہو چلا تھا کہ ایک طوفان سا اٹھا۔ اخباروں میں ذکر ہونے لگا کہ کنول ٹھاکر نادار گھر نہیں ایک قحبہ خانے کی بنیاد رکھ رہی ہے۔ دشمنوں کی ریشہ دوانیوں اور پریشان کن

سازشوں کی وجہ سے شوبھا بینرجی کے زہر کی وجہ سے کنول کماری ٹھاکر کے نیک ارادے شکست کھا گئے۔ نادار گھر کو بند کرنا پڑ گیا۔ اس لیے نہیں کہ نادار گھر میں فی الواقع کوئی خرابی تھی بلکہ اس لیے کہ شوبھا نے جھوٹ کو سچ ثابت کر دکھایا ہے۔

پھر اسی دوران میں کنول کو تعلیم یافتہ پڑھے لکھے طبقے کی عورتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور اس نے بڑے دکھ سے اس بات کا انکشاف کیا کہ تعلیم پھولوں کی نرمی کی طرح صرف دماغوں کے اوپر ہی سطح سے ٹکراتی ہے۔ عورتیں ابھی جاہل ہیں انہیں تعلیم کا صحیح مقصد معلوم نہیں، انہیں اپنے آپ کو سمجھنے اور اپنی طاقتوں سے وقت پڑنے پر کام لینے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ یہ میں اپنے خیال سے کہہ رہا ہوں، یہ باتیں نہ تو مجھے نیرا نے بتائیں اور نہ ہی کنول نے۔ پھر میرا اپنا خیال ہے کہ ہمارے گرد پھیلی تعلیم اور اس کے غلغلے، عورتوں کی آزادی اور ان کی شان سے اگر میں نے یہ باتیں اخذ کر لیں تو اس نے کیوں نہ کی ہوں گی۔ جو اصلاح کا مقصد لے کر ہی اپنی راہوں پر چلی تھی اور اس کے باوجود کبھی کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ اس کا مقصد اصلاح تھا۔ قوم کی، دل کی، ملک، مرتے ہوئے معاشرے کی اور طبقے کی جو برسرِ اقتدار اور ملک کا نصف سے زیادہ حصہ تھا۔ میں نے خود اس بات کو بہت پریشان ہو کر دیکھا ہے کہ لڑکیاں بڑے چاہ سے کالجوں اور اسکولوں میں جاتی ہیں اور جب وہاں سے نکلتی ہیں تب بھی اسی حد تک کوری اور کھوکھلی ہوتی ہیں، وہ پہلا ذرا سا نور جو روایتوں اور مذہب کے نام سے دل میں ہوتا ہے وہ بھی ان کے پاس نہیں رہتا۔ مغربی تقلید سے چُندھیائی آنکھوں کو وہ اپنے تاریک ماحول پر کھولتے ڈرتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ کنول کماری ٹھاکر ہی تنہا اس سارے ماحول میں روشنی تھی۔ پر اتفاق کی بات ہے کہ جن عورتوں کو میں ملا ہوں وہ زندگی کی راہ پر اتفاق سے مجھ سے ٹکرا گئی ہیں، ان میں صرف کنول ہی ایسی تھی جو ان سب سے الگ اور بلند تھی اور پھر بھی یہ تو اس کا اصلاح کا جذبہ تھا جو کبھی ہم سے خراجِ تحسین حاصل کر سکا اور نہ ہی اس کے نیک ارادے جو ہم سے داد حاصل کر سکے، بلکہ ہم تو آنکھیں بند کر کے اس کے حکم کی تعمیل میں بھاگتے رہے۔ ہم مرد تھے نا اور مرد کام کی طرف سر کے بل دوڑتا ہے۔

بچپن میں ماں سے اور اس کے بعد کتابوں سے سور بیر زانیوں اور میرا جیسی عورتوں کی کہانیاں پڑھ کر اس نے بھی اپنا ایک مذہب بنا لیا جس پر اس نے اپنے کو قربان کرنے کو سوچ لیا شاید وہ شروع سے ہی سر تیغ کر کے زندگی پر داخل ہوئی تھی کہ یہ جسم کس کام کا اگر اس کو پرماتما اور

اس کی پیدا کردہ انسانیت کو بچانے کے لیے نہ لگایا جائے۔ اس کے باوجود اس نے کبھی کسی اسٹیج پر کھڑے ہو کر کسی تقریر کے دوران میں یہ نہیں کہا کہ وہ انسانیت کو بچانے کے لیے اور دنیا کو طاغوتی طاقتوں سے بچانے کے لیے نکلی ہے وہ تو اپنے کو ٹوٹا ہوا پھول اور بھگوان کے چرنوں کی دھول سمجھ کر اس کے چرنوں میں اپنے آپ کو گرانے سے ہی بڑی ہوئی تھی۔ بھگوان کی دَیا اور اس کی نظر نے اس بھکارن کو وہ دان دیا کہ اس کا کشکول سورج بن گیا۔

نیرا نے مجھے بتایا کہ اس نے راتوں کو اسے بھگوان کی مورتی کے سامنے بلکتے اور روتے دیکھا ہے۔ ایسے کہ اس کا سارا دھیرج آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ گیا ہے۔ وہ بھگوان کی مورتی کے سامنے یوں تڑپی ہے کہ میرا بھی کیا روئی ہوگی۔ اس نے اپنے مان کے لیے کسی در کے سامنے جھکنا قبول نہیں کیا' پر اس کا ماتھا اس مورتی کے چرنوں میں رات رات پڑا رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ یہ پرارتھنا کی ہے ''پربھو تمہاری شرن کے علاوہ مجھے اور کسی طرح کی امید نہیں' تو نے اگر مجھے طاقت دی ہے تو سہارا بھی دے۔ تو ہی میرا رکھوالا اور تو ہی میرا ساتھی ہے۔ ساری دنیا اگر مجھ سے بگڑ جائے تو بھی مجھے تیری مدد کی امید اس راہ پر ڈگمگا نہ سکے۔ سارے کام بگڑ جانے پر تو نہ بگڑے' میرے پریم نگر کی آبادی تو ہی ہے۔ پربھو تُو اپنے مندر سے میری ناقص عقل اور ٹوٹے دل کی چمک کو بھروسہ عطا کر۔'' نیرا نے مجھے بتایا کہ اس نے کبھی کسی سادھو سنت کے چہرے پر اتنا پیار نرمی اور روشنی نہیں دیکھی اور پھر بھی دن کے اجالے میں کسی نے اسے مذہب کے متعلق باتیں کرتے نہیں سنا۔ یہ بھگوان اس کا اپنا تھا۔ یہ وشواس بھی اس کا بالکل اپنا اور کسی کے سامنے اپنے دل کے اندھیروں سے پردہ اٹھانا کنول نے کبھی پسند نہیں کیا۔ اس نے ایک زمانے کی ملاقات کے باوجود کبھی کسی سے اپنے بھگوان کی بات نہیں کی۔ مجھے جب نیرا سے معلوم ہوا کہ وہ ساری ساری رات بھگوان کی مورتی کے سامنے روتی رہی ہے تو میں حیران رہ گیا۔ ہمارے ہاں تو کسی بڑے سے بڑے مہاپرش کی تپسوی نے اتنا نہیں کیا ہوگا جو کھلم کھلا دنیا سے ناتا توڑ کر بھگوان کا نام ڈھونڈنے چلے جاتے ہیں۔ ان کی بات الگ ہے۔ پر یہ اُپدیش دینے والے یہ اونچی اسٹیجوں پر چڑھ کر مذہب کو الجھانے والے یہ تو کبھی اتنا سا دھیرج نہیں کر سکتے خود کوئی کام کریں نہ کریں پر بھگوان کا نام لے کر دوسروں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ شاید کرنے والوں اور کہنے والوں کے فرق کی وجہ سے بھگوان کی عظمت وہ نہیں رہی۔ وہی پرماتما جس کا نام لے کر ڈوبے بیڑے تیرنے لگے تھے' وہ ہی بھگوان جس کا نام لے کر جلتی آگ میں گرنے والے بچ بچ گئے۔ اس کے نام میں آج کیا اتنا اثر

نہیں کہ مرتی ہوئی زندگی کروٹ بدل لے۔ اپنے گیسو سنوار لے۔

پر میں تو کنول کماری ٹھاکر کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے یہ باتیں نیرا کی زبانی معلوم ہوئی ہیں اور اب آخر میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ساری دنیا اور اپنے گرد کی طاقتوں سے اتنی بے نیاز کیوں تھی۔ اس نے کبھی کسی کی پرواہ کیوں نہیں کی' اس لیے کہ اسے تو اس کا سہارا تھا' اس کا بھروسہ تھا' جسے کبھی پکارو اور سچے دل سے پکارو تو ضرور مدد کو پہنچتا ہے پر میں تو اب اس پر اعتبار نہیں کرتا جو کچھ ہمارے گرد ہوا ہے۔ کیا ایسے میں پکارنے والوں نے اسے یونہی پکارا تھا۔ جب چیختی چلاتی عورتیں ایسی ستونتیاں جنھوں نے سورج سے بھی منہ چھپایا تھا' اسے پکار رہی تھیں' ان کے آنسو کہاں گئے بھگوان سے کون پوچھے؟ کیا تم صرف کنول ٹھاکر کا سہارا بن گئے تھے۔ تم نے کیوں نہیں مدد کی' پر میں تو ایک ناچیز کمزور ذرہ ہوں۔ میں اس سے پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس اجڑے سوئے ہوئے دلہن کے سہاگ کی طرح اجڑے ہوئے تاج کے شہر میں کون سی ایسی شے رہ گئی ہے جس کے لیے پرارتھنا کی جائے اور آخر میں' میں اس بات پر مطمئن ہوں اگر ان ستونتیوں کی بات بھگوان نے نہیں سنی تو کنول کی بات بھی نہیں سنی۔ بھگوان ان دنوں اپنے کان بند کیے آنکھیں بند کیے صرف سو رہا تھا' اس کے اور دنیا کے درمیان بادل اور گرج' برستی گولیوں اور برستی بارش کا طوفان تھا' بجلیاں تھیں' آگ تھی' چیخیں تھیں اور وہ پھر بھی سو رہا تھا اور کنول کی ساری پرارتھنا دنیا کو بچانے کی ساری کوششیں فضول گئیں۔ اس کا رات رات بھر بھگوان کے چرنوں میں بیٹھ کر رونا اکارت گیا۔ اس کا بھگوان کوئی اور نہیں' تمھارے پرماتما اور پربھو کی طرح کا تھا۔ کنول کی آنکھوں کی ساری تابانی اور سارا نور اس کے دل کی ایک شعاع پیدا نہ کر سکے۔ ایک کرن بھی نہیں اور اس کے باوجود نیرا کہتی ہے کنول کماری ٹھاکر بھی ہو کر جس کو اب میں بولنے والوں کی طرح خواب میں چلنے والوں کی طرح یہی کہتی رہی۔ ''انسانیت کو بچاؤ۔'' آخر کنول عورت تھی ایک کمزور اور ایک بے سہارا سی عورت۔ اس کے دل کا راز اور تمنائیں ظاہر ہو ہی گئیں۔

اور نیرا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ہمیشہ راتوں کو بھگوان سے شرن چاہتی اور اپنا مان رکھنے کی پرارتھنا کرتی رہی۔ اسے بھی کسی شرن کی ضرورت تھی۔ اسے بھی اپنے مان کا خیال تھا۔ اسے بھی اپنی شان مقصود تھی۔ یہ مجھے نیرا سے پتہ چلا ہے ورنہ میں تو آخر تک سمجھتا رہتا کہ کنول کو ان سب چیزوں سے واسطہ نہیں تھا۔ وہ ان سب چیزوں سے' ان آرزوؤں سے بلند ہے۔ کیا بھگوان سے کوئی شے مانگنا' کیا اس کے سامنے جھکنا' اپنی تمنا اسے بتانا کوئی معمولی کام ہے؟ ہم اسی دروازے

پر سوالی ہوتے ہیں جہاں معلوم ہو ہم دروازے کو چھونے کے قابل ہیں۔ ہم دھتکار نہیں دیئے جائیں گے اور بھگوان کا مندر تو بڑا اونچا ہے۔ بڑا بلند ہے بڑا پوتر ہے۔ اس مندر کی سیڑھیاں چڑھنے کی بھی اس کو ہمت تھی جو اپنے آپ کو ان کے چرنوں کی دھول بنانے کے قابل سمجھتی تھی۔ پر کنول ٹھا کر اور جا بھی کہاں سکتی تھی۔ اس کا وہی اپنا تھا' ہمارے ارد گرد اس کا تھا ہی کون؟

نادار گھر بند کرنا پڑا۔ ان دنوں بھی نیرا نے بتایا ہے کہ اس کو اداس نہیں دیکھا۔ اس نے کبھی گھر میں بیٹھ کر شوبھا بینر جی کا نام نہیں لیا۔ کبھی ایسا تذکرہ نہیں کیا۔ ان دنوں بھی وہ اپنے پھولوں کو اسی پیار سے دیکھتی اور کیاریوں کو محنت سے ٹھیک ٹھاک کرتی۔ شاید اس کے لیے دنیا کو سنوارنا اور ٹھیک کرنا بھی پھولوں کی کیاریوں کو درست کرنے کی طرح ایک دلچسپ اور خوبصورت مشغلہ تھا۔ بڑے لوگوں کی طرح' وہ کام کے لیے الگ اور لوگوں سے ملنے کے لیے الگ وقت نہیں بتاتی تھی۔ اس کے لیے ہر کام' ہر وقت پر ہو سکتا تھا۔ ہر وقت کام کا تھا۔ جب بھی کوئی ملنے آیا ہے اسے مستعد اور جاگتے ہوئے پایا ہے۔ نہ جانے وہ سوتی کب تھی۔ نادار گھر بند ہو گیا۔ بند کرنا پڑا۔ پر کنول نے عورتوں کے لیے بھاگ دوڑ کر اپنے رسوخ کو کام میں لا کر ٹھکانے بنا ہی دیئے تاکہ ان کو پھر اسی پستی کی طرف نہ جانا پڑے اور پھر اس نے خیال کرنا شروع کیا۔ شاید اس کے کام کرنے کے طریقوں میں کوئی غلطی باقی رہ گئی ہے۔ اسے اپنی طاقتوں پر شک ہونے لگا اور انہی دنوں تو میں نے اخبار چھوڑ دیا تھا۔ کنول نے بھی الگ ہو کر نادار گھروں کے جھنجھٹوں سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو چھپا کر عورتوں کی تربیت کرنا شروع کیا مگر دنیا میں زندگی کے سبق بھی' راہیں متعین نہ کر سکے۔ راہیں اتنی الجھی اور اندھیری تھیں شاید اسے کچھ سوجھ ہی نہ سکا ہو گا۔

پھر کرشنا بوس نے اپنے خاوند کو قتل کر دیا۔ مقدمہ چلا۔ لوگوں نے کنول کو بھی گھسیٹنا چاہا مگر کرشنا نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا ''آخر میں بھی آنکھیں رکھتی ہوں۔ کنول میری جگہ نہیں تھی۔ اگر آپ میں سے کسی کی بیٹی یا بہن ان حالات میں ہوتی تو شاید وہ یہ فیصلہ بہت پہلے کر لیتی اور عدالت نے اسے قتل کے جرم میں 14 سال کی سزا دی۔ جن دنوں میں اس سے ملا ہوں وہ کنول کے پاس دس سال کے بعد اور 5 سال کی معافی حاصل کرنے کی وجہ سے آ گئی تھی۔''

بظاہر شکست کھا کر اور تعلیم میں بھی نقائص دیکھ کر کنول نے سوچا آخر مغرب میں یہ شور اور آزادی کیسی ہے' کیوں نہ اسے بھی دیکھ لیا جائے۔

سمندر پار جانے کا شوق دوسری عورتوں کی طرح صرف ڈگری کی زیادتی یا آزادی کی ہوا کو اپنے گرد محسوس کرنے کا جنون نہ تھا بلکہ یہ تو ایک خالص کوشش تھی کہ اپنے نقائص کو دور کرنے کے لیے اپنا مقابلہ دوسرے لوگوں سے کرنا چاہیے۔ اپنے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ مانگے کے پروں اور غیر ملکی طاقت کی خواہش مند نہ تھی۔ دوسروں کو چندھیا دینے کی تمنا جو ہر عورت میں کسی نہ کسی کونے میں چھپی ہوئی ہے' اس کے دل میں ایک ایسی چمک تھی۔ جیسی ہیرے میں ہوتی ہے۔ دبی دبی اور پھر بھی برتن بن کر نہ گرنے والی۔ پانچ سال میں یورپ کے ملکوں کا دورہ کر کے وہاں کے کھوکھلے پن کو اس نے دیکھ لیا تھا۔ وہ اس بات سے مطمئن ہوگئی ہوگی کہ ہمارے ہاں زندگی پر جو پرانا پن ہے' وہ اس نئے پن سے بہت بہتر ہے' جس نے یورپ کی عورتوں کو ایسی کشتیاں بنا دیا ہے جن کی کوئی منزل نہیں ہے۔ وہ خاندان کے بندھن توڑ کر اکیلے پن کے مضراب میں گرفتار ہو جاتی ہیں اور چونکہ مقصد صرف عیش سے زندگی بسر کرنا ہوتا ہے' اس لیے عیش مٹھاس کی زیادتی کی وجہ سے بھوک کو مٹا دیتی ہے اور آخر عمر میں کتوں بلیوں اور مجبور زندگی سے تنگ آ کر وہ اپنے اکیلے گھروں کے سامنے کرسیوں پر بیٹھی دل میں ان تمناؤں کا ماتم کرتی رہتی ہیں جو ان کی راہوں سے گزر گئیں۔ روتھ کے ساتھ اس نے کئی مجرد عورتوں کے حریمِ ناز میں داخل ہو کر ہر ایک شے پر اداسی دیکھی تھی۔ شاید اس لمحے اسے بھی خیال ہوا ہوگا کہ اگر انجام یہ ہے تو کسی مرد کی شرن میں سکون مل سکے گا مگر میرا خیال ہے اگر اس نے ایک لمحے کے لیے بھی کسی مرد کا سہارا ڈھونڈنے کی غرض سے کسی کی طرف دیکھا ہوتا تو شاید کئی مرد اس کے اشارے پر اپنا آپ قربان کرنے کو تیار ہو جاتے۔

نیرا نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر دھنن بھٹا چاریہ تو دیوانوں کی طرح کنول کا نام لے کر جینے لگے تھے۔ میں بھی ڈاکٹر صاحب کو جانتا ہوں وہ شہر کے بڑے آدمیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی طبیعت میں ایک سادگی تھی جیسی بچوں میں ہوتی ہے۔ اپنی بات منوانے کے لیے وہ اڑتے نہیں' مچل جایا کرتے تھے۔ بچوں کی طرح اور پھر ان کی بات مان لی جاتی۔ پہلے پہل تو ہم سب لوگ ان کی سادگی سے چونک سے گئے۔ پھر رفتہ رفتہ ڈاکٹر بھٹا چاریہ کا مستقل رویہ دیکھ کر ہم سب ان کا احترام کرنے لگے اور شاید ان کی یہی سادگی کنول کو بھا گئی تھی۔ کیونکہ ایک زمانہ آیا کہ وہ اس کے سب سے بڑے مداح بن گئے تھے۔ پھر وہ کنول سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ ان کی بیٹیاں کنول کے پاس پڑھتی تھیں۔ کنول نے سوچا ہوگا' وہ اس کو بھی اپنی بیٹیوں بہنوں کی طرح عزیز رکھتے ہیں

اور اگر یہ بھی نہیں تو کم از کم وہ اسے ایک عورت سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کبھی احترام کے قابل نہیں سمجھتی تھی مگر اس کا احترام ہر ایک کو کرنا پڑتا تھا اور ڈاکٹر بھٹاچاریہ بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔ اس نے ہمیشہ بحث کے دوران مجھ سے کہا ہے' آخر آپ عورتوں کو ماں بہن بیٹی سے بلند کر کے الگ کرتے ہیں، محض عورت سمجھ کر اس کی عزت کیوں نہیں کرتے۔ آپ اسے کسی نہ کسی رشتے میں منسلک کرنا کیوں چاہتے ہیں؟ اور میں نے اسے کسی بھی رشتے میں ملانا چھوڑ دیا ہے۔ وہ میرے لیے محض عورت تھی۔ جیسے ہم قدرت کی شکتیوں کو کبھی انسانی رشتوں کی وجہ سے تصور نہیں کرتے۔ بعینہٖ کنول بھی تھی۔ پر میں تو ڈاکٹر بھٹاچاریہ کی باتیں سنتا رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے مچلنے کی عادت نے انہیں کنول کے میل ملاپ اور سادگی کو غلط سمجھنے پر آمادہ کیا۔ وہ اپنی وجاہت کے قائل تھے۔ کبھی کبھار کسی پارٹی میں، کسی میٹنگ میں، جب بھی مردانہ خوبصورتی کا ذکر آیا ہے تو انہوں نے ایک بچے کی سی سادگی اور ایک ہٹ دھرم کی سی ضد سے اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے میں خوبصورت ہوں، میں دراز قد ہوں اور میں سانولا سلونا ہوں اور ہم سب نے ہمیشہ ہنس کر ان کی بات ٹال دی۔ یہ نہیں کہ ہمیں ان کی بات کا اعتبار نہیں تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسے ہونے کے باوجود اس مردانہ حسن سے عاری تھے جو مرد کی شان بن کر رہ جاتا ہے۔ ان میں بچپنا تھا، سنجیدگی نہ تھی اور کنول تو سب مردوں سے بڑے بچے سمجھ کر ایک سا برتاؤ کرتی تھی۔ اسے تو کسی مرد کی شکتی سے ڈر نہیں لگا۔ وہ ڈاکٹر بھٹاچاریہ سے کیا گھبراتی۔ میں اس کے اور ڈاکٹر بھٹاچاریہ کے ذاتی تعلقات کو نہیں جانتا۔ میرے خیال میں ہم سب اس کے قریبی دوست اور پھر بھی اس سے اتنے ہی دور تھے۔ ہم کو اپنا فاصلہ معلوم تھا۔ ہم حاشیہ نشین تھے۔ مودب نشست کے گرد سکون سے بیٹھے حکم کے منتظر ہم اپنا سبق سیکھ چکے تھے مگر ڈاکٹر صاحب کو یہ سبق سیکھنا تھا اور بہت دکھ سے سیکھنا تھا۔

ڈاکٹر بھٹاچاریہ کی ایک ملنے والی انسپکٹرس آف اسکولز ہو کر نئی نئی آئی تھی۔ اپنی سادگی اور ازلی بددیانتی کی بنا پر مرد ہر عورت کو محض اس لیے کہ وہ کھلونا بن سکتی ہے' اس کے رنگ سے متاثر ہو کر دوسروں کے سامنے اس کی نمائش کر کے اپنے احساسِ برتری کو تسکین دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب تو پھر بھی اچھی محفلوں سے باز رہتے تھے اور بڑے فخر سے کنول کا ذکر کیا کرتے تھے۔ پھر یہ انسپکٹرس دوسرے مذہب کو چھوڑ کر اپنے بھگوان کے چرنوں میں آ رہی تھی۔ انہوں نے عیسیٰ کی شرن چھوڑ کر بھگوان کرشن کے چرن چھونے کی مہربانی کی تھی۔ چاہے عورت محبت میں گرفتار ہو کر

اپنا آپ تج دے مگر مذہب ہندوستان میں ایک ایسی دیوار ہے اسے پھاند کر آنے والوں کو لوگ بڑے غور اور چاؤ سے دیکھتے ہیں اور اسی لیے مسز بھٹنا گر بھی تھوڑے دنوں ایک عجوبہ اور سوسائٹی میں ایک موضوعِ سخن بنی رہیں اور یہ بھی وجہ تھی کہ عیسائی حکومت کا مذہب تھا۔ حکومت کا مرتبہ ہر زمانے میں عوام سے بلند رہا ہے اور اس لیے اس عورت کی ہمت کی داد دینے کے لیے لوگ اس کے گرد اکٹھے ہوتے اس کو سراہتے سب سے بڑی وجہ تھی کہ وہ عورت تھی، جوان تھی اور عورت کے لیے جوان ہونا خوبصورت ہونے سے بھی بڑا پروانہ راہداری ہے۔ پھر اس میں وہ بے باکی تھی جو ہمارے ہاں عام ہونے کے باوجود ناپید ہے۔ ہندوستان میں بے باکی کو سراہنے والے بھی اپنے ہاں اس کو دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ مغرب نے ان کے داغوں کو بدلنے میں ایک حد تک مدد کی ہے مگر فطرت کو نہیں بدل سکا۔ مشرق میں عورت کا زیور شرم ہے، حیا ہے اور لاج ہے۔ پڑھ لکھ کر عورتیں لاکھ ہوٹلوں ڈانس اور پارٹیوں میں آزادانہ گھومیں مگر مرد اسے ہی سراہتے ہیں جو اپنے اور ان کے مغرب اور مشرق کے درمیان ایک فاصلہ رکھے۔ دل کو دماغ کو جذبات کو جو بات سب سے زیادہ قابلِ قبول لگتی ہے۔ وہ عورت کی شرم ہے اس کا عورت پن ہے۔

چند دنوں ڈاکٹر بھٹاچاریہ مسز بھٹنا گر کو لیے لیے ہر جگہ گئے خوب گھومے، کئی لوگوں سے اس کا تعارف کروادیا، کئی لوگوں سے اس کی وجہ سے متعارف ہوئے مگر کنول کے پاس اسے لانے کی ابھی تک ہمت انہیں نہیں ہوئی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ سوچ رہے ہوں کہ اس عورت کا اور کنول کا فاصلہ ایک زندگی ایک معاشرے اور ایک زمانے کا ہے۔ شاید وہ سوچتے ہوں گے کہ کنول ان کا اس عورت سے ملنا پسند نہ کرے۔ (پر یہ بات انہوں نے کاہے سوچی ہوگی) بہت دنوں بعد وہ آئے مسز بھٹنا گر کی چند باتیں کرتے پھر رک جاتے۔ چائے پیتے ہوئے اپنی بیوی کی جہالت کی تعریفیں کرتے ہوئے باقی لوگوں اور سیاست حاضرہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ رک جاتے پھر باتیں کرنے لگتے۔ کنول ہنس کر کہتی: ''ڈاکٹر صاحب آج کل آپ کس سوچ میں رہتے ہیں؟'' وہ ٹال جاتے۔ شہر کے نئے میوزک سرکل کا اور ایسی ہی اور باتوں کے متعلق کنول کو بتانے لگے۔ پھر ایک دن ان کی بیوی بھی ساتھ آئی تھیں۔ وہ کنول کی بہت معتقد اور اس کے حسن، اس کی شان اور اس کی لاج سے کافی متاثر تھیں۔ کہنے لگیں ''آپ سب جگہ لئے لئے گھومتے ہیں۔ بھٹنا گر کو کبھی یہاں بھی تو لائیے پتہ لگ جائے گا کیسی ہیں وہ ہم تو ان سے بیزار ہو گئے ہیں'' اور پھر کنول سے باتیں کرتے ہوئے بتانے لگیں کہ ''مسز بھٹنا گر تو گھر میں مستقل موضوعِ سخن اور ہر روز کی مستقل مہمان ہیں۔

ڈاکٹر صاحب بے چارے مان گئے کہ وہ انہیں کسی دن لائیں گے۔"

دوسرے دن صبح سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بھیگے جھونکے جسم میں تیر کی سی تیزی سے گھستے اور ہڈیوں کو کاٹتے جاتے۔ کنول کی طبیعت خراب تھی۔ کالج میں چھٹی تھی۔ کرشنا حسبِ وعدہ مس جوزف کے پاس جا چکی تھی۔ گھر میں نیرا تھی جو باورچی خانے میں بیٹھی سردی کے اس ریلے سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آسمان گدلا اور دھوپ بڑی مدھم تھی۔ بادل جوہڑ کے گندے پانی پر برف کے ٹکڑوں کی طرح تیر رہے تھے۔ فضا میں نیلاہٹ نہ تھی، خوشگواری نہ تھی۔ صرف مالی بابا اپنی سانس کی ہلکی سیڑھی کندھے پر اٹھائے باغ میں گھوم رہا تھا۔ سردی کی تیزی سے پھول بھی دوہرے ہو گئے تھے۔ سب طرف ایک اداسی تھی جو خوشبودار باڑ کے ساتھ لگ کر ہوا کے جھونکے اس کی باس اندر کمروں میں لے جاتے۔ کنول کا کمرہ جس میں آج تک کسی مرد کا بار نہیں، بہت سیدھے سادے طریقہ پر سجا تھا۔ بھگوان کی مورتی کے سامنے اس کے پھول پڑے تھے۔ کونے میں ستار تھا، کتابوں کے ڈھیر الماریوں، میزوں اور کمرے کا بڑا حصہ روکے تھے۔ میں نے کبھی کنول کا خاص کمرہ نہیں دیکھا، پر نیرا بتاتی ہے کہ ایک تپسونی کی سی سادگی سے، ایک سادھو کی سی ضرورت سے وہ رہتی تھی۔

نیرا نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے باورچی خانے میں آنے والوں کی آوازیں سنی ہیں اور پھر ڈاکٹر بھٹاچاریہ کی ہنسی کی آواز مجھے کنول کے کمرے سے آئی۔ اتنے سالوں میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ کسی مرد کی ہنسی اس کے اندرونی کمرے میں گونجی ہو گی۔ میں تیزی سے اٹھ کر گئی۔ بیٹھنے کے کمرے میں ایک عورت تھی جس کے ہندوستانی وضع کے غرارے کی سیاہی اور پیلاہٹ مجھے دروازے سے ایک جھلک کے ساتھ دکھائی دی اور پھر وہ کہہ رہی تھی' ڈاکٹر صاحب آپ نے اچھا نہیں کیا' کسی عورت کے پرائیویٹ کمرے میں جانے سے پہلے آپ نے خوب غور کر لیا ہوتا کہ وہ آپ کی قریبی دوست ہے؟ مجھے قرآئن سے لگتا ہے یہ پرنسپل آپ کی ویسی دوست نہیں جس طرح آپ ذکر کرتے ہیں۔ کم از کم میں مطمئن ہوں کہ کنول کماری ٹھاکر میری طرح آپ کے قریب نہیں ہے۔"

ڈاکٹر صاحب ایک زوردار قہقہہ لگا کر بولے: "عورتوں کے متعلق کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر ٹھاکر ابھی آئیں گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں یہ سب باتیں سن کر اندر گئی تو کنول کا رنگ اتنا زرد ہو رہا تھا اور وہ کہہ رہی تھیں اے بھگوان تو ہی میرا کھیون ہار ہے۔"

اپنی طبیعت کی خرابی کے باوجود وہ بیٹھنے کے کمرے میں آ گئیں۔ ڈاکٹر بھٹا چاریہ ایک بے وقوف کے سے تیقن اور گھبراہٹ سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ دوسری عورت مسز بھٹنا گر جب میں چائے دینے گئی تو دیکھا کہ بہت بڑھیا کپڑوں میں آن سے بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک معمولی عورت سے بھی معمولی لگ رہی تھی۔ اس کے تقریباً سیاہ رنگ پر وہ کپڑے اپنی جان کو رو رہے تھے۔ وہ مسلسل باتیں کر رہی تھی۔ کرشن بھگوان کی مورتی اور دھرم کی باتیں، کتنی اوپری لگتی تھی وہ۔

ڈاکٹر صاحب سے اس کا ذکر سن کر میں اس کے نام سے واقف ہو چکی تھی۔ باتیں تعلیم اور اسکولوں، کالجوں اور اصلاحات کے متعلق تھیں اور مسز بھٹنا گر اپنے تجربے اور کام کی بنا پر کنول سے کہہ رہی تھیں کہ تعلیم کے سارے محکمے میں ایک دم تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اخلاق کو سنوارنے اور تعلیم کا صحیح مقصد بتانے کی ضرورت ہے اور کنول خاموشی سے اس کی باتیں سنتے ہوئے ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ یہ نہیں کہ اس کو ایسی باتیں کرنے اور کہنے کا شعور نہیں مگر وہ دوسروں کی باتیں خاموشی سے سننے اور اپنی کم کہنے کی عادی تھی۔ ملنے والے آتے رہے ہیں۔ اپنی طرف سے اصلاحات پیش کرتے۔ کالج میں ترمیمات کی باتیں کرتے۔ کنول نے کبھی کسی کو جواب نہیں دیا۔ کبھی کسی کا دل نہیں توڑا اور اس کے باوجود تعلیم کے متعلق اس کے اپنے اصول تھے۔ وہ کہنہ بنیادوں پر عمارت کھڑی کرنا چاہتی تھی۔ ایک صدی کو بھول کر اخلاق اور اصول کی گزشتہ روش کو یاد دلانا چاہتی تھی اور استاد اور شاگرد کا تعلق جو بھلایا جا چکا ہے، اس کو تازہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا ہم مشرق میں زندگی کے قریب ہیں۔ اپنے دکھوں اور دھڑکنوں کی وجہ سے وہ انفرادیت جو مغربی زندگی کا حصہ ہے وہ ترقی کا منتہائے نظر جو ہم نے اپنی منزل بنا لیا ہے غلط ہے۔

مگر اس دن انسپکٹرس آف سکولز مسز بھٹنا گر کی باتیں سعادت مندی اور خاموشی سے سنتی ہوئی ڈاکٹر بھٹا چاریہ کی باتوں کا تسلی سے جواب دیتی ہوئی کنول اس دوسری عورت کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ قالین کے پھولوں میں جمی ہوئی نگاہیں، جانے کیا ڈھونڈ رہی تھیں۔ کیا وہ خاک کے ذروں کو اٹھا کر آفتاب بنانا چاہتی تھی؟

باتیں پھر تعلیم سے موسیقی کی طرف مڑ گئیں۔ مسز بھٹنا گر خاموش تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے "آج اتنی سردی ہے آپ کیوں نہیں مس ٹھاکر کو اپنا وہی گیت سنا دیتیں جو آپ نے

اللہ آباد کانسرٹ میں گایا تھا۔'' کنول نے اتنی دیر ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی ڈاکٹر اور انسپکٹر س کو بحث کرتے دیکھ رہی تھی۔ بالآخر ستار منگوایا گیا اور مسز بھٹنا گر گانے کو تیار ہو گئیں۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے ''مس ٹھاکر' انہیں تو رقص سے بھی دلچسپی ہے۔ اس کانسرٹ میں انہوں نے ایک ماڈرن ڈانس بھی کیا تھا۔'' کنول تھوڑا سا ہنس دیں۔ بولیں ''کچھ نہیں۔'' پھر ستار بجتا رہا اور گیت گایا جانے لگا۔ شاید مسز بھٹنا گر رقص کے لیے تیار ہو رہی ہوں گی۔ جب گھنٹی زور سے بجی اور کالج کی نوکر تارا نے آ کر کہا کہ مس گپتا کی طبیعت یک بیک بگڑ گئی ہے۔ وہ آپ کو یاد کر رہی ہیں۔

مس گپتا حساب کی پروفیسر تھیں۔ اتنی خاموش' سنجیدہ اور زرد رو میں کالج میں بہت کم جاتا تھا اور اس لیے اسے کم کم ہی دیکھا ہے مگر تارا اکثر بتاتی کہ وہ کالج کے بعد اپنے کمرے سے کم ہی نکلتی ہیں۔ پڑھانے میں ایسی ماہر اور اپنے کام میں بے حد مستعد مگر مس گپتا کے گرد ایک سایہ سا تھا' ایک دھند تھی اور لوگوں کے ساتھ بھی انہیں کبھی ہنستے اور قہقہے لگاتے نہیں دیکھا گیا۔ اپنے خیالوں میں لپٹی وہ تیزی سے ایک سے دوسرے کلاس روم کی طرف جاتیں اپنا کام ختم کیا اور کمرے میں آ کر لیٹ جاتیں۔ تارا جب بھی کبھی کسی کام سے چائے لے کر اندر جاتی انہیں دیوار کی طرف منہ کیے لیٹے دیکھتی۔ ڈاک سے سب لوگوں کے ڈھیروں خط آتے مگر کبھی کسی کو خط لکھتے نہیں دیکھا گیا۔ کبھی کسی کو انہوں نے خط نہیں لکھا۔ ایک دردانگیز سکون سا تھا' اس زندگی پر ایک ٹھہراؤ' ایک سناٹا وہ بڑی بڑی آنکھیں جو پڑھاتے ہوئے لپک جاتیں کلاس روم کے باہر ان کی چمک پھر بجھ جاتی۔ وہ زردی آنکھوں میں بھی گھس آتی۔

پہلے پہل لوگوں نے مارے تجسس کے ان کی خاموشی کو توڑنے' ان سے دوستی کرنے' انہیں اس خول سے باہر کھینچنے کی بہت کوشش کی مگر کوئی کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر باقی پروفیسروں نے مس گپتا کو اس طرح بھلا دیا جیسے وہ زندہ ہی نہ تھی۔ اسٹاف روم سے نکلتے اور کالج کے لمبے برآمدوں میں گھومتے کبھی کبھار آمنا سامنا ہو جاتا تو وہ انہیں یوں دیکھتیں گویا ماضی سے نکل کر کوئی یاد ان کے سامنے سے گزر گئی ہو گی۔ لڑکیوں نے بھی ان کی زردی اور خاموشی' ان کی سنجیدگی اور لیاقت کا ذکر کرنا چھوڑ دیا اور جب باقی لوگ بھول گئے تو کنول نے مس گپتا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اس کا ہاتھ بھی اسی طرح جھٹک دیا گیا مگر اس نے تو ناامید ہونا سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ متواتر کوشش کرتی رہی۔ اپنے دفتر میں بلا کر مس گپتا سے کالج کے متعلق مشورہ لیتی' ان کے کام کی رفتار

اور ترقی کی بابت باتیں کرتی۔ مس گپتا کی خاموشی ویسی ہی رہی جو بات اس سے پوچھی جاتی' اس کے علاوہ اور بات کرنے اور کہنے سے جیسے انکار کر دیا تھا۔ مگر کنول کماری ٹھاکر نے بھی اپنی کوششوں میں پیچھے ہٹنا نہیں سیکھا تھا۔ دوسروں سے الگ انہوں نے کئی بار مس گپتا کو چائے پر مدعو کیا۔ ان سے موسیقی اور رقص کے موضوع پر پھولوں کے متعلق اور سیاست حاضرہ کے بارے میں باتیں کیں۔ کالج کے ڈراموں' جلسوں اور ادبی محفلوں میں مس گپتا کو انتظام سونپا گیا اور یہ دیکھ کر ہم سب کو بہت حیرت ہوئی کہ اس کی انتظامی قابلیت باقی لوگوں کے مقابلے میں بہت بہتر تھی اور بلا مبالغہ بے نقص تھی۔ اس کے کیے گئے کاموں میں کبھی کوئی خامی نہیں رہی مگر خاموشی اور سنجیدگی زردی کا وہ خول' ان کے گرد یونہی چڑھا رہا۔

وہ بیمار بھی ہو جاتی تو کبھی کسی کو کچھ نہ کہتی۔ کالج سے رخصت لے کر اپنے کمرے میں لیٹی رہتیں۔ تارا نے کبھی انہیں دروازے کی طرف منہ کیے لیٹے نہیں دیکھا۔ شاید انہیں کھلے دروازے سے گھٹی امید اور کوئی تمنا نہ تھی۔ کنول نے بیماری کے دوران میں جا کر دیکھا تھا مگر مس گپتا نے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ کبھی کسی استفسار کا جواب نہیں دیا۔ کمرے کی ہر شے اتنی صاف ستھری اور بہترین ذوق کا پتہ دیتی تھی۔ بے داغ اور قیمتی بستر کی چادر تک میں شکنیں نہیں ہیں۔ مس گپتا میں سوائے ان کے خاموشی کے کوئی نقص نہ تھا۔

اس صبح جب ہوا تیز تھی۔ سردی' سردیوں کی یخ ہوا کی طرح ہڈیوں کے گودے تک میں گھس رہی تھی' تارا نے آ کر کہا' مس گپتا سے کوئی ملنے آئے ہیں۔ تعطیل کے دن کسی نے کبھی انہیں کمرے سے باہر نکلتے نہیں دیکھا تھا اور آج مس گپتا سے کوئی ملنے آیا تھا۔ کاغذ کے پرزے پر لکھے گئے نام کو وہ بہت دیر گھورتی رہی۔ یوں جیسے وہ لفظ زندہ ہیں اور اس کو بھی دیکھ رہے ہیں۔ اس کے کمرے میں بھی جھانک رہے ہیں۔ تارا نے پھر کہا' تو میں جا کر کیا کہہ دوں۔ مس گپتا نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور تارا کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ ان کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ زردی سفیدی میں بدل رہی تھی۔ انہوں نے کہا'' جا کر کہہ دو میں ملنے نہیں آ سکتی۔''

تارا چلی گئی مگر پھر واپس چلی آئی۔ کہنے کے لیے جو ملنے آئے ہیں' وہ کہتے ہیں ان کو دیکھے بنا نہیں جا سکتا۔ مس گپتا کا رنگ سفید ہوتا جا رہا تھا اور لگ رہا تھا ابھی چند منٹوں میں وہ بے ہوش ہو کر گر جائیں گی۔ دوبارہ اسے دیکھ کر اس کاغذ کے پرزے سے جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا اور جس کو وہ گھور رہی تھیں' آنکھیں اٹھا کر انہوں نے کالج میں آنے سے اب تک پہلی بار

اس سے زور سے کہا' تم نے سنا نہیں جاؤ۔ ان سے کہہ دو جس کو وہ ڈھونڈتے ہیں' وہ میں نہیں ہوں۔ کہہ دو میں ان سے نہیں ملوں گی۔ یہ کہہ کر وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح بستر پر گر گئیں۔ تارا کو سوجھ نہیں رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کیا کہے وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی گئی اور اس ملنے والے کو پیغام دے کر' مس گپتا کے پاس آ گئی۔ اسے خاموش اور زرد رو عورت کے ساتھ بہت ہمدردی تھی۔ وہ سب سے زیادہ خیال سے اس کا کام کرتی تھی۔

مس گپتا بستر پر تڑپ رہی تھی مگر خاموشی سے آنسو آنکھوں سے رواں تھے۔ تارا کو دیکھ کر انہوں نے بہت تکلیف سے کہا ''جاؤ مس ٹھاکر کو بلا لاؤ۔'' اور وہ پہلی بار تھی جب مس گپتا نے کنول کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔

مس بھٹنا گر کو وہیں چھوڑ کر کنول تیزی سے مس گپتا کے کمرے میں آ گئی۔ تکلیف سے بے تاب مس گپتا نے اپنا ہاتھ بڑھا کر کنول کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی ''آپ کی نوازشوں اور مہربانیوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔ آپ نے ایک بہن کے سے صبر اور ماں کے سے پیار سے میری طرف توجہ دی ہے مگر میں شرمندگی کی وجہ سے اس توجہ کے اپنے آپ کو نا قابل سمجھ کر آپ کو شکریے کے دو بول بھی نہ کہہ سکی۔ میرے گرد سب لوگوں نے اپنے پیار سے مجھے حصہ دینا چاہا مگر میں اس پیار کے قابل نہ تھی۔ اب یہ دکھ جان لیوا ہے کہ بچ نہیں سکتی۔ میرا دل تیزی سے ڈوب رہا ہے...... کنول نے تارا سے کہا' جاؤ ڈاکٹر بھٹا چاریہ کو بلا لاؤ۔''

مس گپتا نے ہاتھ کے اشارے سے کہا جانے دیجئے۔ اس کا وقت نہیں ہے۔ ''آپ میری بات سنئے۔ آپ کے کالج میں مرنے والی عورت کے متعلق آپ سے بہت کچھ پوچھ لیا جائے گا اور کوئی ہوتا تو میں کچھ بھی نہ بتاتی مگر آپ کو بتائے بنا مرنا ایک گناہ ہے اور میں پہلے ہی دکھی ہوں۔ آپ کو کیوں پریشان کروں۔ تارا ڈاکٹر بھٹا چاریہ کو بلا لائی تھی۔ انہوں نے مریضہ کو دیکھتے ہی خواب میں بولنے والوں کی طرح کہا' ارے رشما ہو' رشما یہ تم ہو۔ مریضہ کے چہرے پر کرب تھا۔ اندرونی تکلیف کے مارے آنکھیں بند تھیں۔ وہ ابھی کنول کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے تھی جیسے یہی ہاتھ اس کا سہارا اور اس کی پناہ ہو۔''

پھر اسے تیزی سے ہسپتال لے جایا گیا۔ مگر سرد ہوا کے بہتے ریلوں میں شام کو مس گپتا اپنا وہ خون بھی تھوکتی' جو اس کے جسم میں تھا' موت کے آغوش میں چلی گئی۔ ڈاکٹر بھٹا چاریہ کی ساری دوائیں اور تدبیریں ناکام ہو گئیں۔ کنول کئی دنوں تک ایک مایوس اور اداس ماتم کرنے

والے کی طرح خاموش اور چپ چاپ رہی۔ مس گپتا کا کمرہ بند رہا۔ کالج پر ایک سایہ سا ڈولتا رہتا۔ پھر ایک دن کوئی آدمی کنول سے ملنے آیا۔ یہ کہنے کہ وہ مس گپتا کا سامان لینے آیا ہے۔ وہ اس کا بھائی ہے۔

کنول نے کہا ''زندگی میں وہ کبھی کسی سے نہیں ملی۔ کبھی کسی کا خط اس کے پاس نہیں آیا اور شاید اس نے بھی کبھی کسی کو خط نہیں لکھا۔ آپ کس طرح اس کے بھائی ہو سکتے ہیں'' اور آنے والے نے کہا'' میرے علاوہ ایک اور شخص بھی جانتا ہے کہ رشما میری بہن تھی۔ ڈاکٹر بھٹا چاریہ یہ جانتے ہیں'' اور کنول کو یاد آ گیا۔ مس گپتا اسپتال میں جا کر اتنی جلدی مر گئیں اور بے پناہ رنج میں ڈوبی کنول نے کسی سے اس کے متعلق سوال نہ کیا۔

پھر اس نے کنول کو رشما کے بارے میں بتایا ہوگا کیونکہ کنول نے نیرا اور تارا کو کہا کہ مس گپتا کا سامان انہیں دے دیا جائے وہ کمرہ بھی خالی ہو گیا۔ اپنے بارے میں ایک لفظ بتائے بنا مس رشما گپتا مر گئی۔ اس کی موت کا علم صرف کنول کو تھا کیونکہ اس کے بھائی نے کنول ٹھاکر کو بتایا تھا کہ مرنے والی زمانے کی ٹھکرائی ہوئی مایوس اور پریشان ماں باپ کی دھتکاری ہوئی لڑکی رشما، تعلیم کا سہارا لے کر محبت کے غلط مفہوم کو صحیح کرنے کی کوشش میں ختم ہو گئی ہے۔ محبت جو لڑکپن کا خواب جوانی میں جذبات کا گورکھ دھندا اور اس سے اگلے وقت میں ایک بے پناہ دکھ اور مصیبت کا باعث بن جاتی ہے۔

اس کے بعد کنول نے اس سوال کو کالج کی ادبی مجلسوں میں کھلم کھلا اجلاسوں میں زیر بحث رکھا۔ وہ بچیوں کو بے راہ رو لوگوں کی مثالیں دینا نہیں چاہتی تھی مگر اس نے ایک فرض سمجھ کر لڑکیوں کو صحیح اور ٹھیک جذبے کی صحت اور خامی کے متعلق سمجھانا شروع کیا۔ محبت کی پستیاں اور بلندیاں محبت کی شان اور اس کی تاریکیاں، بچیاں کچھ سمجھ سکیں یا نہیں، بہر حال کنول ٹھاکر نے اپنی کوششیں مرتے سمے تک جاری رکھی ہیں۔

اس نے کبھی لڑکیوں کے دلوں میں ایک ٹھکرائی ہوئی عورت کی طرح محبت کے خلاف نفرت پھیلانے پر توجہ نہیں کی۔ وہ تو محبت کے ازلی سرچشموں کو اس خس و خاشاک سے پاک کرنا چاہتی تھی۔ وہ محبت کو ایک ایسا جذبہ بنانا چاہتی تھی جس پر قومیں، ملک، نسلیں، انسان اور زمانہ فخر کرے کہ محبت کا نام صرف جذبات کی کشمکش ہو کر نہ رہ جائے، محبت صرف ہوسناکی نہیں، محبت مرد اور عورت کے تعلق سے ہی رقم نہیں، محبت تو ارفع اعلیٰ بلندی اور رفعت کا نام ہے، جس کو انسانیت کہتے

ہیں جو انسان میں نیکی، پھول میں خوشبو، چاند میں کرن اور سنگ میں شرر بن کر رہتی ہے۔ یہ نظام کائنات اسی محبت کے سہارے رواں دواں زندہ اور ترقی کر رہا ہے۔ رشما گپتا نے محبت کے مفہوم کو صحیح کرنے کے لیے تعلیم کا سہارا لیا۔ اس نے محبت کو غلط جگہ میں ڈھونڈا تھا، محبت تو پاکیزگی ہے جو ڈھونڈنے سے نہیں ملتی جو غلط ہی نہیں، اس لیے اس کی صحت اور سچائی ڈھونڈنے والے بھٹک گئے ہیں۔ محبت ہر انسان کے دل میں ہے۔ محبت کائنات سے اس تعلق کا نام ہے جس کے سہارے ہم زندہ ہیں۔ کسی کے ساتھ محبت کا وابستہ کرنا اسے قید کرنا ہے۔

کالج ایک سلطنت تھی اور کنول ایک رحم دل حاکم کی طرح دوسروں سے عزت کروانے اور حصول عزت کی تمام تر لوازم سے مزین ہو کر اپنے آپ سے آگاہ اس حکومت کو چلا رہی تھی۔ اس کی فتوحات کسی فوج کی مرہون منت نہیں ہیں، بظاہر عام لوگوں کی طرح وہ بھی ایک پرنسپل تھی، جہاندیدہ دوسروں سے واقف محکمے کی ایک رکن اعلیٰ اور تعلیم کی ترقی میں کوشاں۔ ایک وجود جسے دوسروں سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جس کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ ملک کے اس ناقص طبقے سے تھا جس کو لوگ عورتوں کی جائے پناہ کہتے ہیں۔ کسی قسم کی عورت ہو، ہوشیار، بے وقوف، پارسا، بدبخت، گم کردہ راہ اور راہ سیدھی چلنے والی ہے، چالاک یا بھولی، تعلیم اور اسکول اس کے لیے اپنی آغوش وا کیے موجود ہیں۔ زمانے کی ٹھوکروں سے پریشان عورتیں زمانے سے بلند بالا عورتیں کالجوں میں دیکھ لیجئے۔ اپنے آپ سے نالاں اس محکمے میں آ کر اپنے آپ کو بھول سکتی ہیں، اپنے کو بھولی ہوئی یہاں اپنے کو پا سکتی ہیں۔ مجرو زندگی گزارنے کے لیے اسکول ایک خول ایک پناہ گاہ کا کام دیتے ہیں۔ زمانے کی ستائی ہوئی خاوندوں اور بچوں سے بیزار اقتصادی بدحالی کے ہاتھوں گرفتار یہاں اپنے لیے ایک راستہ بنا سکتی ہیں۔ یہاں پستیاں ہیں، بلندیاں ہیں، نشیب و فراز ہیں۔ شہیدوں کی سی عقیدت اور محبت و جنگجو کے سے عزم اور ارادے سے بڑھنے والی کمزور عورتیں۔

مرد اپنے آپ سے انجمن ہوتے ہیں۔ دنیا کے سمندروں میں لہروں کی سی آمد و رفت سے وہ ملتے اور بچھڑتے رہتے ہیں۔ ہر پریشان حال مرد کو کہیں نہ کہیں سکون مل جاتا ہے۔ وہ محبتوں کے زاویوں سے نشیبوں سے اپنے گرد و پیش جھانک سکتا ہے مگر عورت کے لیے میدانِ تگ و تاز بہت ہی مختصر ہے۔ اگر عورت کو آزادی اور پناہ کی ضرورت ہے تو اسکول اور تدریس سے بڑھ کر کوئی پیشہ بہتر اور مکمل نہیں ہے

اور یوں کنول کے لیے بھی کالج ایک پناہ تھی یا کالج کے لیے ایک بہتر اور عظیم پرنسپل کی ضرورت کنول کماری ٹھاکر کی صورت میں پوری ہوئی تھی۔ بہر حال کنول ٹھاکر ایک مزدور عورت تھی جو رات دن اپنے پاؤں جما کر جان لڑا کر اپنے کالج کو دنیا کی بہترین درسگاہ بنا رہی تھی۔ یہ نہیں کہ اسے اس جنگ میں دوسروں کی مخالفت سے لڑنا نہیں پڑا مگر اس نے دشمنوں کی صفوں کے سامنے پسپا ہونا کبھی پسند نہیں کیا۔ میں نے کالج کے لیے ایک سپاہی کی سی مستعدی سے بات کرتے صرف اسے ہی دیکھا تھا۔ کنول سے پہلے اس کالج کی پرنسپل سے اکثر پارٹیوں اور میٹنگوں میں ملنے کا اتفاق ہوا تھا' ایک خوبصورت اور نازک عورت کی طرح وہ اپنے بے پناہ چمکیلے بالوں اور چہرے کی کشش سے آگاہ اپنی بلندی سے نیچے جھانک کر بات کرتی تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ عورت مغرب زدہ تھی، مگر پھر بھی اس میں ایک کمی تھی' اس کو دیکھ کر اس سے مل کر اس کی گفتگو سن کر کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ عظمت مجسم ہے۔ میں یہ بات کنول کے لیے بھی نہیں کہتا شاید یہ میری نگاہیں تھیں یہ ملنے والوں' دیکھنے والوں کی جانب داری تھی یا حقیقتاً وہ ایسی ہی تھی۔

مگر کالج کو اس نے پستیوں سے اٹھا کر بامِ عروج تک پہنچا دیا تھا۔

تعلیمی محکمے کے کام یوں بھی چلتے رہتے ہیں۔ مسز بھٹناگر اور اس کی طرح کے سینکڑوں انسان اس میں سما جاتے ہیں۔ تعلیم تو سمندر ہے جس میں بڑے نہنگ ہیں۔ خوبصورت مچھلیاں ہیں۔ چٹانوں کے ساتھ لپٹے رہنے والے سیپ بھی ہیں اور لہروں کے تلاطم کے ساتھ ابھرنے اور ڈوبنے والے صدہا انسان بھی ہیں مگر کنول کو اس کی فتوحات ان ذاتی خوبیوں کی وجہ سے نصیب ہوئیں جو دوسروں کی نگاہوں میں بالکل معمولی اور شاید خوبیوں کے نام سے شمار نہیں کی جا سکتیں۔ ایک نوکر سے لے کر ایک چپڑاسی سے لے کر کالج کی پروفیسروں تک کو اس سے ایسی شکایت نہیں ہوئی جو عام جگہ پر جھگڑے کا باعث بن سکتی ہے۔ وہ دوسروں کے جذبات کا احترام کیا کرتی تھی نوکر سے لے کر بڑے انسان تک اس کے سامنے اپنے آپ کو ایک کتاب کی طرح کھول سکتے تھے' بنا اس ڈر کے کہ وہ اس میں کوئی ایسی بات پڑھ لے گی جس کو چھپانا وہ پسند کریں اور اگر کنول نے کبھی ایسی ناگوار خامیاں دیکھی ہیں تو اس نے کبھی اس کا ذکر کرنا پسند نہیں کیا۔ شاید دوسروں کی خامیوں کو دیکھتے ہوئے وہ یہ کبھی نہیں بھولی کہ وہ خود ایک کمزور اور ناچیز انسان ہے۔ جس کی خامیاں کبھی بھی اس کے لیے ایک رکاوٹ بن سکتی ہیں۔

باوجود بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ حیران ہوں اتنے بڑے عملے کی افسرِ اعلیٰ ہونے کے باوجود اس میں غرور نہیں تھا اور غرور ایک ایسی خامی ہے جو بڑے بڑے اوتاروں کو، رشیوں، منیوں کو لے ڈوبتی ہے۔ اس کا سارا اسٹاف اس سے مطمئن تھا اور لوگوں کو مطمئن کرنے کا طریقہ اس نے اپنے تجربے اور بالغ نظری سے سیکھا تھا۔ وہ سوچتی ہوگی کہ اگر ان لوگوں کی جگہ میں ہوتی تو مجھ سے کیسا سلوک روا رکھا جاتا۔ میں کس طرح کام کرتی۔ شاید ہوا کی طرح کنول ٹھاکر بیک وقت اتنے وجودوں میں حلول کرتی تھی۔ اس کا مذہب مجسم ہمدردی کا مذہب تھا۔ اس کا راستہ دوسروں کے احترام کا راستہ ہے۔ دوسروں پر بھروسہ کرنے کا راستہ تھا۔ اور اسی لیے کسی نے کبھی اس سے دغا کرنے اور اندھیرے میں کھینچنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے کالج کے نوکروں سے دفتر کے ملازموں سے کبھی ذاتی کام نہیں لیے اور ذاتی ضروریات کو گھٹا کر اس نے اتنا کم کر لیا تھا کہ انہیں بغیر کسی مصیبت کے وہ خود بھی پورا کر سکتی تھی۔ نیرا نے مجھ سے کہا ہے کہ کنول کا سلوک اس کے ساتھ ہمیشہ ایک دوست کا سا رہا ہے۔ اس نے دوسرے ملازموں کو بھی انسان سمجھ کر ہمدردی اور محبت سے دیکھا ہے۔

لڑکیوں کی ماؤں اور رشتہ داروں کے ساتھ اس کا سلوک ہمیشہ دوستانہ رہا ہے۔ اس نے خندہ پیشانی سے مل کر ان کی شکایتوں اور اصلاح کے لیے ان کی ترکیبوں پر غور کرتی تھی۔ اس نے کبھی کسی کی بات کو ناممکن کہہ کر رد نہیں کیا، ٹھکرایا نہیں اور یوں سارے شہر کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔ لڑکیوں کے والدین کالج کو ایک اصل تربیت گاہ سمجھتے تھے۔ میں نے لوگوں کو ذاتی اغراض کی بنا پر بھی کبھی اس کی مخالفت کرتے نہیں سنا۔

ایک ماہر ڈاکٹر کی طرح وہ انسانی فطرت سے واقف تھی۔ لوگوں کی غلطیوں کو نظر انداز کرنے اور ان سے درگزر کرنے میں بھی اس کا جواب نہیں تھا۔ اس نے کھلی آنکھوں سے دیکھ بھال کر اپنے ماحول سے واقف ہو کر حکومت کی ہے مگر یوں کہ کبھی کسی کو احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ کسی کا حکم مان رہے ہیں۔ حکم دینے سے پہلے وہ ماننے والوں کے دل میں اپنے لیے احترام اور ایک ایسا جذبہ پیدا کر چکی ہے جس کا مطلب تھا کہ وہ کام بنی نوع انسان کے فائدے کے لیے ہو رہا ہے، وہ کام کسی کا ذاتی نہیں کسی کا خاص نہیں اور پھر بھی سب کا مقصدِ حیات وہی ہے۔ اس نے اپنی ذات کو ہر شے میں سے منہا کر لیا تھا اور اسی لیے وہ کالج کے ایک ایک پتھر میں سما گئی تھی۔ روشنی بن کر، شمس بن کر اور طاقت بن کر۔ لوگوں کا کام اسٹاف کی فرض شناسی کو وہ ہمیشہ ایک ذاتی احسان سمجھ کر اٹھاتی اور کسی کی ذرا سی ہمت تھوڑی سی محنت اور مروت کو بھی اس نے کبھی نہیں بھلایا۔ اس

نے باقی لوگوں کے لیے کام کو ایک تفریح بنا دیا تھا اور پھر بھی کام سب سے بڑا مقصدِ حیات مطمحِ نظر اور منزل تھا۔ وہ یہ بھی کبھی نہیں بھولی کہ زندگی میں سب طرف صفائی اور ہموار راستے نہیں مل سکتے، راہیں ناپید ہیں ایسے انسانوں سے بھی واسطہ پڑ جاتا ہے جو کسی رخ سیدھے نہیں ہو سکتے، جن کا واحد مقصد دوسروں کی راہوں کو الجھانا ہے مگر اس نے کبھی شکایت نہیں کی۔ اس نے کبھی ناکامی کے لفظ سے شکست نہیں کھائی۔ کوشش کرتے رہنا اور ہمیشہ بڑھتے رہنا ہی اس کا نظریہ تھا اور پھر بھی اسے معلوم تھا کہ کام مکمل کبھی نہیں ہو سکتا۔ روغن کرنا صیقل اور ادھڑی ہوئی زندگی میں پیوند لگاتے رہنا ہی ایک عزم کے ساتھ قدم بڑھانا ہی زندگی ہے۔

یہ صدا بڑھتے رہنے کا ایک ایسا نظریہ تھا، جس نے اسے کامیابی کے زینوں پر تیزی سے چڑھایا ہے۔ اور پھر بھی یہ کامیابی اس کی اپنی نہیں، محبت کے اس اصول کی تھی جس پر وہ عمل پیرا تھی۔ اس کی چھوٹی سی سلطنت میں کبھی کسی کو غیر مطمئن نہیں دیکھا گیا اور نیرا کے علاوہ بینا نے بھی تو ہمیشہ مجھے بتایا ہے کہ کنول ٹھاکر کے ہاں اصول زندگی بن گئے تھے، جیسے سانس اور نظر ہے۔ وہ بھلائی ہوئی روایتیں جو دوسروں کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھیں، اس کے لیے سب کچھ تھیں۔ مجھے یاد ہے بینا نے بتایا کہ ایک بار پرانی تاریخ پڑھاتے ہوئے شدت جذبات سے کنول ٹھاکر کلاس میں رونے لگیں۔ ان کے آنسو دیکھ کر سب آبدیدہ ہو گئے۔ شاید کنول اس لیے بھی سب سے زیادہ زندہ تھی کہ وہ گزرے زمانوں میں رہ سکتی تھی وہ گزرے زمانوں کو جذباتی طور پر اسی شدت سے محسوس کر سکتی تھی۔ اس کے دل کی نرمی ہی اس کی طاقت اور فتح تھی۔

محبت کے جس مذہب کو کنول نے اپنایا تھا، سادگی اور بالغ نظری کے جس اصول پر اس نے عمل کیا تھا، اپنے اور دوسروں کو سمجھنے کے لیے جو واضح لائن ہمیشہ اس کے سامنے رہی ہے، بے پناہ طاقت اور بڑھتے رہنے، کبھی نہ تھکنے کی جو راہ اس کے سامنے تھی، درگزر کرنے اور انصاف کرنے کی جو کشش اس کے کام میں تھی، ان سب نے مل کر اسے کامیاب بنایا ہے اور پھر بھی مجھے معلوم ہے یہ سب سے زیادہ اس کی ذاتی کشش تھی، جو اس کی کامیابی کا باعث ہوئی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا اس کے بعد لوگ کامیاب نہیں ہوں گے۔ اس کے بعد یہ لوگ اور کالج اس طرح کام نہیں کرے گا۔ لڑکیاں آج بھی کالج کے در و دیوار سے ویسے ہی مانوس ہیں، مگر یہ درس گاہ ایک ان تھک کام کرنے والی روح کی مرہونِ منت ہے۔ جس نے اس کے لیے ایک نام پیدا کیا۔ وہ نام بھی مٹ سکتا

ہے مگر کنول کماری ٹھا کر نہیں مٹ سکتی۔ کبھی نہیں۔

اس کی سیدھی سادھی خوبیاں ایک فن کار کی خوبیاں تھیں۔ کالج اس کے لیے فن کی طرح واحد ذریعۂ نجات تھا۔ اس نے اپنے آپ سے بچنے کے لیے اس فن کا سہارا لیا تھا، اپنے وجود کے اندھیروں سے بچنے اور روشنی کی طرف جانے کا واحد ذریعہ یہ کالج تھا۔ اپنے خوابوں کو وہ کسی نہ کسی طرح کالج کے آئینے میں دیکھ سکتی تھی۔ اصلاح کا جو بے پناہ جذبہ اس کے دل میں تھا، اس کی نمائش اور تکمیل کے لیے بھی اس نے ایک چھوٹی سی سلطنت کا سہارا لیا ہے۔

ایک فن کار کی طرح ہی اس نے کام کے اوقات اور آرام کے وقتوں میں فرق رکھا ہے۔ کالج اس کا جنون تھا مگر کالج اس کی صحت مندی کی نشانی بھی تھا۔ نیرا نے مجھے بتایا ہے کہ کنول کا مطالعہ بے پناہ تھا۔ ملنے والوں کو بھی معلوم تھا اگر چہ اس نے اپنا ذکر اپنے کاموں کا ذکر کبھی کسی سے نہیں کیا، اس کے باوجود بھی وقت فیصلہ اور سلیقہ کارکردگی یونہی نہیں آ سکتا۔ مشرق کے فن کاروں اور مصنفوں کے سب کام تقریباً اسے ازبر تھے۔ وہ ان تھک پڑھنے والی تھی۔ پڑھنا بھی ایک کام تھا، عیش نہیں تھا۔ وہ کتابوں میں ڈوب کر پڑھتی تھی۔ اس کے لیے کتاب بھی بھگوان کے سامنے جھکنے کی طرح ایک مقدس کام تھا۔ وہ مورتی کے چرنوں میں بھی تن من دھن سب تیاگ کر جھکتی تھی۔ وہ کتاب کو بھی یونہی پڑھتی تھی، اس نے یہ کبھی نہیں کیا کہ ٹیلی فون بھی سن رہی ہے، کتاب بھی دیکھ رہی ہے اور ستار بجانے کے لیے بھی جی میں سوچ رہی ہے۔ ہر کام اس کے لیے اپنی سچائی اور تقدس رکھتا تھا۔ کتابیں پڑھتے ہوئے وہ اپنے آپ کو بھول جایا کرتی تھی۔ کتاب اس کی جائے پناہ اور عیش گاہ تھی۔ کالیداس اور مہابھارت۔ بھگوت گیتا اور بڑے بڑے اردو انگریزی شاعروں کے اشعار اور ان کے فن کے شاہکار اس کے لیے ایک ہی اہمیت رکھتے تھے۔ میں نے شیکسپیئر کی ماہیت کی روح کو سمجھنے والا کنول کماری سے بڑھ کر کوئی نہیں دیکھا۔ اگر چہ میں نے کبھی اس سے بحث نہیں کی۔ کبھی اس کے مطالعے کے متعلق اس سے پوچھ نہیں سکا۔ اس سے پڑھنے والی لڑکیاں خدا جانے کتنی مطمئن ہوتی ہوں گی اور میرا اپنا خیال ہے کہ بینا کی طمانیت اور انسانیت سمجھنے کا طریقہ کنول کماری کا ہی تھا۔ بینا نے ہمیشہ کنول کو پرستش کرنے والے کی طرح چاہا۔ دوسروں میں اپنے لیے اتنی عقیدت پیدا کرنے کے لیے بھی ایک مکمل اور سچا فنکار ہونے کی ضرورت ہے نا۔

وہ تنہائی کی قیمت جانتی تھی، اس لیے سادھوؤں اور مہاتماؤں کی طرح وہ کبھی کبھار کالج کو بھول کر اپنے گرد کی دنیا کو بھول کر کمرے میں بند ہو جاتی۔ کتابوں اور ستار کے ساتھ، اپنے پربھو

کی مورتی اور اپنے دل کی تمناؤں کے ساتھ۔ شاید کنول کے دل و دماغ کی غیر معمولی تیزی اور سادگی' اس کی نگاہوں کی صفائی اور اس کے دل کی طہارت بھی' اس تنہائی کا نتیجہ تھیں۔ اس کی یہ طاقت کہ وہ اپنے گرد پریشانیوں کے ڈھیروں میں بھی سکون حاصل کر سکتی تھی' اس کے لیے اصل سرچشمۂ حیات بن کر رہ گئے۔

اور اس نے شاگردوں کو' اپنے ساتھ مل کر کام کرنے والوں کو' کالج کی زندگی میں حصہ لینے والوں کو بھی اپنے اس جذبے کا حصہ دیا تھا۔ کالج کا ایک ایک فرد اس طرح کام کرتا تھا گویا یہی کام اس کا آخری فن پارہ تھا' مگر کسی نے کبھی اندھا دھند اس کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی۔ ایک لڑکی بھی نکتہ چینی کرنے اور بگڑتے کام سنوارنے کے طریقے جانتی تھی۔ لڑکیاں کالج میں اپنی جگہ بنانے اور اپنے نام کا اپنے گھر کا اپناوقار رکھنے کے طریقے سیکھ گئی تھیں۔

پڑھنے اور کام کرنے میں ایک فخر محسوس کرنے کا جذبہ بھی کنول نے ہی لوگوں کو سکھایا ہے۔

میں جن لوگوں سے ملتا رہا ہوں' کبھی بات کرنے کا' کالج کی ترقی کے متعلق گفتگو کرنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے۔ ہمیشہ میں نے دوسروں کو بھی یہی سوچتے اور کہتے ہوئے پایا ہے کہ بادشاہ کے عزم اور ایک مزدور کی محنت کو ملا کر ایک فن کار کی تکمیل سے ختم کیا جائے تو کنول کماری ٹھاکر کا نام لینا چاہیے۔ اس نے کالج میں اپنے خوابوں کو یوں ملایا تھا کہ کالج کی تکمیل اور اس کی درستی' اس کی زندگی بن کر رہ گئی تھی۔ ایک فن کار اپنے دل کی ڈھکی چھپی تمناؤں کو اپنے فن کے ذریعے بے نقاب کرتا ہے۔ اس نے ادب پڑھاتے ہوئے لڑکیوں سے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ ''اپنے آپ کو بڑے لوگوں' عظیم مصنفوں اور گزرے ہوئے نامور لکھنے والوں کی صحبت کے قابل بناؤ۔'' پڑھنے کے جو طریقے اس نے لڑکیوں کو بتائے ہیں' ان پر عمل کر کے ہر انسان اپنے میں ایک فن کار کی سی خوبی پیدا کر سکتا ہے۔ بینا سے سن کر میں نے بھی ان طریقوں پر عمل کیا ہے مگر کنول کی سی شان کہاں سے پیدا کروں گا۔

نیرا نے کہا کہ میں نے کبھی کنول کو جاگتے اور نیند کے لیے بے تاب ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ ایک بچے کی سی معصومیت سے آنکھیں بند کرتی اور سو جاتی۔ ایک بار صبح میں نے اٹھ کر جب شکایت کی کہ مجھے ساری رات نیند نہیں آ سکی تو اس نے حیرت سے کہا' واہ یہ بھی کوئی مشکل ہے' آنکھیں بند کر کے اپنے بچپن کی باتیں سوچا کرو۔ ان دنوں کی جب تم گاؤں کی پنگھٹ پر پانی بھرتیں اور ماں کی مدد کے لیے گھاس پھوس کر لایا کرتی تھیں۔ جب تم اور بھائی کھیتوں سے بھٹے چرا

کرلایا کرتے اور آگ پر انہیں بھون کر کُرتے کے دامن سے پونچھ کر کھاتے تھے۔ بس ایسی ہی اچھی پیاری اور گزری باتوں کو یاد کر کے سو جایا کرو اور پھر جب بھی مجھے نیند نہیں آتی میں نے ہمیشہ یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ میں نے بچپن اور بیتی باتوں کو یاد کیا ہے۔

کیاریوں کو پانی دیتی مالی بابا کے ساتھ بیج بوتی اور پھولوں کو گلدانوں میں لگاتی، کنول ہر کام میں کھوسی جاتی تھی۔ وہ ہر شے سے جو اس کے گرد تھی ایک والہانہ عقیدت سے محبت کرتی تھی اور اس لیے سورج کی شعاعوں کی طرح محبتوں نے اسے گھیرے رکھا ہے۔ اس نے کبھی اپنا ذکر نہیں کیا۔ لوگوں کی باتیں زیادہ سنتی، اپنی کم کہتی اور کبھی کبھار تو مہینوں اس کے منہ سے 'میں' کا لفظ نہیں سنا گیا۔

اس کو کبھی کوئی تکلیف بھی نہ ہوئی ہو گی مگر اس نے اپنی خوشیوں کی طرح اپنی تکلیفوں کا ذکر بھی کسی سے نہیں کیا۔ شاید اسے اور کئی لوگوں کی طرح اپنے دکھ کے ذکر سے فرصت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ کبھی کبھار راتوں کو ستار کی تاروں کا لرزنا بتاتا تھا کہ آج ایک سچی پجارن اپنے پربھو کے چرن چھو رہی ہے۔ اس کی آواز میں سوز تھا یا ساز، لے تھی یا نہیں۔ میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پر نیرا کہتی ہے کہ "کنول کے گیتوں میں ایک ایسا سوز تھا جو دکھ کو سلاتا ہے، جو اسے جگاتا ہے اور جو بھگوان کے چرنوں میں آنکھیں بند کر کے بیٹھ کر سنا جا سکتا ہے۔" کاش کبھی میں وہ گیت سن سکتا۔ پر اپنی اپنی قسمت ہے نا۔ میں اتنا بھاگوان کہاں سے ہوں؟ شاید موسیقی اور مذہب اس کے لیے سرچشمہ حیات اور خوشیوں کے سپنے تھے۔ ہم لوگ اپنے پرماتما کو بھلا دیتے ہیں مگر اسے تو سوائے اس کے کسی کی شرن نہیں چاہیے تھی۔ اسے تو کسی کا بھروسہ نہ تھا۔

اس نے اپنے سے بڑے افسروں کے سامنے کبھی ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اس نے دنیاوی جاہ و جلال اور ترقی کی کبھی خواہش نہیں کی۔ اس نے شہرت اور نمود کی کبھی تمنا نہیں کی اور شاید اس لیے وہ سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور ترقی یافتہ تھی کیونکہ وہ ایک انسان تھی۔ اس نے دنیا کو برائیوں سے پاک کرنے کی کوشش کی ہے مگر عقل مند لوگوں کی طرح اسے معلوم تھا کہ دنیا میں خامی کہیں نہ کہیں ضرور رہے گی۔ اس کے خلاف ایک عزم سے لڑنا ہوتا ہے مگر اسے دنیا سے بالکل نکالنا ناممکن ہے۔ اس کا جینا ایک جہاد تھا اور اس کی موت بھی ایک شیر کی موت تھی۔ وہ انسانیت کے نام پر ان قوتوں سے لڑتی ہوئی مر گئی جنہوں نے دنیا کے حصے بخرے کر دیئے ہیں، جنہوں نے انسان کو انسان سے الگ کر دیا ہے اور جنہوں نے نیکی کو برباد کر دیا ہے۔

کنول نے پہلے پہل عورتوں کی اصلاح کرنے کے لیے شہر کی عام آبادی اور جلسوں میں بھی راہ و رسم بڑھائی اور آخر میں بڑے دکھ سے اس نے معلوم کیا کہ عورتیں اصلاح سے زیادہ نکتہ چینی کرنے کی طرف آمادہ ہیں۔ یوں بھی بے بیاہی عورت ان کے لیے ایک عجوبہ ہوتی ہے۔ مذہب کی رُو سے جس کا اخلاق قابلِ گرفت ہو سکتا ہے اور پھر سمندر پار سے آئی ہوئی کوئی بھی عورت جو ان کی اپنی بہن اور بیٹی نہ ہو' ان کے لیے موضوعِ سخن بن جایا کرتی ہے۔ مردوں کی طرح عورتوں میں ایک حس کم نہیں زیادہ ہوتی ہے۔ وہ بہت تیزی سے دوسروں کے سوال کو سوالیہ نشان بنایا کرتی ہیں۔ کنول کی باتیں' اس کے آداب' اخلاق اور اس کے راہ و رسم پر عورتوں کو اعتراض ہونے لگا۔ انہوں نے اس سے پوچھنا شروع کیا ''تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ تم کو اکیلی زندگی کاٹنی نہیں ہے' تم اکیلی پریشان نہیں ہو جاتی ہو' جب دوسرے ملک میں جا کر تم وہاں کے مردوں سے بات کرنا پڑی تو تم جھجک محسوس نہیں کرتی تھیں؟'' امارت کے سہارے بڑھنے اور ممتاز کرسیوں پر بیٹھنے والی عورتوں کو کنول کا ایک لڑکی ہو کر ایک عام عورت ہو کر ان سے بڑھنا اچھا معلوم نہیں ہوا۔ انہوں نے اسے اپنی پارٹی بازی میں گھسیٹنا اور گھروں کے رونے' اس کے سامنے رونا شروع کر دیئے۔ چند دنوں میں ہی وہ ان سب سے بیزار ہو گئی۔ یہ نہیں کہ وہ محنت سے انہیں بدل نہ سکتی تھی بلکہ یہ کہ اس نے سوچا کہ ایک فنکار کے لیے زندگی بہت ہی کم ہے اور کام زیادہ ہیں۔ نئی پود' آنے والی نسل میری توجہ کی مرہونِ منت ہے۔ یہاں عورتوں میں جو نتائج بہت وقت لگا کر بھی حاصل نہیں ہو سکتے' وہ لڑکیوں میں کم وقت لگا کر حاصل ہو سکیں گے اور اس لیے اس نے اپنی تمام تر توجہ کا مرکز کالج کو بنا لیا۔ گاہے گاہے وہ عورتوں کے جلسوں اور پارٹیوں میں بھی شرکت کرتی رہی مگر اب اس کا جانا کم ہو گیا تھا' وہ ان سے ملتے ہوئے اپنی خوبیوں کو ہی اپنے نقص تصور کرنے لگتی۔ اس کا حسن اس کی عادتیں اس کی طمانیت اس کی خوشی سب ہی اس کی پیٹھ پیچھے اس کی خامیاں بن جاتے۔ یہ بگاڑ جو عورتوں میں تھا صدیوں کی وراثت تھی۔ وہ گزرے زمانے کو غلط اور قابلِ اصلاح نہیں سمجھتی تھی۔ پھر اس کا خیال تھا۔ پچھلے وقتوں سے ورثے میں صرف خامیاں لی گئی ہیں' خوبیاں نہیں اور وہ روایتوں کے سہارے اپنی بچیوں میں خوبیاں پیدا کرنا چاہتی تھی۔ انفرادی طور پر ہر ایک اس کی کوششوں کو سراہتا تھا مگر اجتماعی طور پر عورتیں اسے ناپسند کرتی تھیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ اس سے اور بھی جلتا تھا۔ وہ عورتیں جو تعلیم کے سہارے مردوں سے قبولیت اور شہرتِ عامہ کی سند حاصل کرنا چاہتی تھیں' کنول کے رویے کو دیکھ کر جل جاتیں' پھر تعلیم کا مقصد بھی تو غلط ہو گیا تھا۔ تعلیم

عورت کو آزاد بنا دے گی، اسے ایک شتر بے مُہار بنا دے گی۔ اس سے اس کی نسوانیت چھین لے گی۔ یہ تو کبھی ہندوستانیوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا، مگر اب وہ اس کڑے دور سے گزر رہے تھے، تعلیم یافتہ لڑکیاں مذہب کی قید کے بغیر دوسرے مذہب کا احترام کیے بنا شادیاں کر رہی تھیں۔ ہر روز نئے معاشقے اخبار میں بڑے بڑے حاشیوں میں چھپتے۔ عزت کا تحفظ، تعلیم یافتہ طبقے میں ایک عام بات بن کر رہ گیا۔ عورتوں نے آزادی پا کر گل فشانیاں شروع کر دی تھیں۔ اپنے آپ کو بلند اور باوقار بنانے کی بجائے عام اور سستا بنا لیا تھا۔ عورتیں ملکی تحریکوں میں بھی حصہ لینے لگی تھیں۔ آزادی کے جلوسوں کی قیادت بھی کرتی تھیں۔ مردوں کے دوش بدوش بھی چل رہی تھیں۔ بظاہر لوگ ترقی کی اس رفتار سے مطمئن بھی تھے مگر متوسط طبقہ ہر ملک کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے، چیختا چلاتا اسی روش پر جا رہا تھا، امارت تو عیبوں کو ثواب اور پردہ بنانے کی جرأت کرسکتی ہے مگر کبھی کبھار جب عام زندگی سے اٹھ کر بھی لوگ نقل کرنے لگے تو ملک گھبرا گیا۔ پر گھبراہٹ سے کیا بنتا تھا۔ پھر کنول نے بہت حیرت اور بڑی تکلیف سے دیکھا تھا کہ لڑکیاں ترقی تو کر رہی تھیں، مگر وہ اپنے آپ سے بڑھ کر قدم رکھ رہی تھیں۔ اپنے کو نسوانیت کے اس زیور سے خالی کر رہی تھیں، جو ان کے لیے سب سے بڑی فتح اور خوبی ہے۔

عشق اور محبت تو بڑے پرانے بہت دیرینہ جذبے ہیں مگر نئے جاگتے ہوئے غلام ہندوستان میں یہ جذبے مغرب کی تقلید میں اتنے بھونڈے بن کر رہ گئے تھے۔ عام زندگی کی بے اطمینانی یہ کہہ رہی تھی کہ سکون کی ضرورت ہے۔ خاندان کا مرکز تباہ ہو رہا ہے۔ گھروں میں جو چین اور سکھ مرد کو سارے دن کی مشقت کے بعد مل جاتا تھا، وہ مفقود تھا۔ عورتیں گھروں کو واپس جائیں۔

عورتیں شادی سے بھاگتی ہیں اس سے ان کی آزادی سلب ہوتی ہے۔ مگر عورت کی آزادی مرد کے مقابل گھر کی سلطنت کو سنبھالنے میں ہے اور کنول نے تہیہ کر لیا کہ وہ عورتوں کو چھوڑ کر لڑکیوں کی اصلاح کرے گی۔ وقت کم ہے اور سارے کام مکمل نہیں ہو سکتے۔ بہت کچھ حاصل نہیں کیا جا سکتا، مگر جو تھوڑا بہت موقعہ ہے، اس سے فائدہ اٹھانے سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے کالج کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ اس نے انسانیت اور صحیح شاہراہوں کے دروازے کھول کر سامنے رکھ دیئے۔ کنول کے کالج میں تعلیم پائی ہوئی لڑکیاں ہمیشہ ان روایات کی حفاظت کریں گی۔ اس میں سے کوئی بھی غلط راستے پر اندھادھند نہیں چلے گی۔ ان میں سے کوئی بھی ایسے

اقدامات نہیں کرے گی، جس سے کالج کے نام پر دھبہ لگے۔ کیونکہ کالج ان کا غرور ان کا مشترکہ ورثہ ان کے ماضی کا جزو لاینفک اور پھر بھی کنول کماری ٹھاکر! کا ہے۔ نروپما نے بینا کو بیاہ دیا ہے۔ بینا نے شادی کی مخالفت نہیں کی۔ اس کے خیالات کو مانجھنے اور سنوارنے کا کام کنول کا ہے۔ ایک دماغ کی تربیت ایک نسل کی تربیت ہے۔ ایک خاندان کی تربیت ایک معاشرے کی تربیت ہے کیونکہ افراد اور خاندان معاشرے کی اساس اور اس کا عمل ہیں۔ کنول نے جانے کتنی نسلوں کو درست کیا ہے۔ اس کا کتنا عظیم احسان ہم پر ہے۔ کالج پروفیسروں اور لڑکیوں کے لیے ہمیشہ ایک گھر بنا رہا ہے، جس کی اصلاح اور درستی ان سب کا کام تھا، وہ لڑکیوں کو مقالات افلاطون لکھنے کے قابل بنانا نہیں چاہتی تھی، یہ کام قدرت نے عورت کے ہاتھ میں نہیں سونپا مگر کسی طرح وہ انہیں معاشرے کا نصف بہتر بنانے کے حق میں تھی۔ اس نے خود خواب دیکھے ہیں مگر انہیں خوابوں کی دنیا سے نکال کر عملی بنایا ہے۔ چھوٹے چھوٹے خوابوں کا احترام اس نے کیا ہے۔ بینا اپنی سسرال سے اپنی تعلیم کے باوجود ایک سگھڑ اور سلیقہ شعار بہو کا خطاب لے چکی ہے اور یہ سلیقہ اسے کالج کے کاموں سے آیا ہے۔ اس نے اپنی زندگی اور وقت کا بہترین حصہ وہاں گزارا ہے۔ وہ آج بھی سسرال سے آ کر مجھ سے کنول کی بات کرے گی تو کہے گی: ''آپ کی دوست کی یہ بات ہے بابا۔'' مگر مجھے معلوم ہے وہ اب کنول کا نام لینے سے بھی گھبراتی ہے۔ شادی کے وقت اس کے آنسو گھر چھوٹنے سے زیادہ کنول کے غیر حاضر ہونے کے تھے۔ کنول کے اس دنیا سے چھپ جانے کے تھے۔ وہ جتنی بے قراری سے رو رہی تھی، وہ نروپما کے لیے نہیں وہ میرے لیے بھی نہیں تھے۔ مجھے پتہ ہے میں بہت وثوق سے کہہ سکتا ہوں، وہ اس لمحے اس محرومی پر رو رہی تھی کہ وہ دلہن بنی ہے اور اس کی محبوب پرنسپل اسے ایک پودے کی طرح پروان چڑھانے اور اس سے خوش ہونے والی کنول زندہ نہیں ہے مگر میں کہتا ہوں جب تک کالج کی ایک لڑکی بھی زندہ ہے، جب تک کالج کی ایک اینٹ بھی سلامت ہے، کنول مر نہیں سکتی۔ رات کی سیاہی میں دن کے اجالے میں نہ جانے کتنے ہیں جو چپکے چپکے اس کا نام لیتے ہوں گے۔ مرنے کے بعد وہ مردوں کے لیے ایک ایسی دیوی بن گئی ہے جس کی پرستش ممنوع قرار دے دی گئی ہو مگر پھر بھی اس کا احترام ابھی ملک اور اس کی رگ رگ میں موجود ہے اور رہے گا۔

کنول کو کتنے لوگوں نے چاہا ہے۔ کنول کی شخصیت سے کتنے لوگ متاثر ہوئے ہیں۔ کتنوں نے اس سے جل کر اس کی مخالفت کی ہے۔ کتنے اس کے دوستوں کی فہرست میں اس کے

قریب ہونے کے لیے بے تاب رہے ہیں۔ کتنوں نے اس کی گزرگاہوں کی خاک کو ماتھے پر چڑھایا ہے۔ کتنے لوگ اس کے ہاتھ کے ایک لمس کے لیے بے قرار تڑپتے رہے ہوں گے۔ نہ جانے کتنے ہیں جو اپنے مرضوں سے شفا پا گئے۔ کتنوں نے اس کی نگاہوں سے سکون اور ٹھہر کر دھیرج سے انتظار کرنے کا سبق سیکھا ہو گا۔ وہ تو ایک درس تھی۔ درسِ عبرت نہیں اور پھر بھی ہم میں سے سب وہ سبق نہیں سیکھ سکتے۔ صرف اس پر ایک نظر کر سکتے ہیں کیونکہ وہ آسان نہ تھی۔ وہ مشکل نہ تھی۔ وہ پردوں میں پوشیدہ نہ تھی۔ اس کی ساری زندگی ہمارے سامنے تھی۔ ہماری ساری نسلیں اس کا احسان مانتی رہیں گی۔ وہ جمنا کے کنارے کیا ایک دوسرا تاج ہے' محبتوں کا مقبرہ۔

مسز بھٹنا گر اس کی ملاقات کے بعد کنول کے ملنے والوں اور اس کے بعد دوستوں میں شمار ہونے لگیں۔ وہ کنول پر ہزار جان سے فدا تھیں اور اس کے باوجود ہماری طرح انہیں بھی اپنا فاصلہ معلوم تھا۔ انہوں نے کبھی اس کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے اپنی ظاہری شان و شوکت اور زرق برق لباس کی پسند کو چھوڑ دیا۔ انہوں نے مردوں سے بھی کنارہ کشی کر لی۔ وہ بھگوان کی سچی بھگت بننے کے لیے اب کنول کے ستار سے دل بہلایا کرتیں مگر انہوں نے کبھی اس کے بھگوان کے سامنے جھکنے کی جرأت نہیں کی۔ یہ شاید فاصلہ تھا جس کو پاٹنے کی کوشش نہ کر سکیں۔ انہوں نے ایک بار کنول کے اعزاز میں ایک دعوت کی تھی جس میں ہم سب مدعو تھے۔ وہ پہلی مسز بھٹنا گر' جس کا ذکر نیرا نے کیا ہے' مجھے کہیں دکھائی نہیں دیں۔ اس دعوت میں ڈاکٹر بھٹا چاریہ نہیں آئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا بھی۔ پر ہنس کر چپ ہو رہیں ان کا کہنا تھا کہ دعوت کنول کے اعزاز میں ہے اور کنول مصر تھی کہ اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی وجہ سے اتنی عزت افزائی کی جائے۔ اسے سخت شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے دعوتوں کے موقعوں پر بھی خاص لباس زیب تن نہیں کیا۔ اس میں کالج کی کنول کی سادگی ہوتی تھی۔ میں نے کبھی کسی موقعہ پر بھی اسے ان لوازمات سے مزین نہیں دیکھا جن کو عورتیں غازہ اور لپ اسٹک کے نام سے یاد کرتی ہیں۔ شاید اس کی اپنی شان ان سب چیزوں سے بالا اور بڑھ کر تھی یا شاید اس کے اپنے اصول تھے کہ اس کی روح کی دوشیزگی ان سب باتوں سے متنفر تھی۔

میں یوں بھی اپنی مصروفیت اور اس اصول کی بنا پر کہ میں کبھی بن بلائے وہاں گیا نہیں۔ کم کم ہی ڈاکٹر بھٹا چاریہ سے کنول کے ہاں ملا ہوں۔ مہینوں بلکہ سالوں میں یہ اتفاق ہوتا تھا اور

پھر یہ اتفاق اور بھی کم ہونے لگا۔ وہ سرکاری آدمی تھے۔ کانگریس کے ایک سرگرم کارکن، میں ہندو ہونے کے باوجود غیر جانب دار اور سیاست کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی۔ میرے اخبار نے کبھی پروپیگنڈے کے تحت کسی ایک فرقے کی مخالفت یا مطابقت نہیں کی ہے۔ میرے ہاں کا ایک ایک فرد اس اصول پر سختی سے کاربند تھا۔ میرے دفتر میں کام کرنے والے ہندو مسلمان نہیں محض انسان تھے۔ میں نے یہ بات بھی کنول سے سیکھی تھی۔ ان دیواروں سے ان حدود سے بلند ہو کر ہم لوگ صرف بنی نوع انسان کی خدمت کرتے تھے اور میں فخر سے اس بات کا ذکر کرتا ہوں، اسی لیے میں ایک بہت کامیاب انسان نہیں ہوں۔ فطرتاً میں سیاہی آدمی ہوں نہیں، اس لیے میرا اخبار بھی سیاہی سے زیادہ ایک ادبی روزنامہ بن گیا۔ میرے ایڈیٹر نے اخبار کے رپورٹر تک نے زبان اور محاورے کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔ ہم نے اس زبان کا احترام کیا ہے جس کو ہمارے بزرگوں نے خونِ جگر سے پرورش کیا تھا۔ میں کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر نہیں جھکا ہوں۔ اسی وجہ سے فسادات کے دنوں میں جب مجبوراً اخبار کو دو میں سے ایک حد کی طرف بڑھنا تھا، میرا سارا عملہ خاموش ہو گیا۔ ہم نے اخبار کو ادبی اخبار میں تبدیل کر دیا اور میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے اور میرے دفتر کے ملازموں نے مل کر جن روایتوں کو تعمیر کیا تھا، وقتی تقاضے کی وجہ سے ہمیں انہیں مسمار کرنا نہیں پڑا۔ ان دنوں جب ادب بھی زہر آلود مسموم اور فسادی ہو گیا تھا ہم رک کر سانس لینے لگے مگر ہم نے انسان سے ہندو اور مسلمان ہونا پسند نہیں کیا۔ میرے لیے آئندہ زمانے میں کامیابی اور ترقی کے کوئی راستے نہیں ہیں کیونکہ دراصل میں کسی طبقے کو کسی مذہب کو نہیں سراہتا۔ میرا مذہب انسانیت ہے۔ میرا مذہب بحر شمالی سے لے کر آسٹریلیا تک کسی نہ کسی زبان میں انسانوں کی زبانوں اور دلوں سے روز ظاہر ہوتا ہے۔ میرا مذہب ہر ایک کے سینے میں روشنی کی چنگاری، کرن اور شعاع بن کر رہتا ہے اور اس انسانیت پر یقین رکھنے کے باوجود مجھے معلوم نہیں۔ انسان کو کیا ہو گیا تھا۔ انسان کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا بالآخر مجھے اس بات پر یقین کرنا پڑے گا کہ انسانیت کی چنگاریاں بجھ گئی ہیں اور پھر بھی میں مایوس نہیں ہوں کیونکہ مایوس نہ ہونا کام کرتے رہنا اور ٹھہر کر نتائج کا انتظار کرنا یہ باتیں میں نے کنول ٹھاکر سے سیکھی ہیں۔ پر کنول ٹھاکر آج کہاں ہے؟ کنول ٹھاکر بجھتے ستاروں کی روشنی اور ٹمٹماتی تاریکی میں، میں یہ سوال اپنے سے ہی کہہ سکتا ہوں؟

انسانیت کا یہی درس جو اس نے اپنے گرد رہنے والے لوگوں کو دیا ہے، فضا مکدر ہو رہی تھی۔ ہر طرف تباہی تھی۔ ہر طرف بربادی تھی۔ اخلاق کے نظریے محبت کے طریقے پرانی قدریں

سب تباہ ہو رہی تھیں۔ انسان تیزی سے ہندوستان میں ہندو اور مسلمان بن رہے تھے۔ بھگوان کی مورتی کے سامنے جھکنے والے نفرت کا پرچار کر رہے تھے۔ خدا کی حمد وثنا کرنے والے اور مسجد کے بلند میناروں پر چڑھنے اور اذانیں دینے والے زہر گھول رہے تھے۔ انسان سانپ بن رہے تھے اور ایسے میں اندرونی دباؤ کے باوجود کنول ٹھاکر ایک انسان ہی رہی۔ اس نے ہندو اور مسلمان بننا گوارا نہیں کیا۔ اس نے اپنے کالج کی چار دیواری میں مذہب کے زہر کو پھیلنے نہیں دیا۔ جن دنوں فسادات سے پہلے یہ بیج بویا جا رہا تھا' پاکستان کے خاکے اور ہندوستان کے نقشے لیے لیے لیڈر ورکر گلی گلی کوچے کوچے گھوم رہے تھے' جلسے کر رہے تھے۔ کنول ٹھاکر کو بھی کہا گیا کہ وہ اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے کچھ کرے۔ نیرا کہتی ہے کہ "آنے والے اس دن بیٹھنے والے کمرے میں بیٹھے بہت دیر تک بحث کرتے رہے۔ بڑے بڑے اوتاروں کا حوالہ دے کر بات کرتے رہے اور صرف اس دن" نیرا کہتی کہ کنول کو میں نے غصے اور حقارت سے بات کرتے سنا۔ اس نے آنے والوں سے کہا "کوئی ایسا حوالہ لائیے' کوئی ایسی بات کیجئے جس سے انسان کو انسان کے خلاف کیا جا سکے۔ میں ہندو اور مسلمان میں یقین نہیں رکھتی۔ میرے لیے جو لڑکیاں کالج میں ہیں وہ ایک امانت ہیں۔ میں اس امانت میں اپنے اصول میں کوئی تبدیلی کرنا نہیں چاہتی۔ آپ مجھے جذباتی باتوں سے نہیں خالص دلائل سے قائل کیجئے۔ میں مان جاؤں گی۔ کیا بھگوان کرشن نے یہ کہا ہے کہ وہ محبت کو نہیں دیواروں کو چننے کے لیے آئے ہیں۔ کیا بدھ بھگوان نے یہ کہا ہے آپ بڑے لوگوں کی بات کہیے۔ میں ماننے کو تیار ہوں مگر آپ ہندو مت کے نام پر مجھ سے کچھ نہیں کروا سکتے۔ یہ زہر میرے ہوتے ہوئے اس جگہ نہیں پھیل سکتا۔" وہ لوگ ناامید ہو گئے۔ وہ بات کرنے' دلیل دینے میں اس پڑھی لکھی عورت سے جیت نہیں سکتے تھے۔ اس کو اپنی ہار بھی اچھی نہیں لگی۔ سچ میں ایک ظالم قوت ہے۔ سچ زہریلا ہوتا ہے بلندی کو یہ زہر صحیح راہ پر لگا دیتا ہے۔ مگر طبیعتوں کا سفلہ پن اس بلندی اور آگ کو برداشت نہیں کر سکتا اور پرچار کرنے والے تو اپنے آپ کو اتنا مکمل سمجھتے ہیں کہ ان میں کسی طرح کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ وہ تو صرف جذبات سے انسان کے بودے پن کو برانگیختہ کرنے کھڑے ہوتے ہیں' انہیں دلائل سے کیا غرض ہے اور اس لیے سیاسی حلقوں میں' مذہبی حلقوں میں کنول ٹھاکر کی مخالفت ہونے لگی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب انقلاب ابھی فضا میں تھا مگر ہم اس کا خیر مقدم کرنے کو بالکل تیار نہ تھے۔ دو مختلف ملکوں کا تصور ہمارے ذہن میں تھا مگر اس کے خاکے میں رنگ کب

بھرے جاسکیں گے۔ یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا۔ مسلمان اور ہندو ہمسایوں کی طرح قریب قریب اور پھر بھی ایک بے چینی سے پریشان تھے۔ ہر روز بحث ہوتی اور محلوں، گلیوں اور شاہراہوں، ہوٹلوں کا موضوعِ سخن دو ملکوں کا خواب بن گیا۔

ان دنوں بینا نے مجھے بتایا کہ کنول ہر صبح لڑکیوں کو سمجھاتی کہ تم ملک کی صحیح بیٹیاں بنو۔ تم اس زہر کو پھیلنے سے روکو۔ ہم محض اور صرف انسان ہیں۔ خدا بھی اتنا ہی رحیم و کریم ہے جتنا بھگوان کرشن ہے۔ بھگوان بھی وہی پیغام لائے تھے جو مسلمانوں کے مذہب کی بنیاد ہے۔ مذہب کا رنگ جدا ہے مگر بنیادی اصول وہی ہیں۔ مورتی اور کعبے میں وہی شکتی براجمان ہے۔ محبت ہی زندگی ہے۔ انسان محبت کے مذہب کی تبلیغ کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ پرماتما بھی وہی ہے جو خدا ہے۔ انسان کی ایک دوسرے سے محبت اور لگاؤ دراصل انسانیت کا تقاضا ہے۔ سب مذہب سچ ہیں جو مذہب نفرت کا پرچار کرے، وہ جھوٹ ہے۔ اس میں آتما اور روح کو بچانے کی کوئی اصلیت باقی نہیں رہتی۔

مگر ان سب باتوں کے باوجود انقلاب نزدیک آ رہا تھا۔ ملک میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ ہر ایک اپنی جگہ پریشان تھا۔ ہزاروں سالوں سے ملک میں لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ خونریزی اور بے اطمینانی کا خواب بھی کبھی کسی نے نہیں لیا۔

انہی دنوں ڈاکٹر بھٹاچاریہ نے کنول سے کہا تھا ''کنول کماری ٹھاکر اتنی مرتی مارتی دنیا میں کسی مرد کی شرن کے بنا کس طرح جی سکو گی۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے اور کیا ہو جائے گا۔ کیوں نہیں شادی کر لیتیں'' اور کنول نے اس بات کو بھی ڈاکٹر صاحب کی تک بندی سمجھ کر کہا تھا۔ ''بات تو ٹھیک ہے۔ پر یہ سوال ہے کون سا مرد میری شرن بنے گا'' اور ڈاکٹر بھٹاچاریہ نے جو کنول کے خیالوں کے متعلق اس کے بڑے بھیا اور باوا کے برابر ہوں گے اور یہ نہیں تو کم از کم اسے سمجھتے اور ایک عورت جانتے ہوں گے، اتنی دیر ملنے ملانے کی وجہ سے اس کا احترام کرتے ہوں گے۔ سولہویں صدی کے انگریز جانبازوں کی طرح جھک کر ایک گھٹنا ٹیک کر اور ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر کہا تھا: ''میں حاضر ہوں'' کنول پر ایک بجلی گر گئی۔ وہ وہاں سے ہل نہ سکی وہ ہنس نہ سکی۔ وہ اپنا ہاتھ تک نہ ہلا سکی اور ڈاکٹر بھٹاچاریہ جن کی بیٹیاں کنول کے کالج میں پڑھتی تھیں، اسی طرح گھٹنا ٹیکے اپنے سینے پر ہاتھ دھرے کنول کو دیکھتے رہے۔ پھر نیرا اندر آ گئی اور ڈاکٹر صاحب تیزی سے اٹھ کر اپنی

جگہ جا بیٹھے۔ وہ بہت کھسیانے ہو رہے تھے۔ نیرا چائے لائی تھی۔ وہ کنول کو بھی جانتی تھی۔ وہ ڈاکٹر صاحب سے بھی واقف تھی۔ اس نے چائے کے برتن رکھ دیئے اور دیر تک بے سدھ چپ چاپ بیٹھی کنول کو دیکھتی رہی۔ کنول کی آنکھیں جیسے پتھرا گئی ہوں۔ ایک ہی طرف دیکھتے دیکھتے ان کی روشنی بھتم سی گئی تھی۔ نیرا نے اتنے سالوں میں پہلی بار کسی مرد کو کنول کے سامنے گھٹنا ٹیکے ایک چاہنے والے کے انداز میں بیٹھے دیکھا تھا۔ پھر وہ گھبرا گئی اور اس نے پاس جا کر کنول سے پوچھا ''میں چائے بنا دوں'' ڈاکٹر صاحب کے لیے۔ کنول کو جیسے ہوش آ گیا ہو۔ وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھنے کے کمرے سے اندر آ گئی اور پھر کسی نے ڈاکٹر بھٹاچاریہ کو کنول ٹھاکر کے کمرے میں نہیں دیکھا۔ ان کی موٹر کبھی اس دروازے کے سامنے کھڑی نہیں ہوئی۔

اور یوں بھٹاچاریہ بھی رخصت ہوئے۔ کنول نے پھر کبھی باتوں کے دوران میں بھی ان کا نام نہیں لیا۔ وہ اس کی زندگی سے اس کے خیالوں سے اس کی یاد سے یکسر نکل گئے۔ میں نہیں جانتا جیسے نیرا نہیں جانتی کہ اس کی زندگی کے تجربات کیا ہیں۔ مردوں کے لیے اس نے وہ دیوانہ جذبہ کبھی اپنے دل میں محسوس نہیں کیا جس کو عشق کہتے ہیں؟ یا اگر اس نے کبھی اپنے دل میں کسی کے لیے محبت محسوس کی ہے کبھی وہ لگاؤ تو کیا اس نے اس محبت کو انسانیت اور اس عظیم چکر میں لگا دیا ہے جس کو وہ انسان پرستی کہتی تھی۔ اس کے گرد تھا ہی کون؟

کرشنا کی محبت کا انجام اس نے دیکھ لیا تھا۔ شوبھا ایک دھتکاری ہوئی روح کی طرح اپنے گُنوں کی آگ میں جلتی رہتی تھی۔ نیرا نے محبت کے لیے گاؤں کی زندگی امن وسکون تج دیا تھا۔ ہر روز اس کے سامنے تماشے ہوتے تھے۔ عورت اور مرد کی محبت ازلی ہونے کے باوجود اتنی عام ہے کہ کنول ٹھاکر نے کبھی اس کی طرف توجہ دینے کی کوشش نہ کی ہوگی اور پھر بھی کنول کا مذہب صرف محبت کا مذہب تھا۔ وہ ایک سایہ دار درخت بن کر ہم سب پر چھائی ہوئی تھی۔ راجندر نے اس کی خاطر اپنا مستقبل تج دیا یا کسی مرد میں وہ ہٹ نہیں تھی جو اس کو جیت سکے۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو اس سے بلند اور عظیم بن کر اس کے قدموں کی ٹھوکر کھانے کے لیے اس کے چرنوں میں جھکتا۔ کوئی ایسا نہ ہوا جو اسے کہہ سکتا کہ اگر تم مجھے ٹھکرا دو گی تم مجھے بھلا نہیں سکو گی۔ راجندر نے یہ مصیبت کی تو تھی مگر وہ بھی اس کو دیکھتے ہی ہار گیا یا یہ وقت کے تقاضے تھے۔ ہماری ساری زندگی بدل رہی تھی اور کنول مصروف تھی۔ اسے اپنے آپ کا ہوش نہ تھا۔ اسے صرف یہ احساس تھا کہ دنیا بے اطمینانی اور مذہب کے نام پر جدا ہونے والی ہے اور وہ اس وقت کو دور دھکیلنے اس سے اپنے اور کالج کو بچانے

کی کوشش میں اپنا آپ بھی بھلا بیٹھی۔

اور نہ جانے اس کے سر میں کون سا درد چھپا تھا کہ وہ ساری دنیا پر چھا جاتی تھی۔ اس کی روح کے آہنگ میں کون سے نغمے تھے۔ کنول یہ گیت کہاں سے چرا لائی تھی۔ اس کی لاتعلقی کو نفرت نہیں کہا جا سکتا۔ وہ کوئی اور رنگ ہو تو ہو، پر نفرت نہیں۔ جو عورت مجسم محبت بن سکتی ہے وہ کبھی بھی نفرت نہیں کر سکتی۔ وہ مردوں سے نفرت نہیں کرتی تھی۔ ورنہ راجندر کو کبھی وہ خط لکھنے کی ہمت نہ ہوتی۔ کبھی ڈاکٹر بھٹا چاریہ اپنے گھٹنے ٹیک کر اپنے دل کا مدعا نہ کہہ سکتے۔ محبت کبھی ایک ذلیل جذبہ نہیں ہو سکتا، ورنہ کنول ٹھاکر اس کو اپنا مذہب نہ بنا لیتی۔ اگر وہ دھرم کے خلاف ہوتی تو وہ کرشن بھگوان کی مورتی کو کبھی ایک مشعل بنا کر اس کے چرنوں میں نہ جھکتی۔ کبھی کسی کی شرن نہ چاہتی۔ یا پھر وہ مذہب اور محبت کے نام سے اتنی سرشار تھی کہ اسے اپنی محبت کو مکمل کرنے کے لیے کسی مرد کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اگر کنول اور زندہ رہتی۔ شاید اس کی زندگی کے اصول بدل جاتے۔ وہ ایک سفلی ایک جذباتی اور شخصی محبت میں یقین کرنا شروع کر دیتی۔ ان بڑے آدمیوں کی طرح جو ایک عمر تک اپنے سہارے اپنی تنہائیوں اور اپنے فن کے سہارے دنیا سے دور رہتے ہیں، مگر پھر اس عام چکر میں پڑ جاتے ہیں اور اسی زندگی کی طرف واپس آتے ہیں۔ کرشنا اس کی دوست تھی۔ وہ سب سے زیادہ نندلال کی ماں تھی۔ اور اپنے خیالوں میں پڑی عورت کب تک کسی دوسری عورت کا سہارا بن سکتی ہے، جس طرح اور بہت سی باتیں ایک راز رہیں گی، اسی طرح کنول کے دل کے گرد کی دنیا بھی ایک راز رہے گی مگر اس راز کے متعلق اپنا دماغ کھپانے سے فائدہ۔ کنول ٹھاکر واپس نہیں آ سکتی۔ کیونکہ وہ میرے اور تمہارے خیالوں سے زیادہ جذباتی تھی۔ لوگ کسی زندہ محبوب سے اپنا دامن جوڑتے ہیں اور کنول ٹھاکر نے ایک خیالی محبوب سے اپنا ناتا جوڑا، جس کو وہ کبھی محبت کا اور کبھی انسانیت کا نام دیتی رہی۔

نیرا بھی اس کے اتنے قریب نہیں تھی۔ کوئی بھی اس کے قریب نہیں ہو سکا۔ کرشنا نے کبھی کبھار اس خول میں گھسنے کی کوشش کی ہے، جس کو وہ کنول کی ہٹ دھرمی کہتی تھی۔ ”کیا فانی محبتیں اور دل لگاؤ بے فائدہ ہوتے ہیں؟“ میں نے بینا سے اکثر پوچھا ہے مگر بینا کو کیا معلوم تھا اور پھر اپنے محبوب کی خامیاں کون دیکھتا ہے۔

کوئل برہن ہے اور برہن جمنا کے اس پار کوک رہی ہے۔ میرا دل گھبرائے ہوئے

پرندے کی طرح سینے کے قفس میں پھڑ پھڑا رہا ہے۔ میں کوئل کے بولنے سے پریشان کیوں ہو رہا ہوں؟ مجھے تو کسی کا انتظار نہیں۔ میری اپنی بیٹی بیاہ کر سسرال جا چکی ہے۔ میری بہن دنیا کے ٹرنک میرے پیچھے اندھیرے میں پڑے ہیں اور یہی دو عورتیں ہیں جو میری زندگی میں میرے قریب رہی ہیں۔ مجھے وہ شامیں یاد آ رہی ہیں جب میں بالکنی کے کنگروں سے آنسوؤں کی طرح ٹپکتے بارش کے قطروں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کاش یہ شامیں لامتناہی ہو جاتیں اور اب کہتا ہوں کسی لمحے کی تمنا کیوں کر پوری ہو جایا کرتی ہے۔ دنیا یہاں نہیں ہے۔ بینا بھی نہیں ہے مگر یہ شامیں لامتناہی ہو گئی ہیں۔ میرے لیے طُلوعِ آفتاب ختم ہو گیا ہے۔ دھندلے مغربی ملکوں کی طرح میری صبح فوراً شام میں جا ملتی ہے اور کوئی ایسا نہیں جس کو میں یہ سب باتیں بتا سکوں۔ محرومی، بے کیفی اور فریاد کی دھنیں ساری زندگی پر چھا گئی ہیں۔ کیا اس شام کی سحر کبھی ہو گی؟

مگر اس دلہن کے اجڑے سہاگ کو کون زندہ کر سکتا ہے؟ جمنا کی متواتر لہریں ایک کے پیچھے ایک بھاگتی ہیں۔ کسے پکڑنے کے لیے، سنا ہے چاندنی راتوں میں گوکل کے پاس ان کناروں پر راتوں کو اب بھی بانسری کی صدائیں آتی ہیں۔ مدھر راگنیاں اور گوریوں کے سیمیں بازو ناچ کے لیے ہوا میں اٹھتے ہیں۔ ساری فضا ایک نشے اور کیف میں ڈوب جاتی ہے۔ یہاں تو تاج کے شہر میں خاموشی ہے۔ اوپر پتھر کے ستارے اتنا کچھ دیکھنے کے بعد بھی اس بے دردی سے آنکھیں جھپک رہے ہیں۔ آسمان اتنا بے حس اور سبزی مائل نیلا ہے۔ ہمارے گرد کائنات اتنی بے حس کیوں ہے؟ جمنا میں خون کی سرخی بھی جھلکتی ہے مگر اب پھر آکاش کا عکس سینے پر لیے جھپکتے تاروں کو اپنے ساتھ بہاتی لہریں آگے ہی آگے بہاتی جاتی ہیں۔ ارے میرے گرد تو کوئی بھی نہیں۔ ڈون وارٹن بوائے تم کہاں ہو؟ تم پردیسی تھے نا، جس طرح میں اپنے گھر میں پردیسی ہوں۔

ڈون وارٹن بوائے تم اپنی سیاہ آنکھوں والی سینور سیتاؤں کے دیس میں چلے گئے ہو، تم جو کہتے تھے کہ نفرت سے غنی، محبت سے غنی اپنے میں انجمن اور پھر اکیلے ہو، تم جو ہماری بائی جی کی موسیقی سے اتنا متاثر ہوئے کہ اپنا آپ بھی بھلا بیٹھے تھے۔ اپنے ساحلی گھر میں واپس بیٹھے نہ جانے تم اس سمے کیا یاد کر رہے ہو۔ تم نے ہمارے ہاں کی عورتوں کو قطار در قطار بھاگتے چیختے روتے گرتے اور بازاروں میں عُریاں تڑپتے دیکھا ہے۔ میں تمہیں بتاؤں بوائے ان دنوں ہم

خودکشی کر رہے تھے۔ بھائی ان دنوں ہم مر رہے تھے۔ ہم اپنے گلے پر خود ہی چھری پھیر رہے تھے۔ تم نے ہماری چیخ و پکار سنی اور تم ڈر گئے۔ کتنے بودے ہو بھاگ نکلے۔ بھلا جو شخص اپنے کو ہلاک کر رہا ہو وہ دوسرے کو کیا نقصان دے سکتا ہے۔ ہماری تہذیب سکراتِ موت کی مایوسی اور کرب میں گرفتار تھی۔ ہم لوگ اپنے پہلے وجود سے نکل گئے ہیں۔ کیا تم نے کبھی مرنے والے کی حالت نہیں دیکھی۔ کیا تم نے کسی ڈوبتے ہوئے انسان کے لیے کشمکش کرتے نہیں دیکھا۔ ڈون وارٹن بوائے ان دنوں ہم خون کے سمندر میں ڈوب رہے تھے اور پھر بھی تم سمجھے شاید ہم تمہیں کچھ کہیں گے۔ وہ عورتیں جن کو چشمِ فلک نے بھی کبھی عریاں نہیں دیکھا' سرِ عام رسوا کی گئیں۔ ان کی عصمت دری کی گئی اور تم اپنے جی سے سوال کر رہے ہو گے' من موہن کہاں ہے؟ وہ جس نے اپنی عورت کی گرمی اور حسن کا ذکر سن کر اس رات ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے تمہارے منہ پر تھپڑ مارا تھا اور جو پھر بھی اس بات پر کہ ہندوستان کی عورت کیا ہے۔ تمہارے سوال کا جواب نہ دے سکا تھا۔ میں تمہیں بتاؤں وہ پاگل تھا بھائی ورنہ سر بازار نیلام کی جانے والی عزت کے لیے کوئی دوسروں سے جھگڑتا نہیں۔ کم از کم کوئی کسی کے منہ پر تھپڑ نہیں مارتا' سمجھے۔ وہ جذباتی ہے۔ من موہن کو بھول جانا کیونکہ وہ بھی کنول ٹھاکر کی طرح جذباتی اور خوابوں میں کھویا ہوا ایک جھوٹا انسان تھا۔ ہم سب جھوٹے ہیں۔ خوابوں میں کھوئے ہوئے۔ خوابوں کے خلاف لڑنے والے' پر ہم نے ایسے بھیانک سپنے کبھی پہلے نہیں دیکھے تھے۔ ہمارے ہاں مذہب کے نام پر ایک دو آدمیوں کا خون تو بہایا گیا ہے مگر یوں کبھی نہیں ہوا بھائی میں سچ کہتا ہوں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا ہم تو ہندو مسلمان سے زیادہ انسان تھے۔ ہم نے صدیوں اس گہوارے میں ایک دوسرے کے دوش بدوش آزادی کی جنگوں میں حصہ لیا ہے۔ ہم نے یہاں اپنی تمناؤں کو پھلتے پھولتے دیکھا ہے اور جب تم نے ہمیں دیکھا' ہمارے قریب ہوئے تو ہم مر رہے تھے۔ ہماری آرزوؤں کا خون سنہری بن کر ہمارے پاؤں میں رچا تھا۔ کاش تم ایک صدی چند سال پہلے آئے ہوتے' پر حسرتیں حسرتیں ہی رہیں۔ میرے بھائی اور میں ایک پاگل کی طرح تم کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جو کچھ ہوا' وہ ایک غلطی تھی۔ ہمارا مقصد آخری لمحے تک یہ نہ تھا۔ ہم جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ سمجھے ہم شکار کیے گئے ہیں۔ یہ گھات میں چھپے شکاری کی گولی تھی جس نے ہمیں خاک و خون میں تڑپایا ہے۔ ہمارے ہاتھ پاؤں ہمارے جسم کی طرح زخم کو باندھنے کے لیے بھی نہیں بڑھ سکتے۔ سنا ہم جانبر نہیں ہو سکتے کیونکہ ہم مر رہے ہیں۔ اس تیز چھری سے ہم کو ذبح کیا گیا ہے جس کو سیاست کہا جاتا ہے ہم نے خودکشی کی ہے۔ ہم

کسی پر الزام نہیں دے سکتے' بھائی اور تم اپنے ساحلی گھر میں بیٹھے سوچ رہے ہو گے کہ تم کبھی ان راجکماروں' دریاؤں' خوابوں' ہیروں' مندروں اور غاروں کی سرزمین سے نہیں گزرے۔ کبھی تم نے وہ جگہ نہیں دیکھی جہاں خوابوں کے ساتھ ساتھ خونریزی اور قتل و غارت بھی ہو مگر ڈون وارٹن دوست! قومیں اپنا سبق سیکھتیں ہیں۔ فرانس نے بھی اپنا سبق سیکھا تھا۔ بھائی ہم بھی اپنا سبق سیکھ رہے ہیں اور تم خود ہی تو کہتے تھے' دوست کہ خیالوں اور قسمت پر اتنا شاکر ہونا تمہیں بھلا لگتا ہے مگر قسمت اور خیالوں میں اتنی دوری کیوں ہے؟

تم نے اپنے ساحلی گھر سے اپنی سیاہ چشم سینور سیتاؤں کے دیس سے جا کر یہ بتانے کے لیے کہ تم سپنے سے نکل کر ایک اصل دنیا میں جا رہے ہو' مجھے ایک پوسٹ کارڈ بھیجا ہے جس پر پرانے غرناطہ کے سب سے بڑے محل الحمرا کی تصویر ہے۔ وہی الحمرا جس کے ایک کمرے میں سرخ خون کے چھینٹے ابھی تک نہیں سوکھے۔ تم نے مجھے یہی یاد کرانا تھا اور میں تمہیں یقین سے کہتا ہوں کہ گناہ گاروں کا خون کبھی رائیگاں نہیں گیا۔ بے گناہوں کا خون کبھی خشک نہیں ہو سکتا۔ ہم مزاروں' شمشان بھومیوں کے درمیان سانس لے رہے ہیں۔ ہماری زمین ایک چِتا بن گئی ہے۔ انگاروں کی طرح ہماری تدبیریں چمک رہی ہیں۔ یہی آگ ہے جو کئی جنم ہمارے گرد جلتی رہے گی اور تم نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا ہے۔

او بوائے' اگر میں اسے نہ مل چکا ہوتا۔ اگر بائی جی کی دی ہوئی تصویریں میرے کمرے میں لٹک نہ رہی ہوتیں' اگر کمرے میں ایک شاہکار نہ ہوتا جس میں انسان ہے' دریا ہے اور کشتی ہے تو میں سمجھ لیتا یہ سفر ایک سال' میں نے ایک خواب میں گزارہ ہے مگر اب میں یہ نہیں سمجھ سکتا کیونکہ تمہاری یاد میرے دل میں ہے۔ ہیرا بائی کا تحفہ میرے پاس ہے اور زندگی کا سفر تو خیر ہر جگہ اکیلے ہی کرنا ہوتا ہے۔ کشتی میں کبھی کوئی کسی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ کشتی تو پانیوں پر اکیلے ہی چلانا ہوتی ہے۔ کتنی مجبوری ہے' بدھ مت کی کتابیں میں نے سمندر میں پھینک دی ہیں۔ یہاں یونیورسٹی میں اپنے مشرقی مذہبوں کے صدر کے سامنے کتابوں کا ڈھیر رکھتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ اس مردہ مذہب کو زندہ سمجھنے کا کیا فائدہ ہے؟ ڈاکٹر جب یہ مذہب ان لوگوں کو کوئی تسکین نہ دے سکا' انہیں گیان اور روشنی کی راہیں کہیں لے جا نہ سکیں تو ہمیں اس کے مطالعے سے فائدہ دنیا میں اور بھی کئی زندہ چیزیں ہیں۔ ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا تھا ہاں' میں نے بھی سنا ہے۔ ہندوستان میں لوگوں نے اہنسا پر مودھرما کے اصولوں کے باوجود ایک دوسرے کے گلے کاٹے۔ دوسرے مذہب کی عورتوں کو

ذلیل کیا۔ بچوں کو نیزوں پر لٹکایا۔ مردوں کو سرِ عام ہنس ہنس کر عذاب سے مارا اور ایسے وحشیانہ کام کیے کہ سارا یورپ کانپ گیا۔ پھر اس نے ان کتابوں کے سارے ڈھیر میرے حوالے کر دیئے کہ میں ان سے جو سلوک جی چاہتا ہے' کروں۔ میں نے فضول کا بوجھ اور جھوٹ سمجھ کر کتابوں کو سمندر میں پھینک دیا۔ ایک ایک کتاب کو پھینکتے مجھے یادوں نے بے چین کر دیا۔ یہ سب ہیرا بائی کی طرف سے اور کچھ اور مختلف لوگوں کی طرف سے تحفہ دی گئی تھیں اور تمہاری ہیرا بائی جس کو دیکھ کر پہلی بار میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچ گیا تھا' اب کہیں نہیں ہوگی۔ ہیرا بائی نے اور اس سے پہلے اس کی ماں نے ان کتاب کے مضمون میں اپنے خواب چھپا رکھے تھے۔ ہیرا کی ماں کی سہاگ کی چوڑیاں' ارے بھائی کیا کیا نہیں یاد آیا۔ ان کتابوں کے ساتھ' مگر میں سوچتا ہوں ان کتابوں میں زہر ہے۔ ایک صحت مند نظریہ زندگی نہیں' ایک مسموم اور ناپاک پروپیگنڈہ ہے۔ ورنہ بدھ کا مذہب جو صلح' دوستی اور اہنسا کا مذہب ہے' کبھی غلط نہ ہوتا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ غلط ثابت نہ ہوتا۔ اور ایک بات بتاؤ مجھے تو اب شک ہونے لگا ہے تمہارے ہاں تو کوئی مذہب ہی نہیں ہے تمہارے ہاں چند نعرے ہیں اور کچھ نام اگر مذہب ہوتا تو محبت ہوتی۔ مجھے اب اپنے مشرقی اور خون کے ملاوٹ پر اپنی آنکھوں کی عربی سیاہی پر ناز نہیں رہا۔ سچ کہنا تمہارے فلسفیوں نے اپنے حجروں میں بیٹھ کر یہ سب اچھی باتیں لکھ دی ہوں گی۔ افسوس ہم مشرق کے لیے کتنے بڑھیا خیالات رکھتے تھے۔

اور تمہاری وہ الوہی موسیقی۔ اب تو وہ بھی مر گئی ہوگی۔ جب معاشرہ مر جائے' پرانی زندگی روندی جائے تو روح کی طرح کی کوئی شے باقی نہیں رہتی۔ موسیقی روح کی ایک عظمت ہے اور تمہارے ہاں عظمت ناپید ہوگئی ہے اور میرا تو خیال ہے ہم نے تمہاری عظمت کے متعلق خواب دیکھے ہیں' من موہن اگر ملے تو کہنا تمہارے ہاں چاہے چیونٹیوں کی طرح عورتوں کو مسل دیا گیا ہے' پھر بھی میں نے دو روشنیاں دیکھ لی ہیں اور اس سے کبھی کبھار پھر سوچنے لگتا ہوں۔ شاید وہ دونوں عورتیں اور میں تمہارے ماضی میں کہیں ملے تھے۔ میرے کمرے میں وہ دونوں فرانسیسی شاہکار اس طرح لٹک رہے ہیں۔ ہمارا ڈاکٹر ان تصویروں کو دیکھتا رہا اور جب میں نے اسے بتایا کہ یہ دونوں ایک عورت کی طرف سے تحفہ ہیں تو اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں ہوش و حواس میں نہیں ہوں مگر میرے یقین دلانے کے باوجود وہ سر ہلاتا اور کہتا تھا جس ملک کی عورتیں اتنی دریا دل ہیں' وہاں یہ خونریزی کس طرح ہو سکتی ہے؟ یا وہاں باقی عورتیں سو رہی ہیں۔ راجکماروں اور غاروں کے ملک کی عظمت کا وہ قائل ہو گیا ہے۔ میں نہیں اور پھر بھی کسی طرح میں کنول ٹھاکر کی

عظمت کا قائل ہوں۔ ہیرابائی بھی میرے دیش کی ساری سینوریتاؤں سے الگ اور بلند، میری نگاہوں میں تمہارے ہمالیہ سے بھی اونچی ہے۔ کبھی کبھار تو سوچتا ہوں۔ میں نے یہ سال بے فائدہ نہیں گزارے۔ انسانی روح کی جس پاکیزگی کے مطالعے کے لیے میں ہندوستان بھیجا گیا تھا، وہ میں نے ڈھونڈ لی ہے۔ مگر وہ پاکیزگی...... آنکھ بند کرتا ہوں تو میرے دماغ میں آگ کے لپکتے شعلے ہیں۔ گولیاں سر پر سے اڑتی ہوئی گزر جاتی ہیں اور کوئی پکار پکار کر کہتا ہے پکڑلو، ماردو جانے نہ پائے اور پھر بھی سیاہ بال بکھرائے وحشت زدہ آنکھیں کھولے عورتیں میرے سامنے سے گزر جاتی ہیں۔ سچ کہنا تمہارے دیش میں اتنی خوبصورتی کس طرح جمع ہوگئی یا ان راتوں کو تم سب مل کر اجنتا کی روحوں کا تعاقب کرتے ان کو قتل کر رہے تھے۔ میری آنکھیں سیاہ لمبے بال دیکھتی ہیں۔ یہ سیاہی جو تمہارے نصیب کی طرح میری آنکھوں کے سامنے پھیل گئی ہے، صرف یہی سیاہ نقطے ہیں۔ میرے ملک کے لوگ کبھی مجھ سے ملنے آتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ میں نے کیا دیکھا تو سانس میرے سینے سے اٹک جاتا ہے۔ آواز میرے حلق میں ہی رک جاتی ہے۔ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ میں انہیں کیا کہوں، آگ کی محرابوں کے نیچے ننگی انسانیت کو دیکھ کر میں کانپ جاتا ہوں جو کچھ تمہارے ہاں ہوا وہ...... مگر اس کے ذمہ دار تم نہیں ہو کوئی نہیں ہے۔ شاید قسمت بھی نہیں۔ تمہارے اَن داتا ہیں۔ مگر گمراہ ہونے والے کو کوئی کیا کہے؟

گجر بجتا ہے اور چاندنی راتوں میں دل کے تار ہل سے جاتے ہیں۔ پر میں دریائے کبیر کے کنارے خوابوں میں ڈوبے ہوئے کھنڈروں میں گھومتا ہوں۔ سوچتا ہوں یہاں الحمرا میں کبھی روایتیں تھیں، زندگی تھی، سیاہ آنکھوں والی عورتیں ان ایوانوں اور جھروکوں سے دریا کو بہتا دیکھتی ہوں گی اور اب چمگادڑیں تیزی سے اپنے سیاہ پر مارتی اڑ جاتی ہیں۔ الحمرا کے ایک ایوان میں ابھی تک وہ خون کے دھبے ہیں جو اسپین کی تباہی اور حکومت کے تختے کو الٹنے کا باعث ہوئے۔ اگر بے گناہوں کا خون رنگ لاتا ہے تو نہ جانے وہ ہندوستان آنے والے دنوں میں معدوم ہوگا کہ نہیں۔ پھر تم بھی جمنا کے کنارے تاج کے کھنڈروں میں ایک روح بن کر گھوما کرو گے اور شاہ جہان کی روح ایک سیاہ چمگادڑ کی شکل میں پر پھڑپھڑاتی گنبد میں چکر لگایا کرے گی۔ پتھروں سے سر پھوڑتی جو اس نے اپنی محبت کے مقبرے کو چھپانے کے لیے لگائے، شاید تمہارے ملک میں ساری محبت کتابوں، مقبروں اور غاروں میں بند کر دی گئی ہے۔ او بوائے، میں ایک جذباتی کی طرح اپنے دکھ کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے یہ سب لکھ رہا ہوں اور پھر بھی سوچتا ہوں تم جس آگ میں جل رہے ہو، اس سے بچانے کا یہ

طریقہ ہے۔ میں ایک محبِّ وطن کی طرح تمہیں تمہارا ملک چھوڑنے کو نہیں کہوں گا۔ اپنے گھر میں کڑیوں کے تلے دب کر مر جانا' دوسرے ملک کی آزاد اور خوبصورت فضا میں سانس لینے سے بہتر ہے۔ مجھے معلوم ہے تم اکیلے ہو گے۔ اتنے اکیلے کہ تم بھول جاؤ گے کہ تم کبھی مجھ سے یعنی ڈون وارٹن سے بھی ملے تھے۔ تم آگ کی محرابوں کے نیچے سے گزر چکے ہو اور راگنی تمہارے ہاں تو پوتر کرنے کا ایک پاک طریقہ ہے اور یوں بھی پاک ہو کر اس ہون کنڈ میں جل کر تم مجھ سے عظیم ہو گئے ہوتے' بہت بڑھیا اور اچھے۔ اور اس لیے میں جو دکھ کے وقت تمہیں چھوڑ کر بھاگ آیا ہوں' تمہاری دوستی کے قابل نہیں ہوں اور پھر بھی تم یاد آتے ہو۔ جمنا کے کنارے تمہارا تاج اور پھر حدِ نظر تک مقبرے ہی مقبرے ہیں۔ محبتوں کے دفینے' مگر جو مجھے سب سے زیادہ یاد ہے' اس کا نام میں نہیں لوں گا۔ محبت کا کوئی نام نہیں۔ محبت خوشبوؤں اور ہواؤں کی طرح بے نام ہے۔ تم ہندوستان میں لاکھ اسے مقبروں میں قید کرنے کی کوشش کرو تم اسے قید نہیں کر سکتے۔

تمہارے ہاں کا سنا ہوا ایک گیت مجھے یاد آ رہا ہے۔

موہ بھرا من پھول کنول کا

دھوپ لگے کملائے

کتنی عجیب سی ترکیب ہے۔ محبت تو دھوپ میں پھیلتی ہے نفرت کی سردی میں ٹھٹھرے دل اس آگ پر اپنا آپ گرم کرتے ہیں اور محبت کا کنول دھوپ میں کملا گیا پر تمہاری روح کو سمجھنے کے لیے ایک سادھو مہاتما ہونے کی ضرورت ہے۔ تم جو سادھو' مہاپرشوں' اوتاروں کے دیش میں رہتے تھے' تم بھی اسے سمجھ نہ سکے یا تمہارے ہاں محبت بھی ایک عذاب ہے۔ دائمی اور نا مختتم' شاید تمہارا دکھ ہی تمہاری دولت ہے۔ تمہارے ہاں کانٹوں کے بستر پر لیٹنا سب سے بڑی عبادت ہے۔ تمہارا سارا ملک عبادت میں مصروف تھا۔ دُرگا پوجا کی طرح۔ دیوالی کی طرح یہ بھی کوئی بڑا تیوہار تھا بھائی؟

برا نہ ماننا میں سمجھ نہیں سکتا' اس لیے پوچھ رہا ہوں اور یہاں راتیں اتنی خوشگوار ہیں۔ وفا اور رقص کی صداؤں میں سیاہ آنکھوں اور قیامتوں کے فتنے ملے رہتے ہیں۔

وارٹن

اس دن چندر شیکھر اور گنگا دھر میرے دفتر میں آئے بیٹھے تھے۔ مجھ سے بحث کر رہے

تھے کہ وقت کے تقاضا کے مطابق اخبار کی پالیسی بدلنا ضروری ہے۔ وہ مجھ پر ہر ممکن زور دے رہے تھے۔ میں نے انہیں پہلے بھی کئی بار جواب دے دیا تھا کہ اخبار ایک پروپیگنڈا نہیں بن سکتا۔ میں نے اپنی عقل کے مطابق انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ انسانیت کی خدمت سب سے بڑی خدمت ہے۔ اگر ہم نے مسلمانوں کے خلاف زہر پھیلایا تو زندگی کا سارا امن درہم برہم ہو جائے گا۔ ہمیں جدا ہی ہونا ہے تو کیوں نہ بھائی بندوں کی طرح ایک چوراہے پر دوستوں کی طرح بچھڑ جائیں۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ہم کو پھر بھی کبھی ایک دوسرے سے ملنے کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ بنیادی طور پر یورپ میں رہنے والے بھی ہمارے قریب ہیں کیونکہ آدم ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ چندر شیکھر کی ہنسی بڑی زہریلی ہے۔ اس کی مسکان میں زہر چھپا ہے۔ اس نے گنگادھر کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا اور گنگادھر نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا ''تم کنول کماری ٹھاکر کے شاگرد ہو یا وہ تمہاری؟''

میں نے کہا تھا: ''کیا بات ہے تم کنول کماری کا ذکر کیسے لے بیٹھے ہو۔ شاگردی استادی کا کیا سوال آ گیا؟''

اور چندر شیکھر نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا تھا: ''ہم کو دھوکا نہیں دے سکتے، ہم تم سے زیادہ دنیا دیکھے ہوئے ہیں دوست۔''

میں نے کہا تھا' دھوکہ دینے کا تو کوئی موقعہ نہیں' میں جو کچھ ٹھیک سمجھتا ہوں وہی کہہ رہا ہوں۔

اس نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے میری طرف جھک کر کہا تھا: ''پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ دو مختلف انسان ایک ہی بات کرتے ہوں۔''

''چلو رہنے دو یہ باتیں گنگادھر نے اسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا تھا۔ ''ہم تمہاری مدد چاہتے ہیں اور ہندو دھرم کے مطابق تم کو ہمیں مدد دینے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ ہم بھگوان کے نام پر یہ کام کر رہے ہیں۔''

میرے دل میں کسی نے ایک دم دیا سلائی سے آگ بھڑکا دی تھی۔ میں نے میز سے اٹھتے ہوئے کہا: ''بھگوان کا نام لیتے وقت سوچ لیا کرو۔ کیا بھگوان تمہیں پاپ کرنے' زہر پھیلانے اور دوسروں کو قتل کرنے کو کہتا ہے۔ تم اپنے ذاتی مفاد کی خاطر جو کچھ کرنا چاہتے ہو وہ بھگوان کی آڑ لے کر کیوں کرتے ہو۔ میں ایک آگ میں سلگ رہا تھا۔ ہمیشہ میں نے ان لوگوں کو

بڑے رسان سے اپنی سمجھ سے کام لے کر سمجھا دیا تھا مگر آج صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے چندر شیکھر کو کہا تم تو اتنے بڑے دھرماتما بنے پھرتے ہو کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں کہہ سکتے کہ ان سب باتوں کے پیچھے بھگوان سے زیادہ تمہاری ذاتی غرض ہے۔ کیوں بھولتے ہو کہ ہر ایک کو کرنی کا پھل ملتا ہے اور تم اپنے گنوں کی آگ میں قطعی جلو گے اور پھر تم اسٹیجوں پر چڑھ کر کہتے پھرتے ہو کہ ہندوستان کسی کا نہیں بلکہ دونوں قوموں کا ہے۔ تم کانگریس اور ہندوستان کی یکجہتی کے حق میں ہو۔ اگر تمہاری طرح کے دھرماتما جو جھوٹ سے بھرے بول پر یقین رکھتے ہیں، کانگریس کا پروپیگنڈا کرتے اور اپنی زبان سے خلوت میں بیٹھ کر اپنی باتوں کو جھٹلاتے رہے تو نہ جانے کیا ہونے والا ہوگا۔

اور چندر شیکھر کرسی پر بیٹھا اسی طرح مسکراتا رہا۔ اپنی زہریلی ہنسی ہنستا رہا۔ جیسے وہ میری ساری باتوں اور جوش کو میرے غصے کو ایک بچے کی ضد سمجھ رہا ہو۔ جیسے اسے اپنی راہوں کا نہ صرف یقین بلکہ سچے ہونے پر اعتبار ہو جیسے اسے اپنی فتح مندی کا نشہ ہو۔ میں چپ ہو گیا تو اس نے گنگادھر کی طرف دیکھ کر پھر کہا۔ ''ہمیں یہاں بھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ تم کنول ٹھاکر کے شاگرد ہو، چلو گنگادھر چلیں۔''

میں نے غصے سے کہا ''تم جو سچ بات ہو ٹھیک بات ہو اچھی بات ہو اسے کنول کماری کا نام لے کر اور بھی بلند کر دیتے ہو مگر سچائی اپنی جگہ قائم ہے۔''

چندر شیکھر نے ہنس کر کہا ''مگر اس بات پر یقین بھی رکھو حالات کے دھارے کے ساتھ انسان بے بس تنکوں کی طرح بہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہم اور تم تو وقت کی لہریں ہیں اور لہروں کو سمندر کے ساتھ سرتابی کرنے کی طاقت نہیں ملی۔ اگر تم یا میں اس معاملے میں خاموش بھی رہے تو وہی ہوگا جو ہونے والا ہے۔'' آخر ہوتا تو وہی ہے جو بھگوان کی مرضی کے مطابق ٹھیک ہو۔ اچھا ہو کم از کم وقت کا تقاضا یہی ہے۔ کیوں نہیں اپنے مستقبل کو آفت سے بچا لیتے۔ تم مجھے اسٹیج کا طعنہ دے رہے تھے۔ میرے بھائی، اصلی زندگی اور اسٹیج میں وہی فرق ہے جو پستی اور بلندی میں ہے جو آکاش اور زمین میں ہے اور پھر وہ دونوں چلے گئے۔ اس شام راجندر بھی مجھے ملا تھا۔ دوپہر تو اس کا فون مجھے گھر سے آیا تھا کہ وہ چائے پر میرا انتظار کرے گا۔ میں دفتر سے فارغ ہو کر سیدھا جمنا کے کنارے اس کی کوٹھی میں چلا گیا۔ وہ اکیلا نہ تھا کئی اور لوگ بھی وہاں تھے۔ چندر شیکھر اور گنگادھر بھی وہاں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ ہمیں یہاں بھی ناکامی ہوگی۔ یہ سب

لوگ ایک الگ جماعت کے سر کردہ رکن ہیں۔ یہ ہم کو غلط سمجھتے ہیں۔ چندر شیکھر میرے پاس آ کر بولا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا راجندر پرشاد سکسینہ بھی آپ کا دوست ہے۔

میں نے کہا' آپ لوگ دوسرے کو یہ یقین کیوں دلاتے ہیں کہ گناہ گار ہیں کیا جماعتوں اور تعلیم کے بغیر انسانیت کا پرچار نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی زہریلی ہنسی ہنس کر پھر بولا۔ میرے بھائی تم جس انسانیت میں یقین رکھتے ہو' وہ ایک خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ اگر میرے کہنے سے تم اس بات کو نہیں مانتے تو حالات تم کو مجبور کروا دیں گے اور جب تم اپنی رائے بدلو گے وقت گزر چکا ہو گا اور پھر تم ہاتھ ملو گے۔

''کس لیے ہاتھ ملوں گا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''آنے والے دنوں میں اخبار کی پالیسی بدلنا تمہارے لیے مفید ثابت ہو گا۔ حکومت کی نظروں میں تمہارا یہ اقدام قابلِ تعریف ہو گا۔''

''کون سی حکومت؟'' میں نے کچھ سمجھتے اور ہنستے ہوئے کہا۔

چندر شیکھر کی زہریلی ملائم ہنسی میرے دل کو چھو رہی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اور گنگادھر پھر باتیں کرنے لگے اور مجھے وہ دونوں دو چھوٹے ابلیس لگ رہے تھے جو دنیا کو گمراہ کرنے کے لیے بھیجے گئے ہوں گے۔ چائے ختم ہو گئی۔ باتیں ہونے لگیں۔ دبی دبی باتیں ہو رہی تھیں' جیسے ہر ایک دوسرے سے ڈر رہا ہو۔ راجندر کے کئی دوست جو دفتر کے دنوں میں اس کے سیکرٹری یا اس کے افسر تھے' ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ سگریٹ پھونک رہے تھے اور کنول کا نام بھی میں نے اِدھر اُدھر سنا مگر باوجود دھیان دینے کے' میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ فضا اتنی مسموم اور گھٹی ہوئی لگ رہی تھی' میرا دل گھبرا رہا تھا۔ جمنا کے پانی کی لہریں تاج کا عکس اپنے دامن میں چھپائے تیزی سے بھاگ رہی تھیں۔ شاید وہ آنے والے لمحوں سے محبت کی اس نشانی کو چھپانا چاہتی تھیں۔ شام اور معمولی شاموں کی طرح نیلی اور شفق کی سرخیوں میں لپٹی ہوئی دلہن کی طرح تھی۔ لان کے درخت خاموش تھے جیسے شکاری جانوروں کی طرح کان اٹھائے نتھنے پھیلائے بو سونگھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ میں اپنے آپ کو اتنے لوگوں کے درمیان بیٹھا ایک قیدی محسوس کر رہا تھا۔ ملازم خاموش مؤدّب و مستعد اپنا کام پھرتی سے کر رہے تھے۔ ایک ہوٹل کی سی ہوا راجندر کے گھر کے چاروں طرف منڈلا رہی تھی۔ وہ خاموش تھا اداس مگر پھر بھی گھبرایا ہوا نہیں۔ بادلوں کی روشنی میں موٹر کے نیلے پیلے' سرخ' سیاہی مائل رنگ چمک رہے تھے اور پھر بالکل الگ رادھے کرشنن کی سیاہ

نیشن بھی کھڑی تھی۔ میں ...... گھبرا گیا۔ مجھے رادھے کرشنن یاد آ گیا۔ نیرا سندری اور جانے کون کون دماغ سے نکل کر سیاہ نیشن کی کھڑکیوں سے جھانکنے لگے اور پھر رادھے کرشنن کے وہ لفظ جو کنول کی صورت میں کسی اتم شکتی کو ملنے کی خوشی کے تھے۔ مجھے یاد آ گئے۔

نہ جانے سیاہ نیشن کو کس نے خریدا تھا؟

رادھے کرشنن کی یہ بات کہ ہوا کے ساتھ چلنا اور حالات کے دھارے کے ساتھ بہنا سب سے بڑی عافیت ہے، مگر پھر بھی کسی طرح میں اس بات کو قابل عمل نہیں پاتا تھا۔

لوگ ٹولیوں میں بٹ کر باتیں کر رہے تھے۔ اطمینان سے سگریٹ پی رہے تھے اور سیاست کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جیسے یہ دلدلی زمین ہے جس پر پاؤں رکھتے ہی وہ پھنس جائیں گے اور دکھ کی موت مرنے لگیں گے۔ ملک کے آنے والے حالات کا ذکر کرتے ہوئے سرکاری افسر بہت سنبھل سنبھل کر کچھ کہتے چپ ہو جاتے۔ سوچنے لگتے جیسے ان سے بڑے سیاست دان خطہ ارض پر پیدا ہی نہیں ہوئے۔

چندر شیکھر اور گنگا دھر چائے پی کر فوراً چلے گئے تھے۔ پھر اور لوگ بھی آہستہ آہستہ جانے کے لیے اُٹھے۔ راجندر سے ہاتھ ملاتے اسے الوداع کہتے اپنی موٹروں یا دوسروں کی موٹروں میں بیٹھ کر موٹر کا پٹ زور سے بند کرتے اور پھر موٹر اسٹارٹ کرنے کی آواز آتی اور راجندر کے باوردی ملازم جھک کر آداب کرتے اور پھر اندھیرا۔ سب سے آخر میں سیاہ نیشن کا مالک اٹھا۔ وہ ایک نو دولتا، کم ظرف اور فتنہ پرور شخص تھا، اس نے ٹھیکیداروں کی صف سے کھڑے ہو کر شہر کے متمول آدمیوں میں قدم رکھا تھا، اس لیے پرانے روایتی لوگوں اور نئے پڑھے لکھے لوگوں میں جو ایک خود اعتمادی ہوتی ہے، وہ اس میں نہ تھی۔ اس کے باوجود ہنس کر ہر بات میں یوں دخل دیتا تھا، جیسے اس کی معلومات بہت وسیع ہوں۔ لوگ اسے برداشت کرتے تھے کیونکہ امارت پر گندگی کا پردہ اور دولت ہر برائی کی خوبصورتی اور ہر کمی کی خوبی بن جاتی ہے۔

جاتے جاتے اس نے راجندر سے کہا: ''راجندر پرشاد بھیا سوچ لو زندگی مفت کی نہیں ہوتی کہ اسے خیالات اور خوابوں کے بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ تم نے مہاپُرشوں سے دولت ورثے میں پائی ہے۔ ہم نے اپنے زورِ بازو سے دنیا میں جگہ حاصل کی ہے۔ اس لیے سمجھتے ہیں کہ نام اور کام سے بڑھ کر دولت ہے۔ ملک سے زیادہ اصولوں کو جگہ نہ دو۔'' اور اس نے راجندر کے کندھے پر یوں ہاتھ رکھ دیا گویا وہ کوئی عزیز دوست ہو اور مجھے معلوم ہے باوجود

اس کے کہ راجندر نے اپنے بازو کو نہیں ہلایا' اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ وہ دل ہی دل میں اس نو دولتیے' اپنے سے مطمئن اور سستے شخص کے ہاتھ کے بوجھ تلے کانپ گیا ہوگا۔ اس کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے سکڑ گئی تھیں اور پھر وہ اسی طرح ہنس کر بات کرنے والے کی بات کا جواب دیتا رہا تھا۔

سب چلے گئے۔ لان پر سناٹا سا تیرنے لگا۔ خالی میزیں اور کرسیاں سنسان گھروں کی طرح لگ رہی تھیں جن کے باسی کبھی نہ آنے کے لیے چلے گئے ہوں۔ میں اور راجندر شام کے اندھیرے اور ملگجی مٹتی ہوئی سرخی میں اکیلے تارے اور خاموش درختوں کے درمیان جو کھوئے ہوئے گم کردہ راہ انسان لگ رہے تھے۔ ہم دونوں اپنی راہوں سے ناواقف غیر لوگوں کے درمیان گھر سے اپنی منزل سے ناآشنا بھٹکے ہوئے مسافر تھے۔

راجندر نے بہت دیر خاموش رہنے کے بعد کہا' ''تم تو کئی دنوں سے مجھے ملے ہی نہیں۔ تمہیں کیسے معلوم ہوتا کہ مجھے قتل کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ مجھے انسانیت کے نام پر کام کرنے سے روکا جاتا ہے۔ میں تمہیں فون کر کے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں جانتا ہوں تم بھی بے حد مصروف اور مجھ سے زیادہ ذمہ دار انسان ہو۔ مجھے کہا جاتا ہے کہ میں کنول کماری ٹھاکر کا شاگرد ہوں۔ میں اسے گمراہ کر رہا ہوں۔ بھلا تم ہی بتاؤ کنول ٹھاکر کو کون گمراہ کر سکتا ہے؟''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں کچھ سوچ نہیں رہا تھا۔ صرف مجھے چندر شیکھر اور گنگا دھر یاد آ رہے تھے۔ دو چھوٹے ابلیس' جو لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے بھیجے گئے ہوں۔ انہوں نے مجھے بھی تو کہا تھا کہ میں کنول ٹھاکر کا شاگرد ہوں۔ وہ لوگ یہ کیوں سوچتے ہیں کہ انسانیت ایک منظّم سازش ہے۔ انسان کے نام پر کام کرنا گناہ ہے۔ کیا سچائی کو بچانے کی کوشش کرنا ایک فضول سا خواب ہے؟ حالات کے سامنے جھک جانا اور دھارے کے ساتھ بہنا زندگی ہے یا چٹان بن کر زمانے کی آندھی کے سامنے ڈٹ جانا؟ کون سی بات ٹھیک ہے۔ کون سا کام اصل ہے اور مستقبل کے اندھیروں میں کیا ہونے والا ہے۔

میرے دل میں پرانے سوال پھر تیرنے لگے۔

کیا محبت ایک اندھیرا ہے۔ کیا یہ ایک راستہ ہے کیا وجود کے' زندگی کے' زمانے کے اور حالات کے اندھیروں میں محبت کی روشنی کے ساتھ سفر کیا جا سکتا ہے؟ اور یہ بھی تو ممکن ہے محبت روشنی نہ ہو ایک اندھیرا ہو۔ محبت ابدی دائمی عذاب ہو' ایسا عذاب جس سے اندر کی سختی ٹوٹ کر نرمی

میں ڈھلتی پگھلتی اور بہتی ہے اور اتنے سوالوں کے باوجود مستقبل اندھیرے میں تھا۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کیا ہونے والا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ ہم شام کے تارے کے نیچے کھڑے ہو کر دو گم کردۂ راہ انسان تھے۔

میں راجندر اور کنول ٹھاکر کیا ایک منظّم جماعت کے سرغنے تھے؟ لفظوں میں عجب طاقت ہے۔ لفظوں کے آئینے میں حالات کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ مسخ ہو جاتی ہے۔ بگڑ جاتی ہے۔ شاید لفظوں کا ہیر پھیر ہی انسان کے کاموں کو عظیم اور پست' اچھا اور برا بنا دیتا ہے۔ ورنہ حالات تو ایک رفتار ایک ڈگر پر چلتے ہیں۔ پھر ہم دونوں اندر آ گئے۔ میں نے دیکھا راجندر کے مہاپرشوں کی تصویریں بڑے بڑے فریموں میں آج بھی وہاں نہ تھیں۔ راجندر میرے لیے چائے لانے کا کہہ کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں نے کہا پھر کیا کرو گے۔ ''انسانیت یا موت'' اور راجندر نے خوش ہو کر کہا'' ''تم نے دو بالکل مختصر اور ٹھیک لفظ کہے ہیں۔ ''انسانیت یا موت'' مجھے معلوم ہے یہ محض دھمکیاں ہیں۔ کوئی مجھے قتل نہیں کرے گا۔ ڈاکوؤں میں یہ طاقت کہاں؟ اور پھر اس میں کوئی سچ ہو تو بات بھی ہے۔ پھر مجھے بازو سے پکڑ کر کہنے لگا مگر بتاؤ تو سہی اگر انہوں نے یہی باتیں کنول ٹھاکر کو کہیں تو کیا ہوگا۔ کنول عورت ہے' گھبرا جائے گی اور پھر اپنی راہ سے بھٹک جائے گی۔''

میں نے کہا'' ''مطمئن رہو کنول میں وہ اصلیت ہے جس کو ہر کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے۔ وہ کم عیار نہیں ہے۔''

''پھر بھی۔'' راجندر نے کانپ کر کہا۔ پھر بھی اگر کنول نے کچھ کہا'' ''اگر کسی نے اسے مار دیا تو؟''

اور اس لمحے مجھے معلوم ہوا کہ کنول کو راجندر چاہتا تھا۔ ہماری طرح نہیں ایک حاشیہ نشین کی طرح نہیں۔ دل کی گہرائیوں سے کنول اور وہ ایک ہی وجود کے دو حصے تھے۔ میں کہہ نہیں سکتا کس بات نے مجھے یہ سمجھنے پر آمادہ کیا۔ ہو سکتا ہے کئی اور باتوں کی طرح یہ بھی ایک وہمہ ہو یا پھر یہ بھی ایک روشنی ہو۔ ایک گیان ہو۔ ایک الہام ہو' جب صرف سچ دل میں اترتے ہیں اور وہاں سے ہر وہم نکل جاتا ہے۔ میں کس طرح اس کی تسلی کر سکتا تھا۔ میں اسے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔

پھر چائے لائی گئی۔ سیاہ پیالوں پر یونانی خدا زیوس اور اس کے گرد دیوتاؤں کو لڑتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ سیاہی چمکیلی اور بہت گہری بے حد جاذبِ نظر تھی اور سفید خدا بادلوں پر بیٹھا

تھا۔ جنگ کے سمندروں کے ہواؤں اور خشکیوں کے جنگلوں کے دیوتا ایک خوفناک جنگ میں زمین کے سرکش خداؤں کے ساتھ برسرِ پیکار تھے۔ ہر چہرے پر کشمکش تھی جو تاریکی کے مقابلے میں زیادہ روشن واضح اور ظاہر تھی۔ خدا کے چہرے پر ایک ابدی اور نہ مٹنے والا ایک دل کو شانتی اور شکتی دینے والا سکون تھا۔ بادل زمین کے بطن سے اٹھتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ اوپر ہی اوپر اور خدا بادلوں کے پردوں سے پرے مسکرا رہا تھا۔ کیا خدا اس جنگ سے اس تاریکی اور روشنی کی جنگ سے خوش تھا۔ چائے کے لیے پیالہ اٹھاتے ہوئے راجندر ہنس کر بولا' میرے ملازم بہت ہی عقلمند ہیں۔ ڈھونڈ کر ایسے پیالے لاتے ہیں۔ یہ چائے کے پیالے میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ نہ جانے آج کس طرح نکالے گئے ہیں۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ یہ دیکھو دیوتا بھی اپنا تن من لگا کر تاریکی کے فتنوں سے جنگ کر رہے ہیں۔ ہم تو انسان ہیں۔ ہم کیوں نہ ان سیاہی کے اندھیرے کی تاریکی کی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما ہوں۔ میں نے اس گھڑی دوبارہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں انسانیت کے لیے سچائی کے لیے لڑتا رہوں گا۔ میں چندر شیکھر کے کہنے کے مطابق ہندو نہیں، مسلمان نہیں۔ صرف انسان ہوں۔

اس کے چہرے پر سے بادل سے ہٹ گئے۔ مجھ سے کہنے لگا۔ چلو آؤ۔ اس خوشی میں چند گیت سنیں۔ گراموفون پر ریکارڈ لگاتے ہوئے وہ آپ سے آپ ہنس رہا تھا۔ میں نے کہا' مجھے بتاؤ کون سی اندرونی روشنی ہے جس سے تمہارا چہرہ منوّر ہو گیا ہے۔

وہ مسکرا کر کھڑا ہو گیا اور بولا: ''چاہے آج رات میری آخری رات ہو مگر میں کام کروں گا۔ اس فیصلے سے مجھے سکون مل گیا۔ ہم تاریکی اور مصیبت کے خلاف جنگ کرنے کا عزم کر لیں تو ہر شے آسان ہے۔ پرماتما جس نے خوشیاں اور رنج زندگی اور موت بنائی ہے' حفاظت کرے یا نہ کرے میں اس کی بنائی ہوئی چیزوں کی حفاظت کروں گا ایسے میں' میں اپنے کو بھگوان سے بھی اونچا محسوس کر رہا ہوں۔''

پھر بولا: ''میں لوگوں کو بھی الزام نہیں دیتا۔ ہر ایک یقیناً وہی راستہ منتخب کرے گا جو آسان سادہ اور سیدھا ہو۔ فائدہ دینے والا اور مستقبل کو محفوظ بنا دے مگر مجھے معلوم ہے کنول کماری ٹھاکر کبھی آسان راہوں پر نہیں چلے گی۔ کئی اور جن کو ہم نہیں جانتے کئی ایسے بھی ہیں جو اس راہ پر چلیں گے اور اس شام اپنے بیٹھنے کے کمرے میں مطمئن' خوش اور منزل کی طرف کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے' راجندر پرشاد سکینہ کو چھوڑ کر جب میں باہر نکلا ہوں تو چاند کی نکھری ہوئی روشنی رات

کو دن بنا رہی تھی۔ رات اتنی خوبصورت تھی کہ میں نے سوچا کہ اگر آج رات میری زندگی کی بھی آخری رات ہو تب بھی مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ ایسی حسین رات کے سپنے میں دفن ہونا بھی محبت اور سکون کی فتح ہوگی۔"

گھر پہنچا ہوں تو من موہن میرا انتظار کر رہا تھا۔ کہنے لگا: "میں شام سے آیا بیٹھا ہوں۔ دو ایک جگہ فون کر کے پوچھا تم ملے نہیں۔ میں نے سوچا یہیں بیٹھ کر ان کنول کے پھولوں کو دیکھتا تمہارا انتظار کروں۔"

بولا: "تمہاری بیٹی اتنی سگھڑ اور اچھی ہے۔ چائے نہ پلواتی۔ وہ تو یہاں بیٹھی مجھ سے باتیں بھی کرتی رہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تھا۔ آنے والے زمانے میں حالات کا ساتھ دو گی یا خیالات کا۔"

"اور جانتے ہو اس نے کیا کہا۔ اس نے ہنس کر کہا' حالات بدل جایا کرتے ہیں خیالات کا ساتھ دینے سے انسان کم از کم اپنے ساتھ تو وفاداری کر سکتا ہے۔ مجھے یہ بتاؤ ایسی باتیں کیا اسے تم سکھایا کرتے ہو؟"

میں نے کہا: "بینا کنول کماری ٹھاکر کی شاگرد ہے۔ یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔ وہ بینا کو ہی نہیں باقی بچیوں کو بھی اس طرح تربیت کر رہی ہے۔" پھر من موہن بولا: "میں یہاں اپنی ایک دوست مسز بھٹنا گر سے ملنے آیا ہوں۔ وہ کسی پارٹی میں مدعو تھیں' میں تمہارے ہاں چلا آیا ہوں۔"

میں نے کہا: "مسز بھٹنا گر وہی جو انسپکٹرس آف اسکولز ہو کر آئی ہیں۔ تمہاری ان سے کیسی دوستی ہے؟"

ہنس کر بولا: "ہر بات کی وجہ نہ پوچھا کرو دوست اور اصل میں دنیا میں واقعات بغیر علت و علل کے ہوا کرتے ہیں۔ جب مذہب نے مجھے سہارا نہ دیا' مجھے کوئی بھی راہ سجھائی نہ دی تو میں نے پھر عورت کے قرب میں راحت ڈھونڈنی شروع کر دی۔ عورت جوان ہو' باتیں کرنا جانتی ہو' تعلیم یافتہ ہو' اسے اپنے کو حسین بنانے کا طریقہ آتا ہو تو چل جائے گی اور پھر عورت کی سب سے بڑی کمزوری محبت سے زیادہ اس بات کا احساس کہ اسے کوئی چاہ سکتا ہے' پھسلانے کو کافی ہے۔"

میں نے کہا: "ڈون وارٹن سے معافی کیوں نہیں مانگ لیتے۔ یہ زیادتی ہے کہ تم خود تو عورت کے وجود کا ذکر ایک بے جان کھلونے کی طرح کرو اور اگر ایک غیر ملکی وہی بات کرے تو اس

کے منہ پر تھپڑ مار دو۔"

من موہن نے کہا: "مگر میں اب بھی ان ستونتیوں کا ذکر نہیں کر رہا۔ بھائی میں تو اب بھی اس گوشت کے اس ہیولے کا ذکر کر رہا ہوں جو رنگوں سے مزین ہے مگر نور سے خالی ہے۔ جس میں کم طلبی اور تہی دامنی کی بیماری ہے جس میں علم معجزہ نہیں بنا۔ میں مسز بھٹنا گر کا ذکر کر رہا ہوں، کنول کماری ٹھاکر کا نہیں۔"

میں نے کہا: "تو اس رات بھی ڈون وارٹن کو سمجھا سکتے تھے کہ ہندوستان کی عورت کے وجود سے اس قسم کے رنگ و نمود کے ڈھانچے نکال دیئے جائیں۔"

کہنے لگا: "مگر مصیبت تو یہ ہے کہ ان کو نکالا نہیں جا سکتا۔ جن عورتوں کو میں ڈھونڈتا ہوں، وہ صرف میرے خوابوں میں رہتی ہیں۔ میں خوابوں میں گھومتا ہوں۔ مجھے روح کی تلاش ایک وقت میں تھی۔ اب نہیں رہی، اس لیے نہیں کہ وہ روح معدوم ہے بلکہ اس لیے کہ وہ روح مجھ سے بلند اور عظیم ہوگی۔ میں اپنے سب گناہوں کے باوجود اسے پا نہ سکوں گا۔ میں اسے چھونے اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا اور اس لیے میں اب عورت کے قرب میں، اس کے سستے پن میں، اس کی خود فریبی میں، اس کی خود پسندی، خود نمائی اور خود ستائی میں پناہ لیتا ہوں۔ اگر ایسی عورتیں نہ ہوں تو زندگی ایک بار بن جائے گی۔"

میں نے کہا: "ہیرا بائی ہے۔"

اور من موہن نے میری طرف دیکھ کر کہا: "تم جانتے ہوئے بھی نادان بنتے ہو۔ کیا ہیرا بائی خود فریبی اور خود پسندی ہے؟ کیا وہ خود آرا ہے؟ موسیقی اس کے لیے ایک فن ہے جس کی پناہ میں وہ اپنے آپ کو کھو کر اپنے کو پانا چاہتی ہے۔ وہ تو اس کا ایک خول ہے جس میں اپنے سے بچنے کے لیے وہ زندہ رہتی ہے۔"

"اور مسز بھٹنا گر؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا: "وہ بھی خول میں پناہ گزین ہے کیا؟"

"نہ جانے تم دو متضاد چیزوں کا ذکر بیک وقت کیونکر کرنے لگتے ہو۔" من موہن نے کہا: "ہیرا بائی مسز بھٹنا گر ابتدا اور انتہا ہیں۔"

اچھا میں نے کچھ سمجھتے اور یونہی ہنستے ہوئے کہا۔ "ایسا ہی ہوگا مگر مسز بھٹنا گر نے بھی تو بھگوان کی شرن ڈھونڈی ہے وہ تو اچھی اور پاکباز ہے۔ بھگوان کی شرن کے لیے کوئی ذریعہ تو نہیں چاہیے وہ تو مندر اور مورتی کہے اور کلیسا میں ہے، پر سوال تو دل کا ہے بھٹنا گر نے کہا وہ ہندو ہوگئی۔

کوئی اور کہے گا وہ پھر عیسیٰ کی بھگت بن جائے گی۔ من موہن نے کہا۔

''اور پھر بھی تم اس سے ملنے آتے ہو۔'' میں نے پوچھا۔

اسی لیے آتا ہوں کہ مجھے وقتی راحت کی ضرورت ہے۔ سستی چیزوں سے جی بھر جاتا ہے تو طبیعت کی مشکل پسندی کھوئی ہوئی' بھلائی ہوئی چیزوں کے باوجود احساس دلاتی ہے۔ دیرابھٹناگر بھی چمکنے والی کھوئی ہوئی انگوٹھی ہے میں اسے پھر پہنوں گا۔''

میں نے کہا: ''وہ تمہاری راہوں کی جستجو کیا ہوتی ہے۔ منزل کی طرف جانے اور اپنے اندھیرے سے گھبرانے کی تمنا۔ روشنی کی ضرورت۔''

کہنے لگا: ''ہمارے لیے مذہب بھی ایک جنون ہے۔ بوڑھی عورتوں کی طرح میں بھی کبھی کبھار ڈھکے چھپے درد سے بے تاب ہو جاتا ہوں۔ روح کی ضرورت اتم ہے' پر میں اتم کے لیے کوشش کرتا ہوں نہیں۔ میرے لیے شراب کا جام دل کا درد اور اپنی شکست اپنی تباہی کا تماشا دیکھنا ہی کافی ہے۔ میں تو ایک ہوا ہوں جسے کہیں قرار نہیں جسے کہیں بار نہیں' سمجھے! مگر یہ تو بتاؤ اس غلغلے اور آنے والی قیامت کے دنوں میں کیا کرنے والے ہو' تم تو حکومت کی خوب مدد کرو گے۔ کانگریس کامیاب ہو جائے تو اپنی چاندی ہی چاندی ہے بھائی۔''

میں نے کہا: ''کانگریس کیا عالمگیر انسانیت کے مذہب کا نام ہے؟''

من موہن نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا: ''تم بھی مُکتی اور نجات کے انسانیت کی راہوں سے سفر کرو گے۔ موج مناؤ دوست۔ ہم تو کسی ایسی راہ پر نہیں چل رہے۔ میں تو جینا چاہتا ہوں اور عیش سے اس لیے میں کسی خیالی دنیا میں نہیں رہوں گا۔ شوبھا بھی بیکار کی باتوں میں کھوگئی ہے۔'' میں نے کہا: ''جب بھی تم آتے ہو تمہارا رنگ نیا ہوتا ہے۔''

من موہن نے کہا: ''تم ایک وجود میں رہتے ہو۔ میں بیک وقت ایک عاشق' ایک انسان' ایک سیاست دان' دونوں ہاتھوں سے دولت کمانے والا' روپیہ لٹانے والا اور نہ جانے کیا کیا ہوں۔ میں ان سب وجودوں میں ہوں' اس لیے تم کو بتا رہا ہوں کہ آج مسز بھٹناگر سے مل کر اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ جاؤں گا۔ اپنے ایک پرانے وجود کی طرف واپس ہی چلا جاؤں گا۔''

اور میں سوچ رہا تھا واقعی وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ انسان محض ایک نہیں ہے۔ وہ تو کئی راہوں سے سفر کرتا ہے۔ چکروں میں گھومتا ہے۔ اپنے کو اونچا کرنے کے لیے وہ کئی پستیوں سے بچتا ہے۔ ان رخنوں کو بند کرتا ہے جن سے انہیں خدشہ ہوتا ہے۔ کوئی اس کے وجود کے اندر

جھانک سکے گا اور سارا وقت اکائی بننے کی، واحد وجود بننے کی کوشش میں لگ کر وہ اپنے باقی رخ بھولنا چاہتا ہے مگر ان آئینوں میں جو اس کے گرد ہیں، اسے اپنا جلوہ نظر آتا ہے۔ من موہن باتیں تو پتے کی کہتا ہے۔

میں نے کہا: ''ڈون وارٹن سے ملو گے؟''

کہنے لگا: ''باہر رات اتنی روشن ہے۔ ایسی رات کو ضائع کرنا میری لُغت میں کفر ہے۔ میں ویرا کے پاس جا رہا ہوں۔ ڈون وارٹن سے کبھی ملو تو اس سے کہنا میں بھی اس کی طرح اکیلے سمندروں پر سفر کرنے نکلا ہوں مگر مجھ میں ہمت نہیں اور اس لیے میں پرانی محبتوں، پرانی ہوسناکیوں کی طرف واپس لوٹتا ہوں۔ ویرا کے چہرے کی روشنی نہیں اس کی تاریکی مجھے بھا گئی ہے۔ میں تمہیں کبھی اس کو نزدیک سے دکھاؤں گا۔ عورتوں کے لیے اس میں کوئی جاذبیت نہیں ہوگی۔ وہ عورتوں سے ملنا بھی پسند نہیں کرے گی۔ مردوں میں اسے کھل کھیلنے اور اپنی چمک دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ وہ اندھیرے کے پھول کی طرح کھل اٹھتی ہے۔ اس کی اپنی کشش ہے جو تمہیں کسی اور عورت میں نظر آئے گی نہیں۔''

میں نے کہا: ''کیا پئے ہوئے ہو۔ عورت کا ذکر یوں کر رہے ہو جیسے وہ کوئی پسندیدہ کھلونا ہو۔''

وہ اس رات کی طرح ہنسنے کی کوشش کو دبانے لگا اور بولا: ''بھائی تم سمجھ ہی نہیں پاتے میں تو رنگین ہیولے کا ذکر کر رہا ہوں عورت کا نہیں۔ ویرا عورت نہیں ایک سہارا ہے۔ رسان سے باتیں کرنے والی اپنی ہنسی سے تمہارے وجود میں گرمی پیدا کرنے والی، وہ اپنا سب کچھ تج نہیں دے گی۔ وہ تم میں سے کچھ لے گی نہیں، اس میں کوئی ایسی طاقت نہیں کہ تمہارے سینے میں بلندی، عظمت پیدا کر لے۔ وہ تمہاری روح کے تار نہیں چھو سکتی۔ وہ عورت نہیں ایک رنگ ہے۔

میں نے پوچھا: ''شوبھا سے ملے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟''

کہنے لگا: ''یہ تو تم کو بتانے آیا ہوں۔ شوبھا نے ڈائنیل سے طلاق لے لی ہے۔ نہ جانے اب وہ کس وجود میں ذکرِ سفر کر رہی ہے۔ عورت ایک معمہ ہے اور اسی لیے میں ویرا کی طرف واپس پھرا ہوں۔ کہیں اسے بھی نہ کھو دوں۔''

شوبھا انہیں راہوں سے واپس پھر رہی تھی۔ شوبھا مکتی اور نجات کے لیے اس عذاب جانکاہی کا سہارا لے رہی تھی جو بعض اوقات صرف دکھ ہوتا ہے، نجات نہیں لاتا۔ مگر اس کا خط آئے

عرصہ ہو گیا ہے۔ نہ جانے کیوں اس نے ڈائنیل سے اپنی علیحدگی کا مجھے نہیں لکھا تھا۔

من موہن جانے کے لیے اٹھا۔ میں نے کہا: ''بیٹھو دوست پھر انہی حالات میں ایسی خاموش راتیں آئی ہی نہیں۔ رنگ تو سب جگہ مل جائیں گے مگر دوست نہ ملیں گے مگر وہ چلا گیا۔ موٹر تک جاتے ہوئے پرانے شرابیوں کی سی لڑکھڑاہٹ اس کے قدموں میں تھی۔ نہ جانے کن خیالوں نے اسے مدہوش کر رکھا تھا۔

بینا ملی تو بولی: ''کبھی کبھار تو آپ بالکل الوپ ہو جاتے ہیں۔ بابا آج آپ کے دوست نے بلوایا تھا۔ مگر ایسی رات میں تو جانا بے کار ہوگا۔'' میں نے کہا ''چلو تم بھی ساتھ چلو۔'' پھر ہم نے نروپما سے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ اُپی بیمار تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اپنی نحیف سی آواز میں بولا۔ ''بابا دیکھیے میں اس تلوار سے سب مسلمانوں کو ماروں گا'' اور اس نے اپنے سرہانے سے لکڑی کی چھوٹی سی تلوار نکال کر میرے ہاتھ میں دے دی۔ وہ لکڑی کا رنگین ٹکڑا میرے ہاتھ میں تھا اور میں سوچ رہا تھا یہ زہراب بہت دور پھیل چکا ہے اور کوئی بھی اس کا تریاق نہیں بن سکتا۔ اُپی میرا بیٹا ہے۔ میں اپنی پالیسی بنانے' ترتیب دینے' لوگوں سے ملنے میں اتنا مصروف رہتا ہوں' میں نے کبھی اس بات کی طرف توجہ نہیں دی کہ میرے گھر میں آگ لگ رہی ہے۔

تلوار اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے میں نے کہا: ''اُپی بیٹا بری باتیں کیوں کرتے ہو۔ کون یہ سب باتیں سکھاتا ہے۔ کس نے تمہیں تلوار لا کر دی ہے؟''

نروپما بولی۔ ''تم تو ہر اس بات کو جو تم نہ کہو' برا کہنے لگتے ہو اور اگر بچوں کا خیال نہیں رکھ سکتے تو کیا میں بھی نہ کروں۔ انہیں دھرم کرم کی باتیں نہ سکھاؤں۔''

اس سے کچھ کہنا بے کار سمجھ کر میں نے بینا سے کہا'' آؤ چلیں۔'' راستے میں میرا دماغ جل رہا تھا۔ اب تو وقت ہی نہیں رہا۔ جانے کل ہی کیا ہو جائے۔ ہم انسانیت اور اپنی راہوں کو دیکھنے میں لگے رہے اور کام کرنے والے کام کر گئے۔ میرے پاس بیٹھی بینا کا چہرہ موٹر کے اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔ اس کی ساڑھی کا پلو سر پر ڈھنپا تھا اور پھر بھی چہرے کی سفیدی ساڑھی کے مقابلے میں زیادہ واضح تھی۔ اگر کوئی بھی میرا ساتھ نہ دے گا تو میری بیٹی بینا تو ہوگی۔ ہم دونوں باپ اور بیٹی آخری وقت تک لڑتے رہیں گے۔ وہ بھی خاموش تھی۔ شاید اُپی کی بات سن کر اسے بھی رنج ہوا تھا۔ وہ میری طبیعت سے بھی واقف تھی۔ پھر آہستہ سے اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی: ''بابا آپ اداس کیوں ہو گئے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔

زندگی اور موت کی راہوں پر آپ کے ساتھ انسانیت کو بچانے اور نیکی کے لیے اگر مجھے مرنا پڑا تو آپ مجھے پیچھے نہیں پائیں گے۔"

اور آج اس رات کے اندھیرے میں کھڑا میں بینا سے کیسے کہوں، بیٹی تم تو سہاگ کے گیتوں کے درمیان وداع ہو گئیں۔ میری جو کبھی کبھار ناکامی اور پریشانی کے لمحوں میں میرا سہارا بن جایا کرتی تھیں۔ تم جو میرے دل کی بات سمجھتی تھیں۔ میں نے تم کو اپنا وجود سمجھ کر اپنے خوابوں میں تم کو پورا کرنے کی سعی کی تھی۔ نروپما نے تم کو سسرال بھجوا دیا۔ ٹھیک ہی تو بات ہے۔ بیٹیاں پرایا دھن ہیں۔ تم سدا ان بڑی بڑی کھڑکیوں پر بنے کنول کے پھولوں کی روشنی میں بیٹھ نہ سکتی تھیں۔ تم کو بھی باقی دنیا کی طرح اپنے وجود کے دوسرے حصوں میں سفر کرنا تھا اور بیٹی تمہارا دکھی باپ کتنا اکیلا ہے۔ اب مجھے تو ان خیالات کا سہارا بھی نہیں رہا، جن کو ساری عمر میں موتیوں کی طرح اپنے سینے میں پرورش کرتا رہا۔ بیٹی بینا میرے دل میں اتنا اندھیرا ہے، میں اتنا اکیلا ہوں، کوئی بھی نہیں۔ اب تو مجھے کوئی توقع نہیں۔ کوئی امید نہیں مگر میں سہارے کیوں ڈھونڈ رہا ہوں۔ ساری عمر خیالوں کے جن تانوں بانوں میں میں موتی پروتا رہا، وہ تانا ہی جل گیا۔ بینا بیٹی تمہیں کبھی اپنے اکیلے باپ کا خیال نہیں آیا جو تیزی سے پگھل رہا ہے جو بڑھاپے کی نہیں موت کی حدوں میں داخل ہو رہا ہے۔ کنول ٹھاکر کے بعد کون سی ایسی روشنی رہی ہے جس کے سہارے میں جی سکوں اور بینا بیٹی تم بھی دور ہو، تمہارے اور میرے درمیان جانے کتنی دوری ہے؟ رام دلارے تم ہی بتاؤ!

اس سے پہلے کہ ہم کسی آفت سے دوچار ہوتے کسی مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر پاتے، مصیبت ہمارے سروں پر تھی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ خدا ایک بار آسمان سے زمین پر اس مشین کو الٹا گھمانے کے لیے آیا تھا۔ انسان ذرّوں میں تبدیل ہو گئے تھے اور ساری سطح برف سے ڈھنپ گئی۔ ہر طرف سکون ہو گیا تھا، امن ہو گیا تھا۔ سناٹا نہیں اصل امن جس کے بعد کسی شور و شغب کی توقع نہیں تھی۔ اس دن صبح کے ساتھ میں نے سوچا تھا، بھگوان کے ووٹ اس مشین کو الٹا گھما رہے ہیں، اسی لیے دنیا چیخ رہی ہے۔ نعروں کی صدائیں آتیں۔ پھر آگ کے شعلے لپکتے۔ بارش متواتر ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود گولیوں کی دھائیں دھائیں۔ خطرے کے سائرن۔ مشین گنوں کے چلنے کی گونج، اگر قیامت ایسی ہی ہو سکتی ہے تو قیامت آ گئی تھی۔ میں نے لوگوں کو نہا کر نئے کپڑے پہن کر تلک لگاتے اور بھگوان کی مورتی کے سامنے

تلواریں اٹھا کر سوگند کھاتے دیکھا۔ نفرت کی آری سے وجود کو کاٹا جا رہا تھا۔ پرخچے اڑائے جا رہے تھے۔ مذہب کی دھجیاں اڑ رہی تھیں۔

ان منظّم اسکیموں اور حملہ کرنے کے موقعوں کا مجھے کیا معلوم تھا۔ میں بھی راجندر کی طرح اس سارے جھنجھٹ سے بے خبر تھا۔ آج سوچتا ہوں پالیسی اور خاموشی ہر کام میں ضروری ہیں۔ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے خطرے سے بچنے اور اس کو سمجھنے کے لیے اپنے نظریوں اور خیالات کو پس پشت ڈالنا پڑتا ہے تاکہ وقت کی نزاکت کا احساس ہو جائے۔ چندر شیکھر اور گنگا دھر کو اتنا صاف جواب دینے کی غلطی ہم تینوں نے کی تھی۔ میں نے بھی، راجندر نے بھی اور ہم سب سے عقلمند اور سوچ سمجھ کر بڑھنے والی کنول نے بھی اور اس لیے ہم تینوں نے اس غلطی کا خمیازہ بھگتا ہے۔ سچائی میں بھی اندھی طاقت ہوتی ہے مگر پالیسی اور رازداری میں ایک دیکھی بھالی اور بجلی کی مشین کی سی تیزی اور طمانیت، سیاست کی مشین کے بٹن دبانے سے جو لہریں حرکت میں لائی جاتی ہیں، ان سے سچائی بے خبر انجان ہوتی ہے، اس لیے جہاں کہیں سچائی بجلی کی لہروں سے چھو جاتی ہے، اسے مفلوج کر دیا جاتا ہے۔ اس میں سکت نہیں رہتی۔

اور ہماری سچائی سے بھی اسکیموں کی لہریں ٹکرا گئیں۔ اس دن میں نے اپنے آپ کو اپنے گھر میں مقیّد پایا۔ لوگوں نے مجھے دھمکیاں دیں کہ تم اگر اپنی انسانیت اور انسان پرستی کا جھنڈا لے کر باہر نکلے تو قتل کر دیئے جاؤ گے۔ تم نہیں نکل سکتے۔ تم کہیں جا نہیں سکتے۔ نروپما بھی ایک ظالم کی طرح میرے خلاف ہوگئی۔ وہ ہنستی تھی اور کہتی تھی اپنا دھرم سب سے اچھا ہے۔ ہم پرماتما کی بلندی کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ ہم سب مسلمانوں کو قتل کر دیں گے۔ میں نے پوری قوت سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ میں نے اس سے چیخ کر کہا تھا، چپ رہو۔ میری موٹر بغیر اجازت کے حملہ آور لے گئے۔ پولیس اور کرفیو کے پردے میں محلّوں کے محلّے صاف کر دیئے گئے۔ ہر لمحہ فضا میں لہریں سی بلند ہوتیں، چیخ و پکار اور دردناک پریشان کن صداؤں سے آسمان اور زمین کے درمیان کا خلا بھر گیا تھا۔ میرے دروازے پر چار سپاہی حفاظت کی خاطر مگر اصل میں مجھے گھر سے باہر جانے سے روکنے کے لیے تعینات کر دیئے گئے تھے۔ میرے کمرے سے ٹیلی فون اٹھا لیا گیا۔ میں بے دست و پا پرندے کی طرح تھا۔ انہیں بینا کا پتہ نہیں تھا۔ بینا مجھ سے زیادہ عقل مند ہے، وہ خاموش چپ چاپ ماں کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔ صبح سے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ میں چڑیا گھر میں بند شیر کی طرح اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ نوکر میری چائے لایا۔ نوکر کھانا لایا۔

میرے دروازے کے سامنے سپاہی ہنستے قہقہے لگاتے اور چیخ و پکار کی آوازوں کو سن کر خوش ہوتے رہے۔ ان کے کندھوں پر بھری ہوئی بندوقیں تھیں۔ سامنے سڑک بالکل سنسان تھیں۔ کبھی تیزی سے کوئی ملٹری لاری اڑتی ہوئی گزر جاتی۔ بارش ہو رہی تھی۔ آسمان پر بادل نہیں تھے۔ ایک گہرے جوہڑ کی سی گندگی سے پانی ٹپ ٹپ نیچے گر رہا تھا۔ گرج کی آواز سنائی نہ دیتی۔ بادل اڑتے ہوئے دکھائی دیتے۔ ایک کھلا ہوا کیچڑ آسمان پر پھیلا تھا جس سے پانی ٹپک رہا تھا۔ درخت سر نیہوڑائے خاموش کھڑے تھے۔ پرندے بھی اڑ گئے تھے۔ میرے کمرے کی چھت میں چڑیا کا گھونسلا بھی آج سنسان تھا اور میں کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتا تھا۔ کنول کے پھولوں کو دیکھ کر مجھے ہر گھڑی کنول کی یاد آ جاتی۔ وہ بھی میری طرح اکیلی ہوگی اپنے کالج میں مقید۔ شاید راجندر بھی اور ہماری طرح کے صدہا اسی طرح مقید ہوں گے جس نے انسانیت کے نام پر آواز اٹھائی اسی کا گلا دبا دیا جاتا تھا۔ اسے ہی قتل کر دیا جاتا تھا۔ ایک پاگل پن اور جنون مذہب کے نام پر پھیل گیا تھا۔ کوئی حکومت نہ تھی۔ انقلاب اور درندگی کا راج تھا۔ ہندوستان نے ایسے پریشان خواب کبھی کاہے دیکھے ہوں گے اور پھر بھی میں چار سپاہیوں کی بندوقوں کا نشانہ بنائے جانے کے لیے زندہ تھا۔ اگر میں ذرا سی حرکت بھی کروں، اگر میں قدم اٹھاؤں تو کئی بار میں نے سوچا اس کمرے میں بند ہوں اور باہر انسان مر رہا ہے، قتل کیا جا رہا ہے، نہ جانے کیا ہونے والا ہے، شہر کی حالت کیا ہے؟ پھر میں نے سوچا، جانے بینا کچھ تو کر رہی ہوگی، میری اپنی بیٹی بینا جس نے میری مصیبت میں، مجھے سہارا دیا ہے وہ مجھے سمجھتی ہے، جسے میرے دل کی تمناؤں کی اسی طرح خبر ہے جیسے میں خود جانتا ہوں۔

اور وہ سارا دن گزر گیا۔ سپاہی ہنستے رہے، بارش ہوتی رہی، نعروں کی صدائیں، کھڑکیوں سے اٹھتا دھواں، دکھائی دیتا رہا۔ آگ کے شعلے چیخ و پکار، مگر میرے گھر میں خاموشی تھی۔ چیخ و پکار کی صدائیں صرف میرے دل میں تھیں۔ میں بالکل اکیلا تھا۔ صبح سے شام تک میرے پاس کوئی بچہ بھی نہیں آیا۔ سپاہی بہت خوش تھے۔ آپس میں آنے والے واقعات اور حادثات کی باتیں میرے کانوں میں بھی پڑ جاتیں۔ وہ محلوں، گلیوں میں قتل و غارت کی باتیں اس طرح کر رہے تھے جیسے اس سے پسندیدہ مشغلہ کوئی اور نہ ہو۔

پھر رات ہوگئی کیونکہ شہر کی تاریکی میرے گھر کے گرد منڈلاتی ہوئی نیچے اتر آئی تھی۔ برآمدے کے ساتھ کمرے میں سپاہی پناہ لے چکے تھے مگر میرے لیے وقت یکساں تھا۔ میں نے

صبح سے نرو پما کو نہیں دیکھا تھا۔ میرے ہر طرف دروازے بند تھے۔ میں قید تھا۔ نہ جانے کیا بجا ہوگا۔ جب میرے غسل خانے کی کھڑکی پر کھٹکا سا ہوا۔ پہلے تو میں نے سوچا' ان آرزوؤں کا کیا ہے۔ نہ جانے بارش تیز ہوگئی ہوگی مگر آواز پھر آئی۔ میں نے اٹھ کر جھانکا یہ دیکھنے کے لیے کہ کون ہوسکتا ہے۔ میں کھڑکی کے پاس گیا۔ نہ جانے کون ہوسکتا ہے۔ کیا ہے اور مجھے ڈر بھی کس کا ہوسکتا ہے۔ میں تو نیم مردہ ہی ہوں اور پھر بینا کی دبی دبی آواز آئی۔ بابا آپ جاگ رہے ہیں۔ میں تیزی سے کھڑکی کے اور پاس ہوگیا۔ پھر کسی شے کے ٹوٹنے کی آواز آئی اور کھڑکی میں سے سر نکال کر بینا نے کہا: ''جلدی آیئے جلدی کیجئے میں نے سپاہیوں کو چائے میں خواب آور دوا پلا دی ہے۔ جلدی آیئے بابا'' میرے پاؤں میں سلیپر تھے۔ کھڑکی سے کودتے ہوئے سلیپر بھی گر گئے۔ میں ننگے پاؤں اپنی بیٹی بینا کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے جا رہا تھا۔ پچھلے دروازے کے قریب پہنچ کر بینا نے کہا'' ''مجھے اور بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اچھا بابا آپ کو میں پرماتما کو سونپتی ہوں۔ اگر ہم ایک انسان کو بھی بچا سکے تو ہماری کوشش سپھل ہو جائے گی۔ بابا گھبرانا نہیں'' اور میں نے بینا کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ ''بینا میری بیٹی میں کہہ نہیں سکتا کہ کیا کرسکوں گا مگر جو بھی ہوسکا تم مجھ پر یقین رکھو' موت بھی مجھے اس راہ سے ہٹا نہ سکے گی۔'' پھر میں ننگے پاؤں پچھلے دروازے سے نکل کر اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا بینا ابھی تک اپنی سیاہ ساڑھی کو سنبھالتی وہاں کھڑی تھی۔

یہ سب باتیں اب زمانوں کی دوری سے زندہ اور پھر بھی مُردہ دکھائی دیتی ہیں۔ یہ واقعات ہم سے صدیوں کے بعد پُر ہیں اور اس کے باوجود میں سمجھ نہیں پاتا کہ ہم سب درندہ وحشی کیوں ہوگئے تھے۔ نام اور مذہب کیا عذاب ہیں؟

سب سے پہلے مجھے کنول کماری کا پتہ نکالنا تھا۔ نہ جانے اس پر کیا بیتی ہوگی' مگر اس طرح جانے اور کھلم کھلا حالات معلوم کرنے کا نتیجہ پھر گرفتاری ہوسکتا تھا اور ایسے میں' میں نے ڈون وارٹن کا سوچا۔ وہ میری مدد کرسکتا تھا۔ اس سے مل کر کسی سواری کا بندوبست کروں گا۔

میں گشت پر سپاہیوں کی نظروں سے بچتا' آڑ لیتا اور باڑوں میں چھپتا' جمنا کے کنارے اس بڑے ہوٹل کے دروازے کے سامنے چلا گیا۔ آج دروازے کے سامنے کوئی سپاہی نہ تھے۔ شاید ہوٹل کی حفاظت کی ضرورت نہ تھی۔ دوسری منزل پر وارٹن کا دروازہ کھٹکھٹا کر جب میں نے کواڑ کھلوائے تو اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں کوئی بھوت تھا۔ میں نے کہا: ''دیکھ کیا

رہے ہو، کیا کسی موٹر کا بندوبست کر سکتے ہو؟'' ڈون وارٹن نے مجھے کھینچ کر اندر کر لیا اور بولا: ''موٹر تو ہے مگر اس کرفیو کی لعنت کا کیا کیا جائے۔ میں صبح سے چار دفعہ کنول کماری کو فون کر چکا ہوں۔ وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا۔ تم کہاں تھے، اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ میں نے صبح سے تم کو پانچ بار فون کیا ہے اور پھر ادھر ادھر سے تمہارا پتہ کرنے کی کوشش کی۔ تم سب انسان پرست کن کونوں میں چھپ گئے ہو۔ کیا پہلی ضرب پڑتے ہی تمہارے حواس کھو گئے اور میں اپنے آپ کو اتنا اکیلا محسوس کر رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے میں غیر ملکی ہوں۔ کتنا اکیلا ہوں۔''

پھر میری طرف دیکھ کر بولا: ''کہاں سے بھاگ کر آ رہے ہو ننگے پاؤں کیوں ہو؟''

میں نے کہا: ''یہ باتیں بتانے کا وقت نہیں۔ جلد از جلد کسی موٹر کا بندوبست کرو، کنول اکیلی ہے۔''

''کنول اکیلی ہے۔'' ڈون وارٹن نے جواب میں بولنے والوں کی طرح کہا: ''پر کئی اور عورتیں بھی تو اکیلی ہیں۔ صبح سے اتنی چیخ و پکار ہو رہی ہے۔ ایک قیامت ہے اور تم صرف اس لیے بھاگ کر آئے ہو، موٹر کو پوچھ رہے ہو کہ کنول کی مدد کو جا سکو۔ میں قطعاً کوئی موٹر نہیں لاؤں گا۔ تم انسانیت میں ہی اس کی خاطر کام کرنا چاہتے ہو۔ میں تمہیں بتاؤں ایک انسان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم واپس اپنے گھر جاؤ۔''

اس کے پلنگ پر بکھری کتابوں اور کپڑوں کے درمیان ننگے پاؤں بیٹھا اپنے آپ کو ایک کھوئے ہوئے چھوٹے اور ذلیل کیڑے کی طرح سمجھ رہا تھا۔ ڈون وارٹن کی میز پر رکھی بدھ کی مورتی کے چہرے پر سیاہی تھی اور آنکھوں کی شانتی گھبراہٹ میں بدل گئی تھی۔ اٹھی ہوئی انگلی افسوس کرنے والوں کی طرح ہونٹوں کی طرف جاتی لگتی تھی۔ اے بدھ بھگوان سوچ رہے ہو کہ وہ تو پتھر میں غائب اور قید ہیں۔ ان کے گرد دنیا مر رہی ہے۔ چیخ رہی ہے، پکار رہی ہے۔

وارٹن بولا ''اگر شہر کی طرف چلتے ہو تو میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ میرے بھائی انسانیت کے نام پر کام کرنے اٹھے ہو تو کسی عورت کو کیوں بچانا چاہتے ہو۔ کسی ایک کی ہی حفاظت کیوں کرنا چاہتے ہو اور پھر کنول ٹھاکر میں خود طاقت ہے اگر وہ نہ بھی بچ سکی تو کیا ہو جائے گا اور اندازے سے میں کہتا ہوں کہ اسے کوئی شے بھی نہیں چھو سکتی۔ اسے کوئی بات تکلیف نہیں دے سکتی۔ تم کیوں سمجھتے ہو کہ وہ بھی کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔ اس کی وہ عظمت کیا خطرے کے ایک

حملے سے ڈھے جائے گی۔ کیا وہ ریت کا محل تھا جو مسمار ہو جائے گا۔"
میں خاموش بیٹھا رہا۔ میرے چہرے پر لکھی پژمردگی نے وارٹن کو تھوڑا نرم کر دیا۔ اس نے کہا" "میرے بوٹ پہن لو۔ کپڑے بدل ڈالو۔ یہ ہیٹ اپنے سر پر ذرا جھکا لو۔ پھر ہم دفتر جا کر کرفیو پاس لے آئیں گے۔ میں نے انہیں فون کر رکھا ہے۔ دو کرفیو پاس کافی ہوں گے۔" پھر میری طرف دیکھ کر بولا" "مگر وہ تمہارے لیے پاس نہیں دیں گے۔ تم انقلاب کی زد میں ایک تنکے کی طرح ہو مگر چور تو ہر صدا سے ڈرتا ہے نا۔"
شہر میں جانا ناممکن تھا۔ باہر کی خاموشی کے مقابلے میں اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ اندر کوئی کرفیو نہ تھا۔ ایک قیامت تھی۔ آگ کے شعلے بارش کے باوجود بند ہو رہے تھے۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ عورتیں چھتوں سے چھلانگیں لگا رہی تھیں۔ عورتیں ننگے سر، ننگے پیر بھاگ رہی تھیں۔ مرد روتے ہوئے آگ کے شعلوں میں دھکیلے جا رہے تھے۔ گولیاں چلنے کی آواز، کواڑ دھڑ دھڑائے جاتے۔ دستی بم پھینکے جا رہے تھے، چیختے اور چلاتے بچوں کو نیزوں پر لٹکایا جا رہا تھا۔ ان کو زندہ ہی آگ میں بھونا جا رہا تھا، تیل کے بڑے بڑے کھولتے کڑھاؤ تھے جن میں لڑکیوں کو برہنہ کر کے دھکا دے دیا جاتا، عورتیں بال بکھرائے وحشت سے آنکھیں کھولے بھاگ رہی تھیں۔ نازک اندام سفید لڑکیاں ننگی پتھرائی ہوئی شکلوں سے برستی بارش میں قطاروں میں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ مرد انہیں دیکھ کر ہنستے اور شراب سے مدہوش ہو کر جس کو جی چاہتا کھینچ لیتے۔ ان لڑکیوں کے آنسو کہاں تھے؟ خدا کہاں تھا، بھگوان کہاں تھا، وہ مقدس نام کہاں تھے جن کے سہارے انسان زندہ تھا۔ رحم دل حلیم پاکباز مرد کہاں تھے اور یہ سب وحشیانہ ہنستے، وحشیانہ قہقہے لگاتے، چیختے، چلاتے کون تھے۔ کیا یہ پرانے زمانے کی روحیں تھیں جن کو ابلیس نے دفعتہً آزاد کر کے دنیا میں دھکیل دیا تھا۔ رام۔ رام۔ کرتے نعرے لگاتے جے جے کار کرتے ہجوم تلواریں گھماتے، چیختے ہنستے بڑھ رہے تھے۔ انسان کی پناہ گاہیں انسان کے آسرے اور سہارے کہاں تھے؟
ڈون وارٹن نے میری طرف دیکھ کر کہا: "یوں کام نہیں بن سکتا یا تو ہم کو بھی اس آگ میں کودنا ہوگا، اگر ہم کچھ کر سکتے ہیں بظاہر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ سب کچھ اتنا ناممکن ہے اس زلزلے میں سب کچھ گڑبڑا چکا ہے۔ تم میرے ہیٹ کو اتار دو۔ آؤ اس آگ میں کود جائیں۔"
"مجھے خود اس جے جے کار میں حصہ لینے دو۔" ہم تھوڑے اندھیرے میں ہو گئے۔ میں نے وارٹن کے کپڑے اتار دیئے۔ اندھیرے میں میرا پاؤں کسی نرم شے سے ٹکرایا۔ نیچے جھک کر

دیکھا تو ایک مری ہوئی عورت کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ میں نے لاش کو دیوار کے ساتھ لگا دیا اور تلوار اس کی مٹھی سے لے لی۔ پھر میرے پیچھے وارٹن بھی ہجوم میں مل گیا۔ ہم دونوں ان لہروں کے ساتھ آگے ہی آگے بہنے لگے۔ نہ جانے کب تک اس قیامت کے غلغلے میں شریک میں اور وہ ہاتھ میں ہاتھ ایک دوسرے کی نزدیکی اور زندگی محسوس کرتے بڑھتے رہے۔ ہجوم کیا کرتا رہا؟ میں تقریباً بے ہوش تھا۔ ایک موڑ پر پہنچ کر پولیس کی گولیوں نے بتایا کہ انقلاب کی اس رو کو روکنے کی جھوٹی کوششیں ہو رہی ہیں۔ لوگ تھک چکے تھے۔ گھروں کو واپس ہوئے' راستے میں جو ہاتھ آیا' اسے قتل کرتے گھروں میں گھس جاتے۔ میری سوچنے کی ساری قوتیں سلب ہو چکی تھیں۔

پھر ایک بڑے موٹے مرد نے مجھے پکڑ کر کہا: ''پولیس آ رہی ہے۔ پولیس ہماری ہے پھر بھی حفاظت ضروری ہے۔ اس طویلے میں لڑکیاں بند ہیں۔ میں کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا۔ تم ان کی حفاظت کرو۔ مگر دیکھو ان بیس لڑکیوں سے ایک بھی کم ہوئی تو تمہاری خیر نہیں۔ مجھے اپنے بڑے افسر کے سامنے پیش کرنی ہیں۔ سمجھے۔'' وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ پولیس کی لاری میرے پاس سے نکل گئی۔ میں ایک دکان کے تختے کے نیچے چھپ گیا تھا۔ ڈون وارٹن کہنے لگا: ''اس سناٹے میں جب کرفیو پھر لگا دیا گیا ہے اور دستے گشت کر رہے ہیں ان بیس لڑکیوں کا کیا کیا جائے'' اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں وہ طویلے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اندر سے چیخنے کی آوازیں آئیں اور پھر بند ہو گئیں۔ کیا لڑکیاں چیخ بھی سکتی ہیں؟ عورت چیخ بھی سکتی ہے؟

اور پھر ڈون وارٹن اور اس کے پیچھے بیس لڑکیاں سڑک پر رینگنے لگیں۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا۔ میں بے ہوش کھڑا تھا۔ پھر میں نے بھی ان کے پیچھے رینگنا شروع کر دیا۔ ہم نہ جانے کتنی ڈھیروں' غلاظتوں' خون کے دریاؤں اور نالیوں' چیخوں کے درمیان سے گزرے مجھے خبر نہیں۔ پھر جب میں نے آنکھیں کھولی ہیں تو ہم سب بھاگ رہے تھے۔ تیز سر پر پاؤں رکھے ڈون وارٹن سب سے آگے تھا۔ لڑکیاں ہانپ رہی تھیں۔ وہ کھڑا ہو جاتا اور انہیں کہتا ''تیز بھاگو اور تیز۔'' میں نے دو لڑکیوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے گھسیٹنا شروع کیا۔ وہ پیچھے رہ گئی تھیں۔ اپنی جان کی حفاظت پرندوں کو بھی چھپنے کے طریقے سکھا دیتی ہے۔ باڑوں میں چھپتے خطرے کے سائرن کی آواز سنتے آگ کے شعلوں کو لپکتے دیکھتے' ہم بھاگ اٹھتے تھے۔ نہ جانے کدھر مجھے کچھ پتہ نہیں تھا۔

رات گہری سیاہ تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ مگر میں ڈون وارٹن کو اپنے سے بہت آگے بھاگتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ لڑکیاں دھبوں کی طرح لگ رہی تھیں اور پھر جب مجھے ہوش آیا تو

ہم ہیرابائی کے سامنے کھڑے تھے۔ اس نے بتی نہیں جلائی۔ موم بتی کی روشنی میں وہ بیس لڑکیاں ہانپ رہی تھیں، کانپ رہی تھیں۔ برہنہ پا اور برہنہ سر رو رہی تھیں۔ ڈون وارٹن نے کہا "اب وقت نہیں ہے۔ تمہیں ان کی حفاظت کرنا ہوگی" اور یہ سب کہہ کر اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور ہم دونوں سنسان سڑک پر خالی الذہن کھڑے تھے۔ کہنے لگا: "چلو آؤ اب کنول کماری کی طرف چلیں۔"

میں نے کہا: "اسے تو کوئی شے چھو نہیں سکتی۔ وہ کوئی ریت کا محل ہے جو ڈھے جائے گی۔"

ڈون وارٹن نے کہا: "مگر اس کے پاس لڑکیاں تھیں۔ مسلمانوں کی لڑکیاں بھی تھیں اور جانے کیا ہو گیا ہوگا۔ جن لوگوں نے گھروں کی تاریکیوں سے لڑکیاں نکال لیں وہ ہوسٹل کی لڑکیوں کی حفاظت کیا کریں گے۔ چلو آؤ۔"

کالج کے پھاٹک کے سامنے امن تھا۔ بظاہر سکون تھا۔ میں نے سوچا کنول ٹھاکر سو رہی ہوگی۔ اپنے بھگوان کی مورتی کے سامنے جھک کر پرارتھنا اور شرن مانگتی ہوگی اور اس کو سکون اور امن کے ماحول میں ڈون وارٹن اور میرے لیے جیسے کچھ دیکھنے اور کہنے کے لیے باقی نہ رہا ہو۔ وہاں بیٹھے رہے۔ برستی بارش میں کالج کے پھاٹک کے سامنے سے تھوڑی دور سڑک پر بیٹھ کر کہا۔

"سنو میرے بھائی یہ عورت جس کا تم ذکر کرتے رہتے ہو، جس کو تم اتنا اونچا سمجھتے ہو، مجھے اس سے محبت ہے۔"

اگر کوئی اور وقت ہوتا تو میں شاید حیران ہوتا مگر شام سے اتنا کچھ دیکھ چکا ہوں کہ عورت میرے لیے کنول کماری ٹھاکر نہیں وہ مظلوم ہستی بن گئی تھی جس کو عریاں کر کے ذلیل کر کے قتل کیا جا رہا تھا جس کو بھیڑوں کی طرح آگ میں دھکیلا جا رہا تھا، جس کا تعاقب کر کے اس کی عصمت دری کر کے اسے مارا جا رہا تھا۔

ڈون وارٹن کی آواز مجھے اپنے کان کے قریب کہتی پھر سنائی دی۔ "زندگی کم ہے۔ آج کی رات ختم ہونے سے پہلے نہ جانے کیا ہو جائے۔ یہ راز جو آج تک میرے جی کو جلاتا رہا ہے میں بتا رہا ہوں۔ آخری وقت میں ایک دوست کی ہمدردی کی ضرورت بھی نہیں ہوئی کیونکہ وقت آ رہا ہے۔ کنول کماری ٹھاکر کی آنکھیں میری آنکھوں سے کبھی مل نہ سکیں۔ اسے کبھی اپنا نہ کہہ سکا اور اس کے باوجود وہ کسی طرح میرے ملک کی سینور یتاؤں سے بھی بلند اور اعلیٰ ہے۔ وہ مجسم عورت ہے مگر......"

پھاٹک دھائیں...... دھائیں ہوا۔ پھر یکے بعد دیگرے بم پھٹنے اور چیخوں کی

صدائیں آئیں۔ ہم دونوں بھاگے۔ لڑکیوں کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نہ جانے ہم پھاٹک کو پار کر کے کیسے پہنچے ہیں۔ کالج میں لوگ بھاگے جا رہے تھے۔ آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ چیخنے، رونے اور شور کی آوازیں، پھر قریب جانے پر کراہنے، رونے اور تڑپنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اندھیرے میں کئی مرد تلواریں لے کر بھاگتے دکھائی دیئے، شعلوں کی روشنی میں مجھے چندر شیکھر نظر آیا۔ ایک لاٹھی گھماتا، شوبھا زخمی کنول کو گھسیٹتی اور آگ سے بچاتی ہوئی آئی۔ اسے دیکھ کر چندر شیکھر نے زوردار خوفناک قہقہہ لگایا۔

''اچھا تو تم یہاں بھی آ پہنچے۔ دیکھتے ہو اب حالات کا دھارا کہاں بہہ رہا ہے؟''

اور میں نے اپنی تلوار گھما کر زور سے چندر شیکھر کے سر پر ماری مگر اس سے پہلے کہ میں اس پر ہاتھ اٹھا سکوں، کسی نے میرا بازو مروڑ کر میری تلوار چھین لی۔ چندر شیکھر نے زوردار قہقہہ لگایا۔ کہنے لگا۔ ''بڑے انسان پرست بنتے ہو۔ تلوار لے کر حملہ کرتے ہو دیوانے۔'' اس نے میری آنکھ کے سامنے ہاتھ ہلا کر کہا، دیوانے اور پھر ہنسنے لگا۔ ڈون وارٹن ہجوم میں گھس گیا تھا۔ میں نے اپنا بازو چھڑا کر چندر شیکھر کی طرف جھپٹنا چاہا، کسی لڑکی کے چیخنے کی آواز آ رہی تھی۔ ''مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو۔''

پھر مجھے ڈون وارٹن کی آواز آئی۔ تم ہندوستانی ہو جو اپنی عورتوں کو مار رہے ہو، اپنی عزت برباد کر رہے ہو۔

نیرا بھاگتی ہوئی میرے سامنے سے گزر گئی۔ کنول اور شوبھا کو میں نے نہیں دیکھا۔ نہ جانے وہ کہاں تھیں۔

میں نے چیختی لڑکیوں کی اور بھی ملی جلی آوازیں سنیں۔ میں نے اپنے بازو چھڑانے کے لیے کشمکش کی۔ کسی نے زور سے میرے سر پر اپنا بلم مارا اور پھر مجھے خبر نہیں کیا ہوا؟

بہت دنوں بعد جب جاگا ہوں تو خون میری آنکھوں کے سامنے چھا جاتا تھا اور بینا کی آواز آتی تھی۔ بابا دیکھو نیرا آئی ہے۔ میں نے روتی ہوئی نیرا کی طرف دھیان کرنا چاہا مگر ساری آوازیں ڈوب گئیں۔ مجھے ساری صدائیں پرائی لگتی تھیں۔ صرف ایک صدا میرے لیے زندہ تھی۔ بابا اب تو دنیا میں کچھ امن ہو گیا ہے اور نیرا آئی ہے۔

مگر انسانی جسموں کے ٹکڑے، لڑکیوں کی آوازیں، چندر شیکھر، آگ کے شعلے میری نگاہوں کے سامنے آ جاتے۔ بم پھٹنے کی صدائیں، دھائیں، دھائیں۔ لوگ مجھے پوچھنے بھی آتے

مگر ان میں کوئی اپنا نہ ہوتا۔ ان میں راجندر نہ ہوتا۔ پھر مجھے ڈون وارٹن کبھی دکھائی نہیں دیا۔ من موہن نہیں یا میں کبھی کسی کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ یہ سارے اپنے اس طوفان میں بہہ گئے تھے۔ نہ جانے کیا تھا کوئی بات تو تھی کہ اپنے سارے اس نگر سے ختم ہو گئے تھے۔

بہت دنوں بعد میرے حواس درست ہوئے میرے گرد صداؤں کا یہ طوفان تھم گیا۔ نیرا پھر آئی۔ تب میں نے پوچھا تھا۔ ''کنول کماری ٹھاکر کہاں ہے؟'' اور روتی ہوئی نیرا نے کہا تھا' ''کنول کو شوبھا بینر جی اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔'' میں نے پوچھا تھا'' وہ کیسی ہے؟'' تو نیرا نے رونا شروع کر دیا تھا۔ نیرا نے کوئی جواب نہ دیا۔ بینا نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے دوبارہ پوچھا: ''نیرا بولتی کیوں نہیں ہو کنول ٹھاکر کہاں ہے؟''

اور نیرا نے بینا کی طرف دیکھا تھا جو اپنا منہ چھپائے رو رہی تھی۔ میں ان دنوں میں سے ایک ایک کے چہرے کی طرف دیکھتا۔ نیرا نے روتے ہوئے کہا تھا' اس رات ہوسٹل میں مسلمان لڑکیوں کو ڈھونڈنے کے لیے چندر شیکھر کے ساتھیوں نے حملہ کیا تھا۔ بم گرائے اور ہوسٹل کو آگ لگا دی۔ کنول ٹھاکر جو کئی راتوں سے جاگ کر وہاں پہرہ دیتی تھی۔ بم کے لگنے سے زخمی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ بازو ٹوٹ گیا' اسے ابھی تک ہوش نہیں آیا۔

ان آنکھوں کی طرف میں ساری عمر دیکھ نہ سکا تھا اور اب وہ ستاروں کی تابانی اور گھلے ہوئے نور کی شفاف جھیلیں اس زلزلے میں پنہاں ہو گئی تھیں۔ ان آنکھوں کو میں پھر دیکھ نہ سکوں گا۔ وہ آنکھیں جن میں آسمان کی گہرائی اور عظمت تھی۔ میں سوچ ہی نہ سکتا تھا کہ کنول ٹھاکر کو بھی دنیا کی کوئی شے ایذا دے سکتی ہے۔ زندگی میں کوئی دکھ اسے بھی چھو سکتا ہے۔

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔'' میں نے نیرا کے بازو کو زور سے پکڑتے ہوئے کہا تھا۔ ''یہ بات غلط ہے۔'' کنول کماری ٹھاکر کو بم اور فسادی کوئی تکلیف نہیں دے سکتا۔'' مگر نیرا نے رونا شروع کر دیا تھا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ بات صحیح ہو گی۔

اس دن سے میرا دل ہر بار' ہر گھڑی ہر دھڑکن کے ساتھ کہتا ہے۔ کنول ٹھاکر' کنول ٹھاکر' کنول ٹھاکر۔ مگر بینا کے زور دینے کے باوجود بھی میں نے اسے کوئی پیغام نہیں بھیجا۔ میں اسے دیکھنے نہیں گیا اور نیرا نے مجھے بتایا ہے کہ کنول خواب میں چلنے اور رونے والوں کی طرح اپنی بیہوشی کے عالم میں بھی کہتی ہے ''انسانیت کو بچاؤ' کوئی میری بچیوں کو بچاؤ' کوئی میری آن اور عزت کو بچاؤ'' عورت کی عزت کیا کہتی ہے۔ پگلی' جذباتی کون سی عزت کا نام لیتی ہے وہ۔

ہندوستان میں عورت ننگی ہے۔عورت کی عزت اور آن خاک میں مل چکی ہے۔عورت کہیں نہیں ہے۔صرف گوشت کے رنگوں کے ہیولے ہیں۔عورت کیا مذاق ہے یہ نام؟

راجندر کی جمنا کنارے کی کوٹھی اس کے مہاپرشوں کے بڑے بڑے فریموں میں منڈلاتی ہوئی تصویریں، اس کے اپنی کمانوں کو سرنگوں کیے، افسوس زدہ کیوپڈ اس کے یونانی خداؤں کے جنگوں والے پیالے، کیوپڈ شکست کھا گئے ہیں۔اور یونانی دیوتا زمین کی سرکش اور طاغوتی طاقتوں کے دوراہے میں مردہ پڑے ہیں۔راجندر پرشاد سکسینہ تمہارا وہ عزم اور ارادہ کیا ہوا، بھائی تم اکیلے تھے نا، ہندو نہ تھے، مسلمان نہ تھے، صرف انسان تھے اور اس جنگ میں تمام انسان پرست جھوٹے ثابت ہو کر پسپا ہو گئے۔تم تو کہتے تھے، تم پرماتما کی بنائی چیزوں کی حفاظت کرو گے۔تم بھگوان سے بھی اونچے ہو اور آج تم کہاں ہو؟ تمہاری ہٹ، تمہاری آن، ارے بھائی کہاں ہو آج؟ سنا ہے تم فسادیوں اور انقلاب پرستوں کے ساتھ لڑتے ہوئے مارے گئے۔بھلا تمہارے جیسے وجیہہ و شکیل انسان کے لیے یہ بھی کوئی موت تھی۔تم تو کنول ٹھاکر کو چاہتے تھے۔تم نے ایک بار اسے لکھا تھا: ”اگر ندی کی روانی اس کی ڈھلوان کی طرف بہنے میں ہے تو تم میری طرف آؤ، میں اتنے یقین سے لکھ رہا ہوں جیسے خود تمہیں کہہ رہا ہوں۔“ اور کنول ٹھاکر بھی تم سے آملی ہے۔ڈون وارٹن بھیا۔تم نے کنول ٹھاکر کو چاہا تھا۔تم نے اپنے گرد مارتی مرتی دنیا کے سکول میں بیٹھ کر مجھے بتایا تھا کہ تم اسے چاہتے ہو۔تم یعنی سینوریتاؤں کے دیس کے باسی کنول کماری ٹھاکر کو چاہتے ہو۔میں تمہیں کیا کہوں بھائی۔تمہاری چاہت اسے کیا بنا گئی او بوائے۔تم غیر ملکی ہماری عورت کو نہیں چاہ سکتے، سمجھے۔تم ہمارے ہاں سے ڈر کر بھاگے اور چلے گئے۔اپنے ساحلوں، خوابوں اور کھنڈروں کے درمیان پناہ لینے کے لیے۔

کل رات شوبھا بینر جی کے گھٹنے پر سر رکھے کنول کماری ٹھاکر مر گئی ہے اور پھر بھی مجھے بائی جی، ہیرا بائی نہیں بھول سکتی۔ہیرا بائی جس نے اپنے گھر میں پناہ گزین بیس مسلمان لڑکیوں کی آبرو بچانے کے لیے دروازے میں کھڑے ہو کر لڑتے لڑتے جان دی تھی، اس نے کہا: ”تم میری لاش پر سے گزر کر ان لڑکیوں کو لے سکتے ہو“ اور لوگوں نے کہا تھا: ”حسن کی ایک مُورت کو مٹا کر اگر مکتی مل سکے تو مہنگی نہیں۔“ ہیرا بائی ان کے کس مصرف کی تھی۔انہوں نے اس کا ستار توڑ ڈالا اور سہاگ کی چوڑیوں کے ٹکڑے بکھر گئے۔ہیرا بائی ستار اور چوڑیوں میں آہنگ ہے۔دونوں میں گیت ہیں اور گیت مجروح ہونے کے بعد فن کار کا زندہ رہنا فن سے بغاوت ہے۔تم سچی فنکار تھیں مر گئیں۔

اور تمہارے ساتھ عورت مر گئی۔انسانیت مر گئی، نسوانیت مر گئی۔آج جس طرح کنول

کماری ٹھاکر کے ساتھ ساری عظمت اور ساری بلندیاں ختم ہو گئی ہیں۔

نروپما نے زمانے کے حالات سے ڈر کر بینا کو بیاہ دیا ہے' میری اپنی بیٹی کو۔ آج میں اکیلا ہوں اور تمام یادوں سے پریشان ہوں۔ میری سونی زندگی میں اب کون آئے گا؟

اور کوئی مجھے بتائے کیا ہم نے غلط خواب دیکھے ہیں؟

شوبھا نے میری بیماری کے دوران میں لکھا تھا؟

جسمانی دکھ اور عذاب اگر روحانی گناہوں کا نعم البدل بن سکیں تو میں پرماتما سے پرارتھنا کروں گی کہ وہ کنول کماری کی بجائے مجھے پکڑ لے۔ پر کون پربھو اور کون بھگوان۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں۔ کنول سن نہیں سکتی' بس بول سکتی ہے' لڑکھڑا سکتی ہے اور پھر بھی اپنے بستر سے اٹھ کر دبے قدموں سارے کمرے میں گھومتی ہے۔ ٹٹول کر کھڑکیوں کو کھولتی ہے۔ باہر جھانک کر کہتی ہے: ''یہاں کتنا اندھیرا ہے۔ کچھ بھی تو دکھائی نہیں دیتا۔ کیوں نیرا۔ بچیاں تو ٹھیک سے ہیں۔ عائشہ کو جا کر تسلی دو۔ نویدہ بہت ڈرتی ہے۔ اس سے کہو گھبرائے نہیں جب تک میں زندہ ہوں کوئی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ میری زندگی میں میری بچیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ مسلمان لڑکیوں کو ان کے حوالے کر دوں۔ پاگل اتنا نہیں سمجھتے وہ میرا آدرش ہیں۔ وہ میرے دل کی تمنائیں ہیں۔ وہ میرے اور باقی دنیا کے درمیان ایک پل ہیں۔'' میں لاکھ پکڑتی ہوں' آوازیں دیتی ہوں مگر وہ کھڑکی کا پٹ کھولے کوئی شے بنا دیکھے اپنے سے باتیں کرتی رہتی ہیں۔

''نیرا یہ دھماکہ کیسا ہے۔ نیرا جلدی سے بتی جلاؤ۔ جلدی کرو نیرا۔ نیرا۔'' اور وہ تیزی سے چلنے کی کوشش میں گر جاتی ہے۔

مجھے بتاؤ کیا یہی انجام ہو سکتا ہے۔ کنول کی آنکھیں نہیں ہیں۔ اس کے ہوش و حواس نہیں ہیں اور اس لیے میں تمہیں یہاں آ کر اسے دیکھنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ میں نے برسوں مندر کے باہر کھڑے ہو کر اس انتظار میں کاٹے تھے کہ شاید میرا پیا اپنے درشن دکھا دے۔ جب میں نے چیخ چیخ کر تھک کر کہا: ''میں پوجا کرنے آئی ہوں دوار کھولو۔'' آس لگاتے لگاتے ایک جگ بیت گیا ہے۔ اپنے پلو سے لٹکی امیدوں کو بھی میں نے ڈائیل کے ساتھ چوراہے میں چھوڑ دیا ہے۔ دروازہ کھلا میری پیاسی زبان سوکھ کر لکڑی ہو گئی۔ مجھ میں پرارتھنا کرنے کی سکت بھی نہ تھی اور بھگوان اپنے ہاتھ میں دردناک عذاب لیے پریشانیاں اٹھائے سیڑھیوں تک آیا اور پھر واپس اسی

طرح آسن جما کر بیٹھ گیا۔ میں اندر نہ جا سکی۔ میں کنول کے ساتھ اس اندھی بھری دنیا میں واپس آ گئی ہوں۔ کسم کلیاں روندی ہوئی پاؤں تلے پڑی ہیں جو کچھ میں نے دیکھا' اس سے زیادہ تم دیکھ چکے ہو۔ کچھ لکھنا اور کہنا بے کار کی باتیں ہیں۔ ساری راہیں ساری روشنیاں ایک دم بجھ گئی ہیں۔ گھور اندھیارا ہے۔ کوئی کسے پکارے اور پھر بھی کنول کماری ٹھاکر نیرا کو پکارتی ہے۔ ''نیرا بچیاں تو ٹھیک ہیں۔ عائشہ کو جا کر تسلی دو۔''

جن دنوں میں نے تھوڑا ہوش پکڑا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے خون کے دھبے مٹ گئے تو نیرا ایک خط لائی تھی۔ یہ کہنے کہ کنول ٹھاکر نے جو خط اپنے بھیا کو لکھا تھا اور پھر اسے ختم کیے بنا رکھ دیا تھا' شاید اس میں کوئی ایسا نشان ہو جس سے اس کے رشتہ داروں' گھر والوں کو اطلاع دی جا سکے۔ شوبھا کو اس کے بھیا ملے تو تھے مگر ان کے متعلق مزید پتہ نہیں ہے۔ اس کاغذ کی تہیں پیلی پڑ گئی ہیں۔ پر کنول کے ہاتھ سے لکھی ہوئی یہ تحریر میرے نام پر کندہ ہے۔ کنول کماری ٹھاکر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔ خط بہت سال پہلے کا ذکر ہے نہ جانے لکھنے والی نے اسے بند کیوں نہ کیا۔

''بھیا تمہارے بدیسی نظریوں اور آزادی کے رنگین ڈھکوں' تمہاری غیر ملکی عورت اور خاندان کے بٹوارے' ماں کی موت' آپ نے مجھے جس راہ پر لگایا تھا' میں اس پر چل رہی ہوں۔ جدا ہوتے ہوئے میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اگر میں اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکی تو ہرگز اپنے کو وجود نہ کروں گی۔ تم میرا نام بھی کبھی نہ سنو گے۔ پر اب یہاں کالج کبھی کبھی لگتا ہے۔ جن راہوں پر میں چل رہی ہوں۔ وہ میری زندگی کا مقصد ہے۔ میرا مستقبل میرے سامنے سے میری منزل واضح ہے۔ میں کھلی آنکھوں سے تیز قدموں سے بڑھ رہی ہوں۔

کنول نے لکھا تھا: ''ہمارے ہاں ہندوستان میں عورت ایک اندھی' بہری' گونگی بجلی ہے جو کبھی کبھار گرتی ہے۔ میں تمہیں بتاؤں تم مغرب کی روشنیوں میں پھنس گئے تھے۔ اپنے آدرش اور اپنے راستے اب بھی سچے ہیں۔ ہم اب بھی زندگی کے نزدیک ہیں۔ بدیسی عورت چمک سکتی ہے' نشہ بن کر گرا سکتی ہے' اٹھا نہیں سکتی۔ وہ اندھیارے کو روشن نہیں کر سکتی۔

مجھے جاتے ہوئے تم نے کہا تھا کہ بھٹکی ہوئی گزرگاہوں' الجھی پگڈنڈیوں پر میں کہیں نہیں پہنچ سکتی اور دیکھو تو سہی میں ان دنوں جس شاہراہ پر ہوں' وہاں تمہاری غیر ملکی بیوی کب ہے۔ تم دھرم بھگوان اور خاندان کو بکھیر کر چلے گئے۔ میں نے پریشان زندگی کو پھر سے اکٹھا کرنے اور

پستیوں کو بلند کرنے، شعور کی اندھی راہوں سے بھاری پتھر ہٹانے کا راز دریافت کرلیا ہے۔ میری زندگی کا آخری لمحہ میرے خون کا آخری قطرہ مشرق کی بھولی روایتوں کو دوبارہ زندہ کرنے اور انہیں قابلِ عمل بنانے میں صرف ہوگا۔ ہمارے ہاں زندگی کی تصویر بہت سادہ ہے۔ اس میں گھر ہے۔ سکون ہے۔ دور تک پھیلے کھیت ہیں اور عورت کے خواب ہیں۔ میں ان باتوں کو پھر سے جگاؤں گی۔ عورت کے خوابوں نے ہمیشہ ہندوستانی زندگی کو نئے آدرشوں کی طرف پرانی راہوں سے دھکیلا ہے، عورت دکھ سہتی ہے، پیڑا سہتی ہے اور زمین بن کر تخلیق کی دشواریوں سے دوچار ہوتی ہے۔ میرے سینے میں یہ تخلیق نئے خیالات اور پرانے آدرشوں کی ہے۔

میرے بھگوان کی مورتی پگھلتی ہے۔ اس کی روشنی میری آنکھوں کو ان پردوں سے پار دیکھنے میں مدد دیتی ہے جو ابھی عالم نو بن کر تمہاری نگاہوں سے بھی پوشیدہ ہیں۔ میں اپنے خیالوں سے پردہ اٹھاؤں تو کوئی بھی اس تابانی کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ ایک اور بات کہوں تم تو میری تقدیر اور قسمت کے بڑے قائل تھے نا، کبھی دیکھو آ کر تو جانو میں نے اپنے سہاروں کے لیے قسمت کو بھی اپنے مطابق بنالیا ہے۔ یہ میرا کالج اور پھلتی پھولتی نئی پود۔ کبھی کبھار میں آنکھیں بند کر کے سوچتی ہوں تو لگتا ہے یہ سب بچیاں، ان عظیم ارادوں کی یادیں، اس آزادی کا سنگ بنیاد بنیں گی جب عورت ماں، بہن، بیٹی اور بیوی سے اونچی ہوگی، جب عورت صرف عورت ہوگی، عورت کی اکیلی طاقتوں کے سماں اپنے سہارے خود ہی اڑ سکے گی، جب عورت کمزور نہ ہوگی، جب تم اسے پھر ستونتی کہہ سکو گے، جب اس کی رائے کی مضبوطی کو تم پھر اڑا لے جائے گی۔

میں کسی سے مدد نہیں چاہتی، صرف میرا بھگوان میرا سہارا ہے۔ مجھے اس کی شرن چاہیے۔ وہی میری طاقت میرا روپ میرا امان ہے۔ میرا کنہائی اب قلب و جگر سے باہر نکلنے والا ہے۔ اس کی بانسری میری اور ساری دنیا کی بند آنکھوں کو کھول دے گی۔

خود سے میرا سر بلند ہو جاتا ہے۔ میں نے آج تک کسی مرد کا سہارا نہیں لیا۔ میری زندگی کے چور دروازوں سے بھی کوئی مرد اس گھر میں داخل نہ ہو سکا۔ سیدھی سادھی خوش اخلاقی کا جو تقاضا تھا، میں نے وہ پورا کیا۔ عام مرد میری نگاہوں میں پتنگے ہیں جو عورت کی آنکھوں کی ذرا سی روشنی پا کر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی مسکراہٹ بھی انہیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ میں نے انہیں اپنے گرد گرنے نہیں دیا۔ میں تو ہیرے کی ایک چٹان ہوں۔ چٹان پتھر ہے جس کے سینے پر سردی گرمی بارش طوفان آندھی کسی کا بھی اثر نہیں ہوتا۔ یہ چٹان جو دو دنیاؤں کے سنگم پر ہے جس کی

سر بفلک بلندیاں تم کو افق کے اتنا نزدیک کر دیں گی اتنا قریب کہ تم ہاتھ بڑھا کر آکاش کو چھو سکو۔
بھگوت گیتا میں وعدہ کی گئی کرشن کی اس سورگ کا دروازہ جس کے اندر داخل ہو کر تمہارے خیال ہی تمہارا عمل بن جاتے ہیں۔ تم کہو گے یہ ایسے خواب ہیں جو انسان پوری طرح دیکھ نہیں سکتا مگر جن کے وجود سے آشنا رہتا ہے۔ جن کو واضح دیکھتا رہتا ہے مگر جنہیں دیکھتے رہنے کی خواہش کبھی مردہ نہیں ہوتی۔ وہی خواب جو بچپن سے بڑھاپے تک ازل سے ابد تک مرد دیکھتا چلا آیا ہے۔ پر بھیا......"

خط اچانک ادھورا چھوڑ دیا گیا تھا اور یہ خط اب کبھی ختم نہ ہو سکے گا۔ نہ جانے کنول کماری ٹھاکر اپنے بھیا کو اور کیا لکھنا چاہتی تھی۔ اپنے اور کون سے خواب کا ذکر کرنا چاہتی تھی۔ شاید اس نے اپنے خط کو اگلی بہتر بہاروں کے انتظار میں ختم نہیں کیا تھا۔ بہار جو اس کے لیے کبھی آ نہ سکی۔ بہار جو ہم سب کے لیے کبھی آ نہ سکے گی۔ بہار جس کی تلاش میں قافلے سرگرداں نکلیں گے مگر اسے پا نہ سکیں گے۔ نہ جانے کب تک ہماری جلوتوں میں اندھیرا رہے گا۔ ہماری آنکھیں بند رہیں گی۔ کنول کماری ٹھاکر کے بعد کون اٹھے گا' نہ جانے کون۔ مستقبل تاریکی میں ہے اور کسی کی نگاہوں میں بھی آنے والی سحر بے حجاب نہیں ہے۔

شہر میں امیدوں کے استقبال کی خاطر زمانوں کے تانے بانے میں دعاؤں کو پرو کر جو قالین تیار کیا گیا تھا لوگوں نے اس کے چیتھڑے اڑا دیئے۔ محبت کا منڈپ سونا ہو گیا۔ مورتی کی جگہ ویران اور خلا ہے۔ کون یاد دلائے کہ یہاں تو ہماری آزادی کا دیوتا اپنے درشن دینے کے لیے آنے والا تھا۔ سب کچھ جل گیا۔ وہ سنہرے خواب بھی جو آنے والی بہاروں کے نشان تھے۔ وہ پھول بھی مرجھا گئے جو ہماری فتح مندی کے سہرے تھے۔ ہوا میں صرف جے جے کار اور شور ہے۔ زمانہ صرف گردش کر رہا ہے۔ آگے نہیں بڑھتا۔ ہماری کوئی منزل نہیں۔ تخلیق اندھیرے میں ایک اندھے آدمی کا راستہ بن گئی ہے۔ شاہراہیں خاموش ہیں۔ کوئی صدا نہیں' کوئی خوشی نہیں' کس کے قدموں کی چاپ سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوں؟ اور پھر بھی سوچتا ہوں کسی جنم میں کسی آنے والے درد میں کسی دوسری دنیا کی روشنیوں میں تھم کر رک کر کنول ٹھاکر کی ان سیاہ آنکھوں کو پہچان لوں گا۔ وہ آنکھیں جن میں صبح کے ستارے کی روشنی کسی بھولے ہوئے جنم کی یادوں میں گھلی ہے۔ اس کے چہرے کا جادو جس کی تابانی محبت کا راز بن کر میرے جذبات کی روشنی میں چمک اٹھے گی۔